ہندی اردو تنازع

(ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں)

ڈاکٹر فرمان فتحپوری



قومی کمیٹی برائے صد سالہ تقریبات پیدائش قائدِ اعظم محمد علی جناح

ہندی اردو تنازع

ہندی اردو تنازع

(ہندو مسلم سیاست کی روشنی میں)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری

ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

شعبہ اردو، کراچی یونیورسٹی

قومی کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ

پیدائشِ قائدِ اعظم محمد علی جناح

وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان - اسلام آباد

اشاعت اول : ۱۹۷۷ء

تعداد : ایک ہزار

قیمت : ۳۶ روپے

ناشر :

نیشنل بُک فاؤنڈیشن
کراچی - اسلام آباد - لاہور - پشاور - کوئٹہ - سکھر - ملتان

طابع : معارف پرنٹرز، کراچی-۴

انتساب

بیاد بابائے قوم قائد اعظم محمد علی جناح ، جنھوں نے ارشاد فرمایا :

''پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی ، جو شخص آپ کو غلط راستے پر ڈالے وہ پاکستان کا دشمن ہے ۔ ایک مشترک زبان کے بغیر کوئی قوم نہ باہم متحد رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے ۔''

بیاد بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، جن کے بارے میں شمس العلما عبدالرحمن دہلوی نے فرمایا :

''آپ نے اردو زبان کے لئے وہ سب کچھ کیا جو کیا جا سکتا تھا۔ خود بھی جو کچھ لکھا وہ کم اہم نہیں مگر بہت زیادہ اہم ہے وہ ، جو آپ نے لکھوایا اور شائع کیا ۔ اور اس سے کہیں زیادہ قابل قدر ہے وہ خیال جو آپ نے اردو کی بابت ملک کے لوگوں میں بلا تفریق مذہب و ملت پھیلایا ۔''

فرمان فتح پوری

فہرست مضامین

خروش اور کانگریس کے مظالم کے خلاف غم و غصہ
* سندھ صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس اور قیام پاکستان
کی قرارداد * مجوزہ پاکستان کے لئے آئینی کمیٹیوں کا قیام *
۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کا اجلاس اور قرارداد پاکستان
* کانگریسی رہنماؤں اور مہاسبھائیوں کا رد عمل
* جمعیت العلمائے ہند اور جمعیت العلمائے اسلام کے
مابین بحثیں * دوسری جنگ عظیم اور سیاسی سرگرمیوں
میں تعطل * مہاتما گاندھی اور قائد اعظم کی تاریخی
مراسلت * گاندھی جی کی طرف سے قومی زبان کے سلسلے
میں نیا الجھاوا * ہندی اور ہندوستانی کا شاخسانہ اور
ماہرین کا تبصرہ * کاکا کالیکر اور مولانا ظفر علی خان کا
مکالمہ * قومی زبان کے مسئلے پر گاندھی جی کی
تحریروں کا خلاصہ * پنڈت سندر لال کا خط مہاتما گاندھی
کے نام * کانگریس کی ہٹ دھرمی اور مختلف صوبوں میں
ہندی کا نفاذ * مولوی عبدالحق اور راجندر پرشاد
معاہدہ * مولانا آزاد اور مولوی عبدالحق کی بات چیت
* کانگریسی زعما اور ان کی اردو دشمنی * ریڈیو کی زبان
اور ہندی اردو کا قضیہ * کانگریس کے اجلاس میں
اردو کے مسئلے پر اختلاف رائے * ڈاکٹر اشرف اور
ڈاکٹر علیم کا نقطۂ نظر * مسلم لیگ اور انجمن ترقی
اردو میں اشتراک و اتحاد عمل * قائد اعظم کی صدارت
میں مسلم لیگ کا اجلاس اور اردو کی حمایت میں
قرارداد * شہید ملت کا بیان * تحریک پاکستان کی
شدت و مقبولیت * زبان کے مسئلے پر گاندھی جی کی
نئی چال اور اس کی ناکامی * جی رام ناتھن اور جے داس
گپتا کے خیالات * ہندوستانی پرچارنی سبھا کی بے اثری

کتاب سے پہلے

اس کتاب کا موضوع ، دو خاص عنوانات ، اردو ہندی تنازع اور ہندو مسلم سیاست پر مشتمل ہے ، مراد یہ ہے کہ یہ دونوں باہم دگر کس طرح متاثر رہے ہیں اور ایک دوسرے پر کیا اثر ڈالا ہے ، اس لحاظ سے اس کتاب کا موضوع بر صغیر میں ہندو مسلم سیاست کا لسانی جائزہ یا اردو ہندی تنازع کی سیاسی تاریخ ہے ۔ زبان و سیاست کے اس عمل میں ، جس کے جائزے پر یہ کتاب مبنی ہے، جسے مسلم قومیت کے ظہور اور پاکستان کے حصول کی تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں ، پاکستان کی ساری زبانوں نے بقدر جثہ حصہ لیا ہے لیکن اردو چونکہ ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی تھی ، اس کا علمی و ادبی ذخیرہ اور حلقۂ اثر بھی وسیع تر تھا ، اور بر صغیر میں مسلم ثقافت و تہذیب کا مظہر و مخزن خاص ہونے کے سبب مسلمانوں کے لئے عربی و فارسی کا بدل تھی ، اس لئے مسلم قومیت اور نظریۂ پاکستان کی تشریح و تشکیل اور تعمیر میں اس کا حصہ دوسری زبانوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے ۔ اردو صرف یہی نہیں کہ ہندو مسلم سیاست کی ترجمان تھی بلکہ مسلمان ، جس مسلم قومیت اور جس دو قومی نظریے کے تحت آزادی کی جد و جہد کر رہے تھے ، وہ ان کے اجزائے ترکیبی کا اہم عنصر بھی تھی ، یعنی مسلمانوں کے مطالبات اور ان کی نمائندہ سیاسی جماعت ، مسلم لیگ کے منشور میں یہ بات بھی شامل تھی کہ آزادی ملنے کے بعد قومی و سرکاری زبان اردو ہوگی۔

قومی زبان کے سلسلے میں ، مسلمانوں کا یہ نقطۂ نظر کسی مذہبی تعصب یا فرقہ‌وارانہ تنگ نظری کا نتیجہ نہیں بلکہ انصاف اور سچائی کے تقاضوں پر مبنی تھا ۔ اردو کو بر صغیر میں ایک مدت سے لنگوا فرینکا کی حیثیت حاصل تھی مدارس میں ذریعۂ تعلیم ہونے کے ساتھ ساتھ سرکاری دفتروں اور

عدالتوں میں بھی وہ مروج تھی، اس کی ترویج و ترقی میں ہندو مسلمان دونوں نے حصہ لیا تھا اور دونوں ہی کی وہ مشترک زبان تھی لیکن اٹھارویں صدی کے آخر میں جیسے ہی، مسلمانوں کے سیاسی اقتدار پر زوال آیا اور انگریزوں کا تسلط قائم ہونے لگا، ہندوؤں میں انگریزوں کے اشارے پر اپنی قومیت کا ایک نیا احساس برتری پیدا ہوا ان کی نظر میں ہر وہ چیز جس کا تعلق مسلمانوں کی ثقافتی و تہذیبی زندگی سے تھا اور جس کو اپنانے میں، اس سے پہلے ہندو خود بھی ایک طرح کا فخر محسوس کرتے تھے قابل ترک قابل نفرت ہو گئی۔ اردو ہر چند کہ خالص دیسی زبان تھی ہندو مسلم ملاپ کے نتیجے میں جنم لیا تھا، اور مسلمانوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبانوں عربی فارسی اور ترکی کو خیر باد کہہ کر ہندو مسلم خیر سگالی جذبے کے تحت اسے اپنایا تھا، بایں ہمہ چونکہ اس کی پیدائش و پرورش مسمانوں کے عہد میں ہوئی تھی اس لئے اس سے بھی بیزاری و نفرت کا اظہار کیا گیا۔ سنسکرت کو دوبارہ زندہ کرنے کا کام، انگریزوں کی سرپرستی میں ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کی معرفت ۱۷۸۴ء ہی سے شروع کر دیا گیا تھا اب فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) میں سنسکرت آمیز ہندی کی تخلیق پر لوگوں کو مامور کیا گیا، ڈاکٹر گلکرسٹ کے کہنے پر للو لال جی نے ہندی نثر کی پہلی کتاب "پریم ساگر" مرتب کی اور یہ ۱۸۰۳ء میں کالج کی طرف سے شائع کی گئی، پھر جیسے جیسے برصغیر پر انگریزوں کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، حکومت کے سائے میں ہندی کا بھی بول بالا ہوتا گیا یہاں تک کہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے سربرآوردہ ہندوؤں نے، جس میں سر سید احمد خاں کے بعض قریبی دوست بھی شامل تھے، اردو کی جگہ ہندی کو ناگری رسم الخط میں سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں رائج کرنے کا مطالبہ کر دیا، گویا ہندو قومیت کے جوش میں تمدنی زندگی کے اس بنیادی رشتے ہی کو کاٹ کر پھینک دینے کی کوشش کی گئی جس میں ہندو اور مسلمان، ہزار اختلاف کے باوجود کئی صدیوں سے بندھے ہوئے تھے۔ سر سید احمد خاں نے اپنی فراست سے اسی وقت پیشین گوئی کر دی تھی کہ اب یہ دونوں قومیں ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں، انھیں ایک نہ

ایک دن الگ ہونا ہوگا ۔ ہوا بھی یہی ، اردو ہندی کے اختلاف کے ساتھ ساتھ دونوں قوموں کے درمیان روز بروز فاصلہ بڑھتا گیا ، ہندی ، ہندو قومیت کا ۔۔ اور اردو ، مسلم قومیت کا لازمی عنصر بن گئی اور ہندی اردو تنازع کو ہندو مسلم سیاست میں ایسی اہم حیثیت حاصل ہوگئی کہ تحریک پاکستان یا تقسیم ہند کی کوئی تاریخ اس کے ذکر کے بغیر مکمل نہیں کہی جا سکتی ۔

اس پس منظر میں ہندی اردو تنازع کی تاریخ پورے دو سو سال پرانی ہے یعنی اتنی ہی پرانی جتنی جدید ہندو قومیت کی تاریخ ہے ۔ میں نے دو سو سال پر محیط اس طویل تاریخ کو ، اس کتاب میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے ۔ ابتدائی دو باب تمہیدی نوعیت کے ہیں ، پہلے میں پاکستان ، مسلم قومیت اور اردو کے باہمی رشتوں کی اہمیت کا اجمالی تذکرہ ہے ۔ دوسرے میں اردو پر روشنی ڈالی گئی ہے تاکہ ان کے تنازع کو سمجھنے میں آسانی ہو جائے ۔ تیسرے باب میں پس منظر کے طور پر ان اہم حالات و واقعات کا مختصر تذکرہ ہے جنھوں نے اردو ہندی تنازع کو جنم دیا ۔ چوتھے باب میں اس تنازع کے ابتدائی دس برسوں میں رونما ہونے والی ان اہم لسانی و سیاسی سرگرمیوں کی تفصیل ہے جن کے سبب سر سید احمد خاں کو یہ کہنا پڑا کہ ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں بستی ہیں اور دو قومی نظریہ پہلی بار عوامی و سیاسی سطحوں پر نمودار ہوا ۔ پانچواں باب ، ہندو قومیت کی ان لسانی و سماجی تحریکات اور سیاسی اقدامات کے ذکر پر مبنی ہے جن کا مسلمانوں پر سخت رد عمل ہوا اور جو دو قومی نظریے کو مسلمانوں کا مستقل سیاسی نقطۂ نظر بنانے میں مدد گار ثابت ہوئے ۔ چھٹا باب ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک کے حالات پر محیط ہے اور اس میں ان لسانی و سیاسی مسائل و مباحث کا تذکرہ ہے جو پہلی بار ، سیاسی سطح پر چھیڑے گئے اور کانگریس اور مسلم لیگ ، یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعتیں ہندی اردو تنازع میں باقاعدہ فریق بن گئیں ۔ اس کے بعد ، ناگری اور فارسی رسم الخط کے مسئلے پر ، ایک الگ باب میں روشنی ڈالی گئی ہے اس لئے کہ ۱۹۰۶ء اور ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصے میں زیادہ بحثیں اسی

موضوع پر ہوئی ہیں۔ آٹھویں باب میں ہندی اردو تنازع کے آخری دس سال کے اہم واقعات کا تاریخی جائزہ ہے آخر میں بعض ایسی تاریخی دستاویزیں محفوظ کر دی گئیں ہیں جو کتاب کے موضوع کے سلسلے میں حد درجہ اہم اور نادر و نایاب ہیں۔

میں نے کتاب کی تسوید و تالیف میں طریقۂ کار یہ رکھا ہے کہ موضوع سے متعلق سارے واقعات و مسائل کو ادوار میں تقسیم کر کے تاریخی ترتیب کے ساتھ بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لسانی اختلافات اور ان کے نتیجے میں رونما ہونے والے مباحث کا تذکرہ، ہر باب میں اہتمام و تفصیل سے کیا گیا ہے اس لئے کہ اس کتاب کا اصل مقصود یہی ہے لیکن اس خیال سے کہ ہندی اردو اختلاف، حقیقت میں ہندو مسلم سیاست ہی کا ایک جزو تھا اور ایک کا اثر دوسرے پر ضرور پڑتا تھا اس لئے لسانی مباحث کے ساتھ ساتھ ہر دور کے اہم سیاسی واقعات کا مختصر ذکر بھی ضروری سمجھا گیا ہے۔ ان مباحث و واقعات کے بیان اور تجزیہ و تحلیل میں یقیناً میرے زاویۂ نظر کو بھی دخل ہوگا لیکن میں نے اپنے زاویۂ نظر کو معروضی بنانے کی پوری کوشش کی ہے۔ جو بات کہی ہے، دلائل و شواہد کے ساتھ کہی ہے اور جہاں سے جو نکتہ یا خیال ماخوذ ہے، حاشیے میں اس کی نشان دہی کر دی ہے۔ میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ تحریک پاکستان یا تقسیم ہند کے تعلق سے لسانی و سیاسی مسائل پر اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب کچھ میری نظر سے گزرا ہے، البتہ جیسا کہ قارئین کو خود اس کتاب کے مطالعہ سے اندازہ ہوگا، اردو اور انگریزی میں جو اہم کتابیں لکھی گئی ہیں، ان میں سے بیشتر میرے مطالعے میں رہی ہیں، چنانچہ اردو ہندی تنازع سے متعلق ایسا مواد جو ہندو مسلم سیاست سے بھی خاص تعلق رکھتا ہو، یا جس سے سیاسی تحریکیں متاثر ہوئی ہوں، مجھے زیادہ انگریزی کتابوں ہی میں ملا ہے۔ اسی لئے میں نے یہ کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں بہ یک وقت مرتب کی ہے، سردست یہ اردو میں شائع ہو رہی ہے۔ انگریزی

کتابوں کے اقتباسات کے عام طور پر اردو ترجمے ھی دئے گئے ھیں لیکن کہیں کہیں خاص وجوہ سے میں نے انگریزی ھی کو ترجیح دی ھے۔

رہ گئی اس کتاب کی افادیت، سو، میں کیا عرض کروں اس کے بارے میں، کتاب کے قارئین ھی کی رائے صائب خیال کی جائے گی۔ پھر بھی اتنا کہوں گا کہ جو لوگ قومی زبان اور قومی مسائل سے دلچسپی رکھتے ھیں وہ اسے افادے سے خالی نہ پائیں گے، یہ البتہ ممکن ھے کہ زبان کے حوالے سے کتاب کا سواد، تاریخ اور سیاست، خصوصاً تحریک پاکستان اور دو قومی نظریے سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے جتنا کارآمد ھو، اتنا اردو زبان و ادب کے طالب علموں کے لئے نہ ھو تاھم انھیں یہ ضرور معلوم ھو سکے گا کہ کسی قومی زبان کا اس کی قوم سے کیا رشتہ ھوتا ھے اور اردو زبان نے پاکستانی قوم اور قومیت کی تشکیل و تعمیر میں کیا کردار ادا کیا ھے۔

مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ھے کہ ھمارے یہاں، اب تک جن لوگوں نے برصغیر کی ھندو مسلم سیاست یا تحریک پاکستان پر قلم اٹھایا ھے ان میں سے چند ایک کے سوا بیشتر نے ھندی اردو تنازع کی اھمیت کو پوری طرح محسوس نہیں کیا۔ بعض نے تو اس مسئلے کا ذکر ھی نہیں کیا، بعض نے کیا بھی ھے تو شاید سیاسی مصلحتوں کی بنا پر بہت سرسری اور ضمنی۔ اس کے برعکس، غیر پاکستانی مصنفین نے اردو ھندی تنازع کو، ھندو مسلم سیاست کا اھم جزو خیال کر کے، اسے اھتمام اور تفصیل سے موضوع گفتگو بنایا ھے۔ پچھلے دو سال میں بعض ایسی کتابیں منظر عام پر آئی ھیں جن میں، ھندو مسلم سیاست کی بحث میں لسانی مسائل پر خاص توجہ دی گئی ھے، ان میں فرانسس رابنسن، پال براس اور سی اے بیلی کی کتابیں خصوصیت سے قابل ذکر ھیں۔ بیلی کے بعض بیانات سے تو یہاں تک اندازہ ھوتا ھے کہ مسلم لیگ اور دو قومی نظریے کی تشکیل و مقبولیت میں، اساسی حیثیت، اردو ھندی تنازع کو حاصل رھی ھے ان کی تحقیق کے مطابق ۱۹۰۶ء میں جب مسلم لیگ قائم ھوئی تو اس کے ابتدائی ممبروں میں بیشتر

وہ لوگ تھے جو اردو ڈفینس سوسائٹی الہ آباد (۱۸۷۳ء) اور اردو ڈفینس ایسوسی ایشن لکھنؤ (۱۹۰۰ء) کے ممبر رہ چکے تھے یا پھر وہ لوگ جو ان کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندوستانی مصنفین نے اپنی تحریروں میں زبان کے مسئلے کو خاصی اہمیت دی ہے۔ انھیں ایک سہولت یہ بھی حاصل ہے کہ ہندوؤں کے نامور عملی سیاست دانوں میں سے بیشتر نے، خواہ ان کا تعلق کانگریس سے ہو یا ہندو مہا سبھا سے، ہندی کی حمایت اور اردو ہندی تنازع کے سلسلے میں ضرور کچھ نہ کچھ لکھا ہے۔ ڈاکٹر سمپورنا نند، پرشوتم داس ٹنڈن، پنڈت جواہر لال نہرو، مہاتما گاندھی، بابو راجندر پرشاد، مدن موہن مالویہ، کاکا کالیکر، ساورکر اور بی جی تلک۔۔ جیسا کہ زیر نظر کتاب میں جا بجا حوالوں سے اندازہ ہوگا، سبھی نے، بار بار اس موضوع پر بیانات دیے ہیں، تقریریں کی ہیں، مضامین لکھے ہیں، اپنی خود نوشتوں میں اس کا باب قائم کیا ہے اور کتابیں مرتب کی ہیں ان امور سے ظاہر ہے کہ یک قومی نظریہ کے پابند ہندو مصنفین اور ان کے ہمنوا بعض دوسرے اہل قلم کو، اس موضوع پر اظہار خیال کرنے اور اپنے قومی نقطۂ نظر کے مطابق نتائج اخذ کرنے میں بڑی آسانی ہے۔

پاکستان میں اس طرح کا بنیادی مواد بہت کم ہے، جو کچھ ہے زیادہ تر مسلم لیگ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کے سالانہ اجلاسوں کی تقاریر و تجاویز اور قراردادوں تک محدود ہے ہمارے سیاسی رہنماؤں نے اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی، ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ بر صغیر کے عوام کے لئے جدید ہندی ایک نئی اور مصنوعی زبان تھی اور اس کو اردو جیسی مقبول عام زبان کا مد مقابل بنانے کے لئے جس قسم کے سیاسی پروپیگنڈے کی ضرورت ہندی والوں کو تھی، اردو کے حامیوں کو نہیں تھی، لیکن بعد کو بھی ہمارے عملی سیاست دانوں نے جو سوانحی یاد داشتیں مرتب کی ہیں ان میں اردو ہندی تنازع کو مناسب جگہ نہیں دی گئی۔ البتہ مولوی عبدالحق نے اور ''ہمایوں'' کے مدیر میاں بشیر احمد نے ہم سب کی طرف سے اس کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔ اردو کے دوسرے

رسائل و اخبارات کے مدیروں نے بھی بہت کچھ لکھا ہے لیکن ان دونوں بزرگوں کا حصہ سب سے زیادہ ہے۔ مولوی عبدالحق نے ایک اہم کام یہ کیا کہ اردو ہندی تنازع کے موضوع پر جو کچھ لکھا گیا خواہ وہ اردو کی موافقت میں ہو یا مخالفت میں ، اس کا بیشتر حصہ رسالہ ''اردو'' اور ''ہماری زبان'' میں محفوظ کر لیا۔ چنانچہ مجھے اس کتاب کے آخری دو ابواب کے لئے زیادہ مواد اسی سے ملا ہے۔ اردو ہندی تنازع سے متعلق مسلمان رہنماؤں کے بیانات اور سیاسی جماعتوں کی قرار دادیں میں نے مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کی روئدادوں اور خطبوں سے چھان بین کر کے نکالی ہیں۔ انیسویں صدی کی لسانی بحثوں کا ابتدائی سراغ ، مشہور فرانسیسی مستشرق گارسین دتاسی کے سالانہ خطبوں اور مقالوں سے ملا ، بعد ازاں اصل مضامین تک رسائی کچھ ایسی مشکل نہ رہی۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ کے پرچے ، جن میں اس موضوع سے متعلق ابتدائی بحثیں شائع ہوئی تھیں ، کہیں دستیاب نہ تھے ، محبی مشفق خواجہ صاحب نے یہ مشکل بھی آسان کر دی ، ان کی توجہ سے علی گڑھ اخبار کے مطبوعہ بیشتر مضامین مجھے دیکھنے کو مل گئے ، ان مضامین میں اردو ڈفینس ایسوسی ایشن الہ آباد کی وہ روئداد بھی تھی جو سر سید احمد خاں کے دستخطوں سے مرتب کی گئی تھی ، اردو ڈفینس ایسوسی ایشن ، لکھنؤ ، ۱۹۰۰ء کی ایک اوریجنل روئداد ، مجھے مسلم لیگ رکارڈ جامعہ کراچی میں مل گئی ، یہ دونوں روئدادیں ، ضمیمے میں دے دی گئی ہیں۔ ضمیمے میں اور کئی ایسی چیزیں دیکھنے میں آئیں گی جو نادر و نایاب ہیں۔ مختصر یہ کہ میں نے موضوع کے بنیادی ماخذوں تک رسائی حاصل کرنے اور ان سے استفادہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے ، پھر بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ یہ کتاب ہر طرح مکمل یا کمزوریوں سے پاک ہے البتہ محدود وسائل اور محدود وقت میں جو کچھ ہو سکتا تھا میں نے اپنے امکان بھر کیا ہے۔

اس کتاب کے سلسلے میں ، بہت سے بزرگوں ، دوستوں اور شاگردوں نے میری مدد کی ہے۔ میں ان سب کا سپاس گذار ہوں لیکن سچ پوچھیے تو ،

نه صرف میری طرف سے بلکه پوری ملت کی طرف سے ، سب سے زیادہ شکریے اور مبارکباد کی مستحق قائد اعظم سنٹیٹری کمیٹی اور حکومت پاکستان ھے جس نے اس موضوع کی اھمیت کو قومی سطح پر محسوس کرکے اس پر کتاب لکھوانے اور شائع کرنے کا اهتمام کیا - ابن حسن قیصر صاحب ، مشفق خواجه صاحب اور ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کا بطور خاص یوں ممنون هوں که ان کے ذاتی کتب خانوں کے دروازے مجھ پر کھلے رھے اور میں نے جس طرح چاھا ان سے استفاده کیا - کتب خانه‌جات حکومت پاکستان کے ڈائریکٹر حفیظ اختر صاحب ، لیاقت نیشنل لائبریری کے ناظم جناب سیفی صاحب ، ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، جامعه کراچی کے مہتمم جناب عادل عثمانی صاحب، مسلم لیگ رکارڈ جامعه کراچی کے نگراں جناب عقیل الظفر صاحب اور اسٹیٹ بنک آف پاکستان لائبریری کے جناب ریاض الدین صاحب اور سید آباد علی صاحب بھی میرے شکریے کے مستحق ھیں که کتابوں کے حصول میں ان کا فراخ دلانه تعاون مجھے همه وقت حاصل رھا - کتب خانه خاص انجمن ترقی اردو اور آل پاکستان مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے ارکان کا بھی شکریه ادا کرنا ھے که انھوں نے بھی میری هر ممکن مدد فرمائی - شباھت علی خان ، زاھد علی ، محمد عمر ، ذاکر علی ، ڈاکٹر محمد عبدالعزیز ، ڈاکٹر سید معین الرحمن اور امراؤ طارق خواه کہیں هوں ، میں ان کی رفاقت اور سہارے کے بغیر نه تو کوئی کام کر سکتا هوں اور نه وه میری اعانت کرنے سے غافل رہ سکتے ھیں - اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں بھی وہ برابر میرے معاون و دمساز رھے ھیں ، اس لئے اس موقع پر جذبه خلوص کے ساتھ انھیں بھی یاد کرنا ضروری ھے - اس سلسلے میں جناب ذھین عالم صاحب بھی میرے دلی شکریے کے مستحق ھیں جنھوں نے طباعت کے مرحلے میں بڑی دیده ریزی کے ساتھ تصحیح کی ذمه داری قبول کی اور ابن حسن قیصر صاحب کا مزید شکریه اس لئے که انھوں نے کتاب کا اشاریه مرتب کرکے اس کی افادیت میں اضافه کیا - قائد اعظم اکیڈمی کے ڈائریکٹر پروفیسر شریف المجاهد صاحب کا ذکر مجھے سب سے پہلے کرنا چاھئے تھا لیکن بعد میں سہی - انھوں نے صرف

یہی نہیں کہ کتاب کا خاکہ تیار کرنے میں میری رہنمائی کی، اور موضوع سے متعلق بعض الجھاوے میرے ذہن سے دور کئے بلکہ مسلسل تقاضوں کے ذریعے، کتاب کے بر وقت تکملے میں بھی میری مدد فرمائی، میں ان سب باتوں کے لئے ان کا دل سے شکر گذار ہوں۔

فرمان فتح پوری

شعبہ اردو، جامعہ کراچی

ہفتہ، ۲۴ جولائی ۱۹۷۶ء

پاکستان، مسلم قومیت اور اردو زبان

"پاکستان" جس میں، آج ہم ایک آزاد قوم اور خود مختار اسلامی مملکت کے وارث کی حیثیت سے رہ رہے ہیں اور جس کی قومی زبان، عربی، فارسی یا ترکی نہیں بلکہ اسی علاقے کی زائیدہ و پروردہ اور مقبول عام زبان "اردو" ہے، بظاہر چودہ اگست ۱۹۴۷ء کو وجود میں آیا ہے لیکن جس خاص نقطۂ نظر کے تحت پاکستان نے جنم لیا اور جسے بہ مشکل منوانے کے بعد ہمیں قومی آزادی و قومی زبان، میسر آئی اس کی تاریخ نئی نہیں، کئی سو سال پرانی ہے، اتنی ہی پرانی جتنی کہ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد۔ اس لحاظ سے قائداعظم کا یہ فرمانا ان کی بصیرت کا ثبوت ہے کہ "پاکستان اسی دن وجود میں آگیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو، مسلمان ہوا تھا۔ یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔ مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمۂ توحید ہے، وطن نہیں اور نہ نسل۔ ہندوستان کا جب پہلا فرد مسلمان ہوا تو پہلی قوم کا فرد نہ رہا ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا اور ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آ گئی۔" ۱

ہندو مسلم قومیت کی بنیادی سچائی یہی تھی، اس سے انکار نہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے ہزار سالہ ملاپ نے ایک دوسرے کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا، ان کے فکر و نظر، علم و عمل، رہن سہن، اخلاق و اطوار، سماجی رسوم و آداب اور علوم و فنون، سب پر ایک دوسرے کا اثر پڑا اور ان کی زندگی

۱ - برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقا، ص ۱۰۰

کا وہ اسلوب قائم نہ رہ سکا جو دونوں قوموں کے ملاپ سے پہلے تھا ۔ اس کے باوجود وہ ایک دوسرے سے الگ رہے ۔ سرکاری دفتروں ، کاروباری اداروں ، نجی محفلوں، بازاروں، تقریبوں اور علمی و ادبی مجلسوں اور تصوف و درویشی کے حلقوں میں ایک دوسرے سے ملتے ، گھومتے پھرتے ، خاطر مدارات کرتے اور غم و خوشی میں شریک ہوتے لیکن باہم شادی بیاہ اور کھانا پینا ممکن نہ ہوا۔ دونوں کے طور طریقے، دینی عقائد و ملی نظریات اور عبادت و ریاضت کے آداب، ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہے۔ بقول جمیل الدین احمد ''ہندو اور مسلم معاشرے مثل دو دھاروں کے رہے ، بعض اوقات ایک دوسرے سے ملے لیکن کبھی دوسرے میں ضم نہیں ہوئے ، ہر دھارا اپنی راہ پر چلتا رہا''[۲] آج بھی یہی صورت ہے کہ ایک ہزار سال سے ایک ساتھ رہنے کے باوجود دونوں قوموں کے ذہنی و ثقافتی رویے ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف بلکہ یکسر متضاد ہیں، اردو کے مشہور افسانہ نگار کرشن چندر نے اس تضاد کو واضح کرتے ہوئے بڑے دلچسپ انداز میں لکھا ہے کہ '':

''ہندو اسے کہتے ہیں جو مسلمان کا دشمن ہو اور پھر وہ کام کرے جو مسلمان نہ کرتا ہو۔ چنانچہ مسلمان گوشت کھاتا ہے، ہندو ترکاری کھاتا ہے ۔ مسلمان سر منڈاتا ہے ، ہندو سر پر چوٹی رکھتا ہے ۔ مسلمان گائے کو حلال کرتا ہے، ہندو اسے ماتا سمجھ کر پوجتا ہے۔ مسلمان سؤر کو حرام سمجھتا ہے ، ہندو اس کا اچار ڈالتا ہے ۔ مسلمان مسجد میں جاتا ہے ہندو مندر میں ۔ مسلمان خاموشی سے نماز ادا کرتا ہے ، ہندو سنکھ اور گھڑیال بجا کر آرتی اتارتا ہے۔ ہندو پرتھوی راج چوہان کی عزت کرتا ہے مسلمان شہاب الدین غوری کی ۔ ہندو راناسانگا کو پوجتا ہے، مسلمان بابر کی شان میں قصیدہ کہتا ہے ۔ ہندو رانا پرتاب کو اکبر سے بڑا خیال کرتا ہے ، مسلمان اکبر کو رانا پرتاب پر ترجیح دیتا ہے۔ ہندو کا

۲ - صحیفہ (لاہور)، اپریل ۱۹۶۸ء، ص ۹۸

ہیرو شیواجی ہے اور مسلمانوں کا اورنگ زیب ۔ ۳"

ہندو مسلم قومیت کا یہی فرق تھا جس نے بعد کو ایک خاص نقطۂ نظر کی شکل اختیار کی اور پاکستان کو جنم دیا ۔ برصغیر کی ہندو مسلم سیاست کے حوالے سے اس نقطۂ نظر کا نام عرف عام میں دو قومی نظریہ ہے ۔ دو قومی نظریے کا سادہ سا مفہوم ، جیسا کہ قائد اعظم کے مندرجہ بالا فقروں سے ظاہر ہے ، صرف اس قدر ہے کہ برصغیر میں ایک نہیں دو بڑی قومیں ، ہندو اور مسلمان، آباد ہیں اور قومیت کی ہر تعریف کی رو سے یہ اپنی اپنی جگہ مکمل و منفرد اکائیاں ہیں ۔ یہ نہ تو ایک دوسرے میں ضم ہو سکتی ہیں اور نہ ایک دوسرے کے وجود کو خطرے میں ڈالے بغیر متحد ہو سکتی ہیں۔ یہ ایک ایسی سچائی تھی جس کا برملا اظہار مسلمانوں کی طرف سے برصغیر کی سیاسی بساط پر پہلے پہل اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد کیا گیا لیکن اس کا احساس ہندو اور مسلمان ، دونوں میں بہت پہلے سے موجود تھا، فرق یہ ہے کہ ہندوؤں کو روز اول سے احساس تھا ۔ چنانچہ البیرونی ، اب سے ایک ہزار سال پہلے جب محمود غزنوی کے ساتھ ہندوستان آیا تو ہندوؤں کے متعلق اس نے اپنے خیالات اس طور قلمبند کئے ۔

"ہندو دین میں ہم سے کلی مغایرت رکھتے ہیں ۔ غیروں کو یہ لوگ ملیچھ یعنی ناپاک کہتے ہیں اور ان کو ناپاک سمجھنے کی وجہ سے ان سے ملنا جلنا، شادی بیاہ کرنا ، ان کے قریب جانا ، یا ساتھ بٹھانا اور ساتھ کھانا جائز نہیں سمجھتے اور جس چیز میں غیر قوم کی آگ یا پانی سے کام لیا گیا ہے، جن دو چیزوں پر ضرورت زندگی کا مدار ہے اس چیز کو ناپاک سمجھتے ہیں ، مزید برآں کسی طریقے سے اصلاح حال کی صورت ہی نہیں ہے اس لئے کہ گو نجس چیز طاہر سے مل کر طاہر ہو سکتی ہے لیکن ہندو کسی شخص کو جو ان کی قوم سے نہیں ہے اور ان میں داخل ہونے کی رغبت

۳ - "شکست کے بعد "، البیان ، چوک انارکلی ، ۱۹۶۶ء، ص ۵۰،
بحوالہ برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقا

یا ان کے دین کی طرف میلان رکھتا ہے، اپنے اندر داخل کرنے کی مطلق اجازت نہیں دیتے۔"[۴]

البیرونی کے یہ مشاہدات حقیقت پر مبنی تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف اپنے اس جذبۂ نفرت کو اگرچہ ایک مدت تک بعض وجوہ سے چھپائے اور دبائے رکھا اور جب تک مسلمانوں کی سیاسی گرفت برصغیر پر مضبوط رہی اسے ظاہر نہ ہونے دیا لیکن جیسے ہی یہ گرفت کمزور ہوئی اور برطانوی تسلط کے امکانات روشن ہوئے وہ مسلمانوں کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

مسلمانوں میں البتہ، ملی احساس بہت دیر کو اس وقت پیدا ہوا جب کہ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد مسلمانوں کا سیاسی شیرازہ منتشر ہو چکا تھا اور ان کے قومی وجود کو سکھوں، مرہٹوں، جاٹوں اور ہندو انگریز گٹھ جوڑ نے خطرے میں ڈال دیا تھا۔ مسلمانوں میں اس ملی احساس کے آثار اگرچہ مجدد الف ثانی کے یہاں بھی مل جاتے ہیں اور بقول شیخ محمد اکرام، "ان کی نگہہ تیز بین نے اندازہ لگا لیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات اتنے بنیادی ہیں کہ دین الٰہی کا منصوبہ بنا کر رام اور رحمان کو ایک کہہ کر انھیں جوڑا نہیں جا سکتا، یہ ایک سعی لاحاصل ہے یا خرابیوں کا پیش خیمہ -- اور بہر کیف اسلام اور مسلمانوں کے لئے ایک خطرۂ عظیم ہے۔"[۵] لیکن مسلم قومیت کی مربوط اور واضح شکل شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ تا ۱۷۶۲ء) کی تحریروں میں نظر آتی ہے، شاہ ولی اللہ کا یہ ملی احساس، برصغیر کے مسلمانوں کے ہر طبقے اور زندگی کے ہر شعبے پر محیط تھا۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں مسلمان بادشاہوں، امیروں، وزیروں، فوجیوں، صنعت کاروں، عالموں، صوفیوں، پیروں، پیرزادوں، واعظوں، مولویوں اور گوشہ نشینوں، سب

۴۔ کتاب الھند، حصہ اول، مترجمہ سید اصغر علی، انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء، ص ۱۶

۵۔ "رود کوثر"، فیروزسنز، لاہور، ۱۹۷۰ء، طبع پنجم

کو مخاطب کیا اور اس انداز سے کہ کم و بیش سبھی، خواب غفلت سے چونک اٹھے۔ ۶ انھوں نے نادر شاہ درانی کے حملے پر سخت افسوس کا اظہار کیا کہ اس کا حملہ برصغیر کے مسلمانوں کے حق میں بڑا تباہ کن تھا اور احمد شاہ ابدالی کو ۱۷۶۱ء میں اس لئے حملے کی دعوت دی کہ وہ مسلمانوں کو غیر مسلموں کے مظالم سے نجات دلا سکتا تھا۔ ایسا ہی ہوا۔ احمد شاہ ابدالی کے حملے نے مرہٹوں کی کمر ایسی توڑ دی کہ پھر ان میں کسی پر حملہ آور ہونے کی قوت باقی نہ رہی۔ ان کے سارے نامور جنگجو مارے گئے اور جانبازوں کی پوری نسل کا خاتمہ ہو گیا، "مشہور مرہٹہ سردار، پیشوا پونے میں بیمار پڑا ہوا تھا، اس کا بھی اس شکست کے غم میں انتقال ہو گیا۔" ۷ یہ الگ بات ہے کہ اس فتح سے مسلمانوں کو بھی کوئی خاص فائدہ نہ پہنچا۔ احمد شاہ ابدالی کے واپس چلے جانے کے بعد مسلمان حکمرانوں میں کوئی ایسا نہ تھا جو اپنے تدبر سے اس کی فتح مندی سے فائدہ اٹھا سکتا، نتیجتاً ہندوستان کی سلطنت رفتہ رفتہ ان کے ہاتھوں سے نکل کر انگریز کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ شاہ ولی اللہ کی تحریک نے مسلمانوں میں جو بیداری پیدا کر دی تھی وہ آگے چل کر مسلمانوں کے بڑے کام آئی بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی:

"شاہ ولی اللہ اگرچہ سیاسی انحطاط کے جزر کو روک نہیں سکے مگر انھوں نے قوم کے اندر ایسی امنگیں پیدا کر دیں جنھوں نے اسے اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے اخلاقی ذوق و شوق میں سے کچھ دوبارہ واپس لے لے اور اپنے عقائد کی پاکی کو باقی رکھ سکے۔ قوم کے ضمیر، اس کے عقائد اور اس کے اخلاقی مقصد پر ایقان کو اٹھارویں صدی کے ملبے میں سے باہر نکال لینا، بذات خود کوئی معمولی کارنامہ نہیں تھا۔ مگر شاہ ولی اللہ نے اس سے بھی زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اپنی تصانیف کے ذریعے انھوں نے مسلم فکر کے بہت سے میدانوں

۶۔ اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ، ص ۱۱ تا ۱۵

۷۔ این ایڈوانسڈ ہسٹری آف انڈیا، حصہ دوم، ص ۵۵۲

میں بڑے دیرپا اضافے کئے۔'' ۸

شاہ ولی اللہ کی وفات کے بعد ہر چند کہ ان کے بیٹوں اور شاگردوں، خصوصاً سید احمد شہید بریلوی، شاہ اسمعیل شہید اور شاہ عبدالعزیز، وغیرہ نے ان کی تحریک کو جاری رکھا اور اس میں شبہ نہیں کہ انہی کی جد و جہد آزادی اور کارناموں کی بدولت مسلمانوں میں وہ جذبۂ حریت بیدار و متحرک رہ سکا جو آگے چل کر برصغیر کی ملت اسلامیہ کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلانے اور ہندوؤں کی محکومیت سے محفوظ رکھنے میں کارگر ثابت ہوا۔ لیکن، اورنگ زیب کی وفات کے بعد مسلمانوں کی سیاسی قوت پر جو زوال آنا شروع ہوا تھا وہ روکے نہ رکا۔ ۱۷۶۵ء تک بنگال اور شمالی ہند کا پورا علاقہ ان کے ہاتھ سے نکل کر عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کی نگرانی میں جا چکا تھا۔ جنوبی ہند میں ایک میسور کی مسلم ریاست تھی جسے ٹیپو سلطان کی وجہ سے انگریز اپنے لئے خطرہ سمجھتے تھے، ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت کے بعد یہ خطرہ بھی باقی نہ رہا، انگریزوں نے پورے برصغیر پر اپنا تسلط قائم کر لیا اور سب سے پہلے مسلمانوں کے نظام تعلیم پر ضرب لگائی گئی۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج قائم ہوا اور ایشیاٹک سوسائٹی بنگال میں ولیم جونز کی سربراہی میں قدیم ہندومت اور مردہ سنسکرت زبان کے احیا کی غرض سے جو کام شروع کیا گیا تھا اسے ایک نیا موڑ دے دیا گیا۔ للو لال جی سے ''پریم سبھا'' کے نام سے جدید ہندی میں ایک کتاب لکھوا کر ناگری رسم الخط میں چھاپی گئی۔ یہیں سے اردو کے مقابلے میں ہندی کا نام سننے میں آیا ورنہ اس سے پہلے بقول ڈاکٹر تارا چند: ''جدید ہندی کا کہیں کوئی وجود نہ تھا۔'' ۹

مسلمانوں کے عہد تک پورے برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی اور سرکاری و عدالتی زبان فارسی تھی۔ فارسی کو ایک ایسے رابطے کی زبان کی حیثیت حاصل تھی جس کے ذریعے مسلمان اپنے اندر ملی وحدت کو کسی نہ کسی طور پر

۸ - برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۲۴۷
۹ - دی پرابلم آف ہندوستانی، ص ۳۲

برقرار رکھ سکتے تھے اور اپنے بعض مسائل کا حل بھی تلاش کر سکتے تھے۔ لیکن انگریزوں کا مقصد چونکہ مسلمانوں کو سماجی اور اقتصادی طور پر کمزور تر کرکے ان کی انفرادیت و اجتماعیت کو ہر طرح ختم کرنا تھا اس لئے دیسی زبان کو فروغ دینے کے بہانے ۱۸۳۷ء میں فارسی کو ہٹا کر اردو کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا گیا۔ یہ محض ایک شعبدہ تھا اور اس کا مقصد مسلمانوں کی اس ناراضگی کا سدباب کرنا تھا جو فارسی کو ختم کرنے سے پیدا ہو سکتی تھی، اس لئے کہ جس وقت یہ حکم جاری ہوا اسی وقت میکالے کی وہ تعلیمی یاد داشت منظر عام پر آئی جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان میں ساری تعلیم انگریزی میں ہونی چاہئے اور جس کا مقصد ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا تھا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو لیکن ذوق، فکر و نظر اور اخلاق و حکمت و دانش کے اعتبار سے انگریز ہو۔ ۱۰ ہندوؤں نے مسلمانوں کے عہد میں، بقول رام گوپال جس طرح فارسی کو اختیار کر لیا تھا اسی طرح انگریزی کو بھی بلا تامل قبول کر لیا۔ لیکن مسلمانوں کے لئے یہ فیصلہ بڑے دور رس نتائج کا حامل تھا، انہوں نے خیال کیا، (یہ خیال کچھ ایسا غلط نہ تھا) کہ انگریزی تعلیم کو رائج کرنا مسلمانوں کی ثقافت کو ختم کرنے اور ان کے مذہب کو آلودہ کرنے کی دانستہ کوشش ہے، چنانچہ وہ انگریزی زبان سے دور رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا ۱۸۸۰-۸۱ء میں جہاں انگریزی ہائی اسکولوں میں چھتیس ہزار چھ سو چھیاسی ہندو طلبہ زیر تعلیم تھے وہاں ان کے مقابلے میں مسلمان طلبہ کی تعداد صرف تین سو تریسٹھ تھی۔ ۱۱

مسلمانوں کی بربادی میں جو تھوڑی بہت کسر باقی تھی وہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے نے پوری کر دی۔ مسلمان چونکہ اورنگ زیب سے لے کر ٹیپو سلطان تک، برابر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باھر کرنے کی کوشش کرتے رہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی وہ آگے آگے تھے اس لئے انگریزوں نے سارا

۱۰ - بیسک ڈاکومنٹس، ص ۱۸

۱۱ - انڈین مسلمس، ص ۳۴

غصه انہیں پر اتارا ۔ ملازمت ، تجارت ، تعلیم ، صنعت و حرفت اور معاش کے سارے دروازے ان پر ایک ایک کرکے بند کر دئے گئے ۔ ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے ، براہ راست تاج برطانیہ کا راج قائم ہو گیا ۔ اب حکومت کی نئی حکمت عملی جن اصولوں کے تحت مرتب کی گئی اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لئے ذیل کے دو بیانات دیکھیے :

گورنر جنرل لارڈ النبرا نے کہا :

''میں اس عقیدے کی طرف سے آنکھ نہیں بند کرسکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے، اس لئے ہماری صحیح پالیسی یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں'' ۱۲

ڈبلو۔ ڈبلو۔ ہنٹر نے لکھا :

''مسلمانان ہندوستان، اب اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرہ کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ ہیں اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہے ہیں اپنے لئے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں ۔'' ۱۳

یہ تھے مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کے وہ تصورات جن کو ذہن میں رکھ کر برطانوی سامراج نے ۱۸۵۷ء کے بعد برصغیر پر حکمرانی کی ۔ ہندوؤں کو ہر طرح آگے بڑھایا گیا اور مسلمانوں کو دانستہ ہر شعبۂ حیات میں نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ ان کی زندگی ہر اعتبار سے ضیق میں کردی گئی اور اس حد تک کہ ہنٹر جیسا مسلمان دشمن ، انگریز بھی اپنی کتاب کے آخری حصے میں یہ کہنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمانوں کے ساتھ سخت نا انصافی

۱۲ - حالی کا سیاسی شعور، ص ۳۰

۱۳ - ہمارے ہندوستانی مسلمان (اردو ترجمہ) ، ص ۱۹

کی جا رہی ہے۔ ۱۴ نتیجتاً چند برسوں کے اندر ہی ہندوؤں، کی ذہنیت میں کچھ ایسی تبدیلی آگئی اور ان میں حکومت کی شہہ پر کچھ ایسا احساس برتری رونما ہوا کہ وہ خود کو ایک ارفع و اعلیٰ قوم اور مسلمانوں کو ادنیٰ و حقیر خیال کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ۱۸۵۷ء کے صرف دس سال بعد ۱۸۶۷ء میں انھوں نے حکومت سے یہ مطالبہ شروع کر دیا کہ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی کو ناگری رسم الخط میں رواج دیا جائے۔ اس پر سر سید احمد خان نے جو اس سے پہلے تک ہندو مسلم اتحاد کے سب سے بڑے حامی تھے، تعجب و تاسف کے ساتھ اس بات کا اظہار کیا کہ اب ہندو اور مسلمان قومیں ہندوستان میں مل کر نہیں رہ سکتیں۔ ۱۵ یہیں سے دو قومی نظرئیے، قوم، قومیت، متحدہ قومیت، ہندو قومیت اور مسلم قومیت کے موضوعات و مسائل پر بحث کا آغاز ہوا۔

یہ بحث اردو ہندی کے مسئلے سے شروع ہوئی تھی اور آخر تک کسی نہ کسی طور پر اس سے منسلک رہی، وجہ یہ ہے کہ قوم اور قومیت کی تشکیل و تعمیر میں دوسرے عناصر کے ساتھ زبان نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ خاص طور پر جمہوری نظام میں جہاں حکومت کا حق افرادی اکثریت رکھنے والی قوم کو حاصل ہوتا ہے، زبان کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ جمہوری نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ جس قوم کے افراد کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہو، ان میں ایک طرح کی ذہنی، جذباتی اور ثقافتی یگانگت بھی پائی جاتی ہو۔ اس یگانگت کے بغیر جمہوری حکومت اور اس کے ادارے انتشار اور بے عملی کا شکار ہو جاتے ہیں، ان کے عزائم اور فیصلے بے اثر اور ان کی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں لیکن اس قسم کی قومی یگانگت جو آزادی اور آزاد مملکتوں کی ترقی کی ضمانت دے سکے، بالعموم قومی زبان سے پیدا ہوتی ہے۔ قوم، بغیر قومی زبان کے گونگی اور بے وقعت اور زبان، بغیر قوم کے غیر مؤثر و

۱۴ - ہمارے ہندوستانی مسلمان (اردو ترجمہ)، ص ۲۱۶ تا ۲۱۸

بے معنی ہو کر رہ جاتی ھے - مولوی عبدالحق نے بہت صحیح کہا ھے کہ:

”زبان اگرچہ مخلوق ھے یعنی انسان کے عمل و سعی کا نتیجہ ھے - لیکن اس کے ساتھ وہ خالق بھی ھے یعنی وہ خیالات کے پیدا کرنے اور سمجھانے میں بھی مدد دیتی ھے - جن کے پاس زبان نہیں ھے ان کے پاس خیال بھی نہیں - جن کی زبان محدود ھے ان کے خیالات بھی محدود ھیں - اسے معمولی چیز نہ سمجھنا چاھئے یہ ھماری معاشرت اور تمدن کے ہر شعبے کے رگ و پے میں پڑی ھوتی ھے - اگر ھم اپنے تمدن و تہذیب کو بچانا اور مضبوط کرنا چاھتے ھیں تو ھمیں اپنی زبان کو بچانا اور مضبوط کرنا لازم ھے - اگر ھم اپنے خیالات کو وسیع اور اعلیٰ بنانا چاھتے ھیں تو زبان کو وسعت اور ترقی دینا ھمارا فرض ھے - یہ قدرت کی ان چند نعمتوں میں سے ھے جو زندگی کو خوشگوار اور برتر بنانے میں مدد دیتی ھیں -“ ۱۶

اس لئے انیسویں صدی کی آخری دھائیوں میں جیسے ھی برصغیر پاک و ھند میں آزادی اور مقامی خود مختاری کے آثار رونما ھونے لگے ، قوم اور قومی زبان کے سوالات بھی خود بخود پیدا ھو گئے -

۱۸۸۰ء میں لارڈ رپن ھندوستان کے وائسرائے مقرر ھوئے ، انھوں نے ۱۸۸۲ء میں پہلی مرتبہ حکومت برطانیہ کی طرف سے اعلان کیا کہ:
”ھندوستان کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے ، رفتہ رفتہ حکومت کے کاموں میں شریک کئے جائیں گے اور مقامی خود مختاری کے اداروں میں انھیں نمائندگی دی جائے گی -“ ۱۷ ھندو چونکہ مسلمانوں کی بہ نسبت ، اقتصادی ، سیاسی اور تعلیمی ھر اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ اور باشعور تھے اس لئے انھوں نے ۱۸۸۲ء

۱۵ - حیات جاوید ، ص ۱۶۳

۱۶ - روئداد ـــ کل ھند اردو کانفرنس ، انجمن ترقی اردو ، دھلی ، ۱۹۳۹ء ، ص ۵۲

۱۷ - دی بیسک ڈاکومنٹس ، ص ۳۳

کے اعلان سے فائدہ اٹھانے کے لئے بہت جلد یعنی ۱۸۸۵ء میں ''آل انڈیا نیشنل کانگریس'' کے نام سے ، انگریزوں کے اشارے پر ، ایک سیاسی جماعت بنالی ۔ ''انڈین نیشنل کانگریس'' میں لفظ ''نیشنل'' کی شمولیت کا مقصد ہندوؤں کے نزدیک پہلے ہی دن سے یہ تھا کہ مسلم قومیت کو کسی طرح ہندو قومیت میں ضم کر دیا جائے تاکہ کسی وقت اگر ہندوستان ، جمہوری بنیادوں پر آزاد ہو تو ہندو ہی من حیثیت‌القوم اس کے حاکم و وارث قرار پائیں ، اور مسلمان اقلیتی فرقے کے طور پر ، ان کی محکومیت میں زندگی بسر کریں ۔ چنانچہ کانگریس نے یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور ''انڈین نیشنل کانگریس'' سیاسی و ثقافتی ، ہر قسم کے امور میں اس کی نمائندگی کرتی ہے ۔ سر سید احمد خان نے اپنی غیر معمولی فراست اور تجربے کی بنا پر ، کانگریس کی چال کو شروع ہی میں بھانپ لیا تھا ۔ انھوں نے مختلف موقعوں پر کھلے لفظوں میں یہ بات کہی کہ ہندوستان میں ایک نہیں بلکہ ہندو اور مسلمان دو بڑی قومیں بستی ہیں ۔ بعد کو ممتاز مسلمان رہنماؤں نے بھی قومیت اور قوم کے بارے میں یہی موقف اختیار کیا۔ لیکن ہندوؤں نے اکثریتی قوت کے زعم اور اپنی سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ان کی رائے کی کوئی پروا نہیں کی اور قیام پاکستان کے چند روز پہلے تک کانگریس کے رہنما خود کو ہندو اور مسلمان دونوں کا نمائندہ کہتے رہے حتیٰ کہ ۱۹۴۴ء میں ، جبکہ ہندوستان کی آزادی کے دن بہت قریب آگئے تھے ، گاندھی جی نے قائداعظم کو ایک خط میں لکھا :

''ہماری گفتگو کے دوران میں آپ نے بڑی سرگرمی کے ساتھ دعویٰ پیش کیا ہے کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں ، یعنی ہندو اور مسلمان ۔ اور یہ کہ اول‌الذکر کی طرح ، موخرالذکر کے وطنی علاقے بھی ہندوستان میں واقع ہیں ۔ یہ استدلال جس قدر آگے بڑھتا ہے اسی قدر آپ کی تصویر میرے لئے تردد انگیز بنتی جاتی ہے ۔ اگر یہ تصویر حقیقی ہوتی تو بہت دلکش ہوتی لیکن میرا اندیشہ دن بدن بڑھتا جا رہا ہے کہ یہ تصویر قطعاً غیر حقیقی ہے اور مجھے تاریخ

میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ اپنا مذہب تبدیل کرنے والی کسی جماعت اور اس کی بعد کی نسلوں نے اصل جمعیت سے الگ ایک قوم ہونے کا دعوی کیا ہو۔ اگر اسلام سے پہلے ، ہندوستان ایک قوم تھا تو اس کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد کے مذہب تبدیل کرنے کے باوجود بھی اسے ایک ہی قوم رہنا چاہئے۔ ایک ہندوستانی مسلمان کو کسی دوسرے ہندوستانی سے ممتاز کرنے والی چیز ، مذہب کے علاوہ اور کیا ہے ، کیا وہ کسی ترک اور عرب سے مختلف ہوتا ہے۔ "۱۸

گاندھی جی کے جواب میں قائداعظم نے لکھا:

"ہمارا دعوی ہے کہ قومیت کی ہر تعریف اور معیار کی رو سے مسلمان اور ہندو، دو بڑی قومیتیں ہیں۔ ہماری قوم دس کروڑ انسانوں پر مشتمل ہے اور مزید برآں یہ کہ ہم ایک ایسی قوم ہیں جو اپنی خاص تہذیب و تمدن ، زبان و ادب ، فنون و تعمیرات ، اسم اصطلاحات ، رسم و رواج ، نظام تقویم ، تاریخ و روایات اور رجحانات و عزائم رکھتی ہے، اور زندگی کے متعلق ہم ایک ممتاز تصور رکھتے ہیں۔ بین الاقوامی قانون کے تمام اصولوں کے مطابق ہم ایک قوم ہیں۔ "۱۹

اس پس منظر میں برصغیر کی ہندو مسلم سیاست میں دو قومی نظریے کے اولین داعی سر سید احمد خاں تھے۔ اور سر سید کی اس دعوت کا اولین محرک ہندی اردو کا وہ تنازع تھا جو ۱۸۵۷ء کے بعد ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف اور تکرار کا خاص موضوع بن گیا تھا۔ بات یہ تھی کہ ہندوستان میں

۱۸۔ جناح گاندھی گفت و شنید ، مطبوعہ آل انڈیا مسلم لیگ ، دھلی ، ۱۹۴۴ء، ص ۵۸ تا ص ۶۵

۱۹۔ جناح گاندھی گفت و شنید ، مطبوعہ آل انڈیا مسلم لیگ ، دھلی ، ۱۹۴۴ء، ص ۵۸ تا ص ۶۵

انگریزوں کے سیاسی تسلط کے بعد، ہندوؤں میں جیسے ہی اپنی قومیت کے احیا کی تحریک شروع ہوئی، انھیں اس قومیت کے لئے ایک جداگانہ قومی زبان کی ضرورت بھی محسوس ہوئی۔ مولوی عبدالحق نے انجمن حمایت اسلام، لاهور، ۱۹۳۱ء کے خطبۂ صدارت میں صحیح کہا تھا کہ:

''ملک کی بدقسمتی که انگریزی تسلط کے بعد بعض اسباب کی بنا پر، جن کی تفصیل کی ضرورت نہیں، ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذهب و زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کے لئے نئی زبان کی ضرورت داعی ہوئی کیونکه قومیت کا رشته زبان هی سے مضبوط ہوتا ہے۔'' ۲۰

چنانچه ہندوؤں نے یه شوشه چھوڑ کر که اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ اس کے مقابلے میں ہندی کو لا کھڑا کیا ورنه اردو کو ایک مدت سے جیسا که زبان و ادب کے متعدد عالموں نے اعتراف و اظہار کیا ہے، برصغیر پاک و ہند میں لینگوا فرینکا کی حیثیت حاصل تھی۔ اس کی پیدائش چونکه ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ کے نتیجے میں ہوئی تھی اس لئے ہزار اختلاف کے باوجود دونوں قوموں کے درمیان اردو ہی ارتباط و اتحاد باهمی کی سب سے اہم اور واضح نشانی خیال کی جاتی تھی۔ اس کی تعمیر و ارتقا میں ہندو، مسلمان اور دوسری علاقائی قومیتیں برابر کی شریک رہی ہیں اور عملاً آج بھی صورت حال یہی ہے۔ اس کے ادیبوں اور شاعروں کی فہرست میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ، ہندو، عیسائی، جین، سکھ اور دوسرے مذاهب کے لوگوں کے نام بڑی تعداد میں موجود ہیں۔ مولوی وحیدالدین سلیم نے جس تہذیب کو ''ہند المانی،، (ہندو اور مسلمان) تہذیب کا نام دیا تھا اس کی واحد ترجمان اردو ہی تھی۔ اسی کی بدولت ہندو اور مسلمان، دو الگ الگ مذہبی و تہذیبی خصوصیات کے مالک ہوتے ہوئے بھی، تمدنی زندگی کے مضبوط رشتے میں

۲۰۔ خطبات عبد الحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۵

بندھے ہوئے تھے اور بھائیوں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ مسلمان حکمراں اگرچہ عربی، فارسی اور ترکی بولتے ہوئے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے لیکن چونکہ انھوں نے دوسرے فاتحین کے برعکس، یہیں رھنا بسنا پسند کیا اور ہندوستان کو اپنا مستقل وطن بنا لیا تھا اس لئے انھوں نے مقامی باشندوں کے ساتھ مل جل کر رھنے کی غرض سے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبانوں کو رفتہ رفتہ خیر باد کہا اور روز مرہ کی زندگی میں اس مخلوط زبان کو اپنا لیا جو اردو کے نام سے ہندوستان کی دوسری بولیوں کے طرز پر نمودار ہوئی تھی۔ محکوموں کے ساتھ اس قسم کی رواداری اور قربانی کی مثال دوسری حاکم قوموں میں مشکل سے ملے گی۔ لیکن اس رواداری و ایثار کے باوجود چونکہ اردو نے مسلمانوں کے عہد میں جنم لیا تھا، مسلمان کے زیر سایہ پروان چڑھی تھی، اور مسلمانوں کی تہذیبی زندگی کا اس پر گہرا اثر تھا اس لئے ہندوؤں کے بڑھتے ہوئے جذبۂ قومیت نے اسے بھی تعصب و نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور مسلمانوں کے وجود کے ساتھ ساتھ اردو بھی ان کی نظروں میں کھٹکنے لگی، ورنہ سچ بات یہ ہے اردو کی جتنی ضرورت ہندوؤں کو تھی مسلمانوں کو نہیں تھی۔ مسلمانوں نے صرف رعیت اور انتظامیہ کی سہولتوں کی خاطر یہ ضروری جانا کہ اپنی مادری زبانوں کے علاوہ مقامی زبانیں بھی سیکھیں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا اور ان کے اس عمل کے نتیجے میں عربی و فارسی اور مقامی زبانوں کے ملاپ سے ایک نئی مخلوط زبان بن گئی۔ یہی زبان آگے چل کر ہندو مسلمان دونوں کی روز مرہ کی زبان قرار پائی۔ بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جسے اردو کہتے ہیں وہ نہ تو ”خالص پراکرت ہے اور نہ خالص فارسی، بلکہ یہ ایک ایسی زبان ہے جو بیرونی اور دیسی زبانوں کے اختلاط سے وجود میں آئی ہے۔“ ۲۱

اس نئی زبان میں بقول ڈاکٹر تارا چند کچھ ایسی کشش تھی کہ وہ بہت جلد سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ صوفیائے کرام نے اس سے تبلیغ کا کام لے کر اور بھی مقبول بنا دیا، اٹھارویں صدی عیسوی تک اس نے ایسی ترقی

۲۱۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۱۵

کر لی که اس کی علمی و ادبی محفلیں ملک کے ہر صوبے اور ہر گوشے میں جم گئیں۔۲۲ اردو کی یہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی ان ہندوؤں کو بہت شاق گزری جنھوں نے انیسویں صدی کے آغاز میں ہندو قومیت کی جارحانہ تحریکوں کو جنم دے کر ''ہندوستان برائے ہندو'' کا خواب دیکھا۔ اور اردو کے خلاف محاذ قائم کرکے، ہندو مسلم اتحاد و تہذیب کی اس عمارت ہی کو ڈھا دینے کی کوششیں شروع کردیں جو صرف اردو زبان کی اساس پر قائم تھی۔ ۲۳ پھر جیسے جیسے اردو ہندی کا تنازع بڑھتا گیا، مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان اختلاف کی خلیج بھی وسیع تر ہوتی چلی گئی۔

برصغیر پاک و ہند کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ انیسویں صدی کے آغاز تک، ہندو، مسلمان، بھائیوں کی طرح مل جل کر رہ رہے تھے۔ مذہبی عقائد و رسوم اور تہذیب و تمدن کے بعض بنیادی اختلافات کے باوجود وہ نہ تو اپنی مذہبی و ثقافتی برتری ایک دوسرے پر ظاہر کرتے تھے اور نہ فرقہ وارانہ انداز میں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوتے تھے۔ لیکن راجہ رام موہن رائے کی تحریک برھموسماج، اور بنکم چندر چٹرجی کے ناول ''آنند مٹھ'' اور بعد ازاں اسی طرز کی دوسری تحریکوں اور تحریروں کے زیر اثر، ہندوؤں میں قومی احیا کی جو لہر پیدا ہوئی اس نے ان میں مسلمانوں کے مقابلے میں زیادہ شاندار ماضی کے وارث ہونے کا خیال مستحکم کر دیا۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار تک وہ خاموش رہے، لیکن جیسے ہی انگریز کے ہاتھوں مسلمان مغلوب ہوئے اور ان کی سماجی و سیاسی حیثیت میں ضعف آیا، ہندوؤں کو ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھانے کا ہر طرح موقع مل گیا۔ ۲۴ چنانچہ ہر جگہ اور ہر موقع پر ہندو قومیت کا راگ الاپا گیا۔ مسلمانوں کی ثقافت کو حقیر اور ان کے عہد حکومت کو جابرانہ و ظالمانہ ٹھہرایا گیا۔ اردو کے مقابلے میں ایک

۲۲ - اے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا، جلد اول، ص ۲۲

۲۳ - اے ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ان انڈیا، جلد اول، ص ۲۳

۲۴ - انڈیاز ہندو مسلم کوئیسچن، ڈاکٹر بنیی پرشاد، ص ۳۱

نئی زبان ہندی کے نام سے سامنے لائی گئی اور اردو کو ہر اعتبار سے گردن زدنی قرار دیا گیا۔ ہندی کے پرچار کے لئے جا بے جا طریقے اختیار کئے گئے ۔ جگہ جگہ سبھائیں اور انجمنیں قائم ہوئیں ، اردو اور اردو والوں کو مردود و مطعون ٹھہرایا گیا۔ ہندوؤں کے اس رویے نے آگے چل کر ہندی اردو تنازع کی صورت میں ، ہندو مسلم سیاست میں ایسی اہمیت حاصل کر لی کہ ہندی ، ہندوؤں کے لئے اور اردو مسلمانوں کے لئے ایک طاقتور قومی نشان (Symbol) بن گئی - ۲۵

اردو ہندی تنازع نے مسلمانوں کو کس طرح دو قومی نظریے کا احساس دلایا اور بعد کو یہی دو قومی نظریہ کس طرح تحریک پاکستان کی بنیاد بن گیا ، اس کی تفصیل میں جانے سے پہلے اردو اور ہندی کا تاریخی جائزہ لینا ضروری ہے ، تاکہ اس سے پیدا شدہ مسائل و نتائج کو پوری طرح سمجھا جا سکے -

۲۵ - لینگوئج ، ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان نارتھ انڈیا ، پال براس ، ص ۱۳۶

اردو ہندی کا تاریخی جائزہ

اردو

برصغیر پاک و ہند میں زبانوں کا ایک جال سا بچھا ہوا ہے۔ بعض علاقوں میں ایک اور بعض میں کئی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ دنیا کا شاید ہی کوئی اور خطہ ہو جس میں زبانوں کی اتنی کثرت ہو، حتیٰ کہ پورے یورپ میں بھی اتنی زبانیں نہیں ہیں۔[1] اس میں شبہ نہیں کہ ساری زبانیں اپنی اپنی تاریخ اور اپنا اپنا ادب رکھتی ہیں، لیکن جو زبان ہر علاقے، ہر صوبے اور ہر طبقے کے افراد میں بولی اور سمجھی جاتی ہے وہ صرف اردو ہے۔ اردو کو یہ مقبولیت آج سے نہیں، کئی صدیوں سے حاصل ہے۔

سترھویں صدی عیسوی میں اگرچہ ہندوستان کی سرکاری زبان فارسی تھی تاہم بعض شہادتیں اس بات کا قطعی ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ روزمرہ کی زندگی میں اردو اس درجہ رچ بس چکی تھی کہ کاروباری ضروریات کے سلسلے میں غیر ملکی تاجروں کے لئے بھی اس سے پوری واقفیت ناگزیر ہو گئی تھی۔ محمد عتیق صدیقی کی تحقیق کے مطابق "سترھویں صدی عیسوی میں جو یورپین سیاح، مبلغ اور تاجر ہندوستان آئے، ان کے مراسلات اور سفر نامے ہندوستان کی اور زبانوں کے علاوہ ہندوستانی زبان کے وجود کی بھی نشان دہی کرتے ہیں، جسے وہ "انڈستان زبان" (Indostan Language) کہتے ہیں۔ جان فریئر (John Fryer) جس نے سترھویں صدی کی تیسری دھائی میں ہندوستان و ایران

۱ - دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد اول، کیمبرج، ۱۹۲۲ء، ص ۳۷

کی سیاحت کی تھی، ایک انگریز درویش ٹام کوریٹ (Tom Coryate) کا ذکر کرتا ھے جو ۱۶۱۶ء میں ھندوستان میں تھا اور انگلش فقیر کے لقب سے مشہور تھا۔ اس کو ” انڈستان زبان ،، پر پوری قدرت حاصل تھی۔ جان فریر حیرت و مسرت کے ساتھ لکھتا ھے کہ اس زبان میں:

” مغل اعظم کے حضور میں داد خطابت دیتے ہوئے اسے قطعاً جھجھک نہ محسوس ہوئی “۔ ۲

یہ واقعہ جہانگیر کے عہد کا ھے اور اس سے نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ ھندوستانی (اردو) نے جہانگیر کے عہد میں زبان کا مرتبہ حاصل کر لیا تھا۔ جان فریر اورنگ زیب کے عہد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ھے:

” دربار کی زبان فارسی ھے اور عوام ’ انڈستان زبان ‘ بولتے ھیں جس کا باضابطہ رسم الخط ھے “۔ ۳

اس دور میں ھندوستانی زبان (اردو) نے جو اھمیت حاصل کر لی تھی اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ھے کہ ۲۲ دسمبر ۱۶۷۷ء کو انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرس نے اپنے ایک مراسلے میں قلعہ سینٹ جارج (مدراس) کو لکھا کہ:

” اس کا اعادہ کیا جاتا ھے کہ کمپنی کے جو ملازمین فارسی سیکھیں گے ان کو دس پونڈ ، اور جو ’ انڈستان زبان ‘ سیکھیں گے ان کو بیس پونڈ بطور انعام دیے جائیں گے۔ نیز یہ کہ اس زبان کی تعلیم دینے والے کسی مناسب آدمی کا تقرر کیا جائے۔ “ ۴

۲۔ اے نیو اکاونٹ آف ایسٹ انڈیا اینڈ پرشیا ، از جان فریر، جلد اول ، ص ۲۰۷، بحوالہ گلکرائسٹ اور اس کا عہد ، ص ۴۷ ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ، علیگڑھ ، طبع اول، ۱۹۶۰ء

۳۔ ایضاً

۴۔ بحوالہ گلکرائسٹ اور اس کا عہد ، ص ۴۷-۴۸

اردو کی یہ مقبولیت بے سبب نہیں ہے۔ اردو اپنی ساخت میں ایک مخلوط زبان ہے۔٥ یعنی اس کی اساس مختلف زبانوں کے الفاظ کے اختلاط پر قائم ہے۔ اس اساس کو ہندو اور مسلمانوں کی سماجی، معاشرتی اور سیاسی ضرورتوں نے جنم دیا اور ان ہی دونوں کی باہمی کوشش سے اس نے ترقی کی راہیں طے کیں۔ لیکن اردو کو مخلوط زبان کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ دنیا کی اور زبانیں خالص ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ دنیا کی کوئی زبان ایسی نہیں جو خالص ہونے کا دعوی کر سکے۔ بات یہ ہے کہ زبان بھی اپنے بولنے والوں کی طرح سماجی و سیاسی عوامل و محرکات کی تابع ہوتی ہے۔ دنیا کی کوئی زبان اپنے گرد و پیش یا سوسائٹی سے ناطہ توڑ کر بہت دنوں تک عملاً زندہ نہیں رہ سکتی، جس طرح کسی فرد یا قوم کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی بقا و ترقی کے لئے سماج اور دوسری قوموں سے اپنے روابط استوار رکھے بالکل اسی طرح زندہ رہنے والی زبانوں کے لئے لازم آتا ہے کہ دوسری زبانوں سے ان کا ربط و ضبط بڑھتا رہے۔ بغیر اس کے نہ کوئی فرد یا قوم، بین الاقوامی مسائل میں حصہ لے سکتی ہے اور نہ کوئی زبان بین المملکتی تبادلۂ خیال کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ زبانوں کے لئے ایک دوسرے سے استفادہ کرنا ناگزیر ہے۔ اس نقطۂ نظر سے اردو دنیا کی ساری زبانوں میں منفرد ہے۔ یہ اپنے وجود میں مختلف زبانوں کے مرکب کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ اس کی بنیاد ہی مختلف زبانوں کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ زبان کیا ہے اپنے ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے زبانوں کی ایک بین الاقوامی انجمن ہے۔ اس لئے کہ اس میں شرکت کے دروازے ہر زبان کے الفاظ پر ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اردو میں ایک فقرہ بھی ایسا نہ ملے گا جس میں دو تین "زبانوں" کے الفاظ شامل نہ ہوں، خصوصاً عربی، فارسی، سنسکرت اور پاک و ہند کی دوسری زبانوں مثلاً ہندی، پنجابی، بلوچی، پشتو، برج بھاشا، راجھستانی وغیرہ کے الفاظ تو اتنی کثرت سے شامل ہیں کہ ان زبانوں سے تعلق رکھنے والا ہر شخص، اردو سے ایک طرح کی قربت محسوس کرتا ہے۔ اسی احساس قربت

٥۔ خطبات عبدالحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۱ء، ص ۷۶

کے سبب ، ہر علاقے کے لوگوں نے اسے اپنی زبان سمجھا ، اس کی ترقی میں حصہ لیا اور پاک و ہند کی لینگوا فرینکا قرار دیا ۔ ممتاز فرانسیسی مستشرق گارسیں دتاسی نے اپنے سالانہ خطبات و مقالات اور اپنی " تاریخ ادب ہندوستانی"۔ ٦ کی مجلدات میں بار بار اس بات کا اظہار کیا ہے کہ:

" ہندوستان کی عام بولیوں میں ہندوستانی (اردو) سب سے زیادہ وسیع البیان اور لچکدار زبان ہے اور اس کا جاننا سب سے زیادہ سود مند ہے ۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں عموماً یہی زبان استعمال ہوتی ہے ۔" ٧

فورٹ ولیم کالج (۱۸۰۰ء) کلکتہ میں ہندوستانی شعبے کے سربراہ ڈاکٹر گلکرسٹ نے آج سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے لکھا ہے کہ:

" چونکہ ہندوستانی ، ہندوستان کی سب سے زیادہ عام زبان ہے اور جو ہمیں شب و روز اپنے دیسی افسروں ، مدرسوں ، ملازموں اور دیگر متعلقین سے گفتگو کرنے میں استعمال کرنی پڑتی ہے اس لئے بخوبی اصول کے ساتھ اسے جس قدر جلد سیکھا جائے اسی قدر بہتر ہے ۔" ٨

" جس طرح یورپ میں ایک تعلیم یافتہ شخص کے لئے بعض جدید و قدیم زبانوں کا علم مفید اور موجب زینت سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ہندوستان میں سنسکرت ، فارسی ، عربی وغیرہ کا علم بھی وہی درجہ

٦ ۔ " تاریخ ادب ہندوستانی "، کی پہلی جلد ۱۸۳۹ء ، میں دوسری جلد ۱۸۴۷ء میں ، اور تیسری جلد ۱۸۷۰ء میں شائع ہوئی

٧ ۔ مقدمہ تاریخ ادب ہندوستانی (اردو ترجمہ) از لیلیان سکستان ، جلد اول ، مملوکہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری ، کراچی یونیورسٹی، ص ٥

٨ ۔ دیباچہ برٹش انڈیا مانیٹر ، بحوالہ خطبات عبدالحق ، ص ۹۴

رکھتا ہے، لیکن یہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں ہر شخص کے لئے ہندوستانی جاننا ایسا ناگزیر ہے جیسا کہ انگلستان والوں کے لئے انگریزی کا جاننا اور اسی لئے ان حضرات کا جو ایسٹ انڈیا کو آنا چاہتے ہیں سب سے ضروری اور بڑا وصف یہی ہونا چاہیے۔ کیونکہ دیر یا سویر ان پر صاف کھل جائے گا کہ ہندوستانی (اردو) کے مقابلے میں یہ علمی زبانیں دوسرے درجے پر ہیں۔ ۹''

''اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف اضلاع اور صوبوں میں خاص خاص بولیاں بولی جاتی ہیں لیکن جرات کے ساتھ یہ دعوی کر سکتے ہیں کہ اگر فرداً فرداً دیکھا جائے تو ان میں کوئی بھی عام طور پر ایسی مفید اور ضروری نہیں جیسی ہندوستانی۔ یہ ایک ایسا مشترک ذریعہ ہے جس کے توسط سے اہل ملک عموماً اور متعدد غیر ملکوں کے اکثر باشندے، جو اس ملک میں بس گئے ہیں، اپنی ضرورتوں اور خیالات کا ایک دوسرے پر اظہار کرتے ہیں۔ اس بیان کی صداقت کے ثبوت میں ہم خود ایک شہادت ہیں اور ہماری طرح پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی، ڈین، عرب، ترک، یونانی، ایرانی، مغل اور چینی بھی، جو اکثر باہم ہندوستانی میں بات چیت کرتے ہیں کیونکہ ان کی اپنی زبانوں کے مقابلے میں ہندوستان کی یہ لنگوا فرینکا زیادہ سہولت بخش ہے . . . . تقریباً کیپ کیمرون سے لے کر کابل تک سارا ملک جو طول میں دو ہزار میل اور عرض میں ۱۴۰۰ سو میل ہے، اس میں جہاں جہاں گنگا بہتی ہے، شاید ہی کسی بڑے گاؤں، قصبے یا شہر میں کوئی ایسا شخص ملے گا جو اچھی خاصی ہندوستانی نہ جانتا ہو اور گنگا سے بھی بہت پرے نیز مشرقی جزائر کے سواحل پر بھی یہ زبان رائج ہے اور اس قدر معروف ہے کہ بہت آسانی سے سمجھی

۹ - دیباچہ برٹش انڈیا مانیٹر، بحوالہ خطبات عبدالحق، ص ۹۵

جا سکتی ہے۔" ۱۰

اردو کی دیرینہ مقبولیت اور ہر دل عزیزی کے بارے میں اسی طرح کا اظہار خیال ، بہت سے ہندو ، مسلمان اور یورپین مورخین اور ماہرین زبان نے کیا ہے ۔ سبھی نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ اردو ، ہندوستان کے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک باسانی سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی چار سو سالہ زندگی میں مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں ، مختلف ناموں سے پکاری گئی ہے ۔ اول اول اس رعایت سے کہ اس نے ہندوستان میں جنم لیا اور ہندوستان کا علاقہ زمانۂ قدیم میں ہند یا ہندو کہلاتا تھا اور اس سے تعلق رکھنے والی ہر چیز ہندی یا ہندوی کہلاتی تھی ، اردو کو ہندی اور ہندوی کے نام سے پکارا گیا ۔ چنانچہ مسعود سعد سلمان لاہوری ، امیر خسرو اور کئی قدیم مصنفین کے یہاں یہی نام ملتا ہے ۔ دکن میں اسے دکنی اور گجرات میں گوجری یا گجری کہا گیا ہے ۔ دھلوی اور ریختہ بھی اس کے نام رہے ھیں ۔ زبان ہندوستان یا ہندوستانی کے نام سے بھی اسے یاد کیا گیا ہے ۔ سترھویں صدی عیسوی کے قدیم اردو شاعر و مصنف ملا وجہی نے " سب رنگ " میں اسے زبان ہندوستان ھی کہا ہے لیکن " ہندوستانی " کا نام بالعموم انگریزوں کی آمد کے بعد ان کے زیر اثر مقبول ھوا ہے ۔ بیشتر پرانے یورپین مستشرقین اور انگریز مصنفین نے اردو کو ہندوستانی ھی کا نام دیا ہے ۔ ایک زمانے تک اردو کو " اردوئے معلیٰ " بھی کہا گیا ہے لیکن یہ سارے نام رفتہ رفتہ متروک ہو گئے صرف اردو رہ گیا ۔ ۱۱

اردو کا لفظ اصلی ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے ۔ یعنی اوردو ، اوردہ ، اردہ ، اور اورودو ، جس کے معنی لشکر اور لشکر گاہ ھیں ۔ یہ لفظ ترکوں کے ساتھ پاک و ہند میں داخل ہوا ، تزک بابری میں یہ لفظ

۱۰ ۔ ایسٹ انڈیا گائڈ ، بحوالہ خطبات عبد الحق ، ص ۹۷ - ۹۸

۱۱ ۔ پنجاب میں اردو ، حافظ محمود شیرانی ، مکتبہ معین الادب ، لاھور ، ص ۱۶ تا ۳۵

لشکر گاہ کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہوا یہ کہ دہلی کے جس علاقے یا بازار میں مغل فوجیوں نے شاہی کیمپ ، یا چھاونی بنائی اس کا نام اردو بازار یعنی لشکر گاہ پڑ گیا ۔ شاہجہاں نے اس اردو بازار کو اس کی اہمیت کے پیش نظر اردوئے معلیٰ کا خطاب دیا ۔ اس اردوئے معلیٰ یا ذی مرتبت فوجی چھاونی میں جو نئی مخلوط زبان عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی تھی وہ " زبان اردوئے معلیٰ " یا " زبان اردو " یعنی لشکری زبان کہلائی ۔ میر تقی میر نے " نکات الشعراء " مرقومہ ۱۱۶۵ھ میں اسے ایک جگہ زبان اردوئے معلیٰ کہا ہے ۔ رفتہ رفتہ اس مرکب سے زبان کا لفظ محذوف ہو گیا اور اس اصول پر کہ زبان میں ، کبھی جزو بول کر ، کل اور کل بول کر ، جزو یا ظرف کی جگہ مظروف اور مظروف کی جگہ ظرف مراد لیتے ہیں ، اردو ، کا لفظ بھی اپنے اصل معنی چھوڑ کر ایک خاص زبان کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور آج کل اردو کے سوا کوئی اور نام اس کے لئے مستعمل نہیں ہے ۔ ۱۲

لیکن برجموہن دتاتریا کیفی نے اردو کی وجہ تسمیہ کے بارے میں ایک اور بات کہی ہے۔ ان کے بیان کے مطابق اردو کا لفظ اصلاً سنسکرت کا بھی ہو سکتا ہے ۔ یہ لفظ در اصل " ارداو " (Urdaoo) ہے " ار " کے معنی ہیں دل اور " داو " کے معنی ہیں دو۔ چونکہ یہ زبان ہندو مسلم تہذیب کے ملاپ سے وجود میں آئی اس لئے اس کا نام " ارداو " یعنی دو دلوں کو ملانے والا پڑ گیا ۔ یہی " ارداو " بعد کو اردو بن گیا ۔ ۱۳

" اردو " کی وجہ تسمیہ سے متعلق علامہ آئی۔ آئی۔ قاضی کی تحقیق بھی قابل توجہ ہے ان کا خیال ہے کہ :

" لفظ اردو (اڑدو) کو اپنی روزانہ بول چال میں ڈھیر یا بہت سی

۱۲ - مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد اول ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۰

۱۳ - آداب اردو ، گلچین کرنالی ، مطبوعہ اردو مینشن ، ملتان ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۷۰

چیزوں کے جمع ہونے کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اور یہ لفظ اس مفہوم میں سندھ میں عربوں کی آمد سے تین ہزار سال پہلے سے رائج ہے۔"

" یہ لفظ بیک وقت اسکنڈے نیویا، فارس اور ہندوستان میں موجود پاتے ہیں اور یہی تین مقام آریوں کے خاص وطن ہیں۔ قدیم ناروی دیو مالا میں ہمیں لفظ 'اردو، یا ارتھر ایک دیوی کے نام کی صورت میں ملتا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہند جرمانی زبان بولنے والی اقوام نے جب اپنا مشترکہ وطن چھوڑ کر مشرق و مغرب کا رخ کیا تو یہ لفظ مروج تھا۔ اگر ہم اوستا کی زبان یا قدیم فارسی دیکھیں تو یہ لفظ وہاں بھی موجود ہے "شیر اردو بیل اور بادشاہ، ارد شیر" کے نام اس دور میں اس لفظ کے مستعمل ہونے کے واضح ثبوت ہیں۔ یہ لفظ آج بھی سندھی اور جدید فارسی میں یکساں طور پر فوج، چھاؤنی اور بازار کے معنوں میں موجود اور مروج ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے معنی میں اجتماع، ڈھیر اور بھیڑ کا مفہوم مشترک ہے۔" [۱۴]

اردو کا لفظ اصلاً ترکی ہو یا سنسکرت سے ماخوذ ہو، اس جگہ ہمیں اس بحث سے زیادہ تعلق نہیں ہے۔ لیکن اس امر پر سب کا اتفاق ہے کہ خاص زبان کے معنی میں یہ لفظ بدیسی نہیں ہے۔ دوسری مقامی زبانوں کی طرح، اردو نے بھی ہندوستان و پاکستان ہی کے علاقوں میں جنم لیا ہے۔ یہیں پروان چڑھی ہے اور ہندو مسلم تہذیب کے اتصال کی یادگار ہے۔ پروفیسر محمود شیرانی کے لفظوں میں:

" ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ یہ زبان ہندوستان میں مسلمانوں کے داخلے اور توطن گزینی کا نتیجہ ہے اور جوں جوں ان کی سلطنت اس

۱۴ - خطبہ صدارت، یوم اردو، منعقدہ خالق دینا ہال، کراچی (۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء)، مشمولہ "ادبی رابطے، لسانی رشتے"، ترجمہ الیاس عشقی، مطبوعہ مجلس ادب، حیدرآباد، ۱۹۷۶ء، ص ۱۰ - ۱۲

ملک میں وسعت اختیار کرتی گئی ، یہ زبان بھی مختلف صوبوں میں پھیلتی گئی ۔" ۱۵

اردو کے ایک دوسرے بڑے محقق مولانا امتیاز علی خان عرشی نے مئی ۱۹۴۸ء کے اورینٹل کالج میگزین میں اردو اور پشتو کے تعلق پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے :

" اردو زبان ، افغانوں کی آمد ہندوستان کا نتیجہ ہے ۔ نہ یہ منچلے غزنوی ، غوری ، خلجی ، لودھی ، سوری ، ابدالی اور روھیلہ لباس میں جوق در جوق یہاں آ کر بستے اور نہ یہ زبان معرض وجود میں آتی ۔" ۱۶

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں کہ :

"اردو ایسی زبان نہیں جسے مسلمان اپنےساتھ عرب، ایران، افغانستان یا ترکستان سے لائے ہوں ، نہ یہ ایسی زبان ہے جو یہاں پہلے سے موجود تھی، اور مسلمانوں نےاپنی عربی ، فارسی یا ترکی چھوڑ کر اسے اختیار کیا ہو ، بلکہ یہ ہندوؤں اور مسلمانوں کےمیل ملاپ ، آویزش و آمیزش اور ربط و ارتباط کا نتیجہ ہے ۔" ۱۷

رہ گئی یہ بات کہ اردو نے پاک و ہند کے کس خاص خطے میں اور کب جنم لیا ہے ، اس کے بارے میں مختلف رائیں ملتی ہیں ، ان میں سے بعض رائیں رد کی جا چکی ہیں اور بعض ہنوز زیر بحث ہیں ، میر امن دہلوی

۱۵ - مقالات محمود شیرانی ، جلد اول، مجلس ترقی ادب ، لاھور، ۱۹۶۶ء ، ص ۵۵

۱۶ - "مقالات منتخبہ "، اورینٹل کالج میگزین و ضمیمہ ، مرتبہ پروفیسر سید وقار عظیم ، لاھور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۸۷

۱۷ - "ادب و لسانیات "، اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۴،

نے لکھا تھا :

" جب اکبر بادشاہ تخت پر بیٹھے تو چاروں طرف کے ملکوں سے سب قوم قدردانی اور فیض رسانی ، اس خاندان لاثانی کی سن کر ، حضور میں آ کر جمع ہوئے لیکن ہر ایک کی گویائی اور بولی جدی جدی تھی ۔ اکٹھے ہوئے ، آپس میں لین دین، سودا سلف ، سوال جواب کرتے ایک زبان اردو مقرر ہوئی ۔ " ۱۸

انشا اللہ خان نے رائے ظاہر کی تھی کہ :

" یہاں (دھلی) کے خوش بیانوں نے متفق ہو کر متعدد زبانوں سے اچھے اچھے لفظ نکالے اور بعض عبارتوں اور الفاظ میں تصرف کرکے اور زبانوں سے الگ ایک نئی زبان پیدا کی جس کا نام اردو رکھا ۔" ۱۹

سرسید احمد خاں کا بیان ھے کہ اردو کا ھیولی اگرچہ سلاطین خلجی کے عہد میں تیار ہو چکا تھا جبکہ امیر خسرو نے اس میں دوھوں کی شکل میں پہیلیاں کہنی شروع کیں، لیکن اس نے زبان کی شکل شاھجہاں کے عہد میں اختیار کی ۔ ۲۰ محمد حسین آزاد نے اردو کو برج بھاشا سے ماخوذ بتا کر اس کی بنیاد کو کئی سو سال پرانی ظاہر کیا ھے لیکن انہوں نے اس بات کو شاھجہاں کی خوش اقبالی سے تعبیر کیا ھے کہ یہ نئی زبان ان کے عہد میں اردو کے نام سے منسوب ہو گئی ۔ ۲۱

۱۸ - باغ و بہار، مرتبہ ڈاکٹر ابوالخیر کشفی ، اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ، ۱۹۶۵ء ، ص ۷۷

۱۹ - دریائے لطافت ، ترجمہ کیفی ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ، ۱۹۳۵ء ، ص ۳

۲۰ - آثار الصنادید ، مطبع نامی ، ۱۹۰۴ء ، ص ۱۰۴ اور تذکرہ اہل دھلی ، انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۶۵ء ، ص ۱۴

۲۱ - آب حیات ، شیخ غلام علی اینڈ سنز ، لاھور ، ۱۹۵۴ء ، ص ۲۰

ڈاکٹر گلکرسٹ نے لکھا ھے کہ :

’’جب تیمور نے ھندوستان پر حملہ کیا اسی وقت اردو کی بنیاد قائم ھوئی۔‘‘ ۲۲

بعد کے محققین نے اوپر دی ھوئی رایوں کو تقریباً رد کر دیا ھے اور اردو کے ماخذ و پیدائش گاہ کے بارے میں نئے نظریات قائم کئے ھیں۔ پروفیسر حافظ محمود شیرانی کا خیال ھے کہ اردو کا اصل ماخذ پنجابی ھے اور اردو نے اول اول پنجاب کے علاقے میں آنکھ کھولی ھے۔۲۳، البتہ اردو شاعری کا آغاز پنجاب میں دکن کے بعد اور دھلی کے ساتھ ساتھ ھوا ھے۔ لیکن ابھی حال میں شاہ حاجی محمد نوشہ متوفی ۱۰۶۴ھ کے کلام کا جو انتخاب شائع ھوا ھے اس سے بقول ڈاکٹر سید عبداللہ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ھے کہ اردو شاعری ’’پنجاب میں دکن کے بعد نہیں بلکہ دکن کے ساتھ ساتھ یا اس سے بھی پہلے شروع ھوئی ھے۔ کیونکہ حاجی محمد نوشہ کے کلام میں محمد قلی قطب شاہ کے کلام سے بھی زیادہ پختہ اور ترقی یافتہ زبان کے نمونے ملتے ھیں۔‘‘ ۲۴ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے ابتداً یہ خیال ظاھر کیا تھا۲۵ کہ اردو نے زبان کی صورت گنگ و جمن کے دوآبے میں اختیار کی لیکن بعد کو ان کے نقطۂ نظر میں تبدیلی پیدا ھوئی اور پروفیسر محمود شیرانی کی طرح ان کا بھی یہ خیال پختہ ھوگیا کہ اردو کی پہلی جنم بھومی پنجاب ھے۔۲۶
مشہور و ممتاز ماھر لسانیات پروفیسر سینیتی کمار چڑجی نے اپنی کتاب

۲۲۔ ھندوستانی فلالوجی، لندن، ۱۸۱۰ء

۲۳۔ تفصیل کے لئے دیکھیے، ’’پنجاب میں اردو‘‘، معین الادب

۲۴۔ انتخاب گنج شریف، مرتبہ سید شرافت نو شاھی، دارالمورخین، لاھور، ۱۹۷۵ء ص ۱۳

۲۵۔ ھندوستانی لسانیات، ۱۹۳۲ء، ص ۱۱۴

۲۶۔ ’’اردوئے معلی‘‘ (لسانیات نمبر) مطبوعہ دھلی، ۱۹۶۲ء، ص ۵۹، ۶۰

''انڈو آرین اور ھندی،، مطبوعہ ۱۹۴۲ء میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اردو کی ادبی شکل، دھلی کے نواح میں مرتب ہوئی ہے لیکن اس کی بنیاد پنجاب میں بہت پہلے پڑ گئی تھی اور وہ اہل پنجاب کے ساتھ دھلی کے علاقوں تک پہنچی ہے۔ ۲۶ الف پنڈت دتا تریا کیفی کا خیال ہے کہ اردو کی ابتدا ان مسلمانوں کی آمد کے بعد ہوئی جو ۱۱۹۱ء میں فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے اور فاتح و مفتوح کی مغائرت کو مٹا کر اسی ملک میں رہنے لگے۔ ۲۷ گریرسن کے نزدیک اردو، ادبی ہندوستانی کی ایک شاخ ہے اور اس کی ابتدا سلاطین کے شاہی فوج بازاروں میں ہوئی ہے۔ ۲۸ ڈاکٹر گیان چند نے گریرسن کی تقسیم کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو دراصل کھڑی بولی کی ایک صورت ہے۔ ۲۹ ڈاکٹر مسعود حسین خان نے رائے ظاہر کی ہے کہ اردو کا اصل ماخذ ہریانی زبان ہے اور ہریانی اس قدیم ابھرنش کی ترقی یافتہ صورت ہے جو دھلی پر مسلمانوں کے قبضے سے پہلے آس پاس کے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور جس پر راجھستانی کا اثر غالب تھا۔ ۳۰ ڈاکٹر شوکت سبزواری اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پالی اور اردو میں گہرا رشتہ ہے اور بہت ممکن ہے اردو کا اصل ماخذ پالی ہی ہو۔ ۳۱ علامہ سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ اردو کا اولین گہوارہ صوبہ سندھ ہے۔ ۳۲ پیر حسام الدین راشدی

۲۶ (الف)۔ بحوالہ اردوئے معلیٰ، ص ۶۳ - ۶۴

۲۷ - کیفیہ، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۳۱

۲۸ - لینگوسٹک سروے آف انڈیا، جلد اول اور نہم

۲۹ - اردوئے معلیٰ، دھلی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۲۵

۳۰ - تفصیل کے لیے دیکھیے ''مقدمہ تاریخ زبان اردو،، مطبوعہ حامی پبلیشنگ ھاؤس، دھلی

۳۱ - تفصیل کے لیے دیکھیے ''اردو زبان کا ارتقا،،، ڈھاکہ، ۱۹۵۶ء

۳۲ - نقوش سلیمانی، مطبوعہ اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۳۱،

نے علامہ ندوی کے نقطۂ نظر سے اتفاق کرتے ہوئے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:

"اردو، ہندو مسلمانوں کی وہ مشترک زبان ہے جو مسلمانوں کی ہندوستان میں آمد سے اور حکومت اور تمدنی روابط کی بدولت اس طرح وجود میں آئی کہ اسلامی زبانوں کے ہزاروں الفاظ، ہندی زبانوں میں شامل ہوگئے اور اہل ہند ہندو ہوں یا مسلمان، انہیں سمجھنے اور بولنے لگے۔ بلا شبہ اردو کو اپنی موجودہ معیاری شکل اختیار کرنے میں بہت مدت صرف ہوئی لیکن اگر اس کے وجود میں آنے کا سبب ہندوستان میں مسلمان کی آمد ہے تو پھر یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمان سب سے پہلے سندھ میں آئے اور یہیں۔ ان کی زبان عربی اور پھر فارسی کا ہندی زبانوں سے ارتباط و اختلاط شروع ہوا لہذا یہ ایک واضح اور یقینی امر ہے کہ اردو کا اصل مولد سندھ ہے۔"۳۳

ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی اردو اور سندھ کے تعلق پر اسی طرح کا اظہار کیا ہے۔ ۳۴ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی نے اگرچہ علامہ ندوی اور پیر حسام الدین راشدی کے موقف سے اختلاف کیا ہے لیکن یہ بھی تسلیم کیا ہے کہ جن عوامل نے ہندوستان کی ایک آریائی زبان کو اردو کا قالب عطا کیا وہ سب سے پہلے سندھ میں کارفرما ہوئے۔ ۳۵ نصیرالدین ہاشمی نے ابتداً اردو کا مولد، دکن کو قرار دیا تھا بعد میں ان کے نقطۂ نظر میں کچھ تبدیلی ہوئی پھر بھی وہ بعض دلائل کی روشنی میں یہی کہتے رہے کہ "جو دعوی

۳۳۔ رسالہ "اردو" انجمن ترقی اردو، کراچی، اپریل ۱۹۵۱ء، ص ۱۶۔

۳۴۔ "تاریخ ادب اردو"، ڈاکٹر جمیل جالبی، مجلس ترقی اردو ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۶۸۰

۳۵۔ اردو سندھی کے لسانی روابط، مرکزی اردو بورڈ، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۴۰

اردو کے دکن میں پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے وہ بہت بڑی حد تک صحیح ہے۔"۳۶ پروفیسر احتشام حسین نے جان بیمز کی مشہور کتاب "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ" کا اردو میں ترجمہ کیا اور اس کے مقدمے میں انہوں نے جان بیمز سے اتفاق رائے رکھتے ہوئے کھڑی بولی کو اردو کا ماخذ قرار دیا اور شمالی ہند کے علاقے کو اردو کی پیدائش گاہ بتایا۔۳۷ صوبہ سرحد کے ماہر زبان مولانہ عبدالقادر کا قول ہے کہ اردو کا اولین گہوارہ غزنی سے پشاور تک کا علاقہ ہے۔۳۸ جہاں فتوحات محمودی نے آبادیوں کے اختلاط کی صورت پیدا کی۔

اس طرح کی اور بہت سی رائیں، اردو زبان کی پیدائش اور پیدائش گاہ کے بارے میں تحقیقی کتب و مقالات میں بکھری پڑی ہیں، ان آرا پر محاکمہ کرنا مقصود نہیں اور نہ اس جگہ اس کی ضرورت و گنجائش ہے البتہ اردو کے مولد کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اس سے یہ نتیجہ ضرور نکلتا ہے کہ پاک و ہند کے مورخین و محققین نے اردو کو اپنے اپنے علاقے کی زبان سے رشتہ قائم کرنے اور اسے اردو کا پہلا گہوارہ قرار دینے میں ایک طرح کا فخر محسوس کیا ہے۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

"یہ امر خاص مسرت کا باعث ہے کہ تقریباً ہر صوبہ اس بات کا مدعی ہے کہ اردو زبان نے وہیں جنم لیا۔ اس سے اردو کی مقبولیت اور وسعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔"۳۹

اردو کی یہی مقبولیت تھی جس کے سبب وہ بہت جلد پاک و ہند کی سب سے اہم زبان بن گئی۔ اردو کی اس تیز رفتار ترقی اور مقبولیت سے یہ

۳۶۔ "دکن میں اردو"، اردو مرکز، لاہور، ۱۹۵۲ء، ص ۱۳-۱۴

۳۷۔ مقدمہ "ہندوستانی لسانیات کا خاکہ"، ادبی پریس، لکھنو، ۱۹۴۸ء، ص ۵۱-۵۹

۳۸۔ انتخاب گنج شریف، دارالمورخین، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۴

۳۹۔ خطبات عبد الحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۸۰

قیاس کرنا کہ حکمرانوں یا مسلمان بادشاہوں کی سرپرستی میں ایسا ہوا، درست نہ ہوگا۔ بقول ڈاکٹر ابواللیث صدیقی: ''یہ زبان کسی پر ٹھونسی نہیں گئی۔ نہ کسی علاقے پر عائد کی گئی، نہ اس کے بولنے اور لکھنے والوں کو انعام و اکرام سے سرفراز کیا گیا اور نہ اسے قبول نہ کرنے والوں سے جواب طلب ہوا، بلکہ یہ سارا عمل نرم روی سے خود اختیاری طور پر ہوتا رہا۔ معاشی اور تمدنی ضروریات نے اسے تقویت پہنچائی اور عوام نے اسے توانائی بخشی۔'' ۴۰ واقعہ یہ ہے کہ اردو کی ترویج و اشاعت میں مسلمان حکمرانوں نے براہ راست کوئی حصہ نہیں لیا۔ مسلمان جب فاتحانہ حیثیت سے ہندوستان میں داخل ہوئے تھے تو وہ اپنی مادری زبانیں یعنی عربی، فارسی اور ترکی ساتھ لائے تھے۔ لیکن حکومت کے ساتھ، استحکام صرف فارسی کو حاصل ہوا۔ سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں وہی مروج رہی اور ہر قسم کی تحریر و تقریر میں اسی سے کام لیا جاتا رہا۔ البتہ معاشرتی اور کاروباری ضرورتوں کے تحت روز مرہ کی گفتگو میں، مسلمانوں کو دیسی الفاظ اور ہندوؤں کو فارسی الفاظ استعمال کرنے پڑتے تھے۔ زبانوں کے اس اختلاط اور عوامی تقاضوں کے نتیجے میں ایک گم نام اور بے نام بولی وجود میں آگئی اور تھوڑے ہی دنوں میں ایک شائستہ اور مستقل زبان بن گئی۔'' ۴۱

اس نئی زبان میں شعر و شاعری کا سلسلہ، جیسا کہ امیر خسرو کی پہیلیوں اور دو سخنوں سے ظاہر ہے، تیرھویں صدی عیسوی کے اواخر ہی سے شروع ہو گیا تھا، سترھویں صدی سے اس میں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ کام ہونے لگا۔ نثر و نظم دونوں میں ہر قسم کے موضوعات پر کتابیں لکھی جانے لگیں۔ ۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج نے اپنے چھاپے خانے کا بھی انتظام کیا اور عربی، فارسی اور سنسکرت کے ساتھ کالج میں اردو زبان کا شعبہ بھی بطور خاص کھولا گیا، بہت سی کتابیں لکھوائی گئیں اور دوسری زبانوں سے ترجمہ کروائی گئیں حتیٰ کہ ۱۸۳۷ء میں فارسی کی جگہ اردو کو دفتری اور عدالتی

۴۰۔ ادب و لسانیات، اردو اکیڈمی سندھ، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۲۰۶

۴۱۔ خطبات عبد الحق، ص ۷۶

زبان بنا دیا گیا - اسی دوران میں دلی کالج میں ، سارے مضامین (بشمول ریاضی اور سائنس) کے لئے اردو کو ذریعہ تعلیم قرار دے دیا گیا ، ان اقدامات نے اردو کی ترقی و مقبولیت کی رفتار کو اور تیز کر دیا - اس سارے عمل میں هندو مسلمان دونوں برابر کے شریک رهے اور دونوں نے اسے اپنی زبان سمجھا - ڈاکٹر تارا چند نے لکھا هے که :

> Urdu, however, was regarded by both Hindus and Mussalmans of the 18th Century as their lingua-franca. Bhartendo Harishandra, one of the pioneers of Modern Hindi, acknowledged in the middle of the 19th Century that Urdu was the language of polite speech in the North even among the members of his community (Agarwals). So when the East India Company ordered the establishment of the Fort William College in Calcutta to teach Indian languages to their officers, Urdu was the language for which teachers were appointed, as also for the classical languages, Arabic, Persian and Sanskrit and provincial languages like Bengali and Brajbhasha.[42]

اردو کی اس مقبولیت اور علمی ترقی سے قطع نظر جیسا که پچھلی سطور میں بھی جا بجا اشارے آچکے هیں ، لسانی نقطه نظر سے بھی وہ پاک و هند کی سر زمین هی میں پیدا هوئی هے، اور آریائی زبانوں کے اس خاندان سے تعلق رکھتی هے جسے آریائی یا هند یورپی خاندان کہا جاتا هے اور جس کے موٹے موٹے اصول وهی هیں جو دوسری آریائی زبانوں کے هیں - مولوی وحیدالدین سلیم نے آریائی خاندان کی زبانوں کے مشترک اصولوں پر تفصیل سے بحث کی هے- ۴۳ برجموهن دتاتریا کیفی نے بھی بعض مشترک اصولوں کی نشاندهی کی هے - ۴۴ راقم‌الحروف نے بھی اس موضوع پر بعض خیالات پیش کئے هیں - ۴۵ اردو کے مقامی زبان هونے اور آریائی زبانوں سے اس کے تعلق

۴۲ - دی پرابلم اف هندوستانی ، اله اباد ، ۱۹۴۴ء، ص ۳۱

۴۳ - وضع اصطلاحات ، انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ص ۱۹

۴۴ - ''کیفیه ، معین الادب ، لاهور ، ۱۹۵۰ء

۴۵ - زبان اور اردو زبان ، قمر کتاب گھر ، کراچی ، ۱۹۷۲ء ، ص ۲۲

کے سلسلےمیں مشہور ماہر لسانیت پروفیسر سنیتی کمار چٹرجی کا تو یہاں تک خیال ہے کہ :

”اگر مسلمانوں نے ہندوستان میں فتوحات نہ حاصل کی ہوتیں تو بھی جدید ہند آریائی زبانیں بنتیں لیکن انہیں جو باوقار ادبی حیثیت حاصل ہوگئی اس میں ضرور دیر ہوتی - اس طرح اردو کے لئے زمین ہموار ہوگئی جس کا رشتہ براہ راست سنسکرت سے نہیں بلکہ اب بھرنش اور بول چال کی شور سینی پراکرت سے ہوتا ہوا اس آریائی ماخذ تک پہنچ جاتا ہے جس نے خود ویدک سنسکرت اور سنسکرت کو جنم دیا -“۴۶

ڈاکٹر رام بابو سکسینہ نے اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”اردو اپنی اصل نسل کے اعتبار سے یکسر ہندوستانی ہے وہ شورسینی پراکرت سے ماخوذ ہے اور اس کے اصول و قواعد اور محاورے بالکل وہی ہیں جو دوسری ہند آریائی زبانوں کے -“۴۷

مختصر یہ کہ اردو اپنے تاریخی ، لسانی اور سماجی پس منظر میں یکسر مقامی زبان ہے - آج سے نہیں پچھلی کئی صدیوں سے اسے پاک و ھند میں لینگوا فرینکا کی حیثیت حاصل ہے - ہر چند کہ موجودہ ہندوستان میں سرکاری حیثیت سے اردو کو ختم کر دیا گیا لیکن اس کی مقبولیت کی عملی صورت وہاں آج بھی وہی ہے جو قیام پاکستان سے پہلے تھی -

ایم - اے ڈیکوف (M. A. Dayakov) نے اردو کی سیاسی و سماجی حیثیتوں پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”برطانوی نو آبادیات میں سب سے وسیع حلقہ اردو زبان کا تھا - مغلوں کے آخری دور میں ، اردو ، ہندوستان کے ہر حصے میں پہنچ

۴۶ - بحوالہ ”اردو معلیٰ“ ، (لسانیات نمبر)، دھلی، ۱۹۶۹ء، ص ۵۶

۴۷ - ”تاریخ ادب اردو“ ، (اردو ترجمہ از مرزا محمد عسکری) نول کشور پریس ، لکھنؤ ، طبع سوم ، ۱۹۲۹ء ، ص ۱ - ۲

گئی تھی، شمالی ہند کی شہری آبادیوں کے بیشتر طبقوں اور کاروبار کی زبان یہی تھی - مغل سپاہیوں اور افسروں کے ذریعے یہ دکن پہنچی اور وہاں مسلم ریاستوں کی سرکاری زبان بن گئی -

انیسویں صدی تک یہ برابر ترقی کرتی رہی، پنجاب کو فتح کرنے کے بعد برطانوی حکومت نے فارسی کو جو کہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں سرکاری زبان تھی، اردو سے بدل دیا - ۱۹۴۷ء، یعنی تقسیم پنجاب تک، اردو وہاں کے ہندو اور مسلمان دونوں کا ذریعۂ اظہار اور ذریعۂ تعلیم رہی - صرف سکھ گورمکھی رسم الخط میں پنجابی کا استعمال کرتے تھے - شمالی ہند میں تو اردو عدالتی زبان تھی اور اینگلوانڈین آرسی کی تعلیم و تدریس بھی اسی میں ہوتی تھی-''۳۸

مستشرقین اور مسلمان مصنفین سے قطع نظر جیسا کہ اس سے پہلے بعض حوالے دے چکے ہیں بہت سے انصاف پسند اور حق گو ہندو مصنفین مثلاً پریم چند، ڈاکٹر رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر تاراچند، پنڈت برجموھن دتاتریا کیفی، ڈاکٹر امبید کر، پنڈت کشن پرشاد کول، سرتیج بہادر سپرو، سر سندر لال، پنڈت آنند نرائن ملا اور رگھوپت سہائے فراق گورکھپوری وغیرہ نے بھی ایک جگہ نہیں بار بار اس بات کا اظہار کیا ھے کہ اردو، ہندو مسلمان، دونوں کا مشترکہ ورثہ ھے اور اسی کے ذریعے ان دو بڑی قوموں کے درمیان یکجہتی و یک دلی ممکن ھے - ڈاکٹر سپرو نے ۲۶ دسمبر ۱۹۲۸ء کے لیڈر اخبار میں یہاں تک لکھا تھا کہ :

''میں ھرگز یہ گوارا نہیں کرسکتا کہ جس زبان کو دھلی اور لکھنؤ کے اساتذہ نے دو ڈھائی سو برس میں مانجھ کر اس مرتبے پر پہنچایا ھے- اس کو اس طرح برباد کیا جائے - اردو کو میں مسلمانوں کی زبان نہیں سمجھتا، یہ ھندو اور مسلمانوں کی مشترک

۳۸- دی نیشنل پرابلم ان انڈیا ٹوڈے، ماسکو، ۱۹۶۶ء، ص ۹۰-۹۱

زبان ہے۔ اس کی پیدائش و نشو و نما میں دونوں نے یکساں حصہ لیا ہے۔ یہ ہرگز تقسیم نہیں ہو سکتی۔ یہ وہ زبان ہے جس نے سترھویں اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ہندو و مسلمانوں میں ایک دوسرے کے خیالات اور مذاق کو سمجھنے کی قابلیت پیدا کی۔ اگر اردو پر یہ اعتراض ہے کہ بعض الفاظ دیہاتیوں کی سمجھ سے باہر ہیں، تو ہندی میں اور خصوصاً اس ہندی میں جو آج بولی جاتی ہے صدھا الفاظ ہیں جو اچھے شہری بھی نہیں سمجھ سکتے۔"۴۹

حد یہ ہے کہ ایک قومی نظریے کے پرستار اور ہندوستان کے سابق صدر و ماہر تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین نے جب یہ دیکھا کہ ہندوستان کی قومی زبان، جدید ہندی قرار دے دی گئی ہے اور اردو کو جڑ سے کاٹ پھینکنے کی کوششیں ہو رہی ہیں، تو وہ بھی چیخ اٹھے، ڈاکٹر یوسف حسین خان کا بیان ہے کہ :

"لکھنؤ میں اردو کانفرنس اس لئے منعقد ہوئی تھی کہ اردو کی حمایت میں جو بیس لاکھ دستخط ہوئے تھے انھیں محضر کے ساتھ صدر، جمہوریہ ہند، کی خدمت میں پیش کیا جائے۔"

انجمن ترقی اردو کے صدر کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین نے اس موقع پر جو خطبہ دیا اس میں انھوں نے کہا :

" کیا ستم ہے کہ اردو پر اور اردو کے حامیوں پر کوئی فرقہ پرستی کا الزام لگائے۔ اردو کسی فرقے کی زبان نہیں ہے۔ کسی مذھب کی زبان نہیں ہے، کسی حکومت کی چلائی ہوئی زبان نہیں ہے، یہ تو میل جول کا پھل ہے۔ جنتا کی زبان ہے۔ یہ وسعت قلب کی زبان ہے، روا داری کی زبان ہے۔ محبت اور پریم کی زبان ہے اس ملک کے بسنے والوں کے رابطہ دلی اور رابطہ ذھنی کا نتیجہ ہے اور

۴۹۔ بحوالہ "اردو حقیقت کے آئینے میں"، کراچی، ۱۹۶۹ء، ص ۴۷

ان بسنے والوں میں ہندو مسلم ، سکھ ، عیسائی کا کوئی امتیاز نہیں ۔" ۵۰

اوپر کی ساری بحث سے جو باتیں نتائج کے طور پر سامنے آتی ہیں وہ یہ ہیں :

(۱) اردو ، بھی پاک و ہند کی دوسری زبانوں کی طرح مقامی زبان ہے ۔ وہ عرب ، ایران یا ترکی سے نہیں آئی بلکہ یہیں پیدا ہوئی ، یہیں جوان ہوئی اور یہیں ترقی کی ساری منزلیں طے کیں ۔

(۲) یہ کوئی نئی زبان نہیں ہے اس کی تاریخ اتنی ہی پرانی ہے جتنی پاک و ہند کے مسلمانوں کی ، اس کے ادب کی تاریخ کم از کم چار سو سال پر محیط ہے اور اس کا ادبی ذخیرہ اتنا وسیع و کثیر ہے کہ ہندوستان کی کوئی اور زبان اس کے مقابلے میں نہیں رکھی جا سکتی ۔

(۳) اردو اپنی ساخت میں ایک مخلوط زبان ہے ۔ وہ مختلف زبانوں اور قوموں کے باہم میل جول ، خصوصاً مسلمانوں اور ہندوؤں کے سماجی و معاشرتی ملاپ سے وجود میں آئی ہے اور اس کی ترقی میں دونوں برابر کے شریک رہے ہیں ۔

(۴) لسانی اعتبار سے اردو کا تعلق آریائی خاندان کی زبانوں سے ہے ، اس کی قواعد ، مرکبات کے اصول ، اور جملوں کی ساخت کا سارا ڈھب آریائی زبانوں جیسا ہے ۔ اس میں عربی ، فارسی ، ترکی اور انگریزی وغیرہ کے بھی بے شمار الفاظ شامل ہیں ۔ لیکن ذخیرہ الفاظ کا زیادہ حصہ جیسا کہ سید احمد دہلوی نے مشہور اردو لغت " فرہنگ آصفیہ " میں بتایا ہے سنسکرت گروپ کی زبانوں کے الفاظ پر مشتمل ہے ۔ اردو کے بنیادی الفاظ خصوصاً مصادر و افعال اور حروف جار ،

۵۰ ۔ " یادوں کی دنیا " ، دارالمصنفین ، اعظم گڑھ ، ۱۹۶۷ء ، ص ۱۲۸-۱۲۹

سب کے سب مقامی ہیں ، صرف اسما و صفات عربی ، فارسی یا باہر کی زبانوں سے لئے گئے ہیں۔

(۵) اردو کو ایک زمانے سے پاک و ہند میں لینگوا فرینکا کا رتبہ حاصل ہے اس کا بین الاقوامی مزاج ، ہر طبقے اور ہر علاقے کے لوگوں کے لئے کشش رکھتا ہے۔ اس کا ذخیرہ الفاظ ، اس کی صوتیات اور اس کے حروف تہجی سب میں ایسے عناصر موجود ہیں کہ اس کے سیکھنے یا بولنے میں غیر زبان کے لوگوں کو چنداں دقت نہیں ہوتی ، ہر شخص بہت جلد یہ محسوس کرنے لگتا ہے گویا یہ اس کی اپنی زبان ہے۔

(۶) اردو ، ہندو مسلمان کے ملاپ کا حاصل اور دونوں کی تہذیبوں کا سنگم ہے ہندو مسلمان میں ، اتحاد و یگانگت کی جو صورتیں پیدا ہوئیں وہ اسی کی مدد سے پیدا ہوئیں۔ اس کی پیدائش و ترقی اور مقبولیت میں کسی جبر کو دخل نہیں تھا۔ ورنہ اگر مسلمان حکمران چاہتے تو اپنے ہزار سالہ دور حکومت میں ہندوؤں کو عربی فارسی یا ترکی سیکھنے پر اسی طرح مجبور کر دیتے جس طرح انگریزوں نے صرف ڈیڑھ سو سال کی حکومت میں ہمیں انگریزی پڑھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ لیکن مسلمانوں نے ایسا نہیں کیا ، بلکہ انہوں نے اپنی زبانوں کو ترک کرکے اپنی رواداری کے ثبوت میں مقامی زبانوں کو ترجیح دی۔

اردو کی یہ وہ خصوصیات ہیں ، جن کا ذکر سبھی نے کیا ہے اور اپنی انہی خصوصیات کی بنا پر وہ ہر عہد اور ہر علاقے میں ، ہر دل عزیز رہی ہے۔ ہندوؤں نے اردو زبان میں وہی مہارت حاصل کر لی تھی جو انہیں کسی وقت فارسی میں حاصل تھی۔ حتیٰ کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں جب فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں رائج کر دیا گیا تو بھی، کسی ہندو کی طرف سے انگریزوں کے اس رویے کے خلاف کوئی آواز بلند نہیں کی گئی۔ سب نے اسے اردو کا حق سمجھا کہ وہ وہ اپنی وسعت و مقبولیت کے

سبب سرکاری منصب پر فائز ہو۔ اردو کی اس حیثیت کے پیش نظر یہ بات بدیہی سمجھی جا رہی تھی کہ اگر کسی وقت ہندوستان آزاد ہوا تو اس آزاد مملکت کی سرکاری اور قومی زبان اردو ہوگی، لیکن مسلمانوں کے اقتدار کے خاتمے پر، ہندوؤں کے سوچنے کا انداز یکسر بدل گیا۔ ان میں ہندو مذہب اور ہندو قومیت کا جذبہ، ایک سیاسی قوت کی شکل میں ابھرنا شروع ہوا اور اتنی شدت کے ساتھ کہ وہی مسلمان قوم، جو کل تک ان کی حاکم تھی اور تہذیبی و ثقافتی ہر اعتبار سے ان سے بہتر و برتر تھی، وہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی نظروں میں کمتر اور ملچھ ہو گئی۔ اب ہر وہ چیز ان کی نظروں میں کھٹکنے لگی جس پر مسلم ثقافت کا سایہ ہو۔ چنانچہ ہندو قومیت کے احیا کے لئے ہندی کے نام سے ایک نئی زبان کا پرچار کیا جانے لگا اور اردو زبان میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر کیڑے نکالے گئے۔ کسی نے کہا اردو ہندوستان کی نہیں بدیسی زبان ہے۔ کسی نے کہا چونکہ یہ دائیں سے بائیں کو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اس لئے صرف مسلمانوں کی زبان ہے۔ کسی نے کہا اس کی پیدائش اور پرورش مسلمانوں اور مسلمان حکمرانوں کے زیر سایہ ہوئی ہے، اور اس پر اسلامی تہذیب کا غلبہ ہے اس لئے یہ ہندوؤں کے لئے قابل قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ بھی کہا گیا کہ اردو کا رسم الخط مشکل ہے اس لئے اس کا سیکھنا سکھانا ہر شخص کے بس کی بات نہیں۔ بعض نے یہ الزام لگایا کہ اس کا دائرہ اثر صرف شہروں تک محدود ہے، گاؤں کے لوگ اسے بہت کم سمجھتے ہیں۔ بعض نے دعوی کیا کہ اردو، در اصل، ہندی زبان کی بگڑی ہوئی شکل ہے اس لئے بہتر یہ ہوگا کہ مسخ شدہ زبان کے بجائے اصل زبان یعنی ہندی کو بروئے کار لایا جائے۔ اس طرح کے اور نہ جانے کتنے اعتراضات اردو کے خلاف اٹھائے گئے۔ یہ سارے اعتراضات چونکہ بے بنیاد اور سیاسی تعصبات پر مبنی تھے اس لئے ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد کا مجروح ہونا لازمی تھا، اختلاف کی خلیج رفتہ رفتہ وسیع ہوتی گئی اور ایک دن وہ آیا کہ دونوں کی سیاسی راہیں اور منزلیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئیں۔ یہ راہیں اور منزلیں کیا تھیں اور اردو ہندی کا تنازع ان میں کس حد تک دخیل ہوا،

اس کی تفصیل میں جانے سے قبل ، اردو کی طرح ، ہندی زبان کی تاریخ پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے ۔

ہندی

ہندی کا لفظ موجودہ ہندی زبان کے معنوں میں نیا ہے انیسویں صدی سے پہلے یہ لفظ ، اس معنی میں کسی جگہ نظر نہیں آتا ۔ اس نے ، در اصل ہندو قومیت کی تحریک کے ساتھ ، مسلمانوں کے سیاسی زوال اور ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جمانے کے بعد جنم لیا ہے ۔ یہی کیفیت لفظ " ہندو " کی ہے ۔ ایک مخصوص قوم کے معنوں میں یہ لفظ بھی نو مولود اور ہندوؤں کے اس سیاسی شعور کا زائیدہ ہے جس نے اکثریتی قوم کی شکل میں ابھر کر پورے بر صغیر پر رام راج قائم کرنے کا خواب دیکھا تھا ۔ اس لئے زبان کی حیثیت سے ہندی پر اظہار خیال کرنے سے پہلے ، ہندی اور ہندو کے الفاظ کی اصل اور ان کے قدیم استعمالات پر ہلکی سی روشنی ڈالنا مناسب ہوگا ۔

" ہندی " سے پہلے لفظ " ہندو " کو لے لیجئے کہ یہی لفظ بعد کو ہندی کی تخلیق کا باعث ہوا ہے ۔ لفظ " ہندو " ابتداً صرف ایک جغرافیائی اصطلاح تھی اور زمانہ قدیم میں اس سے مراد وہ خطۂ زمین تھا جو سات دریاؤں یعنی ستلج ، بیاس ، راوی ، چناب ، جہلم ، سندھ اور سرسوتی سے سیراب ہوتا تھا ۔ اس خطے کا نام ان سات دریاؤں کی رعایت سے شروع میں " سپتہ سندھو " تھا ۔ سنسکرت میں " سپتہ " کے معنی ہیں سات، اور " سندھو " کے معنی ہیں زمین ، علاقہ یا دیش ۔ قدیم ایرانیوں نے سپتہ سندھو کو " ہفتہ ہندو " کر لیا ۔ کیونکہ سنسکرت کا سین ان کے یہاں عام طور پر ہائے ہوز سے بدل جاتا تھا ۔ چنانچہ بہت سے قدیم سنسکرت الفاظ مثلاً شانتی ، واسا ۔ سوما اور اسورا وغیرہ قدیم ایرانی میں علی الترتیب ہانتی ، واہا ، ہوما اور اہورا کی شکل میں ملتے ہیں ۔ یہی " سپتہ سندھو " کے ساتھ ہوا ۔ پہلے یہ " ہفتہ ہندو " ہوا ، پھر مختصر ہو کر ہندو رہ گیا ، چنانچہ قدیم ایرانیوں کے نزدیک " ہندو " کسی مذہب یا قوم کا نہیں بلکہ ایک جغرافیائی حد بندی کا نام تھا اور اس

کی حدود کے اندر رہنے والے سارے باشندوں کو ” ہندو “ کہتے تھے۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے لکھا ہے کہ قدیم ایرانیوں کے یہاں ” ہند “ کا لفظ در اصل ” سندھ “ اور اس سے مراد قدیم تاریخ میں وہ علاقہ مراد ہے جسے آج پاکستان کہتے ہیں۔ ۵۱ شریف الدین پیر زادہ نے ڈاکٹر قریشی ہی کے ایک حوالے سے لکھا ہے کہ :

” لفظ سندھ کا صوتی تغیر لفظ ہند کے استعمال کا باعث بنا۔ سندھ۔ سنسکرت کے لفظ ” سیاند “ سے اخذ کیا گیا ہے۔ جس کے معنی ” بہنے “ کے ہیں ، اور ” سندھ “ دریائے سندھ کا نام ہے۔ ” سیاند “ سے سندھ اور ہند کے نام نکالے گئے ہیں۔ علم اللسان کی رو سے ” ہندوستان “ در اصل دریائے سندھ کی سر زمین ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ ہند اور سندھ کو ہم معنی الفاظ کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ان الفاظ کے درمیان امتیاز اور تفریق رفتہ رفتہ اور ایک عرصہ بعد ہوئی۔ “ ۵۲

لغات میں لفظ ” ہندو “ کے معنی ڈاکو ، غلام ، چور اور سیاہ رنگ کے بھی ملتے ہیں۔ شیخ سعدی نے گلستان کی ایک حکایت میں لکھا ہے کہ :

” دو ہندو از مکین گاہ جست کردہ بر ما ہجوم آوردہ۔ “

اس فقرے میں ” ہندو “ کے معنی ڈاکو اور چور ہیں ، لفظ ہندو کے یہ معنی اردو فارسی کی ساری مستند لغات میں آئے ہیں۔ حافظ شیرازی کا یہ شعر بہت مشہور ہے :

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل ما را

بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را

۵۱ ۔ دی اسٹرگل آف پاکستان ، کراچی ، ۱۹۷۵ء ، ص ۱۶۲

۵۲ ۔ پاکستان منزل بہ منزل ، گلڈ انجمن کتاب گھر ، کراچی ، ۱۹۶۵ء ، ص ۶

مذھب یا قوم کے معنوں میں یہ لفظ فارسی ادبیات یا کسی اور زبان میں نظر نہیں آتا ، خود پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان ھے کہ کسی خاص مذھب یا مذھب کے ماننے والوں کے لئے '' ھندی '' کا لفظ ، پرانی کتابوں میں نہیں ملتا ھے ۔ انہوں نے ھندو اور ھندو ازم کے الفاظ پر تفصیل سے بحث کرتے ہوئے لکھا ھے کہ ان معنوں میں :

'' ھمارے قدیم ادب میں ''ھندو'' کا لفظ کہیں بھی نہیں آیا دریائے سندھ کا پرانا نام سندھو ھے اور یہ لفظ اسی سے نکلا ھے۔ اسی لفظ سندھو سے آگے چل کر ھندو اور ھندوستان ، انڈوس اور انڈیا کے الفاظ بنے ۔ ھندو کے لفظ کو ایک خاص مذھب کے لئے استعمال کرنے کا رواج بہت بعد میں ہوا ۔ ''۵۳

بالفور ایڈورڈ (Balfore Edward) نے '' لفظ '' ھندو کے ذیل میں لکھا ھے کہ قدیم تاریخوں میں یہ لفظ کہیں نہیں ملتا ، برٹش انڈیا کے بت پرست باشندوں کو عام طور پر ھندو کہا جاتا ھے لیکن یہ اصطلاح قریبی زمانے سے مروج ہوئی ھے۔ جن نسلوں پر یہ لفظ اب منطبق کیا جاتا ھے، وہ طاقتور برٹش حکومت کے ماتحت اب مخلوط اور ایک ھو رھی ھیں ۔ اس سے پہلے ان کے لئے کوئی ایک لفظ مخصوص نہ تھا بالفور کے لفظوں میں :

Hindu is entirely a European convetional term and does not represent a nation, a race, or a religion.54

نراد ۔ سی ۔ چودھری (Nirad C. Choudhary) نے اس سلسلے میں مزید وضاحت سے لکھا ھے کہ جس طرح انگریزی ، فرانسیسی ، امریکن اور جرمن وغیرہ کے نام کسی ملک سے تعلق کو ظاھر کرتے ھیں اسی طرح ھندو کا لفظ صرف ھندوستان سے تعلق کو ظاھر کرتا ھے ۔ اس میں مذھب اور قوم کا مفہوم کہیں نہیں ھے ، یعنی ھندو کے لفظ کا اطلاق پہلے ھندوستان کے

۵۳ ۔ '' تلاش ھند '' ، جلد اول ، مکتبہ جامعہ ، دھلی ، ص ۱۳۳

۵۴ ۔ انسائیکلو پیڈیا آف انڈیا ، جلد دوم ، ۱۸۵۸ء ، ص ۵۶

سارے باشندوں پر ہوتا تھا ، خواہ کسی عقیدے اور کسی قومیت سے تعلق رکھتے ہوں ۔"۵۵

ان تفصیلات کی روشنی میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہندو کا لفظ قوم اور مذہب کے معنی میں کسی قدیم لغت یا تاریخ میں موجود نہیں اور خود ہندو مصنفین و مورخین کو اس کا اعتراف ہے کہ یہ لفظ ان کے یہاں موجودہ معنوں میں کبھی مروج نہیں رہا، تو پھر اٹھارویں صدی کے بعد ہندوؤں نے اسے کس طرح اپنا لیا اور ہندو قومیت اور ہندو مذہب کی احیائی تحریکیں کیونکر رونما ہو گئیں ۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ہندو کا لفظ موجودہ معنی میں جیسا کہ بالفور نے لکھا ہے کہ "ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے مضبوط ہو جانے کے بعد سیاسی اغراض کی خاطر دانستہ اپنایا گیا ہے" ۔ اس کے اپنانے کا مقصد ، ہندوستان کے مختلف طبقات اور قومیت کے لوگوں کو ایک قوم کے نام پر مجتمع کرکے ، مسلمانوں کے مقابلے میں ایک نئی قوم کو ابھارنا تھا ۔ اس کے لئے ۱۷۸۳ء میں ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے نام سے ایک انجمن قائم کی گئی ۔ شہنشاہ انگلستان اور گورنر جنرل ہند ، وارن ہیسٹنگز، اس کے مربی و سرپرست مقرر ہوئے ، دوسرے ارکان بھی حکومت کے خطاب یافتہ اور وظیفہ خوار تھے ۔ اس انجمن کے سربراہ سر ولیم جونس (Sir William Jones) اور بعد کو ان کے جانشین میکس مولر (Max Muller) نے ہندوستان کی آریہ قوم کو دنیا کی مہذب ترین قوم ثابت کرکے قدیم ایرانیوں سے ان کا رشتہ قائم کیا، اور زبانوں کے تقابلی مطالعہ کے ذریعے سنسکرت کی قدامت و اہمیت پر خاص طور پر زور دیا ۔ ان کی تحریریں ہندوؤں کو من الحیثیت قوم ابھارنے میں معاون ثابت ہوئیں ۔ ان میں اپنی برتری کا ایک نیا احساس پیدا کردیا ۔ اس کے بعد کے ہندوستان کی تاریخ بقول ڈاکٹر معین الدین عقیل دراصل دو ملکوں کی تاریخ ہے جس میں ہندو اور مسلمان اپنے اپنے قومی تشخص کے لئے کام کرتے رہے ۔۵۵الف ایشیاٹک سوسائٹی میں سنسکرت کی ساری اہم کتابیں ترجمہ

۵۵ ۔ کانٹی نینٹ آف سیریس ہسٹری ، لندن ، ۱۹۶۰ء ، ص ۳۵

۵۵ الف ۔ " ایشیاٹک سوسائٹی ،، (غیر مطبوعہ مضمون)

کرائی گئیں ، اور قدیم آریائی علم و فن کو دنیا کے بیشتر علوم و فنون کا ماخذ قرار دے کر، ہندوؤں کو دنیا کی عظیم ترین قوم ہونے کا احساس دلایا گیا ، پھر یہ احساس انیسویں صدی کے آغاز میں، فورٹ ولیم کالج اور راجہ رام موہن رائے کے ہاتھوں ایک مستقل قومیت کے جذبے میں تبدیل ہو گیا ۔ یہیں سے ہندو کا لفظ مخصوص قوم اور مخصوص مذہب سے منسلک ہو گیا اور یہیں سے ہندوؤں نے سارے غیر مسلم طبقات کو سمیٹ کر ایک منظم اور بڑی قوم بنانے کی جد و جہد شروع کردی ۔ اس کوشش کے نتیجے میں ہندو قومیت کی طرح ہندی نام کی زبان بھی ایجاد کی گئی اور اسے اردو کے مقابلے میں لا کر یہ سمجھانے کی ناکام کوشش کی گئی کہ ہندوستان کی قدیم ترین اور مقبول ترین زبان اردو نہیں ہندی ہے ۔

''ہندی'' کا لفظ ایک جداگانہ زبان کے معنوں میں دراصل فورٹ ولیم کالج، کلکتہ (۱۸۰۰ء) کے ارباب حل و عقد کے منشا و اثر سے مستعمل ہوا۔ اس کالج میں ڈاکٹر گلکرائسٹ کی سربراہی میں مشرقی زبانوں یعنی عربی ، فارسی ، سنسکرت اور اردو کی تعلیم و تدریس کا جو شعبہ قائم کیا گیا اس میں نصابی ضرورت کے لئے مختلف زبانوں کی منتخب کتابیں اردو میں ترجمہ کرائی گئیں ۔ ۵۶ مترجمین و مولفین میں ہندو مسلمان دونوں شامل تھے، اور خود گلکرائسٹ کو اس کام سے بہت دلچسپی تھی ۔ مسلمان مترجمین میں میر امن ، سید حیدر بخش حیدری ، بہادر علی حسینی ، مرزا علی لطف ، کاظم علی جوان ، مظہر علی ولا اور ہندوؤں میں نہال چند لاہوری ، منشی بینی نرائن جہاں اور للو لال جی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ چونکہ تراجم کا بنیادی مقصد انگستان کے نووارد انگریزوں کو اردو سکھانا تھا ۔ اس لئے گلکرائسٹ کی ہدایت پر آسان سے آسان اردو میں ترجمے کئے گئے۔ میر امن کی مشہور کتاب ''باغ و بہار'' کو ان تراجم کا معیاری نمونہ کہہ سکتے ہیں ۔ نہال چند لاہوری اور بینی نرائن جہاں کے اردو ترجمے بھی کم و بیش ''باغ و بہار''

۵۶ ۔ گلکرائسٹ اور اس کا عہد ، محمد عتیق صدیقی ، علیگڑھ ، ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۹

ہی کے معیار کے ہیں، لیکن گجراتی برہمن للو لال جی نے جو ترجمے کئے ان کی نوعیت دوسرے ترجموں سے بالکل مختلف ہے۔ للو لال جی نے "پریم ساگر" کے نام سے "بھگوت گیتا" کے ایک حصے کا ترجمہ کیا اور اسے اردو یعنی فارسی رسم الخط کے بجائے دیو ناگری میں مرتب کیا۔ پریم ساگر کے علاوہ، انھوں نے بعض دوسری کتابیں مثلاً "سبھاس بلاس"، "راج نیتی"، "لطائف ہندی" اور "سنگاسن بتیسی" کے نام سے بھی مرتب کیں۔ ان کتابوں میں برصغیر پاک و ہند کی تاریخ میں پہلی دفعہ یہ اہتمام کیا گیا کہ عربی و فارسی کے مروجہ الفاظ سے گریز کر کے دانستہ برج بھاشا اور سنسکرت الفاظ کو جگہ دی گئی، اور فارسی کے بجائے ناگری رسم الخط میں اشاعت کا انتظام کیا گیا۔ بعض کتابیں، مثلاً "سنگاسن بتیسی" اگرچہ فارسی اور ناگری دونوں رسم الخط میں چھاپی گئیں، پھر بھی اس کی زبان پر برج بھاشا اور سنسکرت کا غلبہ رہا۔ یہ کتابیں ہندوؤں میں بطور خاص مقبول ہوئیں، ہر طرف سے ان کتابوں اور ان کے مرتب کی آؤ بھگت ہوئی، صرف اس لئے کہ ان کے ذریعے اردو سے الگ، ہندی کے نام سے ایک نئی زبان کے رواج اور اس رواج کے ذریعے ہندو قومیت کے فروغ کی ایک صورت پیدا ہوئی تھی۔ خود انگریزوں نے للو لال جی کے اقدامات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دی۔ "پریم ساگر" کا پہلا ایڈیشن ۱۸۰۳ء میں چھپا تھا، بعد ازاں اس کے درجنوں ایڈیشن نکلے۔ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۶۷ء میں ان کے انگریزی ترجمے بھی شائع ہوئے۔ ۵۷

للو لال جی کے اس کام میں ان کے دو ماتحت، پنڈت چتر بھوج مصرا اور سدل مصرا بھی شریک رہے۔ کچھ دنوں بعد یہ ہوا کہ وہی اردو جو فارسی رسم الخط میں "ہندی"، ہندوستانی، اور ریختہ وغیرہ کے نام سے بھی جانی جاتی تھی، دیو ناگری رسم الخط میں منتقل ہو کر، الگ زبان کی حیثیت سے ایسی "ہندی" کہی جانے لگی جس کا اردو سے کوئی رشتہ نہ تھا۔ ایف۔ ای۔ کے (F. E. Key) نے صحیح لکھا ہے کہ:

۵۷۔ "ارباب نثر اردو"، سید محمد، ایم اے، مکتبہ معین الادب، لاہور، ۱۹۵۰ء، ص ۲۶۶

''للو لال جی، ان کے رفقا اور فورٹ ولیم کالج کے کرتا دھرتا دراصل ''ہندی'' زبان کے موجد ہیں، ورنہ اس سے پہلے نہ تو ہندی نام کی کوئی زبان تھی اور نہ اس میں تصنیف و تالیف کا کوئی نمونہ موجود تھا۔ ''۵۸

مولانا حامد حسن قادری نے ہندی اور اردو کی نثری تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''للو لال جی کی پریم ساگر، موجودہ ہندی لٹریچر کا سنگ بنیاد ہے۔ اس سے پہلے ہندی میں کوئی نثری کتاب نظر نہیں آتی۔ ''۵۹

اس سے انکار نہیں کہ ''ہندی'' کا لفظ، فورٹ ولیم کالج کے قیام اور انگریزی اقتدار کے استحکام سے قبل بھی موجود تھا لیکن للو لال جی نے جس نوع کی ہندی کی بنیاد ڈالی، اس سے، اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ اس سے قبل، ہندی کا لفظ دو خاص معنوں میں استعمال ہوتا تھا، ایک وہی جس کا ذکر پچھلی سطور میں آچکا ہے کہ پرانے زمانے میں دریائے سندھ سے ملحق سارا علاقہ سندھ یا سندھو کہلاتا تھا، مسلمانوں نے ''س'' کو ہائے ہوز سے بدل کر ہند اور ہندو کیا۔ پھر اس سے صفت بنائی اور اس علاقے سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو ہندی یا ہندوی کہنے لگے۔ چنانچہ اسی تعلق کی بنا پر جو زبان مسلمانوں کی آمد کے بعد سب سے زیادہ بولی اور سمجھی جانے لگی اور جس کا نام آخر کار اردو ہوگیا اس کو بھی انھوں نے ہندی، زبان ہندی یا ہندوی کے نام سے پکارا۔ محمد عوفی، جس نے فارسی شعرا کا پہلا تذکرہ، اسی علاقے میں بیٹھ کر ۶۱۷-۸ھ / ۱۲۲۱ء ۶۰ میں مرتب کیا جس کا نام آج پاکستان ہے، مسعود سعد سلمان کے ذکر میں لکھتا ہے کہ:

۵۸- ہسٹری آف ہندی لٹریچر، میسور، ۱۹۲۰ء، ص ۸۸

۵۹- داستان تاریخ اردو، آگرہ، ۱۹۵۷ء، طبع دوم، ص ۱۳۱

۶۰- اردو شعراء کے تذکرے اور تذکرہ نگاری، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۲ء، ص ۱۷

"او را سه دیوان است ، یکے بتازی و یکے بپارسی و یکے به هندی۔"[۶۱]

حضرت امیر خسرو نے غرۃ الکمال میں اور بعض اشعار میں خود اپنے متعلق کہا ہے کہ :

" جزو چند نظم هندی نذر دوستاں کردہ است "

ترک هندوستانیم ، من هندوی گویم چو آب
شکر مصری ندارم کز عرب گویم سخن

چو من طوطی هندم از راست پرسی
زمن هندوی پرس تا نغز گویم

تقریباً سارے محققین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ خسرو نے جس زبان کو هندوی کہا ہے وہ اردو هی کا قدیم ترین نام ہے ، بعض کا یہ شبہ کہ اس سے اردو هی نہیں کوئی اور علاقائی زبان سمجھی جا سکتی ہے یوں صحیح نہیں کہ امیر خسرو خود مختلف علاقائی زبانوں سے واقف تھے، اور ان کے فرق کو سمجھتے تھے ۔ اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں انھوں نے سندھی ، لاهوری ، کشمیری ، بنگالی ، گجراتی ، گوڑی اور دھلوی هر ایک کا ذکر الگ الگ علاقائی بولی کی حیثیت سے کیا ہے۔ اگر هندی سے ان کی مراد لاهوری ، کشمیری یا کسی اور زبان سے هوتی تو وہ هندی کا لفظ الگ سے استعمال نہ کرتے ۔ اس لئے یہی کہنا پڑتا ہے کہ مسعود سعد سلمان اور امیر خسرو کے جس کلام کو هندوی کہا جاتا ہے وہ ان کے زمانے کی دوسری علاقائی زبانوں سے جدا ایک ایسی نئی زبان میں تھا جس کا حلقہ اثر کئی صوبوں تک پھیلا هوا تھا۔ یہ زبان ، لاهور، دهلی ، کشمیر اور آس پاس کے علاقوں میں بیک وقت بولی اور سمجھی جاتی، تھی اور یہی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ دور دراز علاقوں تک قدم بڑھاتی گئی۔ اور بالآخر اردو کے نام سے موسوم

۶۱ - لباب الالباب ، مرتبہ سعید ، نفیسی چاپ، تہران، ص ۳۳۴

ہوئی۔۶۲ اردو کے معنوں میں ہندی اور ہندوی کے الفاظ ایک مدت تک استعمال ہوتے رہے ، لیکن اس کا ثبوت کہیں نہیں ملتا کہ ان سے مراد کبھی وہ ہندی زبان تھی جو دیو ناگری رسم الخط میں اٹھارویں صدی کے بعد مروج کی گئی۔

البتہ ''ہندی،، کا لفظ ایک اور یعنی زبانوں کے خاص گروہ کے معنوں میں بھی استعمال کیا گیا ہے ، لیکن یہ استعمال بھی ڈیڑھ سو سال سے زیادہ پرانا نہیں ہے۔ یوں سمجھئے کہ ہندوستانی زبانوں کے جس گروہ کو گریرسن (Grierson) نے ٹرٹنری پراکرت (Tertinary Prakrits) اور ڈاکٹر سینتی کمار چٹرجی نے ہند آریائی زبانوں (Indo-Aryan Languages) کا نام دیا تھا اسے اردو لسانیات کی بحثوں میں ''ہندی،، کا نام دیا گیا۔ پھر بھی اتنی بات واضح ہے کہ اس خاص معنی میں بھی ''ہندی،، کا لفظ بطور صفت یعنی ''ہند،، بمعنی علاقہ کے تعلق ہی سے استعمال کیا گیا ہے۔ پاک و ہند کے جس علاقے میں ہند آریائی زبانیں بولی جاتی تھیں وہ ایک عریض و وسیع علاقہ تھا ۔ اس لئے گریرسن اور چٹرجی نے ان زبانوں کو پہلے اندرونی اور بیرونی کے نام سے دو شاخوں میں تقسیم کیا ، پھر انہیں مغربی ہندی اور مشرقی ہندی کے نام سے دو خاص گروہوں میں بانٹ دیا۔ یہ تقسیم اگرچہ لسانی نقطۂ نظر سے بھی درست نہیں۔۶۳ لیکن یہاں اس کی صحت و عدم صحت سے بحث نہیں ۔ کہنا صرف اس قدر ہے کہ زبانوں کی تقسیم میں بھی ہندی کا لفظ کسی خاص زبان کی نہیں ، بلکہ علاقے کی نسبت سے، زبانوں کے خاص گروہ کی نمائندگی کرتا ہے۔

ان دو معنوں کے سوا ، ''ہندی،، کا لفظ کسی مخصوص زبان کے معنی میں نظر نہیں آتا ، جیسا کہ اوپر ذکر آیا ہے۔ ایک خاص زبان کے معنی میں یہ

۶۲ - '' افکار،، ، امیر خسرو نمبر ، نومبر و دسمبر ، ۱۹۷۵ء ، ص ۱۰۶

۶۳ - '' تاریخ زبان اردو،، ، ڈاکٹر مسعود حسین خان ، حامی پبلیشنگ ہاؤس ، دھلی ، ص ۶۳ تا ص ۶۶

لفظ فورٹ ولیم کالج کے قیام اور پریم ساگر جیسی کتابوں کی اشاعت کے بعد سننے میں آیا ۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں کہ :

''جدید ہندی اس وقت تک نا معلوم تھی ، کیونکہ اس کا کوئی لٹریچر موجود نہ تھا ۔ ادبی مقاصد کے لئے اس کا استعمال فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد شروع ہوا ۔ کالج کے پروفیسروں نے للو لال جی اور دوسرے اساتذہ کی ہمت افزائی کی کہ وہ تصنیف و تالیف کا کام اسی زبان میں کریں جس میں اردو کے مصنفین کرتے ہیں، لیکن عربی و فارسی کے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ استعمال کریں ، اس طرح ایک نئے اسلوب نے جنم لیا اور ہندوؤں نے اسے اپنی خاص ضرورتوں کے عین مطابق خیال کیا ۔ عیسائی تبلیغی جماعتوں نے ، اس میں انجیل کا ترجمہ کرکے اور بھی اہمیت بڑھا دی ۔ لیکن اس نئے اسلوب کو جسے جدید ہندی کہنا چاہئے ، مقبول ہونے میں بڑی دیر لگی ۔ حقیقتاً یہ ۱۸۵۷ء کے بعد ہوا کہ ہندی کی طرف لوگوں نے توجہ کرنی شروع کی ۔ اس کو مستحکم کرنے کے لئے خاص کوششیں کی گئیں ۔ بیمز (Beams) کیلاگ (Kellog) اور بعض دوسروں نے اسی زمانے میں اس کی قواعدیں لکھیں، حتیٰ کہ صوبائی حکومتوں نے بھی لوگوں کو اردو کے استعمال سے روک دیا ۔'' ۶۴

ڈاکٹر تارا چند کی رائے بہت صحیح ہے ، فورٹ ولیم کالج سے قبل ہندی کا لفظ خاص نہیں ، عام تھا یعنی اس کا اطلاق ، برج بھاشا اور راجھستانی ، بندیلی اور اردو وغیرہ پر ہوتا تھا، اور اسی بنا پر اردو بھی ایک زمانے میں ہندی کہلاتی تھی، مگر وہ ہندی جس نے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کر دیا ، اس کی پیدائش بہت بعد کو ہوئی ہے۔ بقول مولوی عبدالحق :

''فورٹ ولیم کے منشیوں نے بیٹھے بیٹھائے بلا وجہ اور بغیر ضرورت یہ شوشہ چھوڑا ۔ للو لال جی نے ، جو اردو کے زبان دان اور اردو

۶۴ - دی پرابلم آف ہندوستانی ، الہ اباد ، ۱۹۴۴ء ، ص ۳۲ - ۳۳

کتابوں کے مصنف بھی تھے، اس کی بنا ڈالی ، وہ اس طرح کہ اردو کی بعض کتابیں لے کر انھوں نے ان میں سے عربی فارسی لفظ چن چن کر الگ نکال دئیے اور ان کی جگہ سنسکرت کے ناموس الفاظ جمادئیے اس طرح ہندی بن گئی - جدید ہندی سے جو لوگ واقف ہیں وہ سب اس پر متفق ہیں کہ اس کی ابتدا اسی طرح ہوئی -"۶۵

کچھ عرصے کے بعد جب اسی ہندی کو ہندو قومیت کی علامت بنا کر ابھارا گیا تو وہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے کا سبب بن گئی - وجہ یہ ہے کہ فورٹ ولیم کالج کی معرفت جس طرح جدید ہندی ، وجود میں آئی تھی وہ کوئی فطری یا لسانی ارتقا کا نتیجہ نہ تھا، بلکہ سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ایک سیاسی حربہ تھا - اور ہندوستان کے سارے باشندوں کو ایک قومی نظریے یا ہندو قومیت کے جال میں پھنسانے کے لئے استعمال کیا گیا تھا - یہ منصوبہ دراصل مسلمانوں کے خلاف تیار کیا گیا تھا - اور اس میں بعض وجوہ سے ہندوؤں کے ساتھ انگریز بھی برابر کے شریک تھے - بلکہ بعض کا تو یہاں تک خیال ہے کہ ہندوؤں نے انگریزوں کی سرپرستی میں اور انہی کے اشارے پر ہندی کا شاخسانہ پیدا کیا تھا - اس کا ثبوت مشہور زمانہ ماہر لسانیات گریرسن کے ان الفاظ سے ملتا ہے :

"بد قسمتی سے ، اس زمانے میں ، انگریزوں کا طاقتور اثر و رسوخ سنسکرت والوں کی طرف تھا - یہ سنسکرت آمیز ہندی بالعموم عیسائی مبلغین استعمال کرتے تھے اور انجیل کے ترجمے بھی اسی میں لکھے گئے تھے -"۶۶

موجودہ ہندی کے بارے میں دوسرے مورخین کی بھی کم و بیش یہی رائے ہے - سید ہاشمی فرید آبادی لکھتے ہیں کہ :

"ہندی یا ہندوی بہ اعتبار لغت ، ہر اس چیز کو کہیں گے جو

۶۵ - خطبات عبد الحق ، ص ۱۱۶

۶۶ - لنگوئسٹک سروے آف انڈیا ، جلد نہم، حصہ اول ، کلکتہ ، ۱۹۱۶ء

ہندوستان سے تعلق رکھتی ہو۔ زبان کے حوالے سے اس کا استعمال غزنویوں کے ابتدائی زمانے، اور البیرونی و بیہقی یعنی گیارھویں صدی عیسوی سے لے کر سراج الدین خان آرزو یعنی اٹھارویں صدی تک پایا جاتا ہے۔ مسلمانوں میں یہ لفظ ایسی مخلوط بولی کے لئے مستعمل تھا جو دھلی، پنجاب اور دوآبہ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی اور جو آخر آخر مخصوص زبان کے معنوں میں ''اردو'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ لیکن ''ہندی'' کے نام سے کسی ایسی زبان کا وجود نہیں ملتا جسے اردو کے مقابلے میں استعمال کیا گیا ہو یا جسے اردو پر برتری حاصل رہی ہو۔ جس ہندی سے اردو کا تنازع ہے اور جو پچھلی صدی کے آغاز میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے ارباب حل و عقد کے زیر اثر نمودار ہوئی ہے بالکل نئے برانڈ کی ہندی ہے۔'' ۶۷

''تاریخ ادب ہندی'' کے مصنف ایف۔ ای۔ کے (F.E. Key) کا بھی یہی خیال ہے کہ ہندی الگ سے کوئی زبان نہ تھی، یہ اردو کے مقابلے میں عربی و فارسی کو اردو سے خارج کر کے اور ان کی جگہ سنسکرت الفاظ کو داخل کرکے بنائی گئی ہے ان کے الفاظ یہ ہیں:

A literary language for Hindi speaking people which could command itself more to Hindus was very desirable and the result was obtained by taking Urdu and expelling from it words of Persian or Arabic origin and substituting for them words of Sanskrit or Hindi origin.[68]

جدید ہندی کے متعلق اس طرح کا اظہار خیال نیا نہیں ہے، انیسویں صدی کے مورخین کے یہاں بھی اسی قسم کے بیانات ملتے ہیں۔ آر۔ ڈبلو۔ فریزر (R. W. Frazer) نے لکھا ہے:

۶۷۔ اے ہسٹری آف فریڈم مووومنٹ، جلد سوم، حصہ دوم، کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۳۵۱

۶۸۔ اے ہسٹری آف ہندی لٹریچر، میسور، ۱۹۲۰ء، ص ۸۸

"High Hindi is purely a book language evolved under the influence of the English who induced native writers to compose works for general use in a form of Hindustani in which all the words of Arabic and Persian origin were omitted, Sanskrit words being employed in its place."[69]

اس سے انکار نہیں کہ فورٹ ولیم کالج سے باھر رہ کر بھی بعض مصنفین نے بعض کہانیاں ایسی زبان میں لکھی تھیں جن میں عربی و فارسی الفاظ سے شعوری طور پر احتراز کیا گیا تھا - مثال کے طور پر ''رانی کیتکی کی کہانی،، پیش کی جاتی ھے - اردو کے مشہور شاعر، انشا اللہ خان انشا نے، جن کی ''دریائے لطافت،، اردو زبان و قواعد کے سلسلے کی پہلی اھم تصنیف خیال کی جاتی ھے - اپنے کمال زباندانی کے اظہار کے لئے مزاحیہ موڈ میں، یہ مختصر سی کہانی لکھی تھی - اس سے ان کا مقصود، جیسا کہ خود دیباچے میں بیان کر دیا ھے تفریح طبع اور لسانی کرتب دکھانے کے سوا کچھ اور نہ تھا - اس طرح کے تجربے انھوں نے اور بھی کئے تھے - بعض ایسی کہانیاں لکھی تھیں جن میں صرف غیر منقوطہ حروف استعمال کئے گئے تھے اس کی ایک مثال ''سلک گوھر،، ھے البتہ للو لال جی اور ان کے ساتھیوں نے فورٹ ولیم کالج کے اندر جس نوع کے تجربے کئے وہ انشا اللہ خان انشا کی تحریروں سے بالکل مختلف تھے - للو لال جی کا صریح مقصد اردو کے مقابلے میں ھندی کے نام سے ایک ایسی زبان کو جنم دینا تھا جس میں عربی و فارسی کے آسان اور مقبول عام الفاظ کی جگہ سنسکرت کے نئے اور غیر مانوس الفاظ شامل ھوں - چنانچہ انھوں نے ''پریم ساگر،، کے نام سے جو کتاب لکھی وہ اسی خاص طرز کی زبان میں ھے - گریرسن نے اپنے لسانیاتی جائزے میں، جس کا حوالہ کسی جگہ اس سے پہلے آچکا ھے، پریم ساگر کا ذکر کرتے ھوئے لکھا ھے کہ عملاً یہ اردو زبان میں ھے صرف یہ کہ جہاں ایک عام مصنف اردو کے الفاظ استعمال کرتا، وھاں ان کی جگہ للو لال جی نے سنسکرت کے الفاظ رکھ دئے ھیں - اس کا مقصد ھندوؤں کے لئے ایک مشترک زبان مہیا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ھے -

۶۹ - اے لٹریری ھسٹری آف انڈیا، لندن، ۱۸۹۳ ء، ص ۲۶۵

للو لال جی ، اردو ، جدید هندی اور برج بھاشا تینوں زبانوں میں لکھتے تھے - برج بھاشا کی کئی کہانیوں کو انھوں نے هندی اور اردو میں منتقل کیا ھے - ان میں صرف ''پریم ساگر،، حقیقتاً جدید هندی میں ھے ، اس کتاب کو بعض حلقوں کی طرف سے اتنی شہرت و اهمیت دی گئی که یه جدید هندی کی پیدائش و ارتقا کے سلسلے کی پہلی کڑی قرار پائی - للو لال جی نے کالج سے سبکدوش ہونے کے بعد ، کلکتے میں اپنا ایک ذاتی چھاپه خانه قائم کیا - بعد کو یه چھاپه خانه ، آگرے منتقل هو گیا اور اس میں جدید هندی کی کتابوں کی اشاعت کا خاص اهتمام کیا گیا - عیسائی پادریوں نے ''پریم ساگر،، کی زبان سے خاص طور پر دلچسپی کا اظهار کیا - چنانچه اس زمانے میں تبلیغی ضرورت کے تحت پادریوں نے اپنے مذهب کے اصولوں کے جو تراجم شائع کئے وہ بالعموم مروجه اردو میں نہیں بلکه للو لال جی کی هندی میں تھے ، یعنی ان میں عربی و فارسی الفاظ کے بجائے دانسته سنسکرت کے الفاظ شامل کئے گئے -۰۷

اس جگه ایک اور مغالطے کو دور کرنا ضروری معلوم هوتا ھے - بعض هندو مصنفین موجوده هندی کی قدامت ثابت کرنے کے لئے اس کا رشته ، برج بھاشا سے جوڑ دیتے ھیں یه صحیح نہیں ھے - برج بھاشا جیسا که خود للو لال جی کی کتابوں سے ظاهر ھے ، اردو اور هندی سے الگ ایک زبان تھی - اردو نے، اور بعد کو موجوده هندی نے، یقیناً اس سے اثر قبول کیا ھے، لیکن برج بھاشا کی ادبی قدامت بھی دهلی میں مسلمانوں کے قدم جمانے یعنی۱۱۹۲ء سے آگے نہیں بڑھتی - علاوہ ازیں برج بھاشا کا ادبی دائره صرف شاعری تک محدود تھا - یه شاعری بھی، جس کی تاریخ میں سور داس، کبیر داس، ملک محمد جائسی ، تلسی داس ، عبدالرحیم خانخاناں اور بھوشن وغیره کے نام

۷۰ - '' هندی ادب کی تاریخ ،، ، ڈاکٹر محمد حسن، انجمن ترقی اردو، علیگڑھ، ۱۹۵۵ء، ص ۱۷۰

ملتے ھیں، مسلمان حکمرانوں کے عہد میں پروان چڑھی تھی-۷۱ برج میں نثری ادب اس وقت تک ناپید تھا اس لئے جدید ھندی نثر کا ناطه، قدیم برج بھاشا سے جوڑنا کسی طرح درست نہیں ھو سکتا۔ ھندی اور اس کی نثر نے انیسویں صدی کے شروع میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جنم لیا ھے اور اس کی ترویج و ترقی میں ھندو اور انگریز ایک دوسرے کے ساتھ سیاسی سازش کے طور پر، برابر کے شریک رھے ھیں۔ ڈاکٹر تارا چند نے بہت صحیح لکھا ھے کہ:

At Fort William College, Calcutta, which was established to teach British Officers, Indian Languages, besides other subjects, a number of them were taken up for study. Among them were Braj + Urdu. Braj, as has been indicated above was the language of poetry and did not lend itself readily for the purposes of prose. Urdu, which was studied by both Hindus and Muslims, was naturally selected as the common language of India. Unfortunately the Zeal of finding distincations led the professors of the college to encourage attempts to create a new type of Urdu from which all Persian and Arabic words were removed and replaced by Sanskrit words. This was done ostensibly to provide the Hindus with a language of their own. But the step had far-reaching consequences and India is still suffering from this artificial bifurcation of tongues.[72]

جے۔ داس گپتا نے ھندوستان کے موجودہ لسانی و قومی مسائل پر بحث کرتے ھوئے اپنی کتاب کے ایک باب میں بطور پس منظر، تقسیم ھند سے پہلے کے لسانی اختلافات یعنی اردو ھندی تنازع سے بھی بحث کی ھے، اس میں انھوں نے ھندی کی قدامت ثابت کرنے کے لئے اگرچه، برج بھاشا اور اردو کے سارے ادب کو بھی ھندی ھی میں شمار کر لیا ھے، تاھم موجودہ یا جدید

۷۱- تفصیل کے لئے دیکھیے ماھنامه نگار (ھندی شاعری نمبر)، مرتبه علامه نیاز فتح پوری، لکھنو، ۱۹۳۶ء، کراچی، ۱۹۶۲ء

۷۲- دی پرابلم آف ھندوستانی، اله اباد، ۱۹۴۴ء، ص ۵۷-۵۸

ہندی کے بارے میں انھیں بھی اعتراف ہے کہ وہ مسلمانوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کے ساتھ ساتھ وجود میں آئی ہے ، اور اردو ہندی کا تنازع وہیں سے پیدا ہوا ہے۔ خود انہیں کے لفظوں میں :

The decline of Muslim rule in India and the advent of British rule were accompanied by a corresponding decline of Persianized Urdu. During the early years of the foundation of British rule, Dr. J. B. Gilchrist of Fort William at Calcutta engaged a group of writers to write Hindustani prose. This form of prose was channelled into two distinctly different styles: Hindi, purged as far as possible of Persian words and Urdu, remaining as close as possible to Persianized style. From this time onward, the difference between Hindi and Urdu became increasingly sharper.[73]

ہندی زبان کی ایجاد و فروغ کے بارے میں اسی قسم کی رائیں دوسرے مصنفین کی بھی ہیں۔ علامہ سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ :

''ہندو اٹھارویں صدی کے آخر میں جس وقت مسلمانوں کی سلطنت کے دباؤ سے آزاد ہو چکے تو ان میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اب انھیں اسلامی اثر کی ہر چیز سے آزاد ہونا چاہئے ، اس بنا پر ، انگریزوں کی وہ حکمت عملی، جس کی بنیاد 'لڑاؤ اور حکومت کرو' پر رکھی گئی تھی بہت کارگر ثابت ہوئی، اور سب سے پہلے اس کا اثر زبان کے معاملے میں ظاہر ہوا۔ ہندی کے نام سے ایک نئی زبان کی تبلیغ شروع کر دی گئی ۔[۷۴]

پنڈت کرشن پرشاد کول کے مطابق :

''اٹھارویں صدی کے آخر میں انگریزی حکومت کی مصلحتوں نے فورٹ ولیم کالج میں پہلے پہل نئی ہندی کی بنیاد اس طرح ڈلوائی

۷۳۔ لینگوئج کان فلکٹ اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ ، کیلی فورنیا ، ۱۹۷۰ء ، ص ۵۲

۷۴۔ نقوش سلیمانی ، ص ۶۸

کہ للو لال جی سے ''پریم ساگر''، ایسی ہندی زبان میں لکھوائی جس کا تعلق اردو ہی سے تھا نہ برج بھاشا سے، بلکہ کھڑی بولی اور ہندوستانی سے تھا۔ فرق یوں پیدا کیا گیا کہ اس میں سنسکرت کے الفاظ کثرت سے داخل کئے گئے اور یہ قرار دیا گیا کہ جس زبان میں فارسی اور عربی الفاظ، کثرت سے ہوں وہ اردو ہے اور مسلمانوں کی زبان ہے۔ بنیاد تو نئی ہندی کی اس طرح پڑ گئی لیکن بہت عرصے تک یہ پنپی نہیں۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد اس نئی ہندی میں کتابیں لکھی جانی شروع ہوئیں، اور جوں جوں ہندو اور مسلمانوں میں قومی اور سیاسی اختلاف بڑھتا گیا، نئی ہندی اسی جوش میں ابھرتی گئی۔ فارسی اور عربی کے وہ الفاظ جو زبان کے روز مرہ میں داخل ہو گئے تھے نکالے جانے لگے، اور ان کی جگہ سنسکرت کے بھاری بھاری الفاظ داخل کئے جانے لگے۔'' ۵۷

پنڈت کرشن پرشاد کول کا بیان درست ہے، لیکن یہ کہنا کہ جوں جوں ہندو اور مسلمانوں میں سیاسی اختلاف بڑھتا گیا، ہندی والوں کا جوش بھی بڑھتا گیا، زیادہ صحیح نہیں ہے۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ جیسے جیسے ہندوؤں میں نئی قومیت کے جوش میں ہندی کا جوش بڑھتا گیا، ویسے ویسے ہندو اور مسلمانوں میں سیاسی اختلاف بھی بڑھتا گیا۔ مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ:

''انگریزی تسلط کے بعد، بعض اسباب کی بنا پر ہندی والوں کو ایک نئی قومیت کی سوجھی، جس کی بنیاد قدیم تہذیب اور قدیم مذہب اور زبان پر تھی۔ اس نئی قومیت کے لئے نئی زبان کی ضرورت داعی ہوئی، کیونکہ قومیت کا رشتہ زبان ہی سے مضبوط ہوتا ہے۔ اب انہوں نے ان علاقوں میں جہاں ہندی بولیاں رائج تھیں ایک مصنوعی ہندی کو داخل کرنا شروع کیا، اور اردو کو وہاں سے نکالنا شروع کیا۔ اس چیز نے ہندو مسلم اتحاد میں ہمیشہ کے لئے رخنہ

۵۷۔ ادبی و قومی تذکرے، انجمن ترقی اردو، علیگڑھ، ۱۹۵۱ء، ص ۱۴-۱۵

ڈال دیا اور دونوں کا سیاسی نقطۂ نظر ایسا بدلا کہ ہندو مسلمان پھر کبھی کسی مسئلے پر متفق نہ ہو سکے۔،،۷۶

اوپر کے مباحث کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ موجودہ ہندی، کوئی قدیم زبان نہیں ہے، اس کو جنم دینے اور اس کی تبلیغ و ترقی کا کام، ایشیاٹک سوسائٹی، بنگال اور فورٹ ولیم کالج، کلکتہ سے شروع ہوا، اور پھر یہ کام انگریزوں کی تعلیمی و لسانی پالیسیوں (جن کی بنا بہر حال سیاسی مقاصد پر رکھی جاتی تھی) کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا گیا۔ ۱۸۳۷ء میں جب فارسی کی جگہ اردو کو سرکاری زبان قرار دیا گیا، اور ۱۸۳۹ء میں جب صدر عدالت دیوانی اور نظامت میں بھی اسے سرکاری حیثیت حاصل ہو گئی، تو بظاہر انگریزی حکومت کا یہ اقدام اردو کے حق میں تھا، لیکن اس تبدیلی سے انگریزوں کی نظر بڑے دور رس نتائج پر تھی، اور یہ نتائج سراسر حکومت کے مفاد میں تھے۔ فارسی کو ختم کر کے انگریزوں نے بڑی خوش اسلوبی سے اس مضبوط و قدیم ثقافتی رشتے کو کاٹ دیا جس میں ہندوستان کے سارے مسلمان، خواہ وہ کسی صوبے اور علاقے کے رہنے والے ہوں، بندھے ہوئے تھے، اور جو مسلمانوں کے حق میں سماجی، سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور علمی و ادبی ہر لحاظ سے، زیادہ مفید و کار آمد تھا۔ اردو کی مقبولیت اور جامعیت کے سبب، اسے کچھ عرصے کے لئے انگریزوں نے فارسی کی جگہ رائج تو کر دیا، لیکن اس تبدیلی سے انھیں دھرا فائدہ پہنچا۔ ایک تو یہ کہ انھیں مسلمانوں کی ثقافتی و سماجی شیرازہ بندی کو کمزور کرنے میں آسانی ہو گئی، دوسرے یہ کہ عوام سے رابطہ قائم کرنے اور اس طرح اپنی حکومت کی جڑوں کو مضبوط کرنے کا انھیں موقع مل گیا۔ علاوہ ازیں ۱۸۳۷ء اور ۱۸۳۹ء میں فارسی کی جگہ اردو کو رواج دینے کے سلسلے میں جو احکامات جاری کئے گئے تھے، ان میں ایسی شقیں بھی موجود تھیں جن کی آڑ لے کر، انگریز اپنے مقبوضہ علاقوں میں کسی بھی دیسی زبان کو رائج کر سکتے

۷۶۔ خطبات عبد الحق، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۵۲ء، ص ۲۴۵

تھے۔ ۷۷ چنانچہ آگے چل کر، انگریزوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور مختلف صوبوں میں مختلف زبانوں کو فروغ دے کر مسلمانوں کے اس ثقافتی اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی جو فارسی کے سبب قائم تھا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ یہ کام اردو کو سرکاری زبان بنانے کے ساتھ ساتھ شروع کر دیا گیا تھا، اس لئے کہ ۱۸۳۳ء میں جو تعلیمی کمیٹی لارڈ میکالے کی سربراہی میں قائم کی گئی تھی اس نے ۱۸۳۵ء میں انگریزی کو ہر سطح پر ذریعۂ تعلیم قرار دینے کے ساتھ ہی، انگریزی تعلیم کی غرض و غایت بھی ان الفاظ میں واضح کر دی تھی کہ:

"ہمارا مقصد بہر طور ایک ایسا اقلیتی طبقہ پیدا کرنا ھے جو ہمارے اور کروڑوں کی اس مخلوق کے درمیان، جس پر ہم حکمران ھیں، ترجمان بن جائے۔ ایسے لوگوں کا طبقہ جو نسل و رنگ کے لحاظ سے ھندوستانی، مگر اپنے رجحانات، خیالات، اخلاق اور فکر کے لحاظ سے انگریز ھو۔" ۷۸

لیکن پروفیسر حمید خان نے انگریزوں کی اس تعلیمی حکمت عملی کو ۱۸۳۵ء سے بھی پرانی بتایا ھے، انھوں نے لکھا ھے کہ:

"یہ خیال کہ اھل پاکستان و ھند اپنے قدیم علوم سے قطع نظر کرلیں، صرف یورپی علوم پڑھیں اور ذریعہ تعلیم انگریزی ھو، اس کا پہلا تحریری سراغ ۱۸۲۴ء کے ایک سرکاری مراسلے میں ملتا ھے۔ ۱۸۳۵ء میں میکالے کی مشہور سرکاری قرار داد نے اس نئی تجویز کو قطعی صورت دے دی۔" ۷۹

۷۷۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی، سید مصطفیٰ علی بریلوی، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۷۹ - ۸۱

۷۸۔ بیسک ڈاکومنٹ، کرسٹائن ڈوبن، لندن، ۱۹۷۰ء، ص ۱۸

۷۹۔ تعلیم و تہذیب، مجلس ترقی ادب، لاھور، ۱۹۷۵ء، ص ۷۷

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فارسی کو ختم کرنے اور اس کی جگہ اردو کو عارضی طور پر سرکاری زبان بنانے کا اصل مقصد، اردو کو یا مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا نہ تھا، بلکہ اس طرح انگریزی اور بعض دوسری زبانوں، مثلاً ہندی کو فارسی اور اردو کے مقابلے میں آگے بڑھانا تھا، ایچ - ایم - متین کے نزدیک فارسی کا ہٹانا، زبان کے سلسلے میں انگریزوں کی پہلی سازش تھی - اس سازش کا مقصد ملک میں زیادہ سے زیادہ زبانوں اور بولیوں کو ابھار کر ان کے بولنے والوں میں انتشار کی راہ ہموار کرنی تھی - ۸۰

اب ان حقائق کی روشنی میں کسی کا یہ دعوی کہ موجودہ ہندی اردو سے قدیم تر زبان ہے، یا یہ کہ اردو بدیسی زبان ہے اور اس کا ہندوستان سے نہیں عرب و ایران سے تعلق ہے، یا یہ کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور ہندوؤں یا ہندوستان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، کسی طرح بھی درست نہیں سمجھا جا سکتا - اصل واقعہ یہ ہے کہ جیسے جیسے ہندو قومیت کے احیا کی تحریک آگے بڑھی اور جیسے جیسے ہندو رہنما، مسلمانوں کے خلاف اپنا سیاسی محاذ مضبوط تر بناتے گئے، اسی نسبت سے، ہندی زبان کی تبلیغ و ترقی کا کام بھی آگے بڑھتا گیا، اور ایک وقت وہ آیا کہ کانگریس کے ممتاز ترین لیڈروں اور بعض ممتازہندو اسکالروں نے بھی، اردو کو بدیسی اور مسلمانوں کی زبان قرار دے کر، ہندی کو قومی زبان کے سلسلے میں ترجیح دینا شروع کردیا - پروفیسر امرناتھ جھا نے لکھا:

''صرف ہندی زبان ایسی ہے جسے ہندوستان کی قومی زبان بننے کا اعزاز ملنا چاہیے، یہ سنسکرت سے ماخوذ ہے، اس کا ملک سے جذباتی رشتہ ہے، ملکی ثقافت اس کے رگ رگ میں رچی بسی ہے، اور ملک کی ساری اہم زبانوں سے اس کا گہرا تعلق ہے - ''۸۱

۸۰ - نیشنل لینگوئج آف پاکستان، کراچی، ۱۹۵۴ء، ص ۲۱۱-۲۱۳-۲۲۹

۸۱ - لیڈر، ۲۳ مارچ ۱۹۴۲ء، بحوالہ دی پرابلم آف ہندوستانی، ص ۱۰۹،

یہاں ''ھندی،، کے بارے میں پہلا دعوی یہ کیا گیا ھے کہ وہ سنسکرت سے ماخوذ ھے ۔ تاریخ اور لسانیات کی روشنی میں یہ دعوی بے بنیاد ھے، ھندی جیسا کہ اوپر تفصیل دی جا چکی ھے ایک طرح کی اردو ھی ھے۔ اور اس کا ماخذ سنسکرت نہیں بلکہ وہ اب بھرنشیں یا قدیم بولیاں ھیں جن سے خود اردو ماخوذ ھے ۔ سنسکرت الفاظ کو اردو میں داخل کرنے کا معاملہ بہت بعد کا ھے اور اس کا تعلق لسانی حقائق سے نہیں صرف سیاسی چالوں اور متعصبانہ کارروائیوں سے ھے ۔

دوسری بات پروفیسر جھا نے یہ کہی ھے کہ ھندی مقامی ثقافت کی وارث و ترجمان ھے، اور آخر میں یہ کہا ھے کہ ھندی کا ھندوستان کی دوسری بڑی زبانوں سے گہرا رشتہ ھے ۔ ان میں سے کوئی خصوصیت ایسی نہیں جس کا اطلاق اردو پر نہ ھوتا ھو، بلکہ سچ یہ ھے کہ یہ اردو ھی کی خصوصیات ھیں جنھیں پروفیسر جھا نے جدید ھندی پر منطبق کر دیا ھے ۔ ھندی کے بارے میں اس طرح کے دعوے بالکل بے دلیل اور کمزور ھیں ۔ ھندی، نہ صرف یہ کہ ادبی سرمایے، بلکہ عوامی مقبولیت، مقامی تہذیبوں کی نمائندگی، اور حلقۂ اثر کی وسعت کے لحاظ سے بھی اردو کے مقابلے میں بہت کمتر درجے کی زبان ھے، اور قدامت کے لحاظ سے تو وہ اردو سے بہت ھی کم عمر ھے ۔ اس لئے کہ ھندی نے ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ یا اس کے کچھ بعد جنم لیا ھے، اس کے برعکس اردو ایک پختہ زبان کی حیثیت سے کم و بیش چار سو سال پرانی ھے ۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ھیں کہ :

> Some recent Hindi writers have protested against this account of the origin of Modern Hindi, but so far as I can see their protests do not seem to hold much water. It appears to me that a dispassionate study of the origin — growth of Modern Hindi—can lead only one conclusion namely that the language is only 135 years old and perhaps not even that.[82]

۸۲ - دی پرابلم آف ھندوستانی، ص ۸۸

جب اردو اور ہندی کی قدامت اور ان کی لسانی و ادبی اہمیت کے متعلق حقائق اس طور پر ہوں جیسے کہ اوپر بیان کئے گئے ہیں، تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو کے مقابلے میں ہندی کیوں ایجاد کی گئی؟ اسے اردو سے قدیم تر اور جامع زبان کہہ کر، کیوں برصغیر پاک و ہند کی قومی زبان بنانے کا منصوبہ بنایا گیا؟ اردو پر بدیسی یا صرف مسلمانوں کی زبان ہونے کی تہمت کیوں لگائی گئی، اور اردو کے رسم الخط کو بدل کر دیو ناگری کو رواج دینے کی کوشش کیوں کی گئی، ان سب باتوں کا جواب تفصیل سے آئندہ ابواب میں آئے گا۔

هندی اردو تنازع کا تاریخی پس منظر

اردو، نتیجہ ہے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد و قیام کا اور اس آمد و قیام کی تاریخ نئی نہیں خاصی پرانی ہے۔ پروفیسر آرنلڈ کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی میں چند مسلمان جنہیں موپلا قوم اپنا بزرگ مانتی ہے عراق سے آئے اور جنوبی ہند کے ساحلوں پر آباد ہو گئے۔ گرم مسالوں، ہاتھی دانت اور جواہرات وغیرہ کی تجارت سینکڑوں برس سے ہندوستان اور یورپ کے درمیان عربوں اور ایرانیوں کے توسل سے جاری تھی۔ اس لئے اسلام کا اثر بھی جنوبی ہند کے مغربی ساحلوں پر پہنچتا رہا۔ باہر مسلمانوں کی کثرت آمد و رفت سے مغربی ساحل کے تجارتی شہروں کی آبادی خلط ملط ہو گئی اور اکثر لوگ آدھے ہندو، آدھے عرب اور آدھے ایرانی ہو گئے۔ مسلمان تاجروں اور ہندو راجاؤں میں تعلقات بڑھتے گئے۔ والیان ملک نے تجارت کا بازار گرم رکھنے کے خیال سے اور ملک کی ترقی کو جو مسلمان سوداگروں کی بود و باش کا نتیجہ تھی مد نظر رکھ کر، مسلمانوں کو اپنی حفاظت میں لے لیا اور ان کی دعوت اسلام میں کوئی مزاحمت نہ کی۔[۱] نتیجتاً مسلمانوں کی آبادی تیزی سے بڑھتی رہی، تھوڑے ہی دنوں میں مالا بار کے ساحلوں پر جا بجا مسلمانوں کی بستیاں نظر آنے لگیں۔ بمبئی کے آس پاس کے ضلعوں میں مسلمان عالموں کے مرکز اور اسلامی مدرسے قائم ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر تارا چند کا بیان ہے کہ ''منگلور میں مسلمانوں کی آبادی چار ہزار تھی جن میں فارس

۱۔ ''دعوت اسلام''، (پریچنگ آف اسلام کا اردو ترجمہ) محمد عنایت اللہ دھلوی، مسعود پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۴ء، ص ۲۱۴

اور یمن کے تاجر بھی تھے ۔ ان کی مسجد کا ایک بیت‌المال بھی تھا اور مسجد میں کافی تعداد میں طلبہ تھے قریب کے دوسرے مقامات پر بھی مسلمانوں کے محلے آباد تھے اور ہر محلے میں مسجد تھی ۔ کالی کٹ (Calicat) میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد مستقل باشندوں کی حیثیت سے رہتی تھی ، انھوں نے دو جامع مسجدیں بھی بنالی تھیں جن میں جمعہ کی نماز ہوتی تھی ۔ کالی کٹ کا راجہ ہندو تھا لیکن سوداگروں اور تاجروں کا سربراہ ابراھیم شاہ بندر نامی ایک مسلمان تھا ۔ کولم (Colam) میں بھی بہت سے مسلمان تاجر آباد تھے اور کئی مسجدیں تھیں ، ایک جامع مسجد تعمیر کے لحاظ سے لائق تحسین تھی ۔ یہاں کا راجہ مسلمانوں کا احترام کرتا تھا ۔''[۲] اس لئے یہ خیال کہ اسلام کا اثر ہندوستان پر بزور شمشیر قائم کیا گیا یا یہ کہ مسلمانوں نے اھل ہند کو جبراً مسلمان بنایا کسی طرح درست نہیں ھے ۔ انھوں نے تلوار کے زور سے نہیں عموماً اپنے حسن کردار اور کاروباری مہارت اور تجارت کے ذریعے مقامی باشندوں کو اپنا گرویدہ بنایا تھا ۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی فتوحات اور حاکمیت کا باقاعدہ سلسلہ ۷۱۲ء سے سندھ پر محمد بن قاسم کے حملے کے بعد شروع ہوتا ھے ۔ بقول علامہ نیاز فتح پوری بجز اس امر کے کہ صحرا و ریگستان ہونے کے لحاظ سے ، سندھ و عرب میں آب و ہوا کا اشتراک پایا جاتا ھے اور کوئی بات ایسی نہ تھی جو ان دونوں کے باشندوں کو ایک دوسرے سے ملا دیتی ۔ اگر فتح مند عرب چاہتے تو مقامی باشندوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیتے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا بلکہ ملک کا سارا انتظام جو عربوں کے حملے سے قبل پایا جاتا تھا اسی طرح قائم رہنے دیا اور ایک آدمی کو بھی اپنی جگہ سے نہیں ہٹایا ۔ جب راجہ داھر قتل ہوا تو محمد بن قاسم نے اس کے وزیر کو اپنے عہدے پر بحال رکھا تا کہ جو حقوق رعایا کو پہلے سے حاصل تھے ان کی حفاظت کرے ۔ ٹیکس وصول کرنے کے

۲ ۔ '' تمدن ہند پر اسلامی اثرات ،، (انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر کا اردو ترجمہ) محمد مسعود احمد ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹٦۴ء ، ص ٦٦

لئے صرف سندھی برھمنوں کو مامور کیا اور ایک عرب کو بھی یہ خدمت سپرد نہیں کی گئی - تجارت کے متعلق بھی عربوں نے بہت وسعت نظر سے کام لیا - سندھ اس سے قبل بھی تجارتی ملک تھا لیکن عربوں نے تجارت کو بہت ترقی دی - خراسان اور سندھ کے درمیان کابل کے راستوں سے تجارتی قافلوں کی آمد و رفت شروع ھو گئی - مذھبی معاملات میں بھی حد درجہ نرمی کا طرز عمل اختیار کیا گیا۔ مقامی لوگوں کو عام اجازت دی گئی کہ وہ اپنے مندروں کی مرمت کرائیں اور آزادی سے پرستش کریں - مسلمانوں کے حملے سے قبل سندھ میں جو معاشرتی قوانین رائج تھے ان میں بھی کوئی مداخلت نہیں کی گئی - ہر چند کہ سندھ میں بھی اسلامی قانون رائج کیا گیا اور قاضی مقرر کئے گئے تا کہ وہ شرع کے مطابق معاملات کو طے کریں لیکن ھندوؤں کو مجبور نہیں کیا گیا کہ وہ بھی اسلامی قوانین کو تسلیم کریں - وہ اپنے تمام معاملات و مسائل جن کا تعلق حکومت سے نہ ھوتا تھا پنچایت کے ذریعے طے کرنے کے مجاز تھے -۳

حسن اخلاق اور حسن انتظام کا یہ طرز عمل صرف محمد بن قاسم تک محدود نہ تھا بعد کے فاتحین نے بھی ان روایات کو برقرار رکھا - اس لحاظ سے ھندوستان پر مسلمانوں کی حکمرانی ، جبر و تشدد کی نہیں ، خیرو برکت کی پیغامبر تھی۔ انھوں نے اگرچہ ایک ھزار سال تک حکومت کی اور دھلی و آگرہ کے گرد و نواح میں ان کے مرکز قائم رھے پھر بھی ان علاقوں میں مسلمانوں کی آبادی چودہ فی صد سے آگے نہ بڑھ سکی - اصل سبب یہی تھا کہ مسلمانوں نے اشاعت مذھب کے سلسلے میں کبھی کسی قسم کی سخت گیری سے کام نہیں لیا - علاوہ ازیں تبلیغ اسلام کے سلسلے میں جو کام بھی ھوا وہ حاکموں نے نہیں صوفیائے کرام نے کیا۔ اور وہ بھی اس طرح کہ انھوں نے اپنے کردار اور اپنے اقوال و اطوار سے مقامی باشندوں کے دل جیت لئے بعض علاقوں مثلاً بنگال ، پنجاب اور سندھ کے صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی یقیناً قدرے تیزی

۳ - نگار، لکھنو ”جوبلی نمبر“ ، بابت جنوری ، فروری ۱۹۴۸ء ، ص ۵ تا ۳۷

سے بڑھی، اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ ان علاقوں میں ، مسلمان صوفیوں نے زیادہ وقت صرف کیا ، دوسرے یہ کہ ان علاقوں میں عام طور سے نیچ ذات کے ہندو یا بدھ آباد تھے جو کہ برھمنیت کے ھاتھوں پہلے ھی سے بیزار تھے۔ چنانچہ مسلمانوں کے مذھب نے جب عملاً یہ ثابت کیا کہ اس میں ذات پات کی تفریق نہیں ھے۔ تمدنی زندگی میں سب کو برابر کے حقوق حاصل ھیں اور سب کو مسجد میں جانے اور عبادت کرنے کی اجازت ھے تو ان کے دل خود بخود اسلام کی حقانیت کی طرف کھنچنے لگے۔ لوگ ، جوق در جوق ، دائرۂ اسلام میں داخل ھونے لگے لیکن صرف اس لیئے کہ برھمنی راج اور ان کی مذھبی سخت گیری سے نجات ملتی تھی۔ رام گوپال کے الفاظ میں :

”ھندوستان کی مسلم آبادی میں بہت بڑی تعداد ، ان نو مسلموں کی ھے یا ان کے خاندان کے لوگوں کی ، جو مسلمانوں کی تبلیغی سرگرمیوں کے زیر اثر دائرۂ اسلام میں داخل ھوئے تھے۔ یہ لوگ ، ھندوؤں کے ان نچلے طبقوں سے تعلق رکھتے تھے ، جنھیں ، اسلام کے طفیل ، آن کی آن میں سماجی زندگی میں مساوات کے ایسے حقوق حاصل ھوگئے تھے جن سے انھیں برھمنیت نے ایک مدت سے محروم کر رکھا تھا۔ “۴

مسلمانوں نے صرف یہی نہیں کہ ھندوستان کے سارے طبقوں کو ایک نظر سے دیکھا اور سب کو اسلامی مساوات کی بنیادوں پر سماجی حقوق دیئے بلکہ انھوں نے اپنے آبائی وطنوں کو خیر باد کہہ کر ، ھندوستان ھی کو اپنا وطن جانا۔ یہیں شادی بیاہ کرنا اور سرجانا پسند کیا۔ یہیں کمایا یہیں لگایا اور یہیں کی طرز ماند و بود کو قبول کر لیا۔ انگریزوں کی طرح ھندوستان کی دولت نہ تو انھوں نے ایران و توران بھیجی نہ انگلستان۔ بلکہ جو کچھ بچایا ، وہ ھندوستان ھی کی ترقی پر صرف کیا۔ یہی نہیں ، رعیت کی دلجوئی کی خاطر ، انھوں نے بعض ایسے تمدنی شعائر اختیار کر لئے جو ان کے عقائد اور مذھب کے

۴۔ انڈین مسلمس ، ایشیا پبلشنگ ھاؤس ، بمبئی ، ۱۹۵۹ء ، ص ۱

خلاف تھے اس کشادہ قلبی اور رواداری کے نتیجے میں ایک نئے تمدن نے جنم لیا اور اس کو ہندو مسلم یا ہند اسلامی تمدن کا نام دیا گیا۔٥ محمود غزنوی سے لے کر عہد تغلق تک مسلمانوں نے سیاسی حکمت میں، نظام حکومت، جنگی محاذ، اور علم و فن، سب میں ہندوؤں کو برابر کا شریک رکھا اور اختلاف مذہب کی بنا پر کسی کے ساتھ کوئی مغائرت نہیں برتی۔٦

مغلوں کا دور تو عملاً ہندوؤں کا دور تھا۔ مغل سلاطین کے درباروں سے کئی ہندو راجہ وابستہ تھے اور سفر و حضر میں بادشاہ کے ساتھ رہتے تھے۔ مغل حکمرانوں کا سلوک، ہندو امرا سے بالکل ایسا ہی تھا جیسا مسلمان امرا سے۔ ہندوؤں کو فوج میں بھی وہی مقام حاصل تھا جو مسلمانوں کو۔ عہدوں اور منصبوں کی تقسیم میں رنگ و نسل یا مذہب کو دخل نہ ہوتا تھا۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب عالمگیر جس کے عہد حکومت کو بعض ہندو اور انگریز مورخین نے حد درجہ مطعون کیا ہے، غیر مسلموں کے ساتھ حد درجہ منصفانہ برتاؤ کرتا تھا۔ پروفیسر آرنالڈ نے اس کے عادلانہ عہد حکومت کے ثبوت میں ایک تاریخی واقعہ اس طور پر بیان کیا ہے:

"عالمگیر کو کسی نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہ تقسیم کرنے پر مقرر تھے، برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور ان کی جگہ کسی مسلمان کو مقرر کیا جائے۔ کیوں کہ

٥۔ "تمدن ہند پر اسلامی اثرات"، ڈاکٹر تارا چند، ترجمہ محمد مسعود احمد، مجلس ترقی ادب، لاہور، ١٩٦٤ء، ص ٢٢٦

٦۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

(الف) ہندوستان کے عہد وسطی کی ایک جھلک، از صباح الدین عبدالرحمن، اعظم گڑھ

(ب) برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، ١٩٦٧ء

قرآن شریف میں آیا ہے ''اے ایمان والو میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت جانو۔''

عالمگیر نے عرضی پر حکم لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے اور نہ ان معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے۔ جو آیت عرضی نویس نے نقل کی ہے اگر یہی حکومت کا دستورالعمل ہوتا تو ہم کو چاہئے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور ان کی رعیت کو غارت کر دیتے مگر یہ کس طرح ہو سکتا ہے۔ بادشاہی نوکریاں لوگوں کو ان کی لیاقت اور قابلیت کے موافق ملیں گی اور کسی لحاظ سے نہیں مل سکتیں۔ ٧ بیشتر مسلمان حکمرانوں کی اس رواداری اور منصفانہ طرز عمل کا یہ نتیجہ ہوا کہ مقامی باشندوں میں سے بہتوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کر لیا اور جنھوں نے ایسا نہیں کیا وہ بھی بغیر کسی امتیاز کے ہر قسم کی مراعات اور جملہ شہری حقوق کے مستحق ٹھہرے۔ چنانچہ مسلمان بادشاہوں کے اس نرم اور انصاف پر مبنی رویے اور وسیع النظر انداز جہاں بانی نے ہندوستانیوں کے سارے شعبہ ہائے زندگی پر نہایت خوشگوار اور دیرپا اثرات ڈالے۔ ان کے ذہن، مزاج، رہن سہن اور انداز فکر سب میں ایسی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو انھیں متمدن و شائستہ قوم بنانے میں معاون ثابت ہوئیں۔ ان مثبت اثرات کا تذکرہ صرف مسلمان مورخوں کے یہاں نہیں بلکہ بہت سے غیر مسلم مورخوں کے یہاں بھی آیا ہے۔ ٨ اور اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ:

٧ - دی پریچنگ آف اسلام (اردو ترجمہ دعوت اسلام)، ص ٢١٢

٨ - بطور مثال دیکھیے:

(الف) انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر، ڈاکٹر تارا چند

(ب) انڈیا تھرو دی ایجز، پروفیسر جے۔ این۔ سرکار

(ج) کنٹری بیوشن آف اسلام ٹو انڈین کلچر، این۔ سی مہتا

(د) ٹرولرس ان دی مغل امپائر، ڈاکٹر برنیر

(ک) دی پریچنگ آف اسلام، از پروفیسر تھامس آرنالڈ

(ل) دی ریلیجس پالیسی آف دی مغل، از سری رام شرما

" ہندوستانی سماج کی نئی تشکیل پر بھی اسلامی اثر کے بالواسطہ نتائج کچھ کم اہم نہ تھے۔ اسلام اور ہندومت کے اتصال سے ہندومت میں خاصا اہم انقلاب آگیا۔"٩

ولیم ہنٹر جس نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیا، اس سلسلے میں لکھتا ہے کہ :

"مسلمان جہاں بھی گئے، اپنے مذہب کی اشاعت کرتے رہے۔ کچھ تو بذریعہ تلوار لیکن زیادہ تر انسانی فطرت کے دو نہایت ہی اہم احساسات کو ابھارنے سے، ہندوؤں نے دہانہ گنگا کی قدیم اقوام کو کبھی اپنی برادری میں شامل نہیں کیا تھا۔ مسلمانوں نے جملہ انسانی مراعات کو برہمنوں اور اچھوتوں دونوں کے سامنے یکساں طور پر پیش کیا۔ ان پرجوش مبلغوں نے ہر جگہ پیغام سنایا کہ ہر شخص کو خدائے بزرگ و برتر کی بارگاہ میں جھک جانا چاہیے۔ خدائے واحد کے سامنے تمام انسان برابر ہیں اور مٹی کے ذروں کی طرح ان سب کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا ہے۔"١٠

بقول ڈاکٹر ریاض الاسلام دراصل مسلمانوں ہی کے اثرات کا نتیجہ تھا کہ، تھوڑے ہی عرصے بعد، ہندوؤں میں مذہبی اور سماجی اصلاح کی نئی نئی تحریکیں پیدا ہوئیں اور آگے چل کر انہیں تحریکوں نے ان میں ہندو قوم اور ہندو قومیت کا ایک نیا احساس پیدا کر دیا۔ بھگتی تحریک کے نام سے ملک کے ہر حصے میں رامانج، نانک، چیتنیہ، کبیر اور رامانند کے سے مصلحین اٹھے اور لوگوں کو ذات پات کے نظام کی سختی کے خلاف تلقین کرنے لگے، ان بزرگوں نے اونچی ذات پات کے بجائے اچھے اعمال کو انسانی عظمت کا معیار

٩ - ثقافت پاکستان، شیخ محمد اکرام، ادارہ مطبوعات پاکستان، کراچی، ص ٢٥

١٠ - ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجمہ ڈاکٹر صادق حسین، لاہور، ١٩٥٥، طبع دوم، ص ٢٢٥

ٹھہرایا۔۱۱ مشہور ہندو رفارمر جسٹس رانا ڈے نے ۱۹۰۰ء میں سوشل کانفرنس کے ایک سالانہ جلسے میں بہ حیثیت صدر، مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ اور ہندوستان پر اثرات سے متعلق ایک عالمانہ مقالہ پڑھا تھا۔ اس میں انھوں نے کہا:

''علاوہ سرچشمہ قوت ہونے کے اسلامی حکومت نے سینکڑوں طریقوں سے ہندوؤں کے آداب و اطوار اور ذوق لطیف کے بنانے میں مدد دی، مسلمان، حکومت کے فن کو پرانے ہندو حکمرانوں سے بہتر سمجھتے تھے۔ فن جنگ، مسلمانوں کی آمد سے قبل نہایت ناقص تھا۔ بارود اور توپ و تفنگ کا استعمال ان کی بدولت رائج ہوا، بہت سی دستکاریوں میں وہ جدت و ایجاد کو کام میں لائے، ان کے نام اور ان کی اصطلاحیں جو غیر ہندو ہیں یہ بتاتی ہیں کہ ان کی اصل بدیسی ہے انھوں نے شمع، کاغذ، گھر کے سازو سامان اور زینت، وغیرہ کو رواج دیا۔ انھوں نے موسیقی اور طب اور ہیئت کے علم میں بہت بڑا اضافہ کیا اور ان کی تقلید میں ہندوؤں نے بھی ان دونوں علوم اور نجوم و کیمیا میں اصلاح و ترقی کی اور مسلمانوں ھی کی بدولت جغرافیہ اور تاریخ پہلی بار علم و ادب کے شعبے قرار پائے۔ انھوں نے سڑکیں، پل، نہریں، کارواں سرائیں اور ڈاکخانے بنائے اور فن تعمیر کے اعلیٰ نمونہ پیش کئے اور فن باغبانی کو ترقی دی۔ نیز ہمیں نئے پھلوں اور پھولوں سے آشنا کیا۔ نظام مالگزاری، جو اکبر کے زمانے میں ٹوڈر مل نے رائج کیا تھا، موجودہ طریقۂ مالگزاری کی بنیاد اسی پر ہے۔ وہ تمام تجارت سمندر کے راستے دور دراز ملکوں سے کرتے تھے انھوں نے اہل ہند کے دل میں یہ احساس پیدا کیا کہ ہندوستان بھی آباد دنیا کا ایک حصہ ہے اور دوسرے ممالک سے تعلق رکھتا

۱۱۔ اسلامک ہسٹری (اے ہسٹری آف مسلمس ان انڈو پاکستان سب کانٹی ننٹ)، نیشنل ٹیکسٹ بک کارپوریشن، لاہور، ۱۹۶۱، ص ۱۲۶ تا ۱۲۹

ہے اور معاشرتی لحاظ سے دوسروں سے منقطع نہیں ۔ ان تمام اعتبارات سے مسلمانوں اور ہندوؤں کی متحدہ قوتوں کا تمدن جس کے نمائندے دھلی کے مغل تھے، ایسی نمایاں ترقی کا حاسل تھا جس کا وجود میں آنا دسویں صدی عیسوی کے قبل ممکن نہ تھا ۔''۱۲

مولوی عبدالحق اس بیان پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ھیں کہ:

''جسٹس رانا ڈے نے، ان برکات کا جو مسلمانوں کی بدولت ہندوؤں کو نصیب ہوئیں یا جو ہندو مسلم اتحاد سے وجود میں آئیں بڑی تحقیق سے اور نہایت بے لاگ طور پر بیان کی ھیں، لیکن یہ ایک بات جو خاص طور پر قابل ذکر تھی وہ بھول گئے۔ جسٹس رانا ڈے اس میں بے قصور ھیں ۔ یہ شکایت مجھے ان تمام مورخوں سے ہے جنھوں نے ہندوستان کی تاریخ پر کتابیں لکھی ھیں ۔ وہ بادشاھوں اور راجاؤں کے شجروں اور نسب ناموں یا ان کی لڑائیوں اور فتوحات، ان کے درباروں اور جشنوں، ان کے جلوسوں اور تفریحوں کے حالات بڑی آب و تاب سے بیان کرتے ھیں ۔ لیکن ذکر نہیں کرتے تو اس چیز کا جو تاریخی اور سیاسی، معاشرتی اور تہذیبی اعتبار سے ہندو، مسلمانوں کے اتحاد اور یک جہتی کی سب سے اہم اور عظیم‌الشان یادگار ہے۔ یوں تو ھماری بہت سی یادگاریں ھیں، لیکن ان میں سے بعض مٹ گئیں یا مٹنے والی ھیں ۔ بعض ایسی ھیں جنھیں لوگ بھول جائیں گے اور کچھ ایسی ھیں جو پرانے آثار کے کھوج لگانے والوں اور قدیم تاریخ کے محققوں تک رھیں گی ۔ لیکن اردو زبان دونوں قوموں کی شرکت اور اتحاد اور دونوں قوموں کی معاشرت و تہذیب کے میل کی ایسی یادگار ہے جسے زمانہ کبھی نہیں بھلا سکتا ۔''۱۳

۱۲ - خطبات عبدالحق، (انگریزی سے اردو میں ترجمہ)، ص ۱۷۷-۱۷۸

۱۳ - خطبات عبدالحق، ص ۱۷۹

ہندوستان پر اسلامی اثرات کے سلسلے میں جو باتیں اوپر کہی گئی ہیں وہ مشتے از خروارے ہیں ، ان میں بے شمار باتوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے اور ثبوت میں ماخذ کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں لیکن اس جگہ ان کے تذکرے سے کوئی فائدہ نہیں۔ کہنا صرف یہ تھا کہ ان اثرات میں مسلمان حکمرانوں کی تلوار کو اتنا دخل نہیں تھا جتنا کہ ان کی رواداری ، حسن انتظام ، ثقافتی برتری ، فراخ دلی ، انسان دوستی ، اور سیاسی و سماجی طرز فکر کو تھا۔ مسلمانوں کی ہزار سالہ تاریخ میں ایک بھی ایسا اہم واقعہ نہیں ملتا جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ ہندو اور مسلمانوں کے باھمی تعلقات پر عقائد کے اختلاف نے کوئی خراب اثر ڈالا ہے یا یہ کہ ثقافتی و مذہبی بعد کے سبب وہ ایک دوسرے سے برسر پیکار ہوئے ہیں ۔ ہندوستان پر جب تک مسلمانوں کی سیاسی گرفت مضبوط رہی ، اور انتظامی اختیار ان کے ھاتھ میں رہے انہوں نے ہندوؤں سے یا کسی غیر مسلم سے ، اختلاف مذھب کی بنیاد پر کبھی کوئی تعرض نہیں کیا ۔ سب کو آزادانہ اپنے عقائد کے مطابق زندگی بسر کرنے کی اجازت رھی ۔ حکومت ، تجارت ، سیاست ، ملازمت اور عسکری نظام سب میں انہوں نے دوسروں کو برابر کا شریک رکھا ۔ ہندوستان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ہندو بھی عام طور پر مسلمانوں کے طرز حکومت اور حسن سلوک سے ہر طرح مطمئن اور خوش و خرم رہے۔ انگریزوں کے آغاز اقتدار سے قبل تک ہندوؤں کو مسلمانوں سے کوئی شکایت نہ تھی ۔ بقول رام گوپال :

> ”ہندو اور مسلمان نہایت پر امن و خوشگوار ماحول میں ساتھ ساتھ رہتے تھے ۔ ایک دوسرے کے رسوم و آداب کے لئے دل میں جگہ رکھتے تھے اور عقائد و اطوار کے امتیاز کی بنا پر باھم اختلاف کی اجازت نہ دیتے تھے ۔“[۱۴]

لیکن اورنگ زیب کی وفات ۱۷۰۷ء کے بعد جوں جوں مسلمان ، سیاسی طور پر کمزور ہوتے گئے ، ہندوؤں کے رویے میں تبدیلی پیدا ہونی شروع ہو گئی اس تبدیلی کے کئی اسباب تھے۔ اورنگ زیب کے بعد ، مغل سلطنت کو

۱۴ - انڈین مسلمس ، ص ۱

کمزور ہوتے دیکھا تو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین، تجارت کے ساتھ ساتھ، ہندوستان کے سیاسی مسائل سے بھی باقاعدہ دلچسپی لینے لگے اور انگریزی تسلط قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگے۔ خواب کی پہلی تعبیر ۱۷۵۷ء میں پلاسی کی جنگ کے موقع پر ظاہر ہوئی، جس میں بنگال کے ہندو سیٹھوں اور میر جعفر کی غداری کے سبب سراج الدولہ کو انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے تاجر، ہندوستان کے ایک حصے کے حاکم و مالک بن بیٹھے۔ ۱۷۶۴ء میں بکسر کی جنگ ہوئی اس میں دھلی کے مغل بادشاہ شاہ عالم کی فوجیں بھی میر قاسم کی حمایت میں شریک ہوئیں اور شکست کھائی۔ نتیجتاً، دھلی کی مرکزی حکومت بھی سیاسی طور پر انگریزوں کے زیر اثر آ گئی۔ ۱۷۶۵ء میں شاہ عالم نے کٹرا اور الہ آباد کے صوبوں کی دیوانی چھتیس لاکھ روپے سالانہ کے عوض، انگریزوں کے ہاتھوں مجبوراً فروخت کر دی چنانچہ شاہ عالم کے بعد جب اکبر شاہ ثانی تخت نشین ہوا تو دلی اس کے ہاتھوں سے تقریباً نکل چکی تھی۔ صرف لال قلعہ پر بادشاہ کا قبضہ تھا۔

اس اثنا میں میسور کے حکمراں حیدر علی اور اس کے بیٹے ٹیپو سلطان نے انگریزوں سے ہندوستان کو نجات دلانے کی کوشش کی لیکن نظام حیدرآباد کی غداریوں کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔ میسور کی سلطنت تباہ ہو گئی۔ ۱۷۹۹ء میں ٹیپو سلطان انگریزوں سے مقابلہ کرتا ہوا شہید ہو گیا۔ اب دیسی حکمرانوں میں ایک بھی ایسا نہ تھا جو انگریزوں سے مقابلہ کرنے کی ہمت کرتا۔ نتیجتاً انیسویں صدی کا آغاز، در اصل انگریزوں کے سیاسی تسلط کے قیام اور ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی برتری کے خاتمے کا اعلان تھا۔ اس کے بعد انگریزوں کی سیاسی سرگرمیاں تیز ہو گئیں۔ سندھ کا علاقہ اب تک آزاد تھا۔ ۱۸۴۳ء میں اسے بھی انگریزوں نے اپنے زیر نگیں کر لیا۔ ۱۸۴۹ء میں پنجاب کی سکھ حکومت کو انگریزوں کے مقابلے میں شکست ہوئی اور پنجاب کا علاقہ بھی انگریزی عملداری کا حصہ بن گیا۔

اب انگریزوں نے اپنے استحکام کے لئے زندگی کے ہر شعبے میں اصلاحات اور

قوانین کے نام سے تبدیلیاں لانا شروع کیں۔ ان سب کا مقصد در پردہ سیاسی گرفت کو مضبوط تر بنانا تھا۔ چنانچہ ۱۸۵۶ء میں لاولدیت کو بہانہ بنا کر، انگریزوں نے نواب واجد علی شاہ کو بھی معزول کر دیا اور اودھ کی سلطنت کو برطانوی مقبوضات میں لے لیا۔ اس طرح کے توسیع پسند ہتکنڈوں اور جارحانہ عزائم نے عوام میں انگریزوں کے خلاف ایک طرح کی نفرت پیدا کر دی۔ آخر کار ۱۸۵۷ء میں انھوں نے آزادی ہندوستان کی خاطر اس تاریخی جد و جہد سے کام لیا جس کا نام انگریزوں نے غدر رکھا۔ لیکن اس آخری معرکے میں بھی، مجاہدوں کو غیر منظم ہونے کے سبب شکست ہوئی۔ مغل سلطنت کے آخری تاجدار بہادر شاہ بغاوت کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔ دھلی کی برائے نام مغل حکومت بھی، ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئی۔ اب پورے ہندوستان پر انگریزوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے اس کا کنٹرول، ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے براہ راست تاجدار برطانیہ کے ھاتھوں میں چلا گیا۔ لارڈ کیننگ ہندوستان کے وائسرائے مقرر ہوئے۔ انھوں نے الہ آباد میں ایک دربار منعقد کیا اور یکم نومبر ۱۸۵۸ء کے اعلان کے ذریعے ہندوستان کو باقاعدہ، برطانوی سلطنت کا ایک حصہ قرار دے دیا گیا۔ ۱۰

۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک، سو سال میں جو سیاسی تبدیلیاں ہوئیں وہ بالعموم مسلمانوں کے خلاف اور ہندوؤں کے موافق تھیں۔ خصوصاً ٹیپو سلطان کی شہادت ۱۷۹۹ء سے بہادر شاہ کی گرفتاری ۱۸۵۷ء تک کے درمیانی پچاس سال میں جو کچھ ہوا وہ مسلمانوں کی سیاسی و سماجی اور اقتصادی و تہذیبی زندگی پر ضرب کاری کی حیثیت رکھتا ھے، یوں کہنا چاھئے کہ انیسویں صدی کی ابتدائی چھے سات دھائیوں کا زمانہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش و ابتلا کا زمانہ تھا۔

برطانوی اقتدار سے پہلے تک، ہندوستان کی سیاسی و سماجی زندگی جیسی کچھ بھی تھی اس میں بہر حال ایک طرح کا ٹھہراؤ اور ایک طرح کی وحدت

۱۰ - پاکستان منزل بہ منزل، شریف الدین پیرزادہ، گلڈ اشاعت گھر، کراچی، ۱۹۶۵ء، ص ۳۱

قائم تھی۔ مختلف فرقوں نے جو اس ملک میں بستے آئے تھے، رہنے سہنے کا ایک مشترک طریقہ مرتب کر لیا تھا۔ اس میں ہر شخص دوسرے کے سہارے کا محتاج تھا۔ ہر ذات یا ہر جماعت اپنے پیشہ میں لگی رہتی تھی۔ بایں همه، ہر جماعت پورے معاشرے کا ایک اہم فرد تھی۔ پیشوں کے اختلاف کے سبب وہ مقابلے یا مجادلے سے بچتے تھے اور سماجی ڈھانچے کے تعمیری پروگراموں میں مذہب کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرتا تھا لیکن برطانوی تسلط نے اس وحدت اور اس ڈھانچے کو توڑ دیا۔ لوگ ایک دوسرے سے الگ اور دور ہونے لگے۔ ان کے درمیان مغائرت اور طبقاتی فاصلے پیدا ہونے لگے۔ یہ مغائرت اور دوری دراصل برطانوی حکمرانوں کی اس سیاسی حکمت عملی کا نتیجہ تھا جو انھوں نے 'تقسیم کرو اور حکومت کرو' کے اصول کو سامنے رکھ کر اپنایا تھا۔ چنانچہ انگریزوں کی خارجہ حکمت عملی کے ایک ذمہ دار رکن سر جان مینرڈ (Sir John Mynard) کا قول ہے کہ:

"یہ یقیناً صحیح ہے کہ برطانوی اقتدار نہ تو قائم ہو سکتا تھا اور نہ آج ھی برقرار رہ سکتا ہے اگر وہ انتشاری میلان جس کا ایک مظہر ہندو مسلم مخالفت ہے، یہاں نہ پایا جاتا۔ نیز یہ بھی حقیقت ہے کہ ہندو مسلم عوام کی رقابت کی ابتدا، برطانوی دور حکومت سے ہوئی ہے۔"[۱۶]

لیکن، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو تفرقہ انگریزوں نے پیدا کیا، اس سے ہندوؤں کو نہیں، سارا نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ وجہ یہ تھی کہ اس تفرقے کی بنیاد ھی، مسلمان کے مقابلے میں ہندوؤں کو مجتمع کرنے، اقتصادی طور پر ان کو طاقتور بنانے اور ان کے تمدن کو ممتاز ترین و قدیم تر ثابت کرنے، نظم و نسق میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز کرنے اور اس طرح کی بہت سی حوصلہ افزا مراعات پر قائم تھی۔ چنانچہ ہندوؤں نے ہر موقع پر

۱۶۔ ہندو مسلم کلچرل اکارڈ، سید محمود، ص ۶۴، بحوالہ حالی کا سیاسی شعور، ڈاکٹر معین احسن جذبی، لاہور، ۱۹۶۳ء، ص ۲۸

انگریزوں کی اس حکمت عملی سے پورا فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کے خلاف، انگریزوں کی ہر سازش میں شامل ہو کر انھیں نقصان پہنچایا۔

انگریزوں اور ہندوؤں کے اس ملاپ اور گٹھ جوڑ کا بھی خاص سبب تھا۔ انگریز اپنے سیاسی تسلط اور اس کے استحکام کے سلسلے میں جتنا خوف زدہ اور چوکنا مسلمان کی طرف سے تھے ہندوؤں کی طرف سے نہ تھے۔ انھوں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ عہد اکبری ۱۵۵۹ء تا ۱۶۰۵ء کے آخری زمانے میں ہندوستان میں قدم رکھا تھا۔ مغلوں کے اقتدار اور دبدبے کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ مسلمانوں کے سیاسی اور تہذیبی کارناموں کی پوری تاریخ ان کے سامنے تھی۔ مسلمان کی شجاعت و جان بازی سے بھی ان کا براہ راست ٹکراؤ ہو چکا تھا۔ وہ عملاً اس تجربے سے گذر چکے تھے کہ ان کے سیاسی تسلط کی راہ میں جتنی رکاوٹیں مسلمانوں نے ڈالی تھیں اور جس بےجگری سے ان کا مقابلہ کیا تھا، اس کے مقابلے میں ہندوؤں نے کچھ نہیں کیا تھا۔ ان حالات میں ان کی سیاسی حکمت عملی کا پہلا اصول یہ تھا کہ مسلمانوں کو جس قدر کمزور بنایا جا سکتا ہے بنایا جائے۔ اس کے برعکس، ہندوؤں کو ہر قسم کی مراعات دے کر، اپنا حایف اور مسلمانوں کا حریف بنا دیا جائے۔ بات یہ ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کا اصل سیاسی اقتدار، ہندوؤں سے نہیں مسلمانوں سے چھینا تھا۔ انھیں ہندوستان میں قدم جمانے کے لئے سب سے پہلے مسلمانوں ہی سے لڑنا پڑا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں بھی ان کا اصل معرکہ، مسلمانوں ہی کے ساتھ ہوا تھا۔ چنانچہ ان مزاحمتوں نے انھیں سمجھا دیا تھا کہ ان کے اصل دشمن، ہندو نہیں مسلمان ہیں اس لئے جب تک مسلمانوں کو پوری طرح قابو نہ کر لیا جائے وہ اطمینان سے حکومت نہیں کر سکتے۔ ۱۸۴۳ء میں ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ البنرا نے اس سلسلے میں صاف صاف لکھا ہے کہ:

''میں اس عقیدے کی طرف آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری مخالف ہے اس لئے ہماری پالیسی

یہ ہے کہ ہم ہندوؤں کو اپنا طرفدار بنائیں ۔''۱۷

برطانوی فوج کے ایک اعلیٰ افسر نے ، ڈیوک آف ولنگٹن (Duke of Willington) کو ایک خط میں لکھا تھا :

''مجھے یقین ہے کہ جو لوگ (مسلمان) ہماری نگرانی میں رہ رہے ہیں وہ ہمارے بھی خواہ نہیں ہیں ۔ اس کے برعکس ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ہندو ہماری کامیابیوں پر بہت خوش ہیں ۔ جب ہمیں ، مسلمانوں کی دشمنی کا جن کی افرادی طاقت آبادی کے دسویں حصے کے برابر ہے یقین ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ آبادی کے اس نو بٹا دس حصے کی جو ہمارا خیر خواہ اور وفادار ہے ، ہم دل کھول کر کیوں مدد نہ کریں ۔''۱۸

انگریزوں کی یہ مسلمان دشمن حکمت عملی ، پوری انیسویں صدی میں جاری و ساری رہی ولیم ہنٹر ، اپنی کتاب مرقومہ ۱۸۷۰ء میں لکھتا ہے کہ :

''مسلمانان ہندوستان ، اب بھی اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی ، ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لئے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلگ رہے اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے ، اپنے لئے بہت بڑی قومی بےعزتی تصور کرتے ہیں ۔''۱۹

چنانچہ ہمیشہ اور ہر موقع پر انگریزوں نے اپنے دور اقتدار میں ہندوؤں کے ساتھ ترجیحی سلوک کیا ۔ حالانکہ وہ اچھی طرح جانتے تھے اور بعض کو

۱۷ ۔ بحوالہ ہندو مسلم کلچرل اکارڈ ، سید محمود ، ص ۶۵

۱۸ ۔ بحوالہ ''مسلم انڈیا'' ، محمد نعمان ، کتابستان ، الہ باد ، ۱۹۴۲ء ، ص ۲۹

۱۹ ۔ ''ہمارے ہندوستانی مسلمان'' ، ترجمہ صادق حسین ، قومی کتب خانہ ، ریلوے روڈ ، لاهور ، ۱۹۵۵ء ، ص ۱۹

اس کا اعتراف بھی تھا کہ عزم، تعلیم اور ذہنی صلاحیت کے لحاظ سے مسلمان ہندوؤں سے کہیں زیادہ فائق ہیں اور ہندو ان کے سامنے نسبتاً طفل مکتب معلوم ہوتے ہیں علاوہ اس کے مسلمانوں میں انتظامی کاموں کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی ہے۔ ۲۰

اس کے باوجود عدم توجہ اور ظلم کا نشانہ، مسلمانوں ہی کو بنایا گیا۔ ہندوؤں کو طرح طرح سے مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔ ایسی تاریخیں لکھی اور لکھوائی گئیں جن میں، مسلمانوں کے عہد حکومت کو ہندوؤں کے حق میں عذاب ظاہر کیا گیا۔ مثلاً اس زمانے کے ایک انگریز مورخ سر ہنری ایلیٹ (Sir Henry Elliot) کا ذکر کافی ہوگا۔ سر ہنری ایلیٹ، ایسٹ انڈیا کمپنی میں ایک معزز عہدے پر فائز تھے۔ آخر میں گورنمنٹ آف انڈیا کے فارن سکریٹری ہوگئے تھے، انھوں نے کئی جلدوں میں برصغیر کی تاریخ مرتب کی۔ اس کی پہلی جلد ۱۸۴۹ء میں شائع ہوئی۔ اس تاریخ میں موصوف نے من گھڑت واقعات کے ذریعے مسلمانوں سے ہندوؤں کو جس طرح متنفر کیا ہے، اس کا صحیح اندازہ، اس کے مطالعہ کے بعد ہی کیا جا سکتا ہے۔ ۲۱، طفیل احمد منگلوری۲۲ اور لالہ رجپت رائے۲۳ نے اس تاریخ کے کئی اقتباسات و اقوال نقل کئے ہیں اور مسلمانوں کے خلاف، انگریز مورخوں کی زہرنا کیوں پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

انگریزوں کی اس مسلمان دشمنی کا ثبوت بعد کے واقعات سے بھی ملتا ہے، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں اگرچہ ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن

۲۰۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، طفیل احمد منگلوری، نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۸ء، ص ۱۵۲

۲۱۔ دی ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹورین (دی محمڈن پیرڈ) جلد سوم، لندن، ۱۸۶۹ء

۲۲۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، ص ۲۲۵ تا ۲۵۹

۲۳۔ آن ہیپی انڈیا، ص ۳۰۸

انگریزوں نے سارا غصہ مسلمانوں پر اتارا ، انھیں بغاوت کا ذمہ دار ٹھہرایا کر ہر طرح کچلنے کی کوشش کی ، صرف اس لئے کہ انھیں ہندوستان پر دوبارہ قابض ہو جانے کا جو خطرہ مسلمانوں کی طرف سے تھا وہ سکھوں یا مرہٹوں سے نہیں تھا ۔۲۴ سر سید احمد خاں نے صحیح کہا تھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ابتدا اگرچہ ہندوؤں کی جانب سے ہوئی، لیکن مسلمان اس آگ میں کود پڑے اور ہندو گنگا نہا کر الگ ہو گئے ۔ سارا نقصان مسلمانوں کو اٹھانا پڑا ۔

ابھی حال میں سر سید احمد خاں کی سیاسی زندگی پر ایک کتاب چھپی ہے ، اس میں سر سید احمد خاں کو انگریزوں کا خوشامدی اور ان کی قومی تحریک کو کم رتبہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش کی گئی ہے ، صرف اس لئے کہ سر سید احمد خاں نے کانگریس کی پر زور اور برملا مخالفت کی تھی ۔ لیکن مصنف اس نکتے کو نظر انداز کر گئے ہیں کہ جس وقت سر سید احمد خاں نے کانگریس کی مخالفت کی تھی اس وقت یہ مخالفت ، انگریزوں کی ناراضگی مول لینے کے مترادف تھی ۔۲۵ وجہ یہ ہے کہ خود کانگریس ، ابتدا میں حکومت کی پٹھو جماعت تھی اور حکومت ہی کے اشارے اور ارکان کی مدد سے وجود میں آئی تھی ۔ بایں ہمہ ، اس کتاب میں بعض حقائق کا اعتراف کیا گیا ہے ، شاید اس لئے کہ اس کے بغیر چارہ نہ تھا ۔ چنانچہ ڈاکٹر اشوک مہتہ اور بعض دوسروں کے حوالے سے مصنف نے لکھا ہے کہ :

> "The Mutiny was not a rebellion of one community, it was a rebellion joined by Hindus and Muslims alike, and both had in view the restoration of the Mughals and the deliverance of the country from the British. But the Muslims for historical and ideological reasons, were more violently anti-British than the Hindus. Therefore after the collapse of the Mutiny, the heavy hands of the British fell upon Muslims and the repression of the Muslim was so ruthless and callous, that even the British authorities could not fail to confess it. Then vindictive policy of the British was now so ruthlessly

۲۴ - انڈین مسلمس ، ص ۲۶

۲۵ - موج کوثر ، شیخ محمد اکرام ، فیروز سنز ، ۱۹۶۸ء ، ص ۱۰۲

carried out that the proud Muslims were reduced to great straits, with their heart broken in despondency and their pride humbled in the dust. The sufferings were tremendous. Their property was totally confiscated and nothing was left with them. The aristocrats deprived of all fief, possession and influence, appeared to be moving corpses. The Hindus were permitted to return to Delhi within a few months after the reoccupation of Delhi, but the Mohammadan population was not allowed to come back till 1859."[26]

انگریز، مسلمان کے درپے آزار تو تھے ہی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بہانے ان کی جائدادیں اور جاگیریں ضبط کر لی گئیں، ان کی عزت نفس پر حملے ہوئے، خواتین کی عصمتیں لوٹی گئیں، ننگے جسموں پر کوڑے برسائے گئے۔ ان کی لاشیں گدھوں کو کھلائی گئیں۔ انھیں خونخوار جانوروں سے روندایا گیا۔ ان کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور بیویوں کو ان کے سامنے ننگا کرکے انھیں خوار کیا گیا۔ کسی کو گولی مار دی گئی کسی کو پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔ بعض کو برہنہ کرکے پہلے زمین پر لٹایا گیا، پھر ان کی مشکیں کسی گئیں اور ان کے جسم کو تانبے کی گرم سلاخوں سے داغا گیا۔ سکھ اور انگریز فوجیوں نے بہت سے مسلمانوں کو آگ میں زندہ جلا دیا اور بعض کو سور کی کھال میں بند کرکے نذر آتش کر دیا۔ بعض کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ غیر فطری عمل کے مرتکب ہوں۔ سینکڑوں مسلمانوں کو ایک چھوٹے سے برج میں بند کر دیا گیا اور جب انھیں قتل کرنے کے لئے باہر نکالا گیا تو پچاس آدمی گرمی کی شدت اور حبس کی وجہ سے دم توڑ چکے تھے۔ بہتوں کو اس جرم میں پھانسی دی گئی کہ انگریزی فوج کے مارچ کے وقت ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے، ان پھانسی پانے والوں اور ظلم کا نشانہ بننے والوں میں عوام الناس کے ساتھ اہل علم و فضل بھی تھے، سردار و رئیس بھی تھے۔ شہزادے اور جاگیردار بھی تھے۔ دلی اور اس کے نواح میں جتنے شہزادے پکڑے گئے سب

۲۶۔ سر سید احمد خاں (اے پولیٹکل بایوگرافی)، شان محمد، لاہور، ۱۹۷۶ء، ص ۳۲

پھانسی پر لٹکا دئے گئے ۔۲۶الف بادشاہ کے تین بیٹوں کو پہلے ننگا کیا گیا ، پھر برسر عام انگریزی فوج کے افسروں نے انھیں گولی کا نشانہ بنایا ۔ ان کی لاشیں کوتوالی کے سامنے لٹکوا دی گئیں جہاں ان کی بوٹیاں گدھ اور کتے کئی دن تک نوچتے رہے ۔۲۷ ہزاروں خواتین عصمت دری کے خوف سے کنویں میں کود گئیں ، شہر پر قبضے کے بعد فوجی افسروں کو ہر طرح آزاد کر دیا گیا ۔ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہوا ۔ مکانوں کے صحن اور دیواروں کو کھود کھود کر دفینے نکالے گئے ، قیمتی ساز و سامان کے ساتھ ساتھ چھتوں کی کڑیاں ، تختے اور کواڑ تک نہیں چھوڑے گئے ۔ بعض مسجدوں کو مسمار کر دیا گیا اور ان کے قیمتی پتھر نکال لئے گئے ۔ دھلی کی شاھی مسجد کو اصطبل میں تبدیل کر دیا گیا ۔ سکھ اور انگریز فوجی اس میں گھوڑے باندھتے تھے شراب پیتے تھے اور سور کو ذبح کر کے پکاتے تھے ۔ ایک دھلی کا نہیں ہر شہر کا کم و بیش یہی حال تھا ۔ ہر جگہ مسلمانوں کو چن چن کر لوٹا ، مارا اور قتل کیا گیا ، صرف اس لئے کہ انگریزوں کی نظر میں ۱۸۵۷ء کی بغاوت کے اصل ذمہ دار صرف مسلمان تھے ۔ ۲۷الف

مختصر یہ کہ قتل و غارت اور بربریت و سفاکی کی جتنی ممکن صورتیں ھوسکتی تھیں سب کو مسلمانوں پر آزمایا گیا ، ظلم و ستم کی اس بارش میں عالم ، جاھل ، عورت ، مرد ، بوڑھے ، جوان ، امیر ، غریب اور مجرم و بے گناہ میں فرق نہ کیا جاتا تھا ، صرف مسلمان ھونا کافی تھا ۔ چنانچہ شاعروں اور ادیبوں تک کو نہ چھوڑا گیا ۔ امام بخش صہبائی مارے گئے ۔ مولانا فضل حق خیر آبادی کو کالے پانی کی سزا ھوئی ، نواب آزردہ کی جائداد کی ضبطی کا حکم ھوا ۔

۲۶الف ۔ تاریخ عروج سلطنت انگلشیہ ، مولانا ذکا اللہ ، شمس المطابع ، دھلی ، ۱۹۰۴ء ، ص ۷۰۸

۲۷ ۔ قیصر التواریخ ، جلد دوم ، کمال الدین ، نول کشور ، لکھنو ، ۱۹۰۷ ، طبع سوم ، ص ۴۵۳

۲۷الف ۔ دی اسٹرگل فار پاکستان ، کراچی ، ۱۹۷۴ء ، ص ۱۷

اسداللہ خان غالب بغاوت کے جرم میں ماخوذ ہوئے اور بہت سے اہل علم و اہل سخن کو بے گناہ سزائیں دی گئیں۔۲۸

انگریز کا پنجہ اتنا جابر اور سارا ماحول کچھ ایسا بھیانک تھا کہ اس بربریت و تشدد کے خلاف زبان کھولنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ لیکن سرسید احمد خاں، ہزار سختیوں اور پابندیوں کے باوجود خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر اس ظلم و ستم کے خلاف ایک طرح کی آواز بلند کی اور نہایت قوی دلائل کے ذریعے بعض معاملات میں مسلمانوں کو سرے سے بے قصور اور حکومت کو ذمہ دار ٹھہرایا۔ لیکن سرسید احمد خاں کی آواز، نقار خانے میں طوطی کی آواز ہو کر رہ گئی۔ انگریزوں پر اس کا کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ ہر انگریز مورخ، اور مصنف، ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کی ساری ذمہ داری، مسلمانوں پر ڈالتا رہا چنانچہ انگریزوں نے مسلمانوں کے سروں پر ظلم و ستم کی جو تلوار ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بہانے لٹکا دی تھی

۲۸۔ تفصیل کے لئے دیکھئے:

(الف) غالب کے خطوط کے مجموعے، اردوئے معلیٰ اور عود ہندی

(ب) داستان غدر، اطہر دہلوی، طبع جدید، لاہور، ۱۹۰۰ء

(ج) ۱۸۵۷ء کے مجاہد شعرا، از امداد صابری، کلکتہ شاہراہ، دہلی، ۱۹۵۹ء

(د) "کمپنی کی حکومت"، باری، مکتبہ اردو، لاہور، ۱۹۴۴، طبع سوم

(س) سن ستاون، از سندر لال، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۵۷ء

(ک) ۱۸۵۷ء کا تاریخی روز نامچہ، از خلیق نظامی، ندوۃ المصنفین، دہلی، ۱۹۵۹ء

(ل) جنگ آزادی ۱۸۵۷ء، خورشید مصطفیٰ رضوی، مکتبۂ برہان، دہلی، ۱۹۵۹ء

وہ ایک مدت تک لٹکتی رہی ، نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان سیاسی و اقتصادی ہر اعتبار سے مفلوج ہو کر رہ گئے۔

مسلمانوں پر انگریزوں کا تشدد ، سیاسی سطحوں تک محدود نہ تھا۔ انھوں نے تجارت ، ملازمت اور معاش کے وسائل بھی مسلمانوں سے چھین لئے۔ پچھلے باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ انگریزوں نے کس طرح فورٹ ولیم کالج میں ، ایک نئی زبان ھندی کو جنم دیا اور ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے سنسکرت کی تعلیم و تحقیق کی آڑ میں ھندوستان اور ھندوؤں کی لسانی و علمی برتری کا سکہ جمایا۔ پہلے فارسی کو ختم کیا گیا ، پھر اردو کو ھٹا کر انگریزی کو ھر سطح پر ذریعہ تعلیم و تدریس بنا دیا گیا۔ سرکاری دفتروں اور عدالتوں کی کارروائیاں فارسی اور اردو کے بجائے انگریزی میں ھونے لگیں تو انگریزی تعلیم کی کمی اور حکومت کی بے اعتنائی کے سبب ، معاش کے دروازے مسلمانوں پر ایک ایک کرکے بند ھونے لگے۔ چھ برس پہلے تک جو لوگ ھندوستان کے حاکم اور سب سے مقتدر طبقے میں شمار ھوتے تھے وہ دیکھتے ھی دیکھتے حقیر و بے وقعت ھو گئے۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے انھیں تباھی کی آخری منزل تک پہنچا دیا۔ یہ تباھی ایسے خوفناک اور بے رحمانہ رویوں کا نتیجہ تھی کہ اپنے تو اپنے ھیں ، غیروں کو بھی اس تباھی پر رونا آ گیا۔ پتھر تک پسیج گئے۔ ولیم ھنٹر کی کتاب مصنفہ ۱۸۷۰ء اگرچہ سراسر مسلمانوں سے بغض و عناد پر مبنی تھی اور مسلمانوں کے خلاف اس میں جتنا زھر اگلا گیا ھے شاید ھی کسی اور جگہ نظر آئے لیکن اس میں مسلمانوں کی تباھی کا باب مطالعہ کے لائق ھے۲۹۔ اس نے کئی جگہ اس بات کا اعتراف کیا ھے کہ ”جب ھندوستان ھمارے قبضے میں آیا تو مسلمان ھی سب سے اعلیٰ قوم تھی ، وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی ھی میں برتر نہ تھے بلکہ سیاست اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ھے ، غیر سرکاری ذرائع زندگی میں

۲۹ - ” ھمارے ھندوستانی مسلمان “ ، باب چہارم ، ترجمہ صادق حسین ، ص ۲۱۳ تا ۳۰۳

بھی انھیں کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں۔ ۳۰

چنانچہ اپنی حکومت سے شکایت کرتے ہوئے وہ بطور تنبیہہ لکھتا ہے کہ:

''اس حقیقت سے چشم پوشی بے سود ہے کہ مسلمان ہم پر کیسے کیسے شدید الزام عائد کرتے ہیں۔ ایسے الزام جو شاید ہی کسی حکومت پر لگائے گئے ہوں، وہ ہمیں اس بات کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ ہم نے ان پر ہر قسم کی باعزت زندگی کا دروازہ بند کردیا ہے۔ ہم نے ایک ایسا طریقۂ تعلیم رائج کر دیا ہے جس سے ان کی قوم بہرہ ور نہیں ہوسکتی اور جو ان کی ذلت و خواری کا سبب بن گیا ہے۔ وہ ہمیں یہ بھی الزام دیتے ہیں کہ ہم نے مسلمان قاضیوں کی برطرفی سے ہزارھا خاندانوں کو مبتلائے آفات کر دیا ہے۔ ہمارا بڑا جرم ان کے نزدیک یہ ہے کہ ہم نے مسلمانوں کے مذہبی اوقاف میں بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے ان کے سب سے بڑے تعلیمی سرمائے کا غلط استعمال کیا ہے۔ ان مخصوص الزامات کے علاوہ جن کے متعلق ان کو یقین ہے کہ بآسانی ثابت کئے جا سکتے ہیں، اور بھی بہت سی شکایات ہیں جو جذبات پر مبنی ہیں اور شاید انگریزوں کے تصور سے قاصر دماغ پر کوئی اثر نہ ڈال سکیں وہ علی الاعلان کہتے ہیں کہ ہم نے بنگال میں قدم رکھا تو مسلمانوں کے ملازمین کی حیثیت سے، لیکن اپنی فتح و نصرت کے وقت ان کی مطلق پروا نہ کی اور نودولت طبقے کی گستاخانہ ذہنیت کے ساتھ اپنے سابق آقاؤں کو پاؤں تلے روند ڈالا۔ مختصر یہ کہ ہندوستانی مسلمان، برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم، جذبات شجاعت سے معرا، اور سرمایہ میں کمینوں کی طرح بد دیانتی سے کام لینے والے، اور دیگر بڑی بڑی نا انصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے، مرتکب ٹھہراتے ہیں۔'' ۳۱

۳۰ - ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۲۱۷

۳۱ - ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۲۱۷ - ۲۱۸

مسلمانوں کی اقتصادی بد حالی اور سماجی انحطاط کے بارے میں اس دور کا ایک فارسی اخبار لکھتا ہے کہ :

''آہستہ آہستہ مسلمانوں سے ہر قسم کی ملازمت، خواہ چھوٹی ہو یا بڑی، چھینی جا رہی ہے، اور دوسری قوموں کو دی جا رہی ہے، لیکن وقت ایسا آ گیا ہے کہ وہ اپنے گزٹ میں اس بات کا خاص طور پر اعلان کرتی ہے کہ مسلمانوں کو سرکاری نوکری نہیں دی جائے گی۔ ابھی ابھی سندر بن کے دفتر میں چند آسامیاں خالی ہوئی تھیں اس افسر نے سرکاری گزٹ میں اشتہار دیتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا تھا کہ یہ ملازمتیں سوائے ہندوؤں کے اور کسی کو نہیں ملیں گی۔''[۳۲]

اس تباہی میں جیسا کہ سارے مورخین نے بیان کیا ہے، زیادہ ہاتھ اگرچہ انگریزوں کی مسلمان دشمن حکمت عملی کا تھا لیکن کہنا پڑتا ہے کہ اس میں خود مسلمان بھی بے قصور نہ تھے، ان کا قصور یہ تھا کہ سیاسی طور پر تباہ ہو جانے کے باوجود ان کے دل و دماغ سے وہ خوئے حکمرانی اور وہ احساس برتری نہ گیا تھا جو پچھلی کئی صدیوں تک حکمران رہنے کے سبب ان میں پیدا ہوگیا تھا۔ ان کو یہ غم کھائے جاتا تھا کہ کل وہ اس ملک کے حاکم تھے اور آج غلام ہیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ اس غم کو دور کرنے کے سلسلے میں وہ جذبات کے سوا عقل و تدبیر سے کام نہ لیتے تھے۔ وہ افلاس اور فاقے کی زندگی کو اس امر پر ترجیح دیتے تھے کہ انگریزوں کی ملازمت کی جائے یا ان سے سیاسی و سماجی روابط پیدا کئے جائیں اور ان کے تعلیمی و اقتصادی منصوبوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ پچھلے سو سال میں انگریزوں نے ان کو جس قسم کی شدید ضربیں لگائی تھیں ان سے وہ نڈھال ہونے کے ساتھ ساتھ حد درجہ بد دل بھی ہو چکے تھے جیسا کہ مولانا حالی نے اپنے مشہور مسدس

۳۲ - ''دوربین (کلکتہ)''، بابت ۱۴ جولائی ۱۸۶۹ء، بحوالہ انڈین مسلمین، رام گوپال، ص ۲۷، اور ''ہمارے ہندوستانی مسلمان''، ص ۲۵۳

”مد و جزر اسلام“ میں بیان کیا ہے ۔ انگریزوں کے مظالم کے نتیجے میں مسلمانوں میں جو تعصب اور مغربی علوم و فنون سے جو تنفر پیدا ہو گیا تھا، وہ انھیں آگے قدم بڑھانے سے روکتا تھا، نتیجتاً وہ زندگی کی دوڑ میں پیچھے رہ گئے۔ انگریزی عملداری کی سرکاری ملازمتوں میں ان کا تناسب ہندوؤں کے مقابلے میں روز بروز کم ہوتا گیا اور ایک دن وہ آیا کہ ان کی سماجی و اقتصادی حیثیت صفر کے برابر رہ گئی ۔ ہنٹر کا بیان ہے کہ :

”مسلمانوں کی دولت کے دو بڑے ذرائع یعنی فوج اور محکمہ دیوانی کے متعلق ہم نے جو طرز عمل اختیار کیا، اس طرز عمل سے مسلمان گھرانے بالکل تباہ ہو گئے، فوج سے بے دخلی مسلمانوں کے نزدیک سب سے بڑی قومی ناانصافی، اور ان کے پرانے نظام مالیات سے ہمارا انحراف، صریحاً وعدہ خلافی ہے ۔“

”ان کی عظمت کا تیسرا بڑا ذریعہ قانونی اور سیاسی یعنی دیوانی ملازمتوں کی اجارہ داری تھی، حالات و واقعات پر زور دینا واجب ہے لیکن پھر بھی سوچنا چاہئے کہ جتنے ہندوستانی سول سروس میں داخل ہوتے ہیں یا ہائی کورٹ کے جج بنتے ہیں ان میں سے ایک بھی مسلمان نہیں ۔ یہاں تک کہ ڈسٹرکٹ کلکٹری میں بھی بہت کم مسلمان ہیں ۔“ ۳۳

”ایک صدی قبل حکومت کے تمام ذمہ دار عہدوں پر مسلمانوں کا مکمل قبضہ تھا، اب مسلمانوں اور ہندوؤں کا تناسب ایک اور سات کا ہے ۔ ہندوؤں اور یورپین کا تناسب ایک اور دو کا، مسلمانوں اور یوروپین کا تناسب ایک اور چودہ کا ۔ تمام نظام حکومت میں اس قوم کا تناسب جو آج سے ایک صدی پہلے ساری حکومت کی اجارہ دار تھی، ایک اور تیئس کا رہ گیا ہے ۔ پریذیڈنسی شہر کے دفتر کی معمولی ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ تقریباً معدوم ہے ۔ سرکاری

۳۳ - ہمارے ہندوستانی مسلمان، ص ۲۴۱، ۲۴۲

دفتر میں مسلمان اب اس سے بڑھ کر اور کوئی امید نہیں رکھ سکتے کہ قلی اور چپراسی ، دواتوں میں سیاھی ڈالنے والا یا قلموں کو ٹھیک کرنے کے سوائے کوئی اور ملازمت حاصل کر سکیں ،،۳۴

''سرکاری ملازمتوں سے کہیں زیادہ سختی کے ساتھ مسلمانوں پر قانون کا دروازہ بند کر دیا گیا ھے - بنگال میں دو ھندو جج ھیں اور مسلمان ایک بھی نہیں - کلکتہ یونیورسٹی سے طبی سند حاصل کرنے والوں میں چار ڈاکٹر تھے تین ھندو ایک انگریز، لیکن مسلمان سرے سے ندارد - ،،۳۵

ھنٹر نے اپنی کتاب میں ، حکومت کے ھر شعبے سے متعلق ، مسلمان ملازموں کی تعداد اور دوسری قوموں کے ملازمین کے ساتھ ان کے تناسب پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ھے - آخر میں ایک گوشوارہ بھی دے دیا ھے۳۶ تا کہ پوری کیفیت کا بہ یک نظر اندازہ کیا جا سکے - ھنٹر نے سرکاری ملازمتوں سے متعلق جو اعداد و شمار دئیے ھیں وہ ۱۸۷۰ء کے ھیں لیکن انیسویں صدی کے آخر تک اس میں کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی۳۷ - محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس کا آٹھواں سالانہ اجلاس دسمبر ۱۸۹۳ء میں بمقام علی گڑھ منعقد ھوا تھا - اس میں سر سید احمد خان کے علاوہ نواب محسن الملک۳۸ - اور سید محمود نے بھی مسلمانوں کے تعلیمی مسائل پر مقالات پڑھے تھے - آخرالذکر دونوں نے اپنے اپنے مقالوں میں مرکزی اور ھندوستان کی ساری صوبائی ملازمتوں کے متعلق نہایت کار آمد گراف اور گوشوارے دئیے ھیں ، یہ گوشوارے ۱۸۹۳ء

۳۴ - ھمارے ھندوستانی مسلمان ، ص ۲۴۶

۳۵ - ھمارے ھندوستانی مسلمان ، ص ۲۴۸

۳۶ - ھمارے ھندوستانی مسلمان ، ص ۲۵۲

۳۷ - ھمارے ھندوستانی مسلمان ، ص ۲۴۵

۳۸ - دیکھئے محسن الملک کا خطبہ مشمولہ '' مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ،، ، مطبع مفید عام ، آگرہ ، ۱۸۹۴ء ، ص ۲۵ تا ص ۱۱۲

سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے لحاظ سے ہندوستان کے مسلمان ہندوؤں کے مقابلے میں اس وقت تک کتنے پس ماندہ تھے۔۳۹

ان باتوں سے باسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کی کیا حیثیت تھی۔ انیل سیل (Anial Seal) کے الفاظ میں:

"By sweeping away the old structure of administration, Cornwallis and his successors had edged Muslims out of the revenue-collecting system. For a time Muslims continued to hold their own in the judicial services and the law, so long as Persian and Urdu, around which their traditional education had been built, continued to be the language of British Administration. But when English was needed in the public services and the High Courts they began to be squeezed out. In 1867 Muslims held 11.7 per cent of government jobs in Bengal staffed by Indians; twenty years later they had less than 7 per cent. In 1871 they had about 12 per cent of the gazetted appointments; a decade later, their share had dropped to just over 8 per cent. In 1886-87, there were only fifty Muslim Officers in the uncovenanted judicial and executive service of Bengal, or one in twelve among Indians. In the law, 'the only secular profession open to well-born Mohammadans' Muslims had been in a relatively strong position during the first half of the century. Until 1851 there had been more Muslim pleaders in Calcutta than Hindus and Christians combined. Between 1852 and 1863, however, not one of the pleaders admitted to the rolls of the high courts in Calcutta was a Muslim. In 1869 among the attorney, proctors and solicitors there were twenty-seven Hindus, but there were no Muslims. In both the administration and the professions, Muslims were being forced out."[40]

ڈاکٹر امبیدکر نے صحیح لکھا ہے کہ ساری انتظامی اور قانونی تبدیلیاں جو حکومت کی طرف سے عمل میں لائی گئیں وہ مسلمانوں پر مسلسل ضربیں تھیں۔۴۱

۳۹۔ دیکھئے سید محمود کا خطبہ مع ضمیمہ، مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۹۴ء، ص ۸۹ تا ۹۰

۴۰۔ دی امرجنس آف انڈین نیشنلزم، کیمرج، ۱۹۷۱ء، ص ۳۰۲، ۳۰۳

۴۱۔ پاکستان یا پارٹیشن آف انڈیا، ص ۳۰

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ھے مسلمانوں کے اس انحطاط و زوال میں حکومت کی بے اعتنائی کے ساتھ ساتھ خود ان کی اپنی انائیت، تنگ نظری اور ناعاقبت اندیشی کو بڑا دخل تھا۔ پرانے خیال کے علما نے مسلمانوں کے ذھن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ انگریزوں کا لایا ھوا، نظام عدالت، نظام طب، نظام تعلیم، نظام حکومت، نظام قانون ان کے مذھبی عقائد اور نظام شرعی کے بالکل خلاف ھے۔ اس لئے انھیں، اس سے گریز کر کے، انگریزوں اور ان کی عملداری سے الگ تھلگ رھنا چاھئے۔۴۲ لیکن ھندوؤں کا نقطۂ نظر انگریزوں اور ان کے نظام حکومت کے بارے میں مسلمانوں سے بالکل مختلف تھا۔ کچھ تو ان کی غلامانہ ذھنیت اور کچھ زمانہ شناسی نے انھیں اس بات پر رضامند کر لیا تھا کہ وہ دل و جان سے حکومت کے ساتھ تعاون کریں اور اس سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ بقول ھنٹر، "مسلمان ھر بات میں کسی نہ کسی وجہ سے الگ تھلگ رھتے ھیں اور جن تبدیلیوں میں زمانہ ساز ھندو بڑی خوشی سے حصہ لے رھے ھیں، مسلمان ان میں بھی شریک ھونا اپنے لئے قومی ذلت خیال کرتے ھیں۔"۴۳ ھندو اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کے اس فرق نے، ظاھر ھے کہ ھندوؤں کو مغربی علوم و فنون اور انگریزوں کی حکمت عملی سے بہت جلد، قریب تر کر دیا۔ انھیں، نئے قوانین، نئے نظام تعلیم، نئی تہذیب اور نئے حاکموں سے مطابقت پیدا کرنے میں دیر نہ لگی۔ ھندوؤں اور مسلمانوں کے ذھنی فرق کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ھے کہ ۱۸۲۴ء میں جب انگریزوں نے کلکتہ میں ایک سنسکرت کالج کھولنے کا ارادہ کیا تو ھندوؤں نے ایک درخواست کے ذریعہ حکومت سے مطالبہ کیا کہ انھیں سنسکرت کالج کے بجائے انگریزی کالج چاھیئے، اس کے برعکس اس کے گیارہ سال بعد ۱۸۳۵ء میں جب انگریزوں نے انگریزی تعلیم کو رواج دینے کا منصوبہ بنایا تو مسلمانوں نے ان منصوبوں کے خلاف آواز بلند کی اور اسے اپنے لئے ضرر رساں

۴۲ - انڈین مسلمین، ص ۲۸

۴۳ - ھمارے ھندوستانی مسلمان، ص ۲۵۷

جانا۔۴۴ چنانچہ انگریزی حکومت سے مفاہمت و مطابقت پیدا کرنے کے سلسلے میں یہ خیال لفظ بہ لفظ درست ہے کہ:

"Hindus, in this respect, were distinctly different from Muslims. During the six hundred years of Muslim rule, they had made themselves remarkably adaptable. During Muslim rule, they not only learnt Persian and Urdu with equanimity but produced eminent scholars and poets. The subordinate revenue service and clerical jobs being open to them under the Muslim rulers, Hindus learnt the official language without allowing any thought to enter their minds that they were doing something offensive to their religion. The Hindu priesthood did not withhold Hindus from Persian schools and service under the Muslim rulers. With the Muslims the case was different. Whether Persia, or as invaders, rulers or administrators in India, they were never faced with an occasion to make a departure from the traditional way of life."[45]

ہندوؤں کے اس غلامانہ طبعی رجحان اور سیاسی سوجھ بوجھ کا نتیجہ ظاہر تھا۔ انہوں نے جس طرح مسلمانوں کے عہد حکومت میں خود کو ان کے منشا کے مطابق ڈھال لیا تھا، بالکل اسی طرح بہت جلد، برطانوی حکومت سے بھی مطابقت پیدا کرلی، اس مطابقت کے صاف معنی یہ تھے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف جس طرح کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی ہندو، اس میں ہر طرح ان کا ساتھ دیں۔ چنانچہ انھوں نے یہی کیا۔ بدلتے ہوئے سازگار حالات کے ساتھ ساتھ، سماجی اصلاحات کے نام سے احیا مذہب کی تحریکوں کو جنم دیا۔ اس سلسلے کی پہلی قابل ذکر تحریک "برھمو سماج" کے نام سے بنگال میں رونما ہوئی۔ راجہ رام موھن رائے نے تصوف، فلسفہ اور مذاہب کا خاص طور پر مطالعہ کیا تھا، قرآن اور ویدوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ سنسکرت، عربی، فارسی اور انگریزی چاروں زبانوں میں دسترس رکھتے تھے۔ اسلامی تصوف اور معاشرتی قوانین سے وہ خصوصاً متاثر تھے بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی تحریک دراصل، اسلام ھی کے زیر اثر وجود میں آئی تھی

۴۴۔ سرسید احمد خان، شان محمد، لاھور، ۱۹۷۶ء، ص ۵۴

۴۵۔ انڈین مسلمین، بمبئی، ۱۹۵۹ء، ص ۲۸

لیکن اپنی روح میں یہ تحریک سراسر ہندوست اور ہندو قومیت کی تولید و تشکیل کی تحریک تھی ۔ بقول پروفیسر شریف المجاھد :

"Raja Ram Mohan Roy had been deeply influenced by his study of Islamic works (including Quran) and by Sufi ideas, and had become culturally Moslemised; he even went to England as the Ambassador of the last Moghal Emperor to plead his cause. Yet at heart he was a staunch Hindu, couched in Liberal terms as were his religious teachings, his deepest yearnings as exemplified in his activities, were to turn the Hindus back to Vedas."[46]

خود راجہ رام موھن رائے کی بعض تحریروں سے بھی صاف پتہ چلتا ھے وہ دوسرے مذاھب کے مقابلے میں ہندوست کو واضح طور پر ترجیح دیتے تھے۔ انھوں نے ایک جگہ لکھا ھے کہ :

''اگر مذھب ذاتی وقوف اور ذات باری اور اس کی صفات کی نسبت ، اعلیٰ خیالات کا نام ھے تو میں بلاشبہ ویدوں کو ترجیح دیتا ھوں''
''ہندو مذھب بردباری اور امن کا مذھب ھے جس کی مسیح نے بھی اپنی شاگردوں کو ھدایت کی تھی لیکن اس کے پیروؤں نے اس کو بھلا دیا ۔''[۴۷]

ڈاکٹر آر سی موجمدار نے لکھا ھے کہ :

It must be remembered that Ram Mohan Roy never regarded himself as anything but a Hindu and stoutly denied upto the last day of his life, the allegation that he was founding a different sect. The detailed programme of his weekly service in what then called Brahma Sabah included the recitation of the Vedas by orthoox Brahmans and non-Brahman was not allowed in the room. The Raja Ram Mohan Roy himself wore the sacred thread of the Brahmans upto his death.[48]

۴۶ - انڈین سیکولزرم ، کراچی ، ۱۹۷۰ء ، ص ۳۱

۴۷ - سوانح راجہ رام موھن رائے ، منشی نتھو رام ، خادم التعلیم پنجاب ، لاھور ، ۱۸۹۳ء ، ص ۲۷۰ - ۲۷۱

۴۸ - این ایڈوانسڈ ھسٹری آف انڈیا ، ص ۸۷۷

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ راجہ رام موہن رائے اپنی وسیع النظری اور روشن خیالی کے باوصف، ایک ہندو برہمن تھے اور اسلامی و مغربی افکار سے متاثر ہو کر انھوں نے ''برہمو سماج'' کے نام سے جو اصلاحی تحریک شروع کی تھی، وہ بنیادی طور پر ہندوست کے احیا کی تحریک تھی۔ انھیں ہندو قوم پرستی کی تحریک میں وہی مرتبہ حاصل ہے جو انیسویں صدی کے آخری نصف میں مسلمانوں میں سر سید احمد خاں کو حاصل ہوا لیکن مذہبی وسیع النظری کے لحاظ سے، سرسید احمد خاں کا مرتبہ راجہ رام موہن سے بڑا تھا، اول اس لئے کہ برہمو سماج بہت جلد مذہبی تعصبات کا شکار ہو گئی۔ اور بابو کشیب چندر وغیرہ نے عملاً اس تحریک اور اس کے بانی کو، رسمی ہندوست کے نقطۂ نظر سے دیکھنا شروع کر دیا۔ خود راجہ رام موہن نے مروجہ ہندو مذہب کی ایسی روایتی چیزوں کو اپنائے رکھا جن کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے برہمو سماج کی بنیاد ڈالی تھی۔ بقول علامہ عبداللہ یوسف علی انھوں نے اپنا جنیو قائم رکھا اور عملی طور پر مقدس گاتیری کی پوجا کرتے رہے۔ ویدوں کی کتھا باقاعدہ ایک ایسے کمرے میں ہوتی تھی جہاں عملی طور پر شودروں کی رسائی نہ ہوتی تھی۔۹۴ دوسرے اس سبب سے کہ راجہ رام موہن نے کلکتے میں جو ہندو کالج قائم کیا وہ سر تا سر فرقہ وارانہ بنیادوں پر تھا اس لئے کہ صرف ہندو طلبہ کو داخلہ ملتا تھا۔ اس کے برعکس، سرسید کے بنا کردہ علی گڑھ کے دروازے سب پر یکساں کھلے ہوئے تھے اور پہلے ہی دن سے اس کے طلبہ و اساتذہ میں ہندو، مسلم اور عیسائی سبھی شریک تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے ۱۸۰۵ء میں ایک کتاب ''تحفۃ الموحدین'' کے نام سے لکھی تھی۔ اس کا سارا متن فارسی زبان میں تھا لیکن دیباچہ عربی زبان میں تھا۔ اس میں انھوں نے مختلف مذاہب کے لئے ایک ہی مرکز کی نشان دہی کرتے ہوئے لکھا ہے:

''آج کل ہندو مذہب کی جس شکل میں پیروی کی جا رہی ہے وہ

۹۴ - انگریزوں کے عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ، کریم سنز، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۹۴

ہندوؤں کے سیاسی مقاصد کے لئے غیر مفید ہے ۔ ذات پات کی تفریق نے ان میں ان گنت طبقے پیدا کر دئیے ہیں ۔ اس فرقہ بندی نے ، ان کو قوم پرور جذبات سے عاری بنا دیا ہے ۔ میں سمجھتا ہوں کہ کم ازکم ان کی سیاسی فلاح اور سماجی آسودگی کے لئے ان کے مذہب میں کسی نہ کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا ضروری ہے ۔،، ۵۰

راجہ رام موہن رائے نے انہیں مقاصد کی اشاعت کی خاطر ، برہمو سماج کے قیام (۱۸۲۸) سے بھی پہلے ۱۸۲۲ء میں '' مراۃالاخبار ،، جاری کیا ۔ کلکتے کا ہندو کالج بھی جس کا ذکر ابھی اوپر آیا ہے اور جس کے بانی خود راجہ رام موہن رائے تھے ، ان کے انہیں مقاصد کی تکمیل کی ایک کوشش تھی ۔ یہ کالج ، ہندوؤں کی مشترکہ کوششوں سے ، انیسویں صدی کے نصف اول تک، ہر طرح ان کی تعلیم و ترقی کا مظہر اور علمبردار بن گیا تھا کیپٹن ٹرنر (Captain Turner) نے ۲۴ مارچ ۱۸۳۲ء میں اس کالج کے قیام کے پس منظر پر روشنی ڈالتے ہوئے پارلیمنٹ کی کمیٹی کے سامنے بیان دیا تھا کہ :

'' کلکتے کے ہندوؤں نے انگریزی جاننے میں بے پناہ دلچسپی کا اظہار کیا ہے اور اس کے لئے اخراجات برداشت کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ۔ چنانچہ اسی مقصد کے لئے ان کو اساتذہ کے حصول میں خاص مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ۔ انہوں نے ۱۸۱۶ء میں بغیر سرکاری امداد کے خود اپنے خرچ سے انگریزی تعلیم کے لئے ایک کالج کی بنیاد رکھ دی ۔،، ۵۱

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے برعکس ہندوؤں میں انگریزی سیکھنے اور اس طرح نئی حکومت اور نئے حکمرانوں سے فائدہ اٹھانے کا

۵۰ ۔ بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی (۱۷۵۷ء - ۱۸۵۷ء) عبداللہ ملک ، مجلس ترقی ادب ، لاہور ، ۱۹۶۷ء ، ص ۲۳۶

۵۱ ۔ صد سالہ جہد آزادی ، ص ۲۲۶

کتنا گہرا جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ ہر چند کہ انگریزی حکومت اور اس سے پہلے بھی ہندوؤں کے ذریعۂ معاش کے تین خاص پیشے تھے ایک تجارت، دوسرے سود پر روپیہ اٹھانا، تیسرے ملازمت۔ تینوں سے انھوں نے خوب کمایا اور ہر زمانے میں اقتصادی طور پر مضبوط رہے۔ لیکن مسلمانوں کے سیاسی زوال، اور ایسٹ انڈیا کے جمتے ہوئے قدم کے ساتھ، انھیں دونوں ہاتھوں سے پیسہ بٹورنے اور جائز و ناجائز طریقوں سے دولت جمع کرنے کا موقع مل گیا۔ ہندوؤں کی شروع سے یہ کوشش رہی کہ زندگی کے مختلف شعبوں پر مسلمانوں کا جو تھوڑا بہت اثر و رسوخ باقی ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح ختم کر دیا جائے، تاکہ ان کے لئے لوٹ کھسوٹ کی راہیں اور کشادہ ہو جائیں۔ چنانچہ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگالی کاشتکاروں کی شکایت پر، بعض انگریزوں اور ہندو آڑھتیوں کی اجارہ داریوں کو روکنا چاہا تو ہندوؤں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ دسمبر ۱۸۳۹ء میں کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا۔ اس جلسے کے داعیان میں سربرآوردہ ہندو دوارکا ناتھ ٹیگور، رام موہن رائے، وادھا مہا دیو منرجی، رگھو رام گھوش، پرما ناتھ دیو، رام رتن بوس، رام چندر بوس، رادھا کرشنا، کرشنا موہن داس پورال، کالی ناتھ رائے اور رام ناتھ ٹیگور وغیرہ شامل تھے۔ اس میں دوارکا ناتھ نے جو تقریر کی تھی، اس کی چند سطریں دیکھئے :۔

> ”نیل کی کاشت سے زمیندار اور کاشتکار دونوں کو فائدہ پہنچا ہے یہ درست ہے کہ بعض انگریز زمینداروں نے جو نیل کے کھیتوں کے مالک تھے زیادتیاں کی ہیں لیکن ایسے زمینداروں کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ اور مجموعی طور پر ان کی وجہ سے فائدہ ہی پہنچا ہے۔ نیل کی کاشت اور اس کی تجارت سے خود ان کو اور ان کے کئی عزیزوں کو بہت فائدہ پہنچا ہے اس لئے اگر انگریز تاجروں پر سے پابندیاں اٹھا لی جائیں اور انگریزوں کے سرمایہ ذہانت اور ان کی صنعتی استعداد کو پوری طرح بروئے کار آنے کا موقع دیا جائے تو اس سے کہیں زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے لیکن یہ اسی صورت میں ہو

سکتا ہے کہ یورپی لوگوں کو یہاں آنے کی اور کاروبار کرنے کی پوری آزادی ہو۔''۵۲

اس جلسے میں ایک قرار داد اس امر کی منظور کی گئی کہ انگریزوں کو ہندوستان میں تجارت کرنے کے لئے ہر قسم کی آزادی اور سہولت دی جائے۔ اسی جلسے میں راجہ رام موہن رائے نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ یورپین کو ہندوستان میں آنے اور کاروبار کرنے کی جتنی آسانیاں ہوں گی، اتنا ہی ہمیں سماجی، ثقافتی اور سیاسی طور پر فائدہ پہنچے گا۔ اس سے واقعی ہندوؤں کو فائدہ پہنچا۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے مشترکہ سرمایہ کاری سے تجارتی کمپنیاں قائم کرنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے ایک ہندو تاجر دوارکا ناتھ ٹیگور ہی نے ''ٹیگور اینڈ کمپنی'' کے نام سے کلکتہ میں، انگریزوں کے اشتراک سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا۔ یہ اس علاقے کا ذکر ہے جہاں انگریزوں کا تسلط پوری طرح مستحکم ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے یہ بیرونی اقتدار ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قدم جماتا گیا ویسے ویسے اس علاقے کے ہندوؤں کے تعلقات، حکومت کے ساتھ استوار ہوتے گئے اور ۱۷۵۷ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کے درمیانی سو سال میں، انگریزوں کی در پردہ اور کھلم کھلا طرفداری و اعانت کے سبب، ہندو، ہر اعتبار سے اتنے طاقتور ہوگئے کہ مسلمان، ان کی نگاہوں میں حقیر و بے وقعت ہوگئے، مسلمانوں کے ساتھ جن کا رویہ ایک عینی شاہد اور سندھیا دربار کے ریزیڈینٹ ٹی۔ ڈی۔ بروگٹن (T. D. Broughton) کی تحریر مرقومہ ۱۸۰۹ء کے مطابق ۱۸۵۷ء سے پہلے تک یہ تھا کہ:

''مرہٹے محرم کا تہوار، احترام کے ساتھ منایا کرتے تھے جب فروری ۱۸۰۹ء میں ہولی کا تہوار محرم کے دنوں میں پڑا تو اس موقع پر انھوں نے ناچ مجرا سے احتراز کیا، جو ہولی کا ایک لازمہ تھا۔ ریاست کا ہر باشندہ جس میں خود مہاراجہ بھی شامل تھا۔ ایک فقیر کی طرح محرم میں سبز رنگ کا لباس پہنتا تھا اور تعزیہ دیکھنے

۵۲۔ انڈین گزیٹیر، کلکتہ آف ۳ دسمبر، ۱۹۳۹ء، بحوالہ صد سالہ جہد آزادی، ص ۲۲۵

جایا کرتے تھے۔''٥۳

وهی هندو، مسلمانوں کے عہد حکومت اور ان کے وجود کو هندوستان میں عذاب سے تعبیر کرنے لگے۔ عام هندوؤں سے قطع نظر راجہ رام موهن رائے جیسے روشن خیال هندوؤں نے بھی یہی رویہ اختیار کیا۔ انھوں نے ۱۸۲۳ء میں دوسرے هندوؤں کی طرح، مسلمانوں کی سیاسی برتری سے کلی طور پر نجات پانے کے لئے شاہ برطانیہ کے حضور میں، مسلمانوں کے خلاف ایک عرضداشت گذاری اس میں انھوں نے لکھا :-

''هندوستان کا بڑا حصہ کئی صدیوں سے مسلمان حکمرانوں کے زیر نگیں چلا آرها ہے اور اس حکومت میں هندوستان کے اصل باشندوں کے شہری حقوق اور مذہبی حقوق کو پاؤں تلے روندا جا رها ہے۔ بالاخر مسلمان حکمرانوں کے ان مظالم سے تنگ آکر دکن اور پنجاب میں مرہٹوں اور سکھوں نے بغاوتیں کر دیں اور اپنی حکومتیں قائم کر لیں۔ لیکن بنگالی چونکہ جسمانی طور پر کمزور تھے وہ اسلحہ اٹھانے سے گریز کرتے تھے اس لئے وہ اس پورے دور میں مسلمان حکومتوں کے وفادار رهے حالانکہ ان کی جائدادیں تباہ و برباد کی جاتی رهیں۔ ان کے مذهب کی توهین هوتی رهی۔ ان کے بے گناهوں کا خون بہایا جاتا رها۔ بالاخر قدرت نے رحم کیا۔ اور انگریزوں کو مامور کیا۔ وہ بنگالیوں کو اس غلامی سے نجات دلائیں اور اپنی پناہ میں ان کو لے لیں۔ میں اپنے مضمون کو ختم کرنے سے پہلے، خدا کا شکر ادا کرنا چاهتا هوں کہ اس نے خلاف توقع، اس ملک کو پہلے حاکموں سے نجات دلائی اور انگریزوں کے ماتحت کیا۔ ایک ایسی قوم کے ماتحت جو شہری اور سیاسی آزادی کی حامی هی نہیں بلکہ اس کا مقصد سیاسی اور معاشرتی مسرتوں میں اضافہ کرنا ہے اور علوم و مذاهب میں آزادانہ تحقیق و تدقیق کو رواج دینا

٥۳ - انگریزی عہد میں هندوستان کے تمدن کی تاریخ، العلامہ عبداللہ یوسف علی، کریم سنز، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۱۰۱

ہے ۔۵۴"

اس طرح کے اور نہ جانے کتنے الزامات ہیں جو انگریزوں اور ہندوؤں کی طرف سے ، مسلمانوں پر ان کی سیاسی و اقتصادی بد حالی کے سبب لگائے گئے ہیں ورنہ یہی انگریز تھے جنھوں نے اورنگ زیب عالمگیر سے دست بستہ اپنے قصور کی معافی چاہی تھی اور بڑی خوشامدوں کے بعد مغل حکمرانوں سے کاروبار کرنے کی اجازت حاصل کی تھی اور وہی ہندو تھے جنھوں نے پچھلے ہزار برسوں میں مسلمانوں کی حکومت کو اپنے لئے رحمت جانا تھا اور ہر موقع پر ان کے گن گاتے تھے لیکن مسلمانوں کے حالات اب بدلے ہوئے تھے اس لئے ہندوؤں کو بھی بدلتے ہوئے دیر نہ لگی ، پہلے جو مسلمانوں کی خیر خواہی پر فخر کرتے تھے وہ اب انگریزوں کا دم بھرنے لگے ، اور ان کی خوشنودی اور اپنی منفعت کی خاطر ، مسلمانوں کے بد خواہ بن گئے ۔

مسلمانوں کا معاملہ ، اس کے برعکس تھا ۔ وہ ہندوستان کے حاکم رہ چکے تھے اور انگریزوں نے ہندوستان کی سلطنت انہیں سے چھینی تھی ۔ اس لئے ان کا غم تازہ اور ان کا مزاج شاہانہ تھا ، ان کا دل ، انگریزوں کی غلامی پر رضامند ہونے کو تیار نہ تھا اور اگر بعض سازشی اور غدار بنگالی ہندو سراج الدولہ کو سنہ ۱۸۵۷ء میں دھوکا نہ دیتے تو شاید ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت ہی قائم نہ ہوتی ، لیکن اب جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا تھا انگریزوں اور ہندوؤں کی متحدہ سازش نے انہیں ہر اعتبار سے کچل کر رکھ دیا تھا ۔ سنہ ۱۸۵۷ء کے بعد تو مسلمانوں کے سامنے تا حد نظر اندھیرا تھا ۔ بے بسی اور مایوسی کا اندھیرا ۔ اس اندھیرے میں جو شخص سب سے پہلے روشنی کی کرن بن کر رونما ہوا وہ سر سید احمد خاں تھے ۔

سر سید احمد خان (۱۸۱۷ — ۱۸۹۸) نے برصغیر کی تاریخ کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا ۔ ان کی نظر اس سلسلے میں بڑی دور رس اور دوربین تھی مسلمانوں کی ہمدردی اور عام انسانوں کی بہی خواہی بھی ان کے مزاج میں

۵۴ ۔ بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی ، ص ۲۰۱

طبعی تھی - وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے اور سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے کے آغاز کے وقت بجنور میں تھے - بغاوت کے جرم میں ہندوستانیوں خصوصاً مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ڈھایا جا رہا تھا، اسے وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے - ان کے خاندان کے بہت سے لوگ اس میں مارے گئے تھے اور وہ خود بھی موت کے منہ سے بال بال بچے تھے - صورت حال کچھ اتنی بھیانک اور سفاک تھی، اس کے خلاف آواز اٹھانے کی کسی میں ہمت نہ تھی - لیکن سر سید احمد خان کا دل ہم وطنوں کی تباہیوں پر تڑپ اٹھا - انھوں نے سرکاری ملازمت کے چھٹنے کا خوف کئے بغیر بڑی دانش مندی اور جرأت سے انگریزوں کے انتقامی جذبات کو دبانے کی کوشش کی - جب انھوں نے دیکھا کہ انگریز بغیر کسی تحقیق کے اور بغیر کسی جرم کے، عورتوں، بچوں اور معذوروں، سب کو قتل کرنے پر آمادہ ھیں تو انھوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور انگریزوں کو اس بات پر رضامند کر لیا کہ سزا صرف انھیں ملنی چاھئے جو اب بھی بغاوت پر آمادہ ھیں - باقی کو بے قصور ٹھہرا کر امن و سکون سے اپنے گھروں میں رھنے کی اجازت دی جائے - اس طرح بر وقت مداخلت کر کے انھوں نے بے شمار ہم وطنوں کی جان بچالی - دوسرا جرأت مندانہ کام انھوں نے یہ کیا کہ سنہ ۱۸۵۹ء میں ''اسباب بغاوت ھند'' کے نام سے ایک رسالہ لکھا اور اس میں انھوں نے دلائل سے یہ ثابت کیا کہ سنہ ۱۸۵۷ء کے واقعہ کی ذمہ داری، عوام سے کہیں زیادہ حکومت پر عائد ھوتی ھے - اس سلسلے میں انھوں نے کئی واقعات اور کئی اھم نکتے بطور دلیل پیش کئے - مسلمانوں کی طرف سے، انگریزوں کو جو بد گمانیاں پیدا ھوگئی تھیں ان کا خاص طور پر ازالہ کیا -

اس کے بعد سر سید احمد خاں نے، قومی خدمت کو اپنی زندگی کا مشن بنا لیا ان کی زیادہ توجہ اس ضمن میں تعلیم کی اشاعت کی جانب رھی اس لئے کہ ان کے نزدیک تعلیم کے بغیر، سچی قومی یا ملکی ترقی ممکن نہ تھی - چنانچہ انھوں نے سنہ ۱۸۶۲ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی - ۱۸۶۶ء میں علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے ایک ھفتہ وار اخبار نکالا، اور اسی سال

برٹش انڈین ایسوسی ایشن کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد رکھی۔ ۵۵ ان سب کا مقصد ، نسل و مذہب کا امتیاز کئے بغیر عوام کی خدمت تھا اور ان سب میں ان کی کوششوں سے ہندو مسلمان دونوں برابر کے شریک رہے۔ لیکن اسی اثنا میں یہ ہوا کہ ہندوؤں نے اپنی ابھرتی ہوئی قومیت کے جوش اور انگریزوں کی خدمت و خوشامد کے بدلے حاصل کی ہوئی طاقت کے زعم میں اردو کی مخالفت شروع کر دی۔ وہی اردو جسے ایک مدت سے ہندوستان کی لنگوا فرینکا کی حیثیت حاصل تھی اور جسے ہندی مسلم تہذیب کا سنگم و ستون خیال کیا جاتا تھا ، سیاسی اغراض کے پیش نظر ، ہندوؤں کی نظر میں کھٹکنے لگی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جیسے ہی ہندوستان پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے بجائے تاج برطانیہ کا سایہ ان کے سروں پر قائم کیا ، عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی کوششیں شروع کر دی گئیں۔

یہ کوششیں ، صرف رجعت پسند یا پرانے خیال کے ہندوؤں کی طرف سے نہ تھیں بلکہ اس کام میں وہ انگریزی تعلیم یافتہ پیش پیش تھے جنھیں وسیع النظر اور روشن خیال سمجھا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ان میں وہ لوگ بھی شریک تھے جو خود اردو کے ادیب و مصنف تھے ، کچھ دنوں پہلے تک ، اردو کو ہندو اور مسلمان دونوں کی مشترک زبان جانتے تھے اور اس میں قابلیت پیدا کرنے پر فخر محسوس کرتے تھے ، لیکن سیاسی حالات کی تبدیلی کی بدولت ان میں ہندو قومیت کا جو نیا احساس پیدا ہو چلا تھا ، اس نے انھیں ہندی کے نام سے ایک قومی زبان کو بھی جنم دینے کی ترغیب دلائی۔ گویا فورٹ ولیم کالج میں اردو کے خلاف اور ہندی کی ایجاد و ترویج کے سلسلے میں جو کام در پردہ شروع ہوا تھا وہ پچاس سال کے بعد بالاعلان ہندوؤں کی سیاسی و قومی اغراض کے حصول کا وسیلہ بن گیا۔

اردو کے خلاف ، ہندی کی یہ تحریک پہلے پہل بنارس کے ہندوؤں کی طرف سے اٹھائی گئی اور وہیں اس تحریک کا پہلا مرکز قائم ہوا۔ سر سید احمد خاں

۵۵ - حیات جاوید ، آئینہ ادب ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۵۲

اس زمانے میں بنارس ھی میں تھے اور پڑھے لکھے ھندوؤں نے اردو کے خلاف جو شورش بپا کر رکھی تھی وہ اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رھے تھے۔ اس سے پہلے ان کا خیال تھا کہ ھندو اور مسلمانوں کے درمیان جو اختلاف پیدا ھو گئے وہ ماضی قریب کے سیاسی و اقتصادی حالات کے تغیر کا نتیجہ ھیں جیسے ھی حالات معمول پر آئیں گے دونوں قومیں، پہلے کی طرح پھر ایک ھو جائیں گی۔ لیکن جب ھندوؤں کی طرف سے ایک جانی بوجھی سیاسی چال کے تحت، اردو کو ھٹا کر ھندی کو سرکاری کرسی پر بٹھانے کی کوششیں شروع ھوئیں اور ان کوششوں نے ھر طرف سے زور پکڑا تو ھندو مسلم اتحاد کی طرف سے وہ مایوس ھو گئے۔ ان کو یقین ھو گیا کہ اب وہ ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتے اور ان میں یگانگت و اشتراک عمل کی وہ صورت زیادہ عرصے تک برقرار نہیں رہ سکتی جو ایک مدت سے چلی آرھی تھی۔ چنانچہ سرسید کے سوانح نگار و رفیق کار اور حد درجہ معتبر و ثقہ راوی مولانا الطاف حسین حالی نے، اس سلسلے میں سرسید کا ایک قول نقل کرتے ہوئے لکھا ھے:

”سنہ ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سر برآوردہ ھندوؤں کو یہ خیال پیدا ھوا کہ جہاں تک ممکن ھو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو اور فارسی خط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ھو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سرسید کہتے تھے ”یہ پہلا موقع تھا جبکہ مجھے یقین ھو گیا تھا کہ اب ھندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ھے،،۔ ان کا بیان ھے: ” انہیں دنوں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رھا تھا اور وہ متعجب ھو کر میری گفتگو سن رھے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ھے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ھے اس سے پہلے تم ھمیشہ ھندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاھر کرتے تھے۔

میں نے کہا کہ اب مجھ کو یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اس پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔۵۶

سر سید احمد خاں نے یہ بات ھندوؤں کے ساتھ رہ کر برسوں کام کرنے، ان کی سیاسی اور لسانی سرگرمیوں کے گہرے مشاھدے، اور ذاتی تجربے کی بنا پر کہی تھی۔ اردو کی مخالفت، جیسا کہ خود سر سید احمد خان اور حالی نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ عام ھندو کی طرف سے نہیں بلکہ اس خاص طبقے کی طرف سے کی جا رہی تھی جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے سبب، اردو کی مقبولیت، اس کی ھمہ گیری اور تہذیبی قوت سے خوب واقف تھا، وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اردو کے مقابلے میں ھندی، کم سن و کم سواد ہے۔ اس کے باوجود اکثریت کے زعم اور حکومت کی شہہ پر، وہ ھندی کو عدالتی اور سرکاری زبان بنانا چاہتے تھے۔ ھندی کے حامی اس خاص طبقے میں سر سید کے وہ ھندو احباب بھی شامل تھے جو روشن خیال کہلاتے تھے۔ صبح و شام سر سید کے ساتھ رہتے تھے اور ان کی بنا کردہ رفاھی انجمنوں کے سر گرم رکن تھے۔ چنانچہ اردو کی مخالفت میں پہلا پتھر، سر سید احمد خاں کے ایک رفیق کار بابو شیو پرشاد کی طرف سے پھینکا گیا۔ بابو شیو پرشاد، سرسید احمد خاں کی سائنٹفک سوسائٹی کے ایک معتبر ممبر تھے۔ انھی نے سب سے پہلے اس بات کا مطالبہ کیا کہ سائنٹفک سوسائٹی کے اجلاسوں کی روئدادیں اور کارروائیاں، ھندی میں شائع کی جائیں، نیز ھندی کے فروغ کے لئے سوسائٹی کی جانب سے ایک رسالہ جاری کیا جائے، پھر انھی کی کوششوں اور انھی کے منشا سے،

۵۶۔ حیات جاوید، آئینہ ادب، لاھور، ۱۹۶۶ء، ص ۱۶۳-۱۶۴

صوبہ شمالی و مغرب میں ھندی کے رواج کے لئے متعدد عرضداشتیں حکومت کو بھیجی گئیں ۔۵۷

بابو شیو پرشاد ، کئی زبانوں میں لکھتے تھے۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب ۱۸۵۴ء کے تعلیمی مراسلے (Wood Despatch) پر مبنی تعلیمی پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کا وقت آیا اور برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی ضرورتوں کے تحت ، انگریزی تعلیم کے ساتھ ، مقامی زبانوں خصوصاً اردو کو بھی اھمیت دی تو ابتدائی و ثانوی مدارس میں اردو کو دوبارہ ذریعہ تعلیم بنانے کے لئے جدید طرز کی نصابی کتابوں کی ضرورت بھی محسوس کی گئی ۔ چنانچہ سائنٹفک سوسائٹی اور بعض دوسرے اداروں کی طرف سے اس سلسلے میں جو کتابیں مرتب کی گئیں یا جن کے ترجمے کئے گئے ان میں سب سے زیادہ کتابیں تنہا بابو شیو پرشاد کی تھیں۔۵۸ یہی شیو پرشاد بعد کو کھل کر سامنے آگئے ۔ انھوں نے ھندی زبان میں ھندوستان کی ایک تاریخ ۱۸۶۴ء میں لکھی تھی ۔ اس تاریخ میں اور اس کے بعد ۱۸۸۲ء میں تعلیمی کمیشن کے سامنے انھوں نے ھندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں جو کہا اس کا خلاصہ فرانسس رابنسن (Francis Robinson) نے اپنی معرکہ آرا تازہ کتاب مطبوعہ ۱۹۷۴ء میں دے دیا ھے نیز اس کی بھی وضاحت کر دی ھے کہ یہ نقطۂ نظر صرف شیو پرشاد کا ھے ۔ بیشتر ھندو اس سے مختلف رائے رکھتے تھے ۔ بابو شیو پرشاد کے نقطۂ نظر کے مطابق :

"For Hindus and Muslims, the question of Language and Script had a more than ordinary significance. For Hindus, Hindi was a language purged of all the Arabic and Persian accretions which served to remind them of the Muslims supremacy while the Nagri Script had a religious significance as the character which Brahmans used and in which Sanskrit was written. For Muslims on the other hand Hindi was dirty and they thought most degrading to learn it. Muslims did not particularly like Urdu, that is Hindi with Arabic and Persian accretions, but in the second half of 19th Century,

۵۷ - دی مسلمس آف برٹش انڈیا ، کیمبرج ، ۱۹۷۳ء ، ص ۱۳۲

۵۸ - سیپریٹ‌ازم امنگ انڈین مسلمس ، ص ۳۶

Urdu and the Persian Script in which it was written became a symbol of Muslim power and influence; and they came to bestow upon it an almost religious significance. It was the dominant language. In 1837 it had given a great phillip when replaced Persian as the language of Govt. Indeed so rapid was its growth that by 1863, out of twenty three newspapers published in the province, seventeen were in Urdu and only four in Hindi and a Hindu revivalist School Inspector was compelled to admit that Urdu is now becoming our mother tongue."[59]

یہاں شیو پرشاد نے یہ ظاہر کرکے کہ "صوبے کے تیس اخباروں میں سترہ اردو کے اور صرف چار ہندی کے ہیں"، اور یہ کہہ کر "اردو اپنی برتری و اہمیت کی بنا پر ہندوؤں کی مادری زبان بننے والی ہے"۔ خود بھی اس بات کا واضح اعتراف کیا ہے کہ اردو کی مقبولیت، ہندی کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس کے باوجود، ان کی مذہبی و قومی تنگ نظری نے انھیں اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ اردو کو اس کی ہردل عزیزی کی بنا پر ہندو اور مسلمانوں کی مشترک زبان مان لیتے۔ چنانچہ یہی کہنا پڑتا ہے کہ شیو پرشاد نے صرف قومی تعصبات کی بنا پر ہندی کی طرفداری اور پرچار کا بیڑہ اٹھایا، انھوں نے اس سلسلے میں جس ہندو قوم پرست انسپکٹر آف اسکول کا ذکر کیا ہے وہ بھی غالباً خود انھی کی ذات تھی اس لئے کہ بنارس کے سرکل میں وھی اس عہدے پر فائز تھے۔۶۰

سرسید کے قریبی ہندو دوستوں میں راجہ جے کشن داس بھی اردو کی مخالفت میں بہت سرگرم تھے۔ راجہ کشن داس علی گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور سرسید احمد خان ان پر اس قدر اعتماد کرتے تھے کہ جب ان کا تبادلہ اگست ۱۸۶۷ء میں جج کی حیثیت میں علی گڑھ سے بنارس ہوگیا تو وہ سائنٹفک سوسائٹی کا سارا کاروبار راجہ صاحب کے سپرد کر گئے۔۶۱ بعد کو

۵۹ - سیپریٹ‌ازم امنگ انڈین مسلمس، کیمبرج، ۱۹۷۴ء، ص ۷۰

۶۰ - سیپریٹ‌ازم امنگ انڈین مسلمس، کیمبرج، ۱۹۷۴ء، ص ۷۲

۶۱ - حیات جاوید، مولانا حالی، ص ۱۰۷ — اور "سرسید احمد خاں"، مولوی عبدالحق، ص ۱۴۳

یہی جے کشن داس تھے جنھوں نے اردو ہندی کے تنازع میں مجتہدانہ انداز سے ہندی کی طرفداری کی۔ رابنسن کے الفاظ ہیں :

"Raja Jai Kishan Das, the acting Secretary of the Aligarh Scientific Society, and one of Syed Ahmed Khan's closest friends, began to urge the cause of Hindi and the Nagri Script in every possible way; he pressed for abolition of Urdu in Government Offices; he placed a Pandit at the Service of the Aligarh High School, and he campaigned for the establishment of Sanskrit College. Eventually, he resigned from the Aligarh Scientific Society on the grounds that he was about to be stationed at Allahabad, but this did not prevent him from becoming Secretary of the Indian Sanskrit Association at Hathras, a few miles from Aligarh."62

سر سید احمد خاں ۱۵۔ اگست ۱۸۶۷ء سے لے کر اپنی ملازمت کے آخری زمانے یعنی جولائی ۱۸۷۶ء تک قیام انگلستان کے ڈیڑھ سال کو چھوڑ کر، بنارس ھی میں رھے ۔۶۳ اور اپنے سارے اہم کاموں کا آغاز یہیں سے کیا۔ ان کے قابل اعتماد ہندو دوست بھی بیشتر یہیں تھے، اور انہی دوستوں سے وہ توقع رکھتے تھے کہ وہ اپنی روشن خیالی کے سبب، ہندو مسلم اتحاد کے ذریعے، آئندہ ہندوستان کی فلاح کے لئے کوشش کریں گے، لیکن بہت جلد انھوں نے یہ محسوس کر لیا کہ یہ محض ان کی خوش گمانی ھے۔ اس لئے کہ بنارس، رفتہ رفتہ ان سازشوں اور سرگرمیوں کا مرکز بنتا جا رھا تھا جو ہندوستان کے مختلف علاقوں میں مسلمانوں اور اردو کے خلاف جاری تھیں، اور ان سرگرمیوں میں ان کے قریب ترین ہندو دوست بھی شریک تھے۔ اس سلسلے میں ان کو پہلا ذاتی تجربہ غالباً ورنا کولر یونیورسٹی کی تحریک کے موقع پر اس وقت ھوا جب ۱۸۶۷ء میں سر سید احمد خاں نے وائسرائے اور گورنر جنرل کو ایک درخواست برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے بھیجی۔ اس درخواست کا خلاصہ یہ تھا کہ ایک اعلیٰ درجے کا ایسا تعلیمی ادارہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم و امتحان کا انتظام مقامی زبان میں ھو، اور

۶۲ - سیپریٹ‌ازم امنگ انڈین مسلمس، ص ۷۳

۶۳ - حیات جاوید، ص ۱۵۸

جس میں اسی قسم کی علمی اسناد دی جایا کریں جیسی انگریزی خواں طلبہ کو دی جاتی ہیں یا یہ کہ ایک اردو فیکلٹی، کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کی جائے یا شمالی مغربی اضلاع میں ایک جدا یونیورسٹی دیسی زبان کی قائم ہو۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا تھا کہ اس غرض کے لئے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہوگا سائنٹفک سوسائٹی، علی گڑھ، انجام دے گی۔۶۴

اس درخواست پر بہت سے ہندوؤں کے بھی دستخط تھے، اور جن خاص خاص آدمیوں نے انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرنے کی حامی بھری تھی ان میں بھی بابو شیو پرشاد، جے کشن داس، ماسٹر پیارے لال اور دھرم نرائن وغیرہ شامل تھے۔ اس درخواست پر حکومت نے خاصی توجہ دی تھی، لیکن بعض دوسری باتوں کے ساتھ بڑی رکاوٹ یہ پیدا ہوگئی کہ بنارس کے ہندوؤں کی طرف سے اس کی مخالفت شروع ہوگئی۔ اردو کے مخالفین نے اخبارات میں اس بات کا مطالبہ کردیا کہ اس مجوزہ یونیورسٹی میں مسلمانوں کے لئے اردو زبان اور ہندوؤں کے لئے ہندی زبان مخصوص کی جائے۔ اگرچہ بقول مولانا حالی یہ بات درخواست دینے سے پہلے ہی طے پا چکی تھی کہ ہندی زبان، سردست علمی و ادبی کتابوں کے ترجموں کی، صلاحیت نہیں رکھتی اور اس میں اعلیٰ درجے کی تعلیم و تدریس نہیں ہو سکتی۔ اس کے باوجود ناگہاں ہندی کا مطالبہ کیا گیا۔۶۵ ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ کسی طرح بھی قابل قبول اور قابل عمل نہ بن سکتا تھا، اس لئے اردو یونیورسٹی کی تحریک بھی، ہندوؤں کی رخنہ اندازی کے سبب، کھٹے میں پڑ گئی۔ البتہ اس قسم کے واقعات سے سر سید احمد خاں کو ہندوؤں کے تعصب کا پورا اندازہ ہوگیا، اور انہیں ۱۸۶۷ء میں، بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر کے سامنے، اپنے اس یقین کا اظہار کرنا پڑا کہ اب دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔۶۶

۶۴ - حیات جاوید، ص ۱۵۸

۶۵ - حیات جاوید، ص ۱۶۱

۶۶ - حیات جاوید، ص ۱۶۴

اوپر بیان کئے ہوئے اس پس منظر میں ۱۸۶۷ء کا سال، ھندی اردو تنازع کے آغاز کا سال قرار پاتا ھے۔ اس سے انکار نہیں کہ اردو کی مخالفت اور ھندی کے پرچار کا در پردہ کام اگرچہ پچاس ساٹھ سال پہلے شروع ھو گیا تھا لیکن اجتماعی سطح پر ھندوؤں کی طرف سے اس کا اظہار اس سے پہلے نہ ھوا تھا۔ اس کا پہلا بیج، بنارس کی سرزمین پر بویا گیا اور اس بیج سے اختلاف کا جو درخت نمودار ھوا وہ سب سے پہلے ۱۸۶۷ء میں سر سید احمد خاں کی توجہ کا مرکز بنا۔

ہندی اردو تنازع کا آغاز
اور
قومی نظریے کی پہلی نمود

(۱۸۵۷ء تا ۱۸۷۰ء)

اردو ہندی قضیے کے نتیجے میں ، سر سید احمد خان نے ، ہندو مسلم اتحاد کی طرف سے مایوس ہو کر ، ۱۸۶۷ء میں جو پیشین گوئی کی تھی وہ لفظ بہ لفظ صحیح ثابت ہوئی - جیسے جیسے اردو ہندی کا اختلاف بڑھا ، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ، فاصلہ بھی بڑھتا گیا - دیکھتے ہی دیکھتے ، جن دو تہذیبی دھاروں نے ہزار سال کے ملاپ کے نتیجے میں ایک سنگم کی صورت اختیار کرلی تھی ، الگ الگ بہنے لگے ، ہندو اور مسلمان ، دو مختلف قوموں کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے ، زندگی کے ہر شعبے میں ایک دوسرے کے مد مقابل بن گئے ، اس دوری اور صف آرائی کے ذمہ دار ، مسلمان نہیں ، سراسر ہندو تھے ، اس لئے کہ اردو ہندی کے جھگڑے کی ابتدا انہیں کی طرف سے ہوئی تھی ، اور ہندو مسلم اتحاد کے سبب سے قدیم و مضبوط رشتے ''اردو'' کو توڑنے بلکہ کاٹ کر پھینکنے کی کوشش انہی کی جانب سے کی گئی تھی - یہ کوششیں چونکہ خاص سیاسی مصلحتوں کی بنا پر ، حکومت کے اشارے پر کی جا رہی تھیں ، اس لئے مسلمانوں ، خصوصاً سر سید احمد خاں کی صلح جویانہ کوششوں کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا اور اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں ۱۸۵۷ء کے بعد جو تحریک ہندوؤں کی طرف سے شروع کی گئی ، اس میں روز بروز شدت پیدا ہوتی چلی گئی -

اردو کے خلاف ابتدائی مرکز ، بنارس میں قائم ہوا پھر اس مرکز کی شاخیں مختلف علاقوں اور صوبوں میں قائم کی گئیں - تھوڑے ہی دنوں میں ،

جگہ جگہ ، اردو کے خلاف ہندی کے حمایتی ادارے وجود میں آگئے ، یہ کام اگرچہ پچھلے کئی برسوں سے کیا جا رہا تھا لیکن جب بنارس کے ہندوؤں نے اجتماعی حیثیت سے قومی مسئلے کے طور پر ، اردو کی مخالفت میں تقریر و تحریر کا سلسلہ شروع کیا تو سر سید احمد خاں اور ان کی معرفت پر بعض دوسرے مسلمانوں کو ہندوؤں کی اس جارحیت کے خلاف آواز بلند کرنی پڑی ۔ لیکن ہندوؤں نے مسلمانوں کے احتجاج کی کوئی پروا نہیں کی ۔ اردو کے خلاف ان کی شورشیں برابر بڑھتی گئیں ، چنانچہ ۱۸۶۰ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیانی چالیس برسوں میں ، اردو ہندی تنازع کے سوا ، اور کوئی ایسا مسئلہ یا موضوع نظر نہیں آتا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتنی شدت سے مسلسل زیر بحث رہا ہو ، چونکہ یہ بحث ہندوؤں کی ہٹ دھرمی کے سبب علمی و لسانی دائروں سے آگے بڑھ کر ، سیاسی رنگ اختیار کر گئی تھی ، اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات پر اس نے گہرا اثر ڈالا ۔ دونوں کے سوچنے کا انداز ایسا بدلا کہ ان کی سیاسی منزلیں ایک دوسرے سے بالکل الگ ہو گئیں ۔

سر سید احمد خاں نے ۱۸۶۷ء میں جس ہندی اردو قضیے کی طرف اشارہ کیا تھا ، اس میں ، ہندوؤں کی طرف سے بحث میں حصہ لینے والے خصوصیت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندو تھے اور ان سب نے اس کام کے لئے خود کو ایک تنظیم کی صورت میں ڈھال لیا تھا ۔ مسلمانوں میں البتہ ، اس مسئلے کی اہمیت اور نزاکت کو محسوس کرنے والا ، سر سید کے سوا کوئی نہ تھا ۔ سر سید ہی نے مسلمانوں کی طرف سے سب سے پہلے ، ہندوؤں کی اس سیاسی چال یا لسانی تحریک کو سمجھا اور اس کی بحثوں میں حصہ لیا ۔ لیکن اپریل ۱۸۶۹ء میں سر سید احمد خاں ، پونے دو برس کے لئے انگلستان چلے گئے ۔ ان کے جانے سے مسلمانوں ، خصوصاً اردو کے حامیوں میں ایک خلا سا پیدا ہو گیا ۔ ہندوؤں نے اس زمانے میں بڑے طوفان بپا کئے ۔ مولانا الطاف حسین حالی کا بیان ہے کہ :

”بنارس میں ، بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر اردو کے خلاف پہلی مجلس قائم ہوئی ، یہیں سے چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی ، رفتہ رفتہ اس کے لئے کمیٹیاں ، مجلسیں اور سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہو گئیں ،

ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم کی گئی جس کے ماتحت تمام مذکورہ بالا اور سبھائیں قائم ہوئیں۔''[1]

لیکن ''ہندو قومیت کے احیا کی وہ سبھائیں جن کی توجہ دلانے پر، ایک قومی زبان کی ضرورت محسوس کی گئی اور اردو کے بجائے ہندی کو سرکاری دفتروں میں رائج کرنے کی کوشش کی گئی، ان سبھاؤں میں قدیم ترین راجہ رام موہن رائے کی برھمو سماج تھی جو ۱۸۲۸ء میں قائم ہوئی تھی، پچھلے باب میں، راجہ رام موہن رائے اور ان کارناموں کا ذکر، قدرے تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ فرانسس رابنس نے انیسویں صدی کی ہندو تحریکوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"From the early nineteenth century, Hindus in different parts of India had been attempting to reinterpret and reform their religion and reinforce and reform their society in the light of the new world of learning and the spirit with which they came into contact through the state education system and the activities of Christian missionaries. The movements inspired by these Hindus, and the reactions they stimulated among orthodox Hindus, were the basis of Hindu revivalism.

Major organisations representing various solutions to the intellectual and spiritual Problems set by British rule developed in different places. They also developed at different times, a new organisation often being stimulated by contact with reforming influences from another part of India. The first was the Brahmo Samaj founded in Calcutta in 1828. In 1867, the sermons of the Samaj's leader, Keshub Chandra Sen, had a hand in inspiring the formation of Bombay city's Partharna Samaj which pressed eagerly for social reform but, unlike its Bengal counterpart, was not prepared to move outside Hinduism."[2]

دسمبر ۱۸۶۸ء کے خطبے میں گارسین دتاسی نے لکھا ہے کہ:

''برھمو سماج کی اھمیت ھر سال بڑھتی جا رھی ہے اور اس کا حلقہ

۱ - حیات جاوید، ص ۱۶۴

۲ - سیپریٹ‌ازم امنگ انڈین مسلمس، ص ۶۶

اثر وسیع ہوتا جا رہا ہے۔ یہ ہندوؤں کی اصلاحی انجمن ہے جس کا مقصد قدیم ہندوستان کے اصل معتقدات کو پھر سے زندہ کرنا ہے۔"[۳]

اس قسم کی تحریکوں نے بعد میں ہندی زبان کی تحریکوں کو جنم دیا، لیکن ۱۸۵۷ء سے پہلے تک کسی باقاعدہ ہندی تحریک کا سراغ نہیں ملتا، مولانا حالی نے اردو کے خلاف کام کرنے والی، بنارس کی جس پہلی مجلس کی طرف اشارہ کیا ہے، وہ ۱۸۶۱ء میں قائم ہوئی تھی۔ اس کے سرپرست مہاراجہ بنارس تھے۔ بعد میں اسی ادارے کا نام بنارس انسٹی ٹیوٹ ہو گیا۔ اس کے اجلاسوں میں ہندو مسلمان دونوں شریک ہوتے تھے۔ ادارہ پانچ خاص شعبوں میں تقسیم تھا ایک شعبہ تعلیم کا تھا، دوسرا عمرانی ترقی کا، تیسرا فلسفہ و ادب سے متعلق تھا، چوتھا علوم و فنون سے اور پانچواں قانون سے۔[۴] خاص بات یہ تھی کہ اس کے ہر شعبے کا صدر کوئی نہ کوئی انگریز تھا اس کے اجلاسوں میں، دوسرے علوم و فنون کے علاوہ، لسانی مسائل پر خاص طور پر توجہ دی جاتی تھی، اردو اور ہندی کے آغاز و ارتقا، ہندی زبان کی اہمیت، فارسی رسم الخط کی خامی، اور دوسرے لسانی مسائل پر مضامین لکھے اور لکھوائے جاتے تھے اور ان پر بحث مباحثہ کیا جاتا تھا۔ اس بحث مباحثے میں عموماً جدید تعلیم یافتہ لوگ شریک ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں اس طرح کے لوگ چونکہ کم تھے اس لئے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت ہی میں تقریریں ہوتی تھیں۔ بیشتر انگریز، لسانی بحثوں میں ہندوؤں کی ہمنوائی کرتے تھے۔ اس ہمنوائی کی وجہ یہ تھی کہ اردو کے خلاف جو تحریک شروع کی گئی تھی، اسے حکومت کی حمایت حاصل تھی۔ گارسین دتاسی نے اردو ہندی کے قضیے پر بحث کرتے ہوئے دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبے میں لکھا ہے کہ:

"برطانوی حکومت اس تحریک کے موافق معلوم ہوتی ہے۔ حکومت

۳۔ خطبات گارسین دتاسی، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۴ء، طبع دوم، حصہ دوم، ص ۲۱۰

۴۔ خطبات گارسین دتاسی، کراچی، ۱۹۷۴ء، حصہ دوم، ص ۱۸۳

کا خیال ہے کہ ہندی کی موافقت سے ہندو لوگ خوش ہو جائیں گے، اور چونکہ ہندوستان کی آبادی کی اکثریت انہیں پر مشتمل ہے اس لئے ہندی کی تائید ملکی مصالح پر مبنی ہے۔ صوبہ جات شمالی و مغربی، اودھ اور پنجاب میں دفاتر اور عدالتوں میں ہندی رائج کرنے سے جو سیاسی فوائد حاصل ہوں گے ان کے متعلق انڈین ڈیلی نیوز کے ایک مقالے میں تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ یہ مقالہ ۲۷۔ جنوری ۱۸۶۹ء کے ''انڈین میل'' میں بھی نقل کیا گیا ہے۔''۵

اردو کے مخالف اداروں میں بنارس انسٹی ٹیوٹ کے بعد جو ادارہ، پیش پیش رہا، وہ الہ آباد انسٹی ٹیوٹ تھا۔ یوں تو ۱۸۷۰ء اور ۱۸۸۰ء کے درمیان، ہندوؤں کی کئی مذہبی و سماجی انجمنیں الہ آباد میں اپنا اپنا کام کر رہی تھیں، لیکن جس میں جدید تعلیم یافتہ افراد شریک ہوتے تھے اور علمی و ادبی موضوعات پر تبادلہ خیال ہوتا تھا، وہ الہ آباد انسٹی ٹیوٹ تھا۔ اگرچہ یہ ایک سیکولر ادارہ تھا، لیکن عام طور پر اس میں غیر مسلم ہی شریک ہوتے تھے۔ چنانچہ ۲۶۔ اپریل ۱۸۶۸ء کے اجلاس کی مطبوعہ رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ اس کے ۲۶ شرکا میں، صرف ایک مسلمان مولوی زین العابدین شامل تھے جو کہ الہ آباد میں سول مجسٹریٹ تھے اور مراد آباد کے رہنے والے تھے۔۶

۱۸۶۸ء میں جب ایک سرکلر اس طرح کا جاری کیا گیا کہ ہوم گورنمنٹ ملک کی تمام عدالتوں میں کسی خاص مقامی زبان کو رائج نہیں کرنا چاہتی بلکہ اس کی رائے کے موافق، ہر عدالت میں وہ دیسی زبان رائج ہونی چاہئے جو اس ضلعے کی زبان ہو، تو الہ آباد انسٹی ٹیوٹ کے ہندو ممبر بھی اردو کے خلاف اور ہندی کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ چنانچہ ۱۸۶۸ء ہی کے ایک اجلاس میں اردو ہندی کے مسئلے پر گرما گرم بحث ہوئی، جس کی

۵۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۷۰

۶۔ دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس، سی۔ اے۔ بیلی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۹۷۵ء، ص ۱۱۸-۱۱۹

تفصیلات ۳ - نومبر ۱۸۶۸ء کے اودھ اخبار (لکھنؤ) میں شائع ہوئیں - بحث اس مسئلے سے شروع ہوئی کہ گذشتہ اجلاسوں میں طے پایا تھا کہ انسٹی ٹیوٹ کی کارروائی دیسی زبان میں لکھی جایا کرے گی - معاً سوال پیدا ہوا کہ دیسی زبان سے کیا مراد ہے، اردو یا ہندی --- ایک ہندو ممبر نے کہا ''ہندی ملک کی اصلی زبان ہے اس کی طرف سے جو بے اعتنائی برتی جا رہی ہے وہ افسوسناک ہے، حکومت سے رجوع کرنا چاہئے کہ دفاتر اور عدالتوں میں اردو کے بجائے ہندی کو رواج دیا جائے اور اسے فارسی رسم الخط کی جگہ دیوناگری میں لکھا جائے - دوسرے ہندو ممبر نے اس تجویز کی تائید کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ ''یہی نہیں بلکہ سنسکرت کو دوبارہ زندہ کیا جائے، یہ بھی اٹھارویں صدی سے نظر انداز کی جا رہی ہے، اس میں تازہ روح پھونکنے کی ضرورت ہے -'' ایک اور صاحب کھڑے ہوئے اور انھوں نے اپنی تقریر میں کہا کہ ''اردو کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کے سلسلے میں صرف رسم الخط کی تبدیلی کافی نہیں، الفاظ و محاورات کا بدلنا بھی ضروری ہے - اس واسطے کہ اردو میں عربی و فارسی کے بے شمار الفاظ استعمال ہوتے ہیں اور ہندی جو کہ خالص ہندوستانی زبان ہے، ان کا بار نہیں اٹھا سکتی -''[۷]

گارسین دتاسی کے بیان کے مطابق، الہ آباد انسٹی ٹیوٹ میں، ہندی اردو کے موضوع پر پہلی اختلافی بحث نومبر ۱۸۶۸ء کے ایک اجلاس میں ہوئی تھی، اس کے بعد اردو کے خلاف تقریر و تحریر کا ایک بڑا محاذ قائم ہو گیا، پے در پے اردو کے خلاف مضامین لکھے گئے اور اب یہ بحث الہ آباد تک محدود نہ رہی بلکہ اخبارات و رسائل کی معرفت ہندوستان گیر ہوگئی - ۲۵ - دسمبر ۱۸۶۸ء کے اجلاس میں جب انسٹی ٹیوٹ نے یہ طے کر دیا کہ دیوناگری رسم الخط کو بہر حال رواج دینا ہے اور اجلاس کی روئداد ہندی میں مرتب ہوئی تو اس بحث میں شدت و وسعت پیدا ہوگئی اور اردو ہندی کی موافقت و مخالفت میں، مضامین کی اشاعت کا طویل سلسلہ قائم ہو گیا - بیشتر مضامین سائنٹفک سوسائٹی اخبار علی گڑھ، تہذیب (لکھنؤ) اودھ اخبار،

۷ - خطبات گارسین دتاسی، ص ۳۶۸ تا ص ۳۶۹

نورالابصار، اور بنارس گزٹ میں شائع ہوئے ۔ اس اثنا میں الہ آباد انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری منشی سرودا پرشاد سنڈل اور سر سید احمد خاں کے درمیان اس موضوع پر مراسلت بھی ہوتی رہی اور اخبار سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں چھپتی رہی ۔ لیکن ۲۰ ۔ نومبر ۱۸۶۸ء کو منشی سرودا پرشاد سنڈل نے ، اردو ہندی قضیے سے متعلق ، سر سید احمد خاں کے نام جو طویل خط لکھا وہ بعض وجوہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ اس خط کے آخر میں انھوں نے سر سید احمد خاں سے یہ بھی گذارش کی تھی کہ :

”جس طرح سے آپ نے ہماری باہمی خط و کتابت کو اس مقدمے میں پہلے ، اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں چھاپا ہے ، میری التماس و التجا ہے کہ اس چٹھی کو مع اپنے جواب کے آپ اخبار مذکور میں چھاپ دیں ۔“[۸]

چنانچہ سرسید نے اس چٹھی کو ۱۹ فروری ۱۹۶۹ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی علیگڑھ میں شائع کر دیا ۔ منشی سرودا پرشاد سنڈل نے اس طویل خط میں ہندی اور دیوناگری رسم الخط کی تعریف اور فارسی رسم الخط کی تنقیص میں لکھا کہ :

”جو اعتراض کہ آپ نے ناگری کے حرفوں کی بابت وارد کیا ہے اس کی بنیاد صرف آپ کی زبان پر ہے باقی کسی دلیل سے اس کی تائید نہیں کی گئی ۔ پس اس کا جواب دینے کی حاجت نہیں ہے ۔ اور اگر یہ بات بخوبی روشن نہ ہوتی کہ آپ کی رائے میں عالی حوصلگی اور فراخی پائی جاتی ہے تو اعتراض آپ کا ایک تعصب سمجھا جاتا آپ اس بات سے ضرور ہی واقف ہوں گے کہ ہندی کے حرفوں کی قوت شاید دنیا کی تمام زبانوں کی قوت سے برتر ہے اس لئے کہ اس سے تمام مختلف آوازیں اور بولیاں جو انسان کی زبان سے

۸ ۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی ، علیگڑھ ، بابت ۱۹ فروری ۱۹۶۹ء ، ص ۱۱۴ تا ص ۱۱۸

نکلنی ممکن ھیں بخوبی ظاھر ھوتی ھیں حالانکہ فارسی حروف میں علاوہ اس دقت کے جو شکستہ حرفوں میں پیش آتی ھے اور برسوں کی محنت سے بھی رفع نہیں ھو سکتی ان حرفوں سے بیشمار لفظوں کا اظہار جو زبان میں رائج و مروج ھیں بغیر اس کے بالکل نہیں ھو سکتا کہ قوت تلفظ میں دست اندازی نہ کی جاوے۔ اس ذاتی بے قوتی کے نقص کو پورا کرنے کے واسطے ایک مصنف کو اکثر بے ڈھنگی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ھیں۔ میں ایسے لفظوں کی ایک بہت بڑی فہرست پیش کر سکتا ھوں جو اس ملک میں معمول اور مستعمل ھیں اور فارسی حرفوں میں بالکل نہیں لکھے جا سکتے ھیں اور اس وجہ سے بجائے ان کے مشابہہ معنی کے اور لفظ قائم کئے جا سکتے ھیں۔

آپ کے اس قول سے مجھ کو بہت تعجب ھوا کہ عدالتوں کی زبان ایسے حرفوں میں تحریر ھونی چاھیے جو قانون داں یعنی وکیلوں کے استعمال میں ھوں گویا کہ کسی حروف کا ان کی جانب سے استعمال ھونا عدالتوں میں اس کے رواج کے لئے دوسرے حرفوں پر ترجیح کی ایک وجہ متصور ھونی چاھیے گو دوسرے حرف اس ملک کے لوگوں کے واسطے کیسی ھی مفید اور آسائش کی بات ھوں جس کی بھلائی اور بہبودی تمام عدالتوں اور گورنمنٹوں کا منشا اور مقصود ھوتا ھے لوگ یہ بھی کہتے ھیں کہ ناگری کے حروف، کارسرکاری میں حرج و تاخیر کا باعث ھوں گے مگر یہی اعتراض بنگالی زبان پر بھی اس سے پہلے کیا گیا تھا کہ رواج اس کا بنگال کی سرکاری عدالتوں میں ھوا۔“۹

سرودا پرشاد کے اس مضمون کا ذکر، گارسین دتاسی نے ایک نقاد کی

۹۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ، بابت ۱۹ فروری ۱۸۶۹ء،
ص ۱۱۴ تا ص ۱۸۸

حیثیت سے اپنے ۱۹ویں خطبے میں اس طور پر کیا ھے :

”بابو سرودا پرشاد نے دیوناگری رسم خط کی بہت تعریف کی ھے اور یہ دعوی کیا ھے کہ دنیا بھر کی زبانوں میں صرف دیوناگری رسم خط ایسا ھے جس میں یہ صلاحیت بدرجۂ اتم پائی جاتی ھے کہ صوت انسانی کے ھر نازک فرق کو واضح کر سکے۔ لیکن واقعہ یہ ھے کہ خود اردو میں ایسے حروف قابل لحاظ تعداد میں میں موجود ھیں جنہیں دیوناگری حروف سے نہیں ادا کیا جا سکتا، چنانچہ ح خ ص ض ط ع غ اور ق کا اظہار نہیں کیا جا سکتا۔ مضمون نگار (سرودا پرشاد) نے دیوناگری رسم خط کی تعریف کے بعد خط شکستہ یعنی زود نوشتہ عربی فارسی خط کی برائیاں گنوائی ھیں اور یہ بھی لکھا ھے کہ اس خط پر پوری قدرت حاصل کرنے کے لئے سالہا سال محنت کرنے کی ضرورت ھے۔ یہ درست ھے کہ اردو خط شکستہ کا پڑھنا دشوار ھے اس لئے کہ سب حروف صاف صاف نہیں ظاھر کئے جاتے لیکن ناگری خط جو خاص کر، ساھوکاری اور تجارتی ضروریات کے لئے استعمال ھوتا ھے اور جسے کائیستھی ناگری کہتے ھیں اس کا پڑھنا ناممکن ھے جب تک کہ پڑھنے والا پہلے سے مضمون سے واقف نہ ھو۔“ ۱۰

سرسید احمد خاں نے سرودا پرشاد کے مضمون کے جواب میں ایک مضمون ۱۲ مارچ ۱۸۶۹ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں شائع کیا۔ ۱۱ لیکن اس سے پہلے بھی اس موضوع پر کئی مضمون لکھے جا چکے تھے۔ ۵ مارچ ۱۸۶۹ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی میں اس بحث کے سارے پہلوؤں پر محیط ایک مقالے میں یہ خیال ظاھر کیا گیا ھے کہ ”یہ تحریک در اصل سیاسی ھے۔ مذھبی اعتبار سے مسلمانوں کی زبان عربی اور ھندوؤں کی

۱۰ - خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۳-۲۷۲

۱۱ - خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۷۶

سنسکرت ھے ۔ اردو ، ھندی کو مذھب سے کوئی واسطہ نہیں ۔ کہا جاتا ھے کہ ھندو عوام ، اردو نہیں سمجھتے لیکن دنیا کے ھر ملک میں کم وبیش یہی حالت نظر آئے گی ، فرانس کے بعض صوبوں کے لوگ ، فرانسیسی زبان نہیں سمجھتے تو کیا محض اس وجہ سے فرانسیسی کو ان صوبوں کی دفتری اور عدالتی زبانوں سے خارج کر دینا کوئی معقول بات ھوگی ۔ اردو کے خلاف اس اعتراض کے جواب میں کہ وہ خالص نہیں مخلوط زبان ھے ، انہوں نے کہا کہ خالص سے خالص ھندی میں بھی عربی اور فارسی کے الفاظ ضرور ملتے ھیں ۔ ان الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ کو رواج دینا نا ممکن ھے ۔ بہت سے ھندو راجاؤں نے جو اپنے ھاں سرکاری طور پر ھندی رائج کر سکتے تھے ، اپنی مرضی اور اختیار سے اردو کو ترجیح دی ھے ، الور ، گوالیار ، جے پور ، اندور اور بیانہ وغیرہ کے رجواڑوں کی سرکاری زبان اردو ھے ۔ اس کے علاوہ یہ بھی غور کرنے کی بات ھے کہ جس وقت ۱۸۳۷ء میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ فارسی بر طرف اور اس کی جگہ اردو ، سرکاری طور پر تسلیم کی جائے گی تو اس وقت یہ آواز کسی ھندو کی طرف سے کیوں نہ اٹھائی گئی کہ حکومت کو اردو کے بجائے ھندی کی سرپرستی کرنی چاھیے؟ جس زمانے میں فارسی (انگریزی عملداری میں) دفتری زبان تھی اس وقت بھی کسی نے مخالفت نہیں کی حالانکہ وہ اردو کی بہ نسبت ھندی سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں رکھتی تھی ، پھر کیا بات ھے کہ آج بعض ھندو ، ایک دم سے اردو کے خلاف چیخ و پکار کر رھے ھیں ۔ اردو کے خلاف الزام دھرا جاتا ھے کہ وہ ایک مخلوط زبان ھے ۔ درست ھے لیکن کیا خود عربی میں سریانی ، عبرانی ، اور یونانی الفاظ کی آمیزش نہیں ھے ۔ کیا فارسی میں عربی الفاظ بھرے نہیں ھوئے ، اور کیا یہ صحیح نہیں کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں دوسری زبانوں کے الفاظ کا میل پایا جاتا ھے ۔ اگر اردو میں عربی فارسی کے بہت سے الفاظ استعمال ھوتے ھیں تو اسی کے ساتھ یہ بھی ماننا پڑے گا کہ ھندی میں سنسکرت کے بکثرت الفاظ گھل مل گئے ھیں ۔ رہ گیا لکھنے کا سوال ، اردو صرف دو طریقوں سے لکھی جاتی ھے ایک محتاط جسے نستعلیق کہا جاتا ھے

دوسرے زود نوشتہ یعنی شکستہ ـــ لیکن ہندی لکھنے کے طریقے بکثرت ہیں "ان کو وہی شخص پڑھ سکتا ہے جس نے ان کا بطور خاص مطالعہ کیا ہو۔ سنسکرت کے فاضل تک ان تحریروں کو نہیں سمجھ سکتے اپنے خط کا پڑھنا خود ہندوؤں کے لئے سخت دشوار ہوتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے گویا وہ کوئی اجنبی زبان ہے۔ وہ زود نوشتہ دیوناگری رسم خط جسے ناگری بھی کہتے ہیں اور جس کو اردو رسم خط کی جگہ رائج کرنے کی کوشش ہو رہی ہے ایسا ہے کہ اس سے نفرت ہونے لگتی ہے۔ اردو، ہندوستان کے سارے شہروں بلکہ سارے دیہات میں جہاں بعض دوسری بولیاں بولی جاتی ہیں، سمجھی جاتی ہے۔ صوبہ جات شمالی و مغربی اور اودھ میں تو صرف اردو ہی بولی جاتی ہے۔ ان تمام فوائد کے پیش نظر بھلا کیوں اردو کو ترک کرکے، ہندی کو اختیار کیا جائے جس میں بہت سی قباحتیں ہیں اور جسے عرصے سے اہل ہند چھوڑ چکے ہیں"۔ ۱۲

۱۳ مارچ ۱۸۶۸ء کے مضمون میں دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خان نے یہ بھی لکھا کہ "یہ اعتراض بھی لغو ہے کہ اردو رسم خط روز مرہ کی چیزوں کے لئے موزوں نہیں کیونکہ "مطالبات"، "رسیدیں" اور "پروانے" اتنے معروف ہیں کہ کسی کو زحمت نہیں ہوتی بلکہ ان میں تبدیلی کرنا ہی سخت باعث زحمت ہوگا۔ دفاتر اور عدالتوں میں جہاں اردو لکھنے میں عدالت کو ایک منشی درکار ہوتا ہے، ہندی میں دو منشی درکار ہوں گے کیونکہ ہندی لکھنے میں بہت زیادہ وقت ضائع ہوتا ہے۔"۱۳

الہ آباد انسٹیٹیوٹ میں ہندو اردو کی بحث چھڑنے اور منشی سرودا پرشاد اور سرسید احمد خاں کے درمیان خط و کتابت اور ان کے مضامین کی اشاعت کے بعد ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیانی عرصے میں اس موضوع پر مختلف

۱۲ - اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ، بابت ۵ مارچ ۱۹۶۹ء، بحوالہ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۷۵-۲۷۴

۱۳ - خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۷-۲۷۶

اخبارات و رسائل میں سینکڑوں مضامین شائع ہوئے ، بنارس انسٹیٹوٹ اور الہ آباد انسٹیٹوٹ کے ھندو ممبروں کی توجہ خصوصاً اس طرف مرکوز رھی اور انھوں نے ھندی کی حمایت اور اردو کی مخالفت میں ایک ملک گیر مہم شروع کر دی ۔ بات نجی محفلوں اور محدود علمی و ادبی حلقوں سے نکل کر عوام تک پہنچ گئی ۔ اور ھندو اپنی اکثریت کے بل بوتے پر سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں ھندی کو نافذ کرانے کے لئے جائز و ناجائز کوششیں کرنے لگے۔ چنانچہ میرٹھ کے ”جلوہ طور“ میں ایک مضمون ”جس کی لاٹھی اس کی بھینس“ کے عنوان سے شائع ھوا ۔ یہ بعد کو ۷ مئی ۱۸۶۸ء علیگڑھ اخبار میں بھی نقل ھوا ۔ اس میں مضمون نگار نے واضح طور پر اس بات کا دعوی کیا کہ :

”چونکہ ھندو لوگ ھندوستان میں اکثریت میں ھیں اس لئے وہ اپنے حسب خواھش تبدیلیاں کرنے کے مجاز ھیں ۔“ ۱۳

مذھبی تعصبات اور سیاسی اغراض کی بنا پر ، اردو اور مسلمانوں کے عہد حکومت پر ، اس زمانے میں کیسے کیسے بے بنیاد اور پوچ الزامات لگائے گئے، اس کا صحیح اندازہ ان مقالات کو دیکھنے ھی کے بعد ھو سکتا ھے جو ھندوؤں کی طرف سے شائع کئے گئے تھے ۔ بنارس گزٹ کی ایک اشاعت میں اردو کی مخالفت میں ایک مضمون شائع ھوا جو بعد کو ۲۲ جنوری ۱۸۶۹ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی ، علیگڑھ میں بھی چھپا ۔ اس میں مضمون نگار نے لکھا :

”واضح ھو کہ جس وقت سے مسلمان اس ملک میں آئے اور ان کی قوت اور حکومت کو وسعت ھوئی، تو انھوں نے ھندی حروف کو یک قلم اپنی سرکار سے دور رکھا بلکہ زبان بھی فارسی ھی قائم کی ، جس کا اثر یہاں تک پہنچا کہ جو فرقے بالتخصیص مسلمان کی سرکار میں محرری کا کام کرتے تھے ان میں یہ زبان بطور

۱۳ - خطبات گارسین دتاسی ، حصہ دوم ، ص ۲۷۸

دیسی زبان کے جاری ہو گئی یعنی جب وہ آپس میں بھی خط و کتابت کرتے تھے تو فارسی ہی زبان میں کرتے تھے بلکہ اب بھی ایسے لوگ اسی طریقہ پر چلتے ہیں اور اسی وجہ سے بہتیرے ان میں سے ایسے ہو گئے کہ اب وے اپنی دیسی زبان اور حروف کو پڑھ اور لکھ نہیں سکتے۔

جاننا چاہیے کہ یہ سب باتیں جب تک مسلمان اس ملک پر حاکم تھے، جس طرح پر ہو، لیکن اچھی قرار دی جا سکتی تھیں۔ پر اب ہم کو وہ کام کرنا چاہیے جو کہ زمانہ حال کے مطابق ہو اور جو جو قباحتیں کہ ہوں ان کو رفع کر دینا چاہئے۔

ہر ایک ملک میں بالعموم دو زبانوں کا رواج ہونا چاہئے۔ اول جو کہ دیسی ہو، دویم جو کہ اس ملک کے حاکم کی ہو۔ اور جس ملک میں کہ دو ایسی زبانیں جاری ہوں جو کہ باہم کم مختلف ہوں ان کی ترقی میں اس طرح پر مساعی ہونا چاہئے کہ درحقیقت اصل کون ہے، اور وضع تحریر و صحیح پڑھنے کا سہل طریقہ کس میں ہے اور دیسی زبان کس میں درست لکھی جا سکتی ہے، اور اس زبان میں کس سے زیادہ مدد مل سکتی ہے، اور وہ عوام میں کس طرح پر خاطر پذیر ہے۔

خیال کرنا چاہئے کہ اردو زبان ہندوستان میں اگرچہ کم تاہم بیشتر عام میں جاری ہے لیکن یہ زبان نہ تو حاکم کی ہے اور نہ ہندوستان کی دیسی زبان سے تعلق رکھتی ہے، اور وضع تحریر اس کی فارسی ہے اور یہ سبب اس لئے کہ فارسی میں ایسے حروف بہت کم ہیں کہ جس سے ہندوی لفظوں کو ٹھیک ٹھیک لکھ سکیں، اس وجہ سے اس کے پڑھنے میں نہایت قباحت ہوتی ہے اور ان کے لکھنے میں بیشتر غلطی واقع ہوتی ہے، جس سے بڑی دقت اور خرابی ہوتی ہے۔ ہندی کے حروف اس ملک کی زبان کے لکھنے کے واسطے بہ نسبت فارسی حرفوں کے کہیں مفید اور افضل ہیں اور ٹھیک ٹھیک تلفظ

الفاظ بھی ہو سکتا ہے۔ اب صرف اس کو لکھنا ضرور ہے کہ بالعموم یہ کس طرح پر رائج ہے اور اس کی مدد کے واسطے کون سی زبان زیادہ تر بہتر ہے۔ حقیقت میں ہندی زبان ہمارے ملک میں بہ نسبت اردو کے کہیں زیادہ مروج ہے اور اگر اوسط نکالا جاوے تو اغلب ہے کہ فیصدی بیس اردو کے خواہاں پائے جاویں گے اور فی صدی ۸۰ ہندی کے خواستگار پائے جاویں گے۔

عام دیہات کے رہنے والے شہر کے باشندوں کی بہ نسبت کہیں زیادہ ہیں۔ اور ان کی عام کارروائی ہندی زبان میں اور ناگری یا کیتھی وغیرہ میں ہوتی ہے۔ بلکہ دیہات میں سرکاری کاروبار بھی ہندی ہی حرفوں میں ہوتے ہیں اور شاذ و نادر ہی فارسی کے حروف وہاں پر سرکار اور عوام کے کاموں میں آتے ہیں۔

اس زبان کو زیادہ تر مدد سنسکرت سے مل سکتی ہے اور چاہے ہماری اس بات کو بہت لوگ نہ قبول کریں لیکن ہم ٹھیک کہتے ہیں کہ ہندی در حقیقت بگڑی ہوئی سنسکرت ہے اور یہی سبب ہے کہ ہندی میں سنسکرت ملنے سے اس کو زیبائش ہوتی ہے اور علاوہ اس کے سنسکرت نہایت پر مایہ زبان ہے نظر برآں ہماری دانست میں ہندی زبان اور حروف سرکاری اور نیز عام کاروبار میں استعمال کرنا چاہئے جس وقت سرکار نے یہ حکم دیا کہ فارسی زبان سرکاری کاموں میں مستعمل نہ ہو اس وقت ہم نے یہ تصور کیا تھا کہ رفتہ رفتہ ہماری ہندی زبان بھی ساتھ ہندی حرفوں کے جاری ہو جاوے گی اور جس طرح کہ زبان اٹھا دی گئی اسی طرح پر ایک نہ ایک دن حروف بھی باقی نہ رہیں گے لیکن اب جو ہم دیکھتے ہیں کہ جا بجا یہ تجویز ہو رہی ہے کہ اردو کی یونیورسٹی قایم ہو اور یہی زبان اور یہی وضع تحریر بالعموم جاری کی جاوے تو ہم کو نہایت افسوس ہوتا ہے کہ ہندوستان کے حق میں لوگ

کیا کر رہے ہیں۔"۱۵

ناگری رسم الخط کی حمایت میں اس طرح کے متعدد مضامین، علیگڑھ اخبار میں شائع ہوئے۔ ان میں ایک قابل توجہ مضمون "عدالتوں میں ناگری خط کی ضرورت" ہے۔ اس میں پچھلے مضمون سے بھی زیادہ سخت الفاظ میں اردو اور مسلمانوں پر الزامات عائد کئے گئے ہیں اور ناگری کی جذباتی انداز میں موافقت کی گئی ہے۔ اس مضمون کا ایک اقتباس بطور مثال دیکھئے:

"جب سے ہندوستان میں مسلمانوں کا تسلط ہوا اس وقت سے ہندوؤں کے مذہبی معاملات میں ایسی سختی برتی گئی جس کے سبب سے ان کے دل نہایت افسردہ و پژمردہ ہو گئے۔ اور ایسے سخت مواقع پیش آئے کہ ان کا سلسلہ مذہبی تمام درھم برھم ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہونچی کہ سنسکرت کا قدیمی علم صرف برائے نام رہ گیا اور اس پر طرہ یہ ہوا کہ کاروبار عدالت بھی فارسی میں دفعتاً شروع ہو گئے چنانچہ رفتہ رفتہ اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علم سنسکرت ہندوستان میں کالعدم ہو گیا۔ اور دنیوی ضرورت کے باعث سے متعدد روزگار پیشہ نے اپنا علم چھوڑ کر فارسی، عربی کی طرف توجہ کی، اور جو لوگ تجارت یا زراعت پیشہ تھے وہ محض بے علم ہو گئے۔ اور چند روزگار پیشہ نے صرف اس قدر مہارت بہم پہونچائی جو دفتر کے کاروبار کے واسطے ضروری تھی۔ الغرض ایسے ایسے وجوہ سے بجائے روشن ضمیری و استعداد علمی کے ہندوستان میں تاریکی جہالت طاری ہو گئی۔ البتہ جب سے عملداری گورنمنٹ برطانیہ کی ہندوستان میں ہوئی، اس وقت سے وہ ظاہری تشدد و سختی تو رفع ہو گئی مگر باوجود توجہ گورنمنٹ روشنی علم جیسی کہ چاہئے نہیں پھیلی۔ گو

۱۵۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ، بابت ۲۲ جنوری ۱۸۶۹ء

زمانہ سابق سے اب، زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہو اور وجہ اس کی یہی ہے کہ دفتر کے کاروبار فارسی خط میں جاری ہوئے۔ پس خلاصہ کلام یہ ہے کہ اس زمانہ میں جو لوگ روزگار پیشہ ہیں اور ان کے خاندان میں تجارت یا زراعت کا پیشہ نہیں ہوتا، وہ بقدر ضرورت بلکہ اس سے بھی کم استعداد اردو بہم پہونچاتے ہیں اور اسی پر اکتفا کرتے ہیں۔ اور منشا اس کا یہی ہے کہ قانون قدرت کے مطابق ان کو فارسی و عربی مرغوب نہیں ہے اور جو لوگ تجارت و زراعت پیشہ ہیں وہ اس کو محض لغو و فضول جانتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے دیہات میں اس کا رواج نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو بہت ہی کم، اور شاذ و نادر بلکہ اکثر شہروں میں بھی یہی حال ہے۔ چنانچہ شاہ جہان آباد میں جس کو اردو کا ماں باپ کہنا چاہئے یہی کیفیت تھی اور ہے، اور نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ غرضیکہ امور مذہبی کی تو یہ کیفیت ہوئی کہ امتداد و انقلاب زمانہ کی وجہ سے اس کے اصول نسیاً و منسیاً ہو گئے اور دینوی ضرورت سے عموماً بایں لحاظ بے پروائی برتی گئی کہ تمام لوگ روزگار پیشہ نہیں ہیں اور یہ ایک شان کبریائی ہے کہ باوجود اس اس قدر انقلاب کے ہندو طبیعتوں میں مادہ تحصیل علم باقی ہے اور وہ ادنی تحریک سے اپنی اصلی قوت پیدا کر سکتا ہے۔ اور وہ یہی تحریک ہے کہ کاروبار عدالت ناگری حروف میں جاری کئے جاویں، تاکہ اس کے تعلق سے ہندوؤں کی طبیعتیں پھر اسی علم سنسکرت کی جانب راغب ہو جاویں جس کے وہ مستحق ہیں، ورنہ اس سد سکندری کی وجہ سے ہم کو اندیشہ ہے کہ گورنمنٹ اپنے اس عمدہ و نیک ارادہ میں زنہار کامیاب نہ ہوگی جس میں اس نے سوائے صرف زر کثیر کے توجہ جسمانی و روحانی بھی عامہ خلایق کی بھلائی کے واسطے جو کہ فی نفسہ قانون قدرت کے موافق اس کا فرض ہے، مبذول فرمائی ہے، یعنی تمام ہندوستانیوں کو زیور علم و

ہنر سے آراستہ و پیراستہ کرنے کا قصد کیا ہے اور اسی غرض سے سر رشتہ تعلیم جاری کیا ہے۔"۱۶

راجہ شیوراج سنگھ رئیس کاشی پور کا بھی ایک مضمون بہ عنوان " عدالتوں میں بجائے فارسی حروف کے، ناگری اور انگریزی حروف جاری ہونے چاہئیں" ۲ جولائی ۱۸۶۹ء کے علیگڑھ اخبار میں شائع ہوا۔ اس میں انھوں نے جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، رومن یا ناگری کو فارسی رسم الخط پر ترجیح دی، ان کے مضمون کا آغاز اس طور پر ہوتا ہے:

"میں بلا تامل اس بات کا موید ہوں کہ عدالتوں میں بجائے فارسی حروف کے جو آج کل علی العموم کل تحریروں میں جاری ہیں، ناگری حرف ہونے چاہئیں، کیونکہ یہ تبدیلی نہایت مناسب ہوگی اور اگر حالات زمانہ پر نظر کی جاوے تو واقعی اس تبدیلی کی بہت ضرورت ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اب تک اس باب میں نہایت تاخیر ہوئی اور عرصہ ہوا کہ بنگالہ میں اس قسم کی تبدیلی پر عملدرآمد بھی ہو گیا۔ گو احاطہ بنگال تمام سلطنت میں از بس ترقی یافتہ ملک ہے مگر ہم کو بھی یہ زیبا نہیں ہے کہ ہم اپنی ترقی میں پست پڑے رہیں۔"

ان تمہیدی سطور کے بعد مضمون نگار نے جو باتیں کہی ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

۱۔ اگر فارسی حروف کی بجائے ناگری حروف جاری کئے جاویں تو اس تغیر و تبدل سے کوئی دقت نہ پیش آوے گی۔ اس لئے کہ اب بھی اردو زبان اکثر ناگری حروف میں لکھی جاتی ہے اور ناگری حروف میں لکھنے سے وہ ٹھیٹ ہندی نہیں بن جاتی بلکہ نہایت صاف اردو رہتی ہے چنانچہ میری آبائی ریاست

۱۶۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ، بابت ۲۳ اپریل ۱۸۶۹ء، ص ۲۵۸ تا ص ۲۶۰

کماؤں میں ہمیشہ اردو ، ہندی حرفوں میں لکھی جاتی ہے۔ اور یہ اعتراض کہ بعض فارسی اور عربی کے الفاظ اپنے لہجہ کے ساتھ اس زبان میں نہیں آ سکتے بالکل بے اصل ہے جو ناگری حروف ہمارے آباؤ اجداد چھوڑ گئے تھے ان میں صرف ایک ایسے حرف کی کمی تھی جس کی صورت عربی کے لفظ ذ۔ض۔ظ یا انگریزی کے زیڈ کی مانند ہو پس اس حرف کے نہونے سے جو دقت پیش آتی تھی اس کو اس طرح پر رفع کیا گیا کہ حرف جے کی مقابل جو ہندی میں ایک حرف ہے اس پر ایک خط کھینچ دیا جاتا ہے پس اب اردو زبان ہندی حرفوں میں بے تکلف جاری ہو سکتی ہے۔

۲۔ ناگری بھی اسی آسانی اور سرعت کے ساتھ لکھ سکتے ہیں ، جیسے فارسی لکھی جاتی ہے۔ اور جو لوگ اس باب میں تامل کرتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی نظر سے ناگری کا شکستہ خط نہیں گزرا، سوائے اس کے جلدی لکھنا کچھ پسندیدہ بات نہیں ہے۔ اس واسطے کہ جس قدر لکھتے وقت جلدی ہوتی ہے اس سے زیادہ پڑھنے میں وقت ضائع ہوتا ہے۔

۳۔ بندوبست اور عوام کے فائدے کے لحاظ سے اس باب میں ایک ہی طرح کی گفتگو کی جاتی ہے اور یہ دونوں صورتیں حقیقت میں ایک ہیں۔ ہندی حروف کے جاری ہونے سے اس ملک کے بندوبست اور لوگوں کو نہایت فائدہ حاصل ہوگا، اس لئے کہ ناگری اس ملک کی زبان ہے اور قدیم زمانہ میں سب لوگ یہی بولتے تھے۔ اور غالب ہے کوئی زبان اس ملک میں سبقت نہ لے جاوے گی اس واسطے کہ وہ اس ملک کے لوگوں کے مذہب کا ایک جزو ہے۔ جب مسلمان لوگ فتحیاب ہوئے تو ان کے ساتھ گویا فارسی حروف کی شکل ناگری کے واسطے ایک سخت مخالفت چیز اس ملک میں آئی اور گو اس

عرصه میں ناگری بالکل نیست و نابود نہوئی مگر عدالتوں اور لشکروں اور قضا کے دفتروں میں سے بالکل خارج کر دی گئی۔

۴۔ اگر بہ تحقیق دریافت کیا جاوے تو معلوم ہوگا کہ ناگری لکھنے والے اب فارسی لکھنے والوں سے بہت زیادہ ہیں۔ کل آبادی میں بہ نظر تعداد ہندو زیادہ ہیں اور ہندوؤں میں اکثر لوگ لکھتے پڑھتے ہیں۔ اگر سو ہندو لکھے پڑھے ہیں تو ان میں فیصدی پانچ ایسے ہوں گے جو ہندی نہ جانتے ہوں اور کسان لوگ بھی اکثر ہندو ہیں اور وہ شہریوں کی نسبت زیادہ ہندی جانتے ہیں۔ بندوبست کی قباحت، اکثر کسانوں کے حق میں زیادہ مضر ہوتی ہو اور قطع نظر ان خرابیوں کے جو ناقص اور اس کی ناقص تعمیل کے سبب سے تمام رعایا اور خصوصاً غربا کو ایذا پہونچتی ہے تمام ملک پر یہ فارسی حرف اور ایک سنگ گراں ہیں۔ ان حرفوں کے سبب سے غریب آدمیوں کو بڑی بڑی خرابیاں پیش آتی ہیں۔

۵۔ عرصہ ہوا کہ احاطہ بنگال میں اسی قسم کی ترمیم کی گئی اور حقیقت میں اس سے نہایت عمدہ عمدہ نتیجے پیدا ہوئے اور بیچارے کسان اس وقت سے بالکل محفوظ ہو گئے کہ ان کو اطلاع نامہ پڑھوانے کے واسطے صدر مقام جانا پڑتا تھا اور پھر تاریخ معینہ پر حاضر ہوتے تھے۔" ۱۷

اس سے پہلے بھی ۱۱ جون ۱۸۶۸ء کے اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ میں، ایک مضمون اردو کی مخالفت میں شائع ہوا تھا اس میں بھی اسی بات پر زور دیا گیا تھا کہ اضلاع شمالی و مغربی کی عدالتوں

۱۷۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ، بابت ۲ جولائی ۱۸۶۹ء، ص ۴۲۲ تا ۴۳۴

میں ہندی زبان کو رائج کیا جائے ۔ مضمون نگار کے بقول ہندی اور اردو زبان میں کوئی خاص فرق نہیں ہے صرف ان دونوں کے حروف تہجی میں اختلاف ہے ، چونکہ ہندی کا رسم الخط اردو کی بہ نسبت آسان ہے اس لئے ناگری ہی کو رائج ہونا چاہئے کہ وہی لوگوں کی سہولت و اطمینان کا باعث ہوگا ، لیکن اس قسم کے جتنے مضامین اردو کے خلاف اور ہندی کی موافقت میں لکھے گئے ، اول تو وہ دلائل کے لحاظ سے غیر معمولی نہ تھے ، سب میں ایک ہی قسم کی باتیں ، الفاظ کے الٹ پھیر کے ساتھ کہی گئی تھیں ۔ دوسرے یہ کہ ان کے جوابات نہ صرف یہ کہ مسلمانوں ، بلکہ انصاف پسند اور غیر متعصب ہندوؤں کی طرف سے بھی ۔ حد درجہ مدلل اور سنجیدہ انداز میں، دئے گئے ۔

اردو کی حمایت میں لکھے جانے والے مضامین میں ایک قابل ذکر مضمون مولوی تفضل حسین کا ہے جو پہلے نورالابصار میں چھپا ، پھر اخبار سائنٹفک سوسائٹی ، علیگڑھ میں شائع ہوا ۔ مضمون کا عنوان تھا ” بحث اس باب میں کہ رواج تحریر اردو کا سر رشتہ جات سرکاری میں بحال رہنا چاہئے یا نہیں ۔“ اس میں مقالہ نگار نے ہندی اردو کے حروف تہجی، ان کی آوازوں اور تحریر میں ان سے پیدا ہونے والے التباسات کو موضوع گفتگو بنایا ہے اور آخر میں یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اردو کی جگہ ہندی اور ناگری کو رواج دینا کسی طرح بھی حکومت و عوام کے حق میں مفید نہیں ہو سکتا ۔

۱۸۶۹ء کے آخر میں ایک اور اہم مضمون بہ عنوان ” ہندی زبان کیا چیز ہے“ اخبار سائنٹفک سوسائٹی ، علیگڑھ میں شائع ہوا ۔ اس مضمون کا گارسین دتاسی نے بھی ۱۸۷۰ء کے مقالے میں اس طور پر ذکر کیا ہے :

” علیگڑھ اخبار مورخہ ۳ دسمبر ۱۸۶۹ء میں، اس بحث کے متعلق ایک نہایت معقول مضمون شائع ہوا ہے جس کا عنوان ہے ” ہندی زبان کیا چیز ہے “ ۱۸

۱۸ - مقالات گارسین دتاسی ، حصہ اول ، انجمن ترقی اردو، دهلی ، ۱۹۴۳ء ، ص ۱۵

اس مضمون کا آغاز، اس طرح ہوتا ہے :

جس گفتگو کی ابتدا الہ آباد انسٹیٹیوٹ سے اس باب میں ہوئی تھی کہ عدالتوں میں عموماً اردو زبان جاری ہونی چاہئے یا ہندی جاری ہونی چاہئے وہ گفتگو اب کسی قدر بڑھ گئی ہے - چنانچہ اضلاع شمال مغرب کی عدالت ہائی کورٹ کے ایک عزلت نشین جج نے بھی اخبار پال مالی میں خاص اس امر کی نسبت اپنی رائے ظاہر کرنے کو کچھ اپنی شان کے خلاف نہیں سمجھا اور اس کے سوائے اور کل اطراف عالم میں سنسکرت کے معاونین نہایت سرگرمی کے ساتھ اپنی اپنی رائیں ظاہر کر رہے ہیں -"

اس کے بعد مقالہ نگار نے ہندی اردو کے مسئلے پر دنیا کی اور زبانوں کے حوالے سے گفتگو کی ہے ، اور ان کی افادیت کا جائزہ لیا ہے - پوری بحث کا لب لباب مضمون نگار ہی کے لفظوں میں یہ ہے کہ :

" ہندی کے موید ایک ایسی زبان کے خواہاں ہیں جس کے ذریعہ سے ہندوستانی زبان کے قواعد تصریف بدستور باقی رہیں- اور صرف عربی اور فارسی لفظوں کی جگہ، جو آج تک زبان مذکور میں داخل ہیں سنسکرت کے الفاظ قایم ہو جاویں پس یہ بات کہ ایسی زبان صرف تعلیم یافتہ ہندو اپنے واسطے قایم کر لیں ایک ایسی بات ہے کہ نہ تو سزاوار الزام ہے اور نہ کچھ قابل تحسین ہے البتہ اس میں صرف ایک یہ قباحت ہے کہ قوم کی عام علمی ترقی اور شیفتگی سے کنارہ کش ہونے میں ہندوستانیوں کا اصلی مطلب یعنی ان کا ایک قوم بنے رہنا اور بھی زیادہ دیر میں حاصل ہوگا اور یہ خیال کرنا کہ ایسی علمی زبان ان زمینداروں اور کاشتکاروں کے حق میں مفید ہوگی جو سلطنت انگریزی کے قانون کے تابع ہیں اور عدالتوں میں آتے جاتے ہیں ہمارے نزدیک علانیہ لغو اور بیہودہ ہے، اس لئے کہ عدالت کی زبان اپنی خصوصیت کی وجہ سے کسی وقت بھی اپنی خاص اصطلاحات سے خالی نہیں رہ سکتی، اور تمام عام محاورات اپنے مختلف

تعلقات کے سبب سے ہمیشہ ایسی حالت میں ہوتے ہیں کہ ان سے قانونی صحت کے لئے کوئی ایسا طریقہ قایم ہو سکے جو ادائے مطلب میں کامل اور غیر مبدل ہو اور عدالتوں کی یہ اصطلاحیں جیسا کہ ایکٹ ۔ مدعی ۔ مدعا علیہ ۔ صیغہ دیوانی ۔ صیغہ فوجداری وغیرہ ہیں ، ہمیشہ رائج رہیں گی اور یہ اصطلاحیں جیسا کہ قیاس چاہتا ہے بلا شبہ ان لوگوں کی سمجھ میں نہ آویں گی جو خالص قانونی مطالب کی تحصیل نہیں کرتے اور قانونی معاملوں سے نا واقف ہوتے ہیں ۔ اب تک یہ اصطلاحیں فارسی اور عربی زبانوں سے برابر لی گئی ہیں ۔ اور جس قدر لوگوں کو ان کا علم ہے وہ علم صرف انہیں لفظوں پر محدود ہے اور ان کے کامل معنی کو ہر ایک شخص اب تک نہیں سمجھتا اور ہندی کی تحریک کے معاونوں کا صرف یہ منشا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام اصطلاحات جن سے لوگ اب عموماً کسی قدر واقف ہو گئے ہیں بالکل بیکار ہو جاویں اور حتی الامکان اجنبی اور عجیب سنسکرت کے الفاظ ان کی جگہ قایم ہو جاویں اور سبب اس کا یہ بیان کرتے ہیں کہ قوم کا بہت بڑا حصہ ہندو ہے اور ہزار برس شاید اس سے بھی زیادہ عرصہ ہوا کہ زبان سنسکرت، عام زبان تھی ۔ اگر بعض انگریزی کے عالم یہ تقریر کریں کہ انگریزی زبان میں سے تمام رومی اور فرانسیسی الفاظ خارج کئے جاویں اور ان کی جگہ ایسے الفاظ قایم کئے جاویں جو بادشاہ ایلفریڈ اور بیرولف کے عہد کی زبان میں سے لئے گئے ہوں تو ان کی خواہش بھی ایسی ہی معقول اور بجا ہوگی جیسے کہ ہندی کے موئیدوں کی ۔

القصہ عدالتوں میں ہندی زبان کے رائج ہونے اور سر رشتہ تعلیم میں اس کے داخل کرنے کی تحریک جو بایں عنوان کی گئی ہے کہ ہندوؤں کی پہلی حالت دوبارہ قایم کی جاوے اور عدل و انصاف بخوبی ہو ایک ایسی تجویز ہے جس کا منشا بالکل ایک نئی زبان اور نئی

قوم اور نئی تربیت کا پیدا کرنا معلوم ہوتا ہے۔‘‘ ۱۹

گارسین دتاسی کا بیان ہے کہ ۲ فروری ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار میں، ہندی کی حمایت میں جو مضمون شائع ہوا تھا اس میں یہ دعوی کیا گیا تھا کہ اردو میں عربی، فارسی کے جو الفاظ استعمال ہوتے ہیں، سنسکرت میں ان کے متبادل بڑی آسانی سے مل جائیں گے اس لئے صرف یہی نہیں کہ ناگری خط کو اختیار کیا جائے بلکہ عربی و فارسی کے الفاظ سے احتراز کرکے سنسکرت الفاظ کو جگہ دی جائے، اس مضمون کو مقالہ نگار کی خواہش کے مطابق اودھ اخبار کے مدیر نے چھاپ تو دیا لیکن بعد میں اس کے استدلال کی دھجیاں بکھیر دیں، اور تمام دلائل کو محض لفاظی قرار دیا۔ ۲۰

۱۲ جولائی ۱۸۶۹ء کے اودھ اخبار میں ایک اور قابل ذکر مضمون شائع ہوا۔ اس میں مخالفین اردو کے اعتراضات کے مسکت جوابات دیے گئے۔ مضمون نگار نے اردو کے حامیوں کی توجہ اس امر کی طرف بھی مبذول کرائی کہ اردو کے بجائے دیوناگری رسم خط کو اختیار کرنے کا مطلب صرف یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ محض طریقہ تحریر بدل گیا، بلکہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا آپ ایک متمول اور وسیع زبان کو ترک کرکے، ایک کم مایہ اور ناقص زبان کو اختیار کر لیں گے۔ ہندی رسم خط کو اردو پر فوقیت دینے سے اور کئی خرابیاں پیدا ہوں گی۔ اردو رسم خط کے ذریعہ سنسکرت کے ان تمام الفاظ کا پوری طرح اظہار کیا جا سکتا ہے جو ہندی میں مستعمل ہیں۔ چونکہ اردو، مختلف زبانوں کے میل سے بنی ہے اس لئے اس کے بولنے والوں کو دوسری زبانیں بولنے میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ ہمیں اپنی زبان (اردو) کی حفاظت کے لئے کوشش کرنی چاہئے اس لئے کہ وہ ہماری قومیت کی نمائندہ ہے۔ ۲۱

اردو ہندی کے قضیے میں دلی کالج کے پروفیسر منشی حکم چند کا بھی ایک مضمون جون ۱۸۷۰ء کے ’’اتالیق پنجاب‘‘ میں شائع ہوا۔ اس میں

۱۹۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی، علیگڑھ، بابت ۳ دسمبر ۱۸۶۹ء

۲۰۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۷۱

۲۱۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۸۰

انھوں نے ھندی کے حامیوں کے اس دعوے کو کہ ھندوستان کے دیہاتوں میں اردو نہیں عام طور پر ھندی ھی سمجھی اور بولی جاتی ھے ''مختلف دلائل'' سے باطل ٹھہرایا۔ ان کے خیال میں ''جس طرح بچوں کی زبان اکھڑی ھوتی ھے اور ان کے فقرے بے ربط ھوتے ھیں'' اسی طرح گاؤں کے رہنے والے، شہر والوں کے مقابلے میں اپنا مافی الضمیر، صفائی اور صراحت سے نہیں بیان کر سکتے۔ ان کی زبان ناقص ھوتی ھے، وہ اپنے مطلب کے لئے ٹھیک لفظ اور اصطلاح استعمال کرنا نہیں جانتے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں آپ یہی حالت پائیں گے ۔ اس میں کسی ایک زبان کو دوسری پر فوقیت حاصل نہیں ھے۔ جب تک کہ کوئی زبان مکمل نہ ھو جائے اس کے خد و خال نمایاں نہیں ھوتے اور اسے ھم اعلیٰ درجے کی زبان نہیں کہہ سکتے۔ اگر ھم اپنی زبان میں لفظ ''پانی، آب یا واٹر'' استعمال کریں، تو مطلب سب لفظوں سے ایک ھی ھوگا لیکن ان میں سے ایک لفظ کو ھم فصیح کہتے ھیں اور دوسرے کو غیر فصیح ۔ در اصل ھمیں الفاظ پر نہیں جانا چاھئے غور طلب امر یہ ھے کہ دنیا میں امن و امان قائم ھونے کی بدولت بعض زبانوں کو نشوونما کا پورا موقع ملا اور انھوں نے اپنی ایک مخصوص صورت اختیار کر لی۔ مثلاً عربی، سنسکرت اور یونانی اپنے مخصوص خد و خال رکھتی ھیں اور ان میں فصاحت و بلاغت کے خزانے پوشیدہ ھیں ۔ ھر زبان میں آپ ترقی یا زوال کا رجحان پائیں گے اور دونوں حالتوں میں ان میں تبدیلیاں پیدا ھونا لازمی ھے ھر صدی کے مشہور مصنفین اپنے زمانے کے ذوق کے ساتھ مطابقت پیدا کر لیتے ھیں چنانچہ گذشتہ صدی کے مشہور شعرا میر تقی اور رفیع سودا نے جو محاورے اور الفاظ استعمال کئے ان میں سے بعض کو اس زمانے کے شعرا نے متروک قرار دیا ھے ۔ کوئی زبان اپنی اصلی حالت پر قائم نہیں رہ سکتی ھر زبان میں بعض لفظ متروک ھوتے ھیں اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ رواج پاتے ھیں ۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خالص زبان اور میل والی زبان میں کیا خاص فرق ھے اور اول الذکر کو ثانی الذکر کے مقابلے میں کیوں خاص اھمیت دی جاتی ھے۔ میں پوچھتا ھوں کہ دنیا میں کوئی ایک زبان بھی ایسی کبھی

جا سکتی ھے جس میں بدیسی الفاظ شامل نہ ھو گئے ھوں؟ اگر کوئی ایسی زبان موجود ھو تو اس کو ترجیح کی کوئی وجہ نہیں - میل والی زبان میں اجنبی الفاظ کچھ عرصے کے استعمال کے بعد کھپ جاتے ھیں اور مقامی رنگ اختیار کر لیتے ھیں اور اس میل والی زبان کو بھی ھم خالص زبان کہہ سکتے ھیں - در اصل یہ تمام امور اردو زبان کی بحث سے خارج ھیں اس واسطے کہ اردو ایک زندہ زبان ھے اور اس قدر زمانے سے ھندوستان میں استعمال کی جا رھی ھے کہ اب اس کو ترک کرنے کا سوال ھی نہیں اٹھایا جا سکتا - یہ بحث بالکل بے نتیجہ ھے کہ آیا اردو ایک خالص زبان ھے یا اس میں دوسری زبانوں کا بھی میل ھے- اب ھندو لوگ یہ چاھتے ھیں کہ اس کی جگہ ھندی کو رواج دیں جس کا استعمال عرصے سے ترک کر دیا گیا ھے اور جس کی حیثیت ایسی ھے جیسے سنسکرت کی - ایک زمانہ تھا جب دلی والے جامہ پہنا کرتے تھے لیکن اب لوگوں نے یہ لباس ترک کر دیا- اگر کوئی یہ لباس پہن کر بازار میں جائے تو لوگ کیا کہیں گے ؟ اکثر لوگ اس کو بھروپ سے تعبیر کریں گے- زبانوں کا بھی یہی حال ھے اب اگر آپ " بدن " کی جگہ " شریر " آسمان کی جگہ " اکاس " اور "شیر" کے بجائے " سنگھ " استعمال کریں تو لوگ آپ کی ھر بات سمجھنے سے قاصر رھیں گے - فارسی رسم الخط کی جگہ جو ناگری رسم الخط استعمال کرنے کی کوشش کی جا رھی ھے اس کا بھی یہی حال ھے- در اصل ایک دفعہ اگر بدیسی الفاظ کسی زبان میں چالو ھو جائیں تو اس زبان کو خالص بنانے کے لئے ان کو بے دخل نہیں کیا جا سکتا اور نہ رسم الخط کو بدلا جا سکتا ھے - فردوسی نے شاہ نامے میں عربی الفاظ بالکل استعمال نہیں کئے- لیکن کیا دوسرے فارسی شعرا جیسے خاقانی، انوری، اور نظامی وغیرھم اس کا تتبع کر سکے ؟ بر خلاف اس کے ان شعرا کے یہاں کثرت سے عربی الفاظ استعمال ھوتے ھیں - اسی اصول پر ھم اردو میں عربی اور فارسی الفاظ استعمال کرتے ھیں - اور کیوں نہ کریں ؟ اردو شہری زبان ھے، ھندی دیہاتوں میں استعمال ھوئی اور اس میں بھی بہت سے عربی الفاظ رائج ھو گئے ھیں - شہروں میں چھوٹا بڑا اردو بولتا ھے اور

سرکاری دفاتر میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اردو میں اخبارات کی بڑی تعداد شائع ہوتی ہے اور ان کی تعداد میں ہر روز مزید اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو میں دوسری زبانوں کے مطالب ادا کرنے کی بھی بہ درجہ اتم صلاحیت پائی جاتی ہے''۔ ۲۲

اسی اثنا میں اردو کی حمایت میں سید وارث علی کا بھی ایک مضمون شائع ہوا اس میں انھوں نے ہندی کے حامیوں کے، اس دعوی کو کہ ''ہندی الفاظ کو اردو رسم الخط میں ادا نہیں کیا جا سکتا'' بے معنی قرار دیا اور لکھا، عربی، فارسی کے البتہ بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کو صحت تلفظ کے ساتھ ہندی میں نہیں لکھا جا سکتا مثال میں انھوں نے تین لفظ، ''ضلع''، ''فیض آباد'' اور ''زبان'' پیش کئے کہ اگر انھیں ہندی رسم الخط میں لکھا جائے گا تو ''جلا'' فیجا آباد اور ''جبان'' ہو جائیں گے۔ اسی طرح ناگری میں ''غ'' اور ''ف'' وغیرہ کی آوازیں بھی نہیں پیدا کی جا سکتیں۔ ۲۳

ہندی اردو کے مسئلے کو ہندوؤں نے اتنی ہوا دی اور اردو کے خلاف اتنا زبردست پروپیگنڈا شروع کیا کہ اسے پورے ہندوستان کے لئے ہندو مسلم مسئلہ بنا دیا۔ اخبار و رسائل، اور علمی و ادبی مجلسوں سے لے کر نجی محفلوں، تعلیمی محکموں اور سرکاری دفتروں تک یہی موضوع گفتگو رہا۔ بقول گارسین دتاسی یہ ہوا کہ:

''علیحدہ علیحدہ جماعتیں قائم ہو گئیں، ایک ہندوؤں کی دوسری مسلمانوں کی۔ قضیہ اس قدر عام ہو گیا اور اتنی اہمیت اختیار کر گیا کہ اس کے بارے میں نوجوانوں سے امتحانات میں سوالات پوچھے جانے لگے۔ چنانچہ ۱۸۷۰ء میں، لکھنو کے محکمۂ تعلیم نے جو امتحان لیا اس میں بعض جماعت کے طلبہ سے مندرجہ ذیل سوالات

۲۲۔ مقالات گارسین دتاسی، حصہ اول، ص ۱۷ تا ص ۲۰

۲۳۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۷۷-۸

پوچھے گئے۔

۱۔ واضح کرو کہ اودھ کی عدالتوں میں اردو کا (فارسی رسم الخط) یا ہندی کا (ناگری رسم الخط) استعمال مفید اور قرین انصاف ہوگا۔

۲۔ اردو اور ہندی کی خوبیاں اور نقائص بیان کرو اسی طرح فارسی اور ناگری رسم الخط کی خوبیاں اور نقائص بیان کرو۔ عوام الناس کے لئے ان دو زبانوں میں سے کس زبان کے استعمال میں زیادہ سہولت ہے :

۳۔ اردو اور ہندی سے کیا مراد ہے ؟ ان دونوں کا فرق واضح کرو۔

۴۔ اردو اور ہندی سے کون سی زبانیں مراد ہیں ؟ تم کن تصانیف کو اردو کی اور کن کو ہندی کی کہو گے ؟

اردو ہندی کے تنازع کے سلسلے میں مسلسل بحثوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے حامیوں کے درمیان بھی ایک طرح کی کشاکش شروع ہو گئی۔ خالص لسانی اور تعلیمی موضوع کو، ہندوؤں نے اپنے لئے قومی اور جذباتی مسئلہ بنا لیا۔ تقریر و تحریر میں، نہ صرف اردو پر بلکہ مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور برصغیر میں ان کے دور حکومت پر رکیک حملے کئے جانے لگے۔ ۶ دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبے میں گارسین دتاسی لکھتا ہے کہ:

” اردو اور ہندی کا جھگڑا بدستور چلا جا رہا ہے، چنانچہ اس سال ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس جھگڑے میں نہایت گرم جوشی کے ساتھ حصہ لیا، بالخصوص ہندو اس معاملے میں تعصب سے کام لے رہے ہیں۔ وہ اپنے حب وطن کے مبالغہ آمیز جوش میں ان تمام چیزوں کو پس پشت ڈالنا چاہتے ہیں جن سے ہندوستان میں مسلمانوں کی سابقہ حکومت کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ چنانچہ ہندو لوگ کھلم کھلا برطانوی حکومت کو مسلمانوں کی حکومت پر ترجیح دیتے ہیں۔ “ ۲۴

۲۴۔ خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۶۶

لکھنو کے مولوی محمد حسین ''انجمن تہذیب'' کے روح و رواں تھے۔ انھوں نے اردو ہندی قضیہ کے سلسلے کی ساری بحثوں کا ایک خلاصہ، کتابچے کی صورت میں شائع کیا تھا، اس میں مخالف و موافق تقریروں کے سارے اہم نکات کو سمیٹتے ہوئے انھوں نے اردو پر کئے جانے والے جملہ اعتراضات کے جوابات بھی دئے تھے، آخر میں انھوں نے لکھا تھا کہ:

''اردو زبان اپنی وسعت، حسن اور شیرینی میں اپنی نظیر آپ ہے، اس کے ذریعے سے قانونی، ادبی، اور علمی مطالب، پوری طرح ادا کئے جا سکتے ہیں۔ یہ زبان سارے ملک میں استعمال ہوتی ہے اس کو کسی ایک صوبے سے مختص نہیں کر سکتے۔'' ۲۵

لیکن، اردو کے مقابلے میں، ہندی کو رواج دینے اور دیوناگری میں لکھنے کا مسئلہ جس کے بارے میں ۱۸۶۸ء اور ۱۸۷۱ء کے درمیان میں بے شمار مضامین لکھے گئے، تقریریں ہوئیں اور اردو بحث مباحثے کا بازار گرم رہا، نیا نہیں تھا، جیسا کہ پچھلے باب میں کہا گیا ہے اس کی ابتدا فورٹ ولیم کالج ہی میں پڑ گئی تھی، ۱۸۵۸ء کے بعد، ہندوؤں کی سیاست آلود مذہبی اور سماجی تحریکوں نے اس کو تقویت بہم پہنچائی اور انیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں، اس نے ہندو اکثریت کے ہاتھوں ایک مطالبے کی صورت اختیار کر لی۔ اردو کے عیوب اور ہندی کے محاسن، ہر محفل اور ہر ادارے میں گنوائے جانے لگے۔ چنانچہ بابو راجندر لال مترا ۱۸۶۴ء ہی میں یہ دعوی کر چکے تھے کہ:

'' ہندوستانی (اردو) کی ابتدائی صورت ہندی ہے جو عام طور پر ہندو لوگ بولتے ہیں، مسلمانوں کی اردو، ہندی ہی سے نکلی ہے۔ اس وقت ہندوستان میں جتنی زبانیں رائج ہیں ان سبھوں میں ہندی سب سے زیادہ اہم ہے''۔

'' ہندوستان کی مشترک زبان کی حیثیت سے پشاور کے کوہستان سے

۲۵- مقالات گارسین دتاسی، حصہ اول، ص ۱۵

لے کر آسام تک اور کشمیر سے لے کر راس کماری تک اس زبان کا سکہ بٹھا دیا ہے۔ اس کے ادب کا مقابلہ، ہندوستان کی اور کوئی زبان نہیں کر سکتی ۔ ،، ۲۶

یہ دعوی سرے سے بے دلیل ہے ۔ جس ہندی کے بارے میں ۱۸۶۴ء میں یہ دعوی کیا گیا ہے ، اس کی اصل کیفیت ، انیسویں صدی کے آخر تک کیا تھی اور اس کی وسعت و مقبولیت کا کیا حال تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف صوبہ متحدہ آگرہ اور اودھ میں :

"۱۸۸۶ء میں چونسٹھ اخبار اردو زبان میں، پانچ ہندی اور اردو میں ، دو اردو اور انگریزی میں ، بارہ ہندی میں ، ایک ہندی اور انگریزی میں ، دو انگریزی میں اور ایک ہندی اور بنگالی میں نکلتا تھا ۔ صرف اردو اخباروں کی اشاعت بارہ ہزار ایک سو دس اور باقی کی چار ہزار آٹھ سو چوبیس تھی ۔" ۲۷

یہ ۱۸۸۶ء کا حال ہے اس سے پہلے تو ہندی کی یہ کیفیت تھی کہ ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان صوبہ شمالی و مغربی میں جو چھبیس اخبار نکلتے تھے ان میں صرف تین ہندی میں تھے ، بقیہ تئیس میں سے انیس اردو میں تین فارسی میں اور ایک بنگالی میں تھا ۔ ہندی کے تین اخباروں میں " سدھا کر ،، ہفتہ وار تھا اور بنارس سے نکلتا تھا ۔ ۱۸۴۸ء میں اس کے کل چوہتر پرچے چھپے تھے اور ۱۸۵۱ء میں یہ تعداد کم ہو کر صرف چالیس رہ گئی تھی ۔ یہ مطبع سدھا کر سے شائع ہوتا تھا ۔ اس کے اڈیٹر پہلے پنڈت رتن کشور تیواری اور بعد کو بندرا بن تیواری تھے ۔ یہ اخبار " ابتداً ،، صرف ہندی میں نہ تھا بلکہ سرکاری رپورٹ کے مطابق :

" اس کی زبان میں ہندی سے زیادہ اردو کی آمیزش ہوتی ہے پہلا

۲۶ - جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال ، نمبر ۵ ، ۱۸۶۴ء ، بحوالہ خطبات گارسین دتاسی ، انجمن ترقی اردو ، ۱۹۳۵ء ، ص ۳۶۰

۲۷ - سیپریٹ ازم امنگ انڈین مسلمس ، حاشیہ ص ۳۲

مضمون هندی میں ہوتا ہے۔ گذشتہ سال (۱۸۵۰ء) کچھ دنوں تک، اس کے ایک ہی صفحے پر اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں خبریں چھپتی تھیں لیکن اب صرف ہندی میں نکلتا ہے اس کی ہندی مغلق اور سنسکرت آمیز ہوتی ہے۔ چنانچہ اس کی اشاعت صرف انہی لوگوں تک محدود ہے۔ جو اس طرح کی ہندی سمجھ لیتے ہیں۔"۲۸

گارسین دتاسی نے بھی ۱۸۵۲ء کے خطبے میں اس ہندی اخبار کا سرسری ذکر کیا ہے۔۲۹ ۱۸۶۹ء کے خطبے میں اس نے یہاں تک لکھا ہے کہ:

"جدید تصانیف اور اخبارات کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کے خلاف جو تحریک اٹھی ہے اس کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اگرچہ ہندو بہت شیخی بگھار رہے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عملاً اس کا اثر، کم ہوتا ہے، اس کا مشاہدہ خاص کر اخبارات کے سلسلے میں ہوتا ہے، چنانچہ اس سال جو نئے اخبارات شائع ہونا شروع ہوئے ہیں، ان میں سے بیشتر اردو میں ہیں۔" ۳۰

گارسین کا بیان حقائق پر مبنی ہے، ۱۸۴۸ء اور ۱۸۵۳ء کے درمیان نکلنے والے ایک ہندی اخبار کا ذکر اوپر کی سطروں میں ابھی کیا گیا ہے، اس عہد کے دوسرے ہندی اخبار "بنارس اخبار" کے مدیر "بابو رگھو ناتھ ٹاٹھے" تھے۔ یہ بھی ہفتہ وار تھا اور "مطبع بنارس اخبار" سے چھپتا تھا۔ اس کے معیار و تعداد اشاعت کے بارے میں سرکاری رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

"بنارس اخبار کی زبان بھی اردو ہی ہوتی ہے۔ مگر رسم الخط

۲۸- صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۳ء)، محمد عتیق صدیقی، انجمن ترقی اردو، علیگڑھ، ۱۹۶۲ء، ص ۸۲ تا ص ۸۳

۲۹- خطبات گارسین دتاسی، ۱۹۳۵ء، ص ۳۳

۳۰- خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۸۱

ناگری ھے اور لیتھو میں چھپا ھے ، دھرم شاستر اور اس قسم کی دوسری سنسکرت کتابوں کے ترجمے بالعموم ، اڈیٹر شائع کرتا ھے۔ اس کے علاوہ ، مقامی خبروں کے سوا اور کچھ نہیں ھوتا اور وہ دوسرے اخباروں سے نقل کی جاتی ھیں۔''۳۱

ھندی زبان کا تیسرا اخبار ''شملہ اخبار'' تھا یہ مطبع شملہ سے شائع ھوتا تھا۔ اس مطبع کے مالک بابو شیو پرشاد تھے اور اخبار کے اڈیٹر شیخ عبداللہ تھے۔ یہ لیتھو سے ناگری رسم الخط میں چھپتا تھا ، زبان اگرچہ اردو ھی ھوتی تھی لیکن گرد و نواح کے راجگان اور دوسرے لوگوں کی سر پرستی حاصل کرنے کے لئے دیوناگری رسم الخط میں چھاپا جاتا تھا ، تعداد اشاعت صرف باون پرچوں تک محدود تھی۔ ۳۲

ھندوؤں کی لگاتار کوششوں کے باوجود ، اگلے دس سال میں ھندی کی مقبولیت میں کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ھوا ، خود بابو شیو پرشاد نے ، جن کی کوششوں سے اردو کی مخالفت کے لئے ایک زبردست محاذ قائم ھو گیا ، اس بات کا اعتراف کیا ھے کہ :

> ''۱۸۶۳ء میں ، صوبہ جات شمالی و مغربی میں تئیس اخبار چھپتے تھے جن میں سترہ اردو کے اور صرف چار ھندی کے تھے۔'' ۳۳

گارسین دتاسی ، ۱۸۷۲ء کے مقالے میں رقمطراز ھے کہ ''صوبہ جات شمالی و مغربی (یوپی) کے ھندوستانی اخبارات کی تعداد ۱۸۶۱ء میں چھبیس تھی، ۱۸۷۰ء میں تنتیس تھی، اور اب اس سے بھی زیادہ ھوگئی ھے۔ ان تنتیس اخباروں میں سے بیس اخبار اردو میں تھے چھ ھندی میں اور پانچ ھندی اردو دونوں میں تھے۔ ۳۴

۳۱ - صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ، ص ۸۴-۸۵

۳۲ - صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات ، ص ۱۲۰-۱۲۱

۳۳ - بحوالہ سیپریٹ‌ازم امنگ انڈین مسلمس ، ص ۷۰-۷۱

۳۴ - مقالات گارسین دتاسی ، حصہ اول ، ص ۲۱۵

مولوی عبدالحق نے اس سلسلے میں جو سروے کیا تھا اس کے مطابق ۱۸۵۱ء میں ھندی اردو کی کل ۱۲۶ کتابیں شائع ھوئیں، جن میں ۸۴ اردو کی تھیں - ۱۸۶۸ء کے میٹریکولیشن کے امتحان میں ۲۵۲ طلبہ اردو کے اور ۲۸ ھندی کے تھے - ۱۸۶۹ء کے ۳۱ اخباروں میں سے ۲۶ اردو کے تھے اور پانچ ھندی کے - ۱۸۷۴ء میں آگرہ اور اودھ سے ۲۵ اخبار اردو کے اور صرف ۹ ھندی کے نکلتے تھے - ۱۸۷۵ء میں ۳۰ نئے اخبار شائع ھوئے تھے جن میں ۱۸ اردو کے تھے اور دو ھندی کے - ڈائریکٹر تعلیمات صوبہ پنجاب کی رپورٹ ۱۸۶۷ و ۱۸۶۸ء سے معلوم ھوتا ھے کہ کل ۱۵۲ کتابیں شائع ھوئیں، ان میں ۱۱۹ کتابیں اردو کی تھیں اور ۳۳ ھندی کی - ۱۸۷۶ء میں اردو ھندی کے ۵۲ اخبار اور رسالے نکلتے تھے، ان میں ۴۴ اردو کے تھے اور ۸ ھندی کے - ۸ مئی ۱۸۷۲ء کے گورنمنٹ گزٹ میں انعامی کتابوں کی جو فہرست چھپی ھے اس میں ۱۹ کتابیں اردو کی ھیں ۴ ھندی کی - ھندی کتابوں پر ادبی انعام پچاس پچاس روپے کا دیا گیا - اردو کتابوں پر چار چار ھزار روپے کا - اردو کتابوں کے مصنفین میں سے ۷ ھندو، ایک انگریز، اور ۸ مسلمان تھے - ۱۸۷۳ء میں ۲۹ کتابوں پر انعام دیا گیا، ان میں ۲۲ کتابیں اردو کی تھیں اور ۷ ھندی کی - ھندی کتابوں کے لکھنے والے سب کے سب ھندو تھے اور اردو کتابوں کے مصنف ۱۰ ھندو، ایک انگریز اور ۱۱ مسلمان تھے - ۱۸۷۳ء میں درسی کتابوں کے علاوہ جو کتابیں شائع ھوئیں ان میں ۴۵ اردو کی تھیں، ۳۵ ھندی کی - ۱۸۷۴ء کی انعامی کتابوں میں ۱۶ اردو کی تھیں، ۲ ھندی کی - ۱۸۷۴ء میں چیف کمشنر، اودھ، نے اردو ھندی کی بحث میں ایک چٹھی شائع کی تھی - اس میں لکھا ھے کہ:

"تنہا لکھنو میں اردو کی ۱۷۲ کتابیں شائع ھوئی ھیں اور ھندی کی صرف ۱۴ -" ۳۵

ان اعداد و شمار اور حقائق کی روشنی میں بابو راجندر لال متر کا یہ دعوی

۳۵ - خطبات عبدالحق، ص ۲۶۵-۲۶۶

که هندی کو اردو کی به نسبت زیاده مقبولیت و اهمیت حاصل هے بے بنیاد ٹھہرتا هے البته اردو کے متعلق یه سچ هے که انگریزوں اور هندوؤں کی متحده مخالفت کے باوجود اس کی هر دل عزیزی میں کوئی فرق نہیں آیا ، دلی کالج کے پرنسپل مسٹر بوترو نے ۱۸۴۱ء میں کہا تھا " اردو نے دو تین سال میں ایسی اهمیت حاصل کر لی هے جو اس سے پہلے نه تھی۔ یه بہار اور مغربی صوبوں سے لے کر هردوار تک سرکاری زبان بن گئی هے - مزید برآں یه زبان سارے هندوستان میں سمجھی جاتی هے -"۳٦ بمبئی کے ایک پادری ریونڈر براون جس نے راس کماری سے لے کر همالیه تک اور گنگا کے دهانے سے لے کر دریائے سنده تک کا سفر کیا تھا ۱۸۷۱ء میں اس امر کا اعتراف کیا هے که هندوستان کے هر حصے میں اردو زبان اپنی وسعت کی بنا پر سب سے زیاده مفید و مقبول هے۔۳۷

اس طرح کی اور نه جانے کتنی باتیں هیں جو اس بات کے ثبوت میں پیش کی جا سکتی هیں که اردو هر دور میں هندی کی به نسبت زیاده مقبول رهی هے ، انیسویں صدی کی آخری چار دهائیوں کا زمانه گو که اردو کی شدید مخالفت اور هندی کی حمایت کا زمانه هے، اس کے باوجود هندوستان کی لینگوافرینکا اردو هی رهی هے - هر جگه اور هر علاقے میں اسے قبول عام حاصل رها هے - اس زمانے کی تفصیلات گارسین دتاسی کے خطبات و مقالات میں محفوظ هیں ، اس نے ۴ دسمبر ۱۸٦۵ء کے خطبے میں لکھا هے که:

" لوگوں کا خیال هندوستانی (اردو) کی نسبت چاهے کچھ هو لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا که وه سارے هندوستان کی مشترک زبان بن گئی هے - دن بدن جو اس کی ترقی هو رهی هے اس کی وجه سے وه پورے دیس کی زبان کہی جا سکتی هے -" ۳۸

سرکزی حکومت کے ایک ذمه دار افسر کپتان ایچ ، سور نے اسی سال اردو

۳٦ - بحواله مقالات گارسین دتاسی ، حصه اول ، ص ٦۰

۳۷ - بحواله مقالات گارسین دتاسی ، حصه اول ، ص ٦۰

۳۸ - خطبات گارسین دتاسی ، ۱۹۳۵ء ، ص ۴۵۷

کے بارے میں گارسین دتاسی کو لکھا:

"بلا شبہ، کچھ عرصے بعد اردو، مشرق کی ایک نہایت اہم زبان کی حیثیت اختیار کر لے گی، اسی زبان کے توسط سے لاکھوں اہل مشرق تبادلہ خیال کرتے ہیں۔ ریل کی وجہ سے جو اندرونی ملک میں ہزار میل کی مسافت تک پھیل گئی ہے اور بھی ہندوستان اور وسط ایشیا کے لوگوں کو ملنے جلنے کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ جب یہ لوگ ملتے ہیں تو ایک مشترک زبان کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں۔ اردو زبان، اس مقصد کو بطریق احسن پورا کرتی ہے اس لئے کہ اس کی ساخت میں ہندی، فارسی اور عربی کے عناصر شامل ہیں۔ اس زبان میں بدرجہ اتم یہ صلاحیت پائی جاتی ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں کے مقاصد کو پورا کرے۔" ۳۹

۷۔ جنوری ۱۸۶۵ء کو پنجاب کے لفٹننٹ گورنر نے لاہور میں اپنی روانگی سے قبل ایک دربار منعقد کیا، جس میں لاہور اور امرتسر کے ان مجسٹریٹوں کو بلایا گیا تھا جنھیں وائسرائے کی طرف سے خطابات ملے تھے۔ اس میں بہت سے امرا، رؤسا اور کئی راجاؤں نے بھی شرکت کی اور لفٹننٹ گورنر نے انگریزی کی بجائے انھیں اردو میں خطاب کیا۔ فروری کے مہینے میں لکھنو میں چیف کمشنر کے زیر صدارت ایک جلسہ ہوا جس میں انھوں نے اودھ کے تعلقہ داروں کے رو برو اردو میں ایک لمبی تقریر کی۔ مہاراجہ گوالیار نے ۱۶۔ اکتوبر کو اپنے ولی عہد کا اردو، فارسی اور مرہٹی زبانوں میں امتحان لیا اور کامیابی پر انھیں جانشین مقرر کیا۔ ۴۰

"اردو کی ترقی کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ ہر سال اس کے اخباروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پچھلے سال، کئی نئے اخباروں کا اضافہ ہوا ہے۔ صوبہ شمالی و مغربی کے بعض شہروں میں جہاں سے ایک اخبار بھی نہ نکلتا تھا

۳۹۔ خطبات گارسین دتاسی، ۱۹۳۵ء، ص ۴۵۸

۴۰۔ خطبات گارسین دتاسی، ص ۴۶۶

اب وہاں سے کئی کئی اخبار نکلتے ہیں - یہی حال پنجاب، اودھ اور بمبئی کا ہے - افغانستان اور سندھ سے بھی اردو اخبارات نکلنا شروع ہو گئے ہیں -"۴۱

"جنوری سے 'پنجاب ایجوکیشنل میگزین' کے نام سے ایک انگریزی ماہنامہ اس غرض سے جاری کیا گیا کہ اردو کی اشاعت و ترقی میں کام لیا جائے - اور اس میں ہر مہینے، مختلف تعلیمی و ادبی انجمنوں کی روئداد چھاپی جائیں -"۴۲

"۲۵ فروری کو لاہور میں طلبہ کے ایک تقسیم انعامات کے جلسے میں حلقہ لاہور کے انگریز ناظر تعلیمات اور سرکاری کالج کے یوروپین پرنسپل نے اردو زبان میں خطاب کیا -"۴۳

گارسین نے اردو ہندی کے تنازع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ۶ - دسمبر ۱۸۶۹ء کے خطبے میں یہاں تک لکھا ہے کہ :

"جس طرح یورپ میں ایک تحریک اٹھی ہے کہ از منۂ وسطیٰ کی طرف رجوع کیا جائے اور ان زبانوں کو زندہ کیا جائے جو اب بولیاں ہو کر رہ گئی ہیں اسی طرح ہندوستان میں بھی از منۂ وسطیٰ کو زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے - اس وقت ہندی کی حیثیت ایک بولی کی سی ہے جو ہر گاؤں میں الگ الگ طریقوں سے بولی جاتی ہے - ہندوؤں کی کوشش ہے کہ اردو کے بجائے ہندی کو فروغ دیا جائے، حالانکہ اردو بہ نسبت ہندی کے شستہ ہے لیکن ہندی ان کے نزدیک خالص ہندوستان کی زبان ہے اس لئے کہ وہ سنسکرت سے نکلی ہے - ان کو یہ نہیں سوجھتا کہ اردو زبان میں عربی اور فارسی کی ساری خوبیاں جمع ہو گئی ہیں -"۴۴

۴۱ - خطبات گارسین دتاسی، ص ۶۸۴

۴۲ - خطبات گارسین دتاسی، ص ۷۶-۷۷۴

۴۳ - خطبات گارسین دتاسی، ص ۴۹۲

۴۴ - خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۲۶۷

گارسین دتاسی کا انیسویں صدی کے وسط میں یہ کہنا کہ اردو میں عربی و فارسی کی ساری خوبیاں جمع ہوگئیں ہیں ، بے سبب نہیں تھا - اردو پچھلے تین سو سال میں ارتقا کی مختلف منزلیں طے کر کے فی الواقع ، زبان و ادب کی بلند معیاری سطح اور ہر دل عزیز مقام پر پہنچ گئی تھی ، یہ سارے برصغیر کی لینگوا فرینکا تھی - چالیس کروڑ آدمی اسے بولتے اور سمجھتے تھے ولی ، خواجہ میر درد ، سودا ، میر تقی میر ، میر حسن ، آتش ، ناسخ ، دیا شنکر نسیم ، ذوق ، غالب ، مومن ، دبیر و انیس ، اکبر الہ آبادی جیسے با کمال شاعر پیدا ہو چکے تھے - ملا وجہی ، میر امن ، رجب علی بیگ سرور ، غلام غوث بے خبر ، غالب ، سر سید احمد خاں ، محمد حسین آزاد ، مولانا حالی ، رتن ناتھ سرشار ، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا شبلی جیسے صاحب طرز ادیب و نثر نگار کے سینکڑوں علمی و ادبی مقالات اور تحقیقی و تنقیدی کتابیں منظر عام پر آچکی تھیں - اردو شعرا کے درجنوں تذکرے مرتب کئے جا چکے تھے اور مرتبین میں ہندو ، مسلمان اور یوروپین سبھی شامل تھے - ۴۵ مختلف زبانوں میں اردو کی ایک سے ایک قواعدیں لکھی جا چکی تھیں -۴۶ خط و کتابت سے لے کر روز مرہ کی گفتگو تک بالعموم اردو ھی میں ہوتی تھی - فارسی کے بعد ، اس کا جاننا اور اس میں مہارت حاصل کرنا ، فخر کی بات اور شرافت کی نشانی سمجھا جاتا تھا - فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کی تعلیم و تدریس کا بھی ایک با قاعدہ نظام برسوں سے قائم تھا - دکن میں وہ ایک زمانے میں سرکاری و درباری زبان رہ چکی تھی ، شمالی ہندوستان میں بھی اسے اپنی ہمہ گیری و مقبولیت کی بنا پر یہی مقام حاصل ہوگیا تھا اور ان لوگوں کے ھاتھوں حاصل

۴۵- تفصیل کے لئے دیکھئے راقم الحروف کی کتاب '' اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری ،، مجلس ترقی ادب لاھور ، ۱۹۷۲ء

۴۶- تفصیل کے لئے دیکھئے - (الف) مقدمہ قواعد اردو از مولوی عبدالحق ، انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۵۱ء
(ب) جامع القواعد (باب سوم) ، از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی ، مرکزی اردو بورڈ ، لاھور ، ۱۹۷۱ء

ہوا تھا جو سیاسی مصلحتوں کے سبب بعد کو خود اردو کے مخالف اور ایک نو ایجاد زبان ہندی کے حامی بن گئے۔

اردو کو مختلف اسکولوں اور کالجوں میں ذریعۂ تعلیم بنا کر بھی آزمایا گیا۔ دلی کالج میں آرٹس کے مضامین کے ساتھ اس وقت کے سائنسی علوم کو بھی اردو میں پڑھایا گیا اور اس کامیابی کے ساتھ کہ غیر ملکی ناظمین تعلیمات کو بھی اس بات کا اعتراف کرنا پڑا کہ مشرقی شعبے کے طلبہ، بلحاظ صلاحیت و معیار، مغربی شعبے کے طلبہ سے بہتر ہیں۔۴۷ نصابی ضرورتوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ، مختلف علوم و فنون کی سینکڑوں کتابیں دوسری زبانوں سے اردو میں ترجمہ و تصنیف کی گئیں۔ طب اور قانونی زبان کے متعدد معیاری ترجمے اردو میں شائع کئے گئے۔ تھوڑے دنوں کے لئے جب اردو کو دفتروں اور عدالتوں میں باریابی حاصل ہوگئی تو اس کی قانونی اصطلاحات، زبان زد خلائق ہوگئیں۔ انڈین پینل کوڈ، ایویڈنس ایکٹ اور کریمنل پروسیجر کوڈ کی جگہ تعزیرات ہند، قانون شہادت اور قانون ضابطہ فوجداری نے لے لی۔ یہ کتابیں آج کی نہیں ہیں اب سے سو سال پہلے، ڈپٹی نذیر احمد اور بعض دوسروں نے مل کر ان کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اور حکومت برطانیہ نے ان تراجم کو بلند پایہ اور معیاری قرار دیا تھا۔ یہ تراجم اور ان کی اصطلاحات آج تک ہماری عدالتوں میں مقبول و مستعمل ہیں۔ لیکن انگریزی سے اردو میں قانونی کتابوں کے ترجمے کا اس سے بہت پہلے آغاز ہو چکا تھا۔ تنہا دلی کالج میں ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۵ء کے درمیان تقریباً ڈیڑھ سو نصابی کتابیں تالیف و ترجمہ کی جا چکی تھیں جن میں بائیس کتابیں قانون کے موضوعات

۴۷۔ مرحوم دھلی کالج، مولوی عبدالحق، انجمن ترقی اردو، دھلی، ۱۹۴۵ء، ص ۲۵

پر تھیں ۔۴۸ یہ سارا کام فارسی رسم الخط میں ہوا اور اس میں ہندو، مسلمان اور انگریز سبھی شریک رہے ۔

پال براس نے بہت صحیح لکھا ہے کہ :

In the eighteen and nineteen centuries, especially a large and vital body of literature was written in Urdu in Persian script. It is important to recognize that both Hindus and Muslims contributed to this literature. Although a division gradually developed between Hindus who preferred to write Hindi-Urdu in Deonagri on the one hand and Hindus and Muslims who wrote Hindi-Urdu in Persian script, this division was not initially entirely a communal one. Only Hindus used the Deonagri, but both Hindus and Muslims used the Persian script.[49]

لیکن ہندوؤں نے ان حقائق سے دانستہ گریز کیا، وہ اردو کی وسعت و مقبولیت کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے، اسے عملی زندگی میں ایک مدت سے برت رہے تھے، اس کے باوجود ان کی سیاسی مصلحتیں، انھیں سچائی کے اعتراف کی اجازت نہ دیتی تھیں۔ انھوں نے جان بوجھ کر اردو اور اس کے رسم الخط پر اعتراضات کئے۔ یہ اعتراضات جیسا کہ اوپر کی تفصیلات سے عیاں ہے، لسانی نہیں سراسر سیاسی تھے اور ہندوستان میں برطانوی اقتدار کے مستحکم ہونے کے بعد، ہندوؤں کے ذہن میں آئے تھے ۔ مولوی عبدالحق نے انیسویں صدی کی سیاسی تبدیلیوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۱۸۵۷ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی برخاست ہوئی انگریزی راج آیا، جدید قانون نافذ ہوئے ۔ جو آگے تھے پیچھے، جو پیچھے تھے آگے ہوگئے ۔ چند ہی سال بعد قومیت کا خیال، جو سارے یورپ پر چھایا ہوا تھا، اڑتا ہوا یہاں بھی پہنچا۔ ریل اور تار

۴۸ - تفصیل کے لئے دیکھئے ۔

(الف) مرحوم دھلی کالج، انجمن ترقی اردو، دھلی، ۱۹۴۵ء

(ب) قدیم دھلی کالج (دھلی کالج میگزین)، ۱۹۵۳ء

(ج) کراچی لا جرنل، (ایس ایم کالج میگزین)، ۱۹۶۴ء

۴۹ - لینگوئج، ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان نارتھ انڈیا، کیمبرج، ۱۹۷۴ء، ص ۱۲۹

کی حیرت انگیز اختراعات، مغربی تعلیم، آزادی اور حب وطن کی تقریروں اور تحریروں اور انگریزوں کی انصاف پسندی پر اعتقاد نے قومیت اور وطنیت کے جذبے کو بھڑکایا۔ خاص کر ہندو اس سے بہت متاثر ہوئے۔ وہ اس نئے دور کو اپنے حق میں آزادی کا دور سمجھے۔ اس کے ساتھ ھی اپنی قومیت اور ماضی کے فخر نے بھی ان کے دلوں میں نیا جوش پیدا کر دیا۔ جسے میکس ملر (Max Muller) نے اور بھی ابھارا، مذھبی و سماجی تحریکوں نے اس میں استحکام پیدا کیا۔ ہندو طرح طرح سے اپنی نئی حیثیت اور انفرادیت جتانے لگے اور جس طرح ایک بیوقوف عورت نے اپنی خوبصورت انگوٹھی دکھانے کی خاطر گھر کو آگ لگا دی تھی، انھوں نے بھی بنے بنائے گھر کو بگاڑنا شروع کر دیا۔ سب سے پہلے نزلہ اردو زبان پر گرا، اس کا سب سے بڑا قصور یہ تھا کہ یہ عہد اسلامی کی پیداوار تھی۔ ۵۰ چنانچہ اسے مسلمانوں کی زائیدہ و پروردہ بتا کر طرح طرح کے الزامات و اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا۔

بابو نوبین چند نے اردو کی مخالفت کرتے ہوئے ایک جلسے میں کہا:

"اھل ھند کو اپنی جدید ادبیات کے لئے اپنی حقیقی قومی زبان استعمال کرنی چاھئے نہ کہ اردو جو مسلمانوں کی زبان ھے اس لئے کہ مسلمان فاتحوں نے اپنی اصلی زبانوں کے لاتعداد الفاظ اس میں شامل کر دئے ھیں۔" ۵۱

اردو پر اس طرح کے الزامات بے بنیاد تھے اور بقول گارسین دتاسی انگریزوں کے ایک خاص طبقے کے اشارے پر کئے گئے تھے، ان الزامات کا جواب دیتے ہوئے جے۔ بیمز (J. Beames) نے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ:

"آج کل عام طور پر اس زبان (اردو) کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ھے جو عدالتوں اور دفتروں میں رائج ھے۔ کہا جاتا ھے کہ اردو جن عناصر سے مرکب ھے وہ اجنبی ھیں اور آپس میں میل نہیں کھاتے۔

۵۰ - خطبات عبدالحق، ص ۱۰۹

۵۱ - خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۹۶

میں اپنے سات سال کے تجربے کی بنا پر کہتا ہوں کہ اردو ہی سب سے زیادہ ترقی پسند اور سب سے زیادہ مہذب زبان ہے ۔ زبان کی یہ واحد شاخ ہے جو یہاں کے باشندوں کی ضروریات کو پورا کر سکتی ہے ۔ اردو سے عربی فارسی الفاظ کا خارج کرنا ایسا ہے جیسے انگریزی زبان سے لاطینی الفاظ نکالنے کی کوشش کی جائے اور یہ چاہا جائے کہ اس میں صرف سکسن (Saxan) اصل کے الفاظ باقی رہیں ۔ زبانیں اس طرح بالارادہ نہیں بنائی جاتیں بلکہ وہ رفتار و حالات کا ساتھ دیتی ہیں ، اردو میں عربی فارسی سے جو الفاظ مستعار لئے گئے ہیں وہ مطالب کو خالص دیسی زبان کے مقابلے میں زیادہ اچھی طرح واضح کرتے ہیں ۔۵۲

لیکن اس جگہ ایک اور بات کی وضاحت ضروری ہے ، اردو کی ایجاد یا اس میں عربی فارسی الفاظ کی شمولیت کی ذمہ داری اتنی مسلمانوں پر نہیں ہے جتنی کہ خود ہندوؤں پر ہے ۔ سب جانتے ہیں کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے ، مخلوط زبانوں کے وجود میں آنے کے کئی اسباب بیان کئے جاتے ہیں ۔ ان میں سے ایک سبب بقول مولوی عبدالحق ملک گیری ہے ۔ ملک گیری کی بھی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں ، ایک تو یہ ہوئی کہ فاتح لوٹ کھسوٹ کے چل دیا، دوسرے یہ کہ فاتح ، مفتوحہ علاقوں میں ہمیشہ کے لئے آ کر رہ بس جاتا ہے ۔ اس صورت میں فاتح اور مفتوح کی زبانوں اور تہذیبوں میں ٹکراؤ ہوتا ہے اور اس سے ایک نئی زبان اور نئی تہذیب پیدا ہو جاتی ہے ۔ اردو نے اسی طرح جنم لیا ، مقامی زبان فارسی سے مخلوط ہوکر ایک نئی زبان بن گئی ، لیکن مقامی زبان میں فارسی کو مخلوط کرنے والے مسلمان نہیں ہندو تھے ۔ بات یہ ہے کہ جب کبھی ہم غیر زبان کے سیکھنے یا بولنے کی کوشش کرتے ہیں تو اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ ہماری زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے ،

۵۲ - جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی ، کلکتہ ، شمارہ نمبر ۱ ، ۱۹۶۶ء ، بحوالہ خطبات گارسین دتاسی ، حصہ دوم ، ص ۹۷

مثلاً جب کوئی پاکستانی یا هندوستانی، انگریزی بولتا یا لکھتا هے تو وہ امکان بھر یہ کوشش کرتا هے کہ اپنی زبان کا کوئی لفظ نہ آنے پائے، جہاں تک ممکن هو انگریزوں کی تقلید کی جائے۔ کبھی کبھی فاتح کی زبان کے الفاظ بے ارادہ بھی مفتوح کی زبان پر چڑھ جاتے هیں جیسا کہ هم اپنی گفتگو میں بہت سے انگریزی کے الفاظ استعمال کر جاتے هیں۔ بالکل یہی صورت، هندوستان میں مسلمانوں کے عہد حکومت میں پیش آئی، اهل هند نے اپنی ضرورت کے تحت فارسی سیکھنی شروع کی اور اپنی زبان میں بلا تامل فارسی کے الفاظ داخل کرنے شروع کر دئے۔۵۳ مولانا محمد علی جوهر نے اردو میں عربی و فارسی الفاظ کے اختلاط اور اردو کو مسلمانوں کی زبان کہنے پر جولائی ۱۹۱۲ء کے کامریڈ میں بہت صحیح لکھا هے کہ:

> "It is worthwhile considering the origin of Urdu because in some quarters it is understood to be a language essentially and peculiarly Muslim. Nothing, however could be farther from truth. In the first case, the Muslims are neither a race nor confined to the geographical limits of single country. There is no such thing as Islamistan or Islamic race. In the Quran Islam and its Prophet are referred to as blessings for the two worlds and for the whole of mankind. There could, therefore, be no Islamic Language, and as a matter of fact, the three hundred millions of Muslims scattered over the whole of the eastern hemisphere use a large variety of languages.
>
> The only conclusion at which we can arrive is that neither in the matter of language nor in that of script can the Muslims afford to concede more than what they had already done in adopting Urdu as their only vernacular or their second vernacular, and retaining the script that is practically common to the Islamic world." 54

بیان کیا جا چکا هے کہ ۱۸۶۸ء، ۱۸۶۹ء اور ۱۸۷۰ء کے سال اردو هندی قضیے کے سلسلے میں بڑے گھما گھمی کے سال تھے، اس زمانے میں جو

۵۳ - خطبات عبدالحق، ص ۳۶۷-۳۶۸

۵۴ - سلیکٹڈ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف مولانا محمد علی، جلد اول، افضل اقبال، لاهور، ۱۹۶۹ء، ص ۲۹-۵۰

لوگ اردو کی مخالفت میں پیش پیش رہے اور برابر کچھ نہ کچھ لکھتے رہے۔ ان میں بابو سرودا پرشاد سنڈل، بابو نوبین چند، بابو راجندر لال متر، بابو شیو پرشاد، جے کشن داس، ایف۔ ایس گمروز، مسٹر کیمپسن، مسٹر کیمبل اور میکڈانلڈ خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کی تردید میں بہت سے لوگوں نے قلم اٹھایا، جن میں سر سید احمد خاں، پروفیسر حکم چند اور گارسین دتاسی کی تحریریں اہم ہیں۔ جن اخبارات و رسائل میں یہ بحثیں عام طور پر شائع ہوئیں ان میں بنارس گزٹ، نورالابصار، اودھ اخبار، علی گڑھ اخبار، انڈین گزٹ، ایشیاٹک جرنل اور رسالہ جلسہ تہذیب وغیرہ کے نام آتے ہیں۔

اسی درمیان میں الہ آباد انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری منشی سرودا پرشاد اور سر سید احمد خاں کے درمیان اردو ہندی کے موضوع پر مراسلت بھی ہوئی اور علی گڑھ اخبار میں چھپتی رہی۔ یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو سر سید احمد خاں انگلستان چلے گئے اور تقریباً ڈیڑھ سال بعد ۲۔ اکتوبر ۱۸۷۰ء کو واپس آئے۔ ۵۵ اس دوران میں اردو کے خلاف جو شورشیں بپا کی گئیں ان کا اجمالی ذکر پچھلی سطور میں آچکا ہے۔ سر سید احمد خاں، اخبارات و رسائل اور احباب سے مراسلات کے ذریعے ان شورشوں سے پوری طرح باخبر رہے۔ ہر چند کہ وہ زبان کے مسئلے پر ہندو مسلم اختلاف کی بنا پر ۱۸۶۷ء میں مسٹر شیکسپیئر سے اپنے اس خیال کا اظہار کر چکے تھے کہ اب ہندو اور مسلمان ایک ساتھ نہیں رہ سکتے، لیکن جب ان کی عدم موجودگی میں اردو کے خلاف ہندوؤں نے جگہ جگہ محاذ قائم کئے اور اردو سائنٹیفک سوسائٹی کے رکن اور سر سید احمد خاں کے دوست اور رفیق کار بابو شیو پرشاد نے عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں اردو کے بجائے ہندی کو رواج دینے کے لئے حکومت کو ہزاروں ہندوؤں کے دستخط سے، پے در پے عرضداشتیں بھجوانی شروع کیں تو سر سید احمد کا یہ خیال کہ ہندو اور مسلمان متحد نہیں رہ سکتے، ہمیشہ کے لئے پختہ ہو گیا۔ چنانچہ انھوں نے انگلستان سے ۲۹۔ اپریل ۱۸۷۰ء کے ایک خط میں نواب محسن الملک کو لکھا:

۵۵۔ حیات جاوید، ص ۱۸۴

''ایک اور مجھے خبر ملی ہے جس کا مجھے کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبان اردو و خط فارسی جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ہے کہ انھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی کے ہندو ممبروں سے تحریک کی ہے کہ بجائے اخبار اردو، ہندی ہو۔ ترجمہ کتب بھی ہندی میں ہو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہرگز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو بضد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہوگا کہ ہندو علیحدہ اور مسلمان علیحدہ ہو جائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ہوگا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔''[۵۶]

یہ خط اور سر سید کی مسٹر شیکسپیئر سے گفتگو جس کا حوالہ پچھلی سطور میں آچکا ہے دراصل، ہندوستان میں دو قومی نظریے کے ابتدائی نقوش ہیں، اردو ہندی تنازع کے نتیجے میں سر سید احمد خاں نے ہندو مسلم اتحاد کے پارہ پارہ ہونے اور جداگانہ قومیتوں کے تشکیل پانے کا جو امکان ظاہر کیا تھا، وہ آگے چل کر پورا ہوا۔ جیسا کہ سر سید احمد خاں نے اپنے خط میں کہا تھا نہ تو ہندوؤں نے ہندی کو چھوڑا اور نہ مسلمانوں نے اردو کو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لسانی اختلاف کی بدولت ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو الگ محاذ ایک دوسرے کے مقابل قائم ہوگئے، اس مقابلہ آرائی نے دو قومی نظریے کو جنم دیا اور آگے چل کر یہی دو قومی نظریہ، مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے برصغیر کے مسلمانوں کا اجتماعی سیاسی شعور کہلایا اور تحریک پاکستان اور قیام پاکستان کا باعث بنا۔ اس پس منظر میں دو قومی نظریے کا محرک اول، اردو ہندی کا تنازع، اور اس نظریے کے اولین داعی سر سید احمد خاں تھے۔

بعض نے اردو ہندی تنازع کے آغاز کا الزام سر سید احمد خاں کے سر تھوپا

۵۶۔ سرسید احمد خاں کے خطوط، مرتبہ وحید الدین سلیم، حالی پریس، پانی پت، ۱۹۰۱ء، ص ۵۹

ہے ۔ ان کا کہنا ہے کہ جب سر سید احمد خاں نے انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی تو اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا۔۵۷ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ بقول مولوی عبدالحق ، جب یہ جھگڑا اٹھا تو اس وقت کانگریس کا وجود بھی نہ تھا ۔ اس کے متعلق خود سر سید نے علی گڑھ کے تعلیمی سروے میں ایک جگہ لکھا ہے کہ :

”تیس برس کے عرصے سے مجھ کو ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا، خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ، خیال پیدا ہوا اور ہمیشہ میری خواہش تھی کہ دونوں مل کر ، دونوں کی فلاح میں کوشش کریں ۔ مگر جب ہندو صاحبوں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اردو زبان اور فارسی کو جو مسلمانوں کی حکومت اور ان کی شہنشاہی ہندوستان کی باقی ماندہ نشانی ہے ، مٹا دیا جائے ۔ اس وقت مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمان باہم متفق ہو کر ملک کی ترقی اور اس کے باشندوں کی فلاح کا کام نہیں کر سکتے ۔ میں نہایت درستی اور اپنے تجربے اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلمانوں میں جو نفاق شروع ہوا ہے ، اس کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے ۔“۵۸

پھر جیسے جیسے اردو ہندی کا تنازع بڑھتا گیا ، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی خلیج بھی وسیع اور گہری ہوتی چلی گئی ، کے ۔ کے ۔ عزیز نے بہت صحیح لکھا ہے کہ :

As political and cultural rivalry increased the two languages began to fall apart. The supporters of Hindi claim for it a national status; the Muslims hotly denied it. As the controversy spread, the two languages became more and more exclusive. Hindi was made 'pure' by the progressive incorporation of Sanskrit words. The Urdu enthusiasts went more often to Persian and Arabic for vocabulary as well as syntax. Though Urdu was in its origin neither the language of Muslims nor a Muslim Language, it gradually became so. Soon it assumed a place in their tradition 'second-only

۵۷ - دی علیگڑھ موومنٹ ، ایم - ایس جین، آگرہ، ۱۹۶۰ء ، ص ۹-۱۳۸

۵۸ - خطبات عبدالحق ، ص ۱۱۲

to their religion'. Thus linguistic conflict added to Indian disunity and helped the formation of more than one nationalism, the more the Hindus laid stress on Hindi the greater emphasis, the Muslim put on Urdu. The Hindi-Urdu controversy was by now an integral part of the Hindu-Muslim questions.[59]

١٨٦٧ء اور اس کے بعد زبان کے سلسلے میں جو اختلافی مسائل پیدا ہوئے، ان کا تجزیہ کرتے ہوئے عزیز احمد نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ دو قومی نظریے کی بنا، سر سید ھی کے زمانے میں انھی کے ھاتھوں پڑ گئی تھی۔ خود ان کے الفاظ میں:

By 1867 emphasis had already began to shift from the use of Hindi as the exclusive language of north Indian Hindus to propaganda and pressure for its exclusive use, at the expense of Urdu, as the language of administration at the lower levels. The movement originated at Banaras and Babu Fateh Chand organised committee with this intent. The early political eclecticism of Syed Ahmed Khan received a shock when Babu Shiv Prashad, himself a writer of Urdu, pushed his dislike of the former Muslim rule in India and its heritage to the extent of pressing the Hindu members of Syed Ahmed Khan's Scientific Society to replace Urdu by Hindi as the language of transactions in the Society. The main opposition to Syed Ahmed Khan's plans for a Muslim University came from the Hindu supporters of Hindi. These developments lit the first spark of modern Muslim Separatism in the mind of Syed Ahmed Khan, who in an interview with Shakespeare, then the Commissioner of Banaras, talked for the first time of the separate political evoluation of Muslims, and expressed a prophetic regret that the two nations, Hindu and Muslim, would not seriously work together for a composite growth.[60]

اردو ھندی تنازع اور سر سید کے حوالے سے، دو قومی نظریے کے آغاز اور مسلم قومیت کی پہلی نمود کے بارے میں کم و بیش اسی طرح کا اظہار خیال، تحریک و قیام پاکستان پر لکھی جانے والی بیشتر کتابوں میں ملتا ھے۔ بعض نے سر سید احمد خاں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ھے کہ ان کے تصور قومیت

٥٩ - دی میکنگ آف پاکستان، لاھور، ١٩٦٧ء، ص ١٢٦

٦٠ - اسٹڈیز ان اسلامک، کلچر ان دی انڈین ان وایرنمنٹ، آکسفورڈ، ١٩٦٣ء، ص ٢٦٠

میں زبان کے مسئلے کو اتنا دخل نہ تھا جتنا کہ مذہب کو تھا۔ دلیل یہ دی گئی ہے کہ بنگال میں ہندی اردو کا مسئلہ نہ تھا پھر بھی وہاں دو قومی نظریہ پروان چڑھا۔ اس سے انکار نہیں کہ اردو زبان کے لئے جو خطرہ پیدا ہوا وہ بالواسطہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کی مذہبی و ثقافتی اقدار کے لئے بھی خطرہ تھا، اس لئے کہ قومی زبان کے بغیر کسی قومی تہذیب و ثقافت کا تصور بے معنی ہے، لیکن برصغیر میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان ابتداً جو چیز، اختلاف اور فاصلے کا سبب بنی وہ مذہب نہیں زبان تھی۔ جب تک زبان کا مسئلہ نہ پیدا ہوا تھا دونوں قومیں اختلاف مذہب کے باوجود امن و سکون سے رہ رہی تھیں۔ اس لئے یہ خیال کہ بنگال میں زبان کا مسئلہ نہ تھا پھر بھی وہاں دو قومی نظریے نے فروغ پایا، درست نہیں ہے۔ اول یوں کہ بنگال میں جس وقت فارسی کو ہٹا کر بنگالی کو سرکاری زبان بنایا گیا ہندو ضرور خوش ہوئے لیکن مسلمان عام طور پر اس تبدیلی کے خلاف تھے۔ انھوں نے اپنی اقتصادی و معاشی اور تعلیمی و ذہنی پستی کے سبب اس تبدیلی کو مجبوراً قبول تو کرلیا تھا، لیکن ان کی رائے اور رضا کو اس میں دخل نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ پہلے بنگالی کے لئے اہل بنگال، عربی رسم الخط ہی استعمال کرتے تھے۔ ۱۸۷۱ء تک اس امر کا دستاویزی ثبوت ملتا ہے کہ مسلمانوں میں عربی رسم الخط میں بنگالی رائج تھی۔ بنگالی زبان کا موجودہ رسم الخط بالکل نیا ہے اور اس کا وجود ۱۸۷۸ء سے پہلے نہیں ملتا۔ مروجہ رسم الخط کی پہلی کتاب ۱۸۷۸ء میں لکھی گئی۔ اس کے بعد بنگالی ہندوؤں نے انگریزوں کی مدد سے عربی رسم الخط کو مٹانے کی مہم چلائی اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔[۶۱] ورنہ تحریک پاکستان کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بنگال کے با شعور مسلمان رہنماؤں نے ہندی کے مقابلے میں شروع ہی سے اردو زبان کی حمایت کی ہے۔

انیسویں صدی کے بنگالی مسلمانوں کی رہنمائی جسٹس امیر علی اور

۶۱۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی، سید مصطفیٰ علی بریلوی، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس، کراچی، ۱۹۷۰ء، ص ۱۵۱-۱۵۲

عبدالطیف کر رہے تھے - دونوں اردو کے حامی اور ہندی کے مخالف تھے۔ ڈاکٹر موجمدار نے بنگالی مسلمانوں کے سلسلے میں لکھا ہے کہ :

Their leaders like Amir Ali and Abdul Latif insisted that Urdu and not Bengali was the language of Bengali Muslims and that instructions either be given in Urdu or in a highly Persianised Bengali. Though the Government remained somewhat indifferent to this demand, the Muslims took it up seriously till the formation of Pakistan. [62]

جسٹس امیر علی نے ۱۵ - نومبر ۱۸۷۱ء کو لندن کی ''انجمن فنون'' میں ایک مضمون پڑھا تھا اور یہ اخبار الاخیار میں چھپا تھا - اس میں انہوں نے اردو کے متعلق کہا تھا :

''مجھے جن زبانوں کا علم ہے ان میں ایک بھی ایسی نہیں جو فصاحت و بلاغت میں ہندوستانی (اردو) کا مقابلہ کر سکے یا جس کا ذخیرۂ الفاظ اس کی طرح مالا مال ہو۔ پنجاب سے لے کر بنگال تک وہ بولی جاتی ہے - حقیقت یہ ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی نہیں اکثر ہندوؤں کی بھی زبان ہے - بنگال کے اکثر شمالی اضلاع میں اردو زبان بولی جاتی ہے اگرچہ ظاہر ہے کہ وہ دھلی اور لکھنؤ کی اردو کی طرح فصیح نہیں - مشرقی بنگال کے مسلمان بھی اکثر اردو بول سکتے ہیں - ''[۶۳]

کے - کے عزیز نے جسٹس امیر علی کے بارے میں لکھا ہے کہ :

Urdu was the language of the Indian Muslims and any interference with its use and extension was unwelcome to Ameer Ali. In the Nagri-Urdu controversy, which raged in Bihar in the 1880's, he took no active part, but he strongly urged the British Government to withdraw the order substituting the Nagri character for the Persian in the Bihar courts, because it irritated and alarmed the Musalmans without satisfying the Hindus. [64]

۶۲ - دی ایڈونٹ آف انڈیپینڈنس ، اے - کے - موجمدار ، ص ۴۴-۴۵

۶۳ - مقالات گارسین دتاسی ، حصہ اول ، ص ۱۶۴

۶۴ - امیر علی ، ہز لائف اینڈ ورک ، لاہور ، ۱۹۶۸ء ، ص ۳۸

مولوی فضل الحق نے ۱۹۳۷ء کے کانگریس راج پر تنقید کرتے ہوئے اردو کے متعلق جو کچھ کہا تھا اس سے بھی یہی پتہ چلتا ھے کہ بنگال کے مسلمان موجودہ سنسکرت آمیز بنگالی کے حق میں نہ تھے۔[۶۰] یہ الگ بات ھے کہ ھندوؤں کے پروپیگنڈے اور زبردستیوں کے آگے ان کی نہ چل سکی، چنانچہ پال براس نے بھی یہ موقف اختیار کیا ھے کہ سر سید احمد خاں کے تصور قومیت میں مذھب اور زبان دونوں برابر کے شریک تھے۔ یہ خیال بڑی حد تک صحیح ھے لیکن تاریخی حقائق یہ بھی بتاتے ھیں کہ سر سید احمد خاں کا تصور قومیت جس عنصر کی بدولت حرکت و عمل میں آیا وہ اردو زبان تھی شاید اسی لئے براس کو بھی اکثریت کی رائے کا حوالہ دیتے ہوئے لکھنا پڑا کہ:

> The Hindi-Urdu controversy of the late 19th Century was the critical factor in the development of Muslim separatism and Hindu-Muslim conflicts from that time forward. It is frequently asserted particularly that the Hindi-Urdu controversy was responsible for a fundamental change in the attitudes of Syed Ahmed Khan and his followers towards Hindu-Muslim Unity, of which they despaired when the movement to replace Urdu by Hindi as the Court language of the northern provinces began. It is known that Syed Ahmed and his followers played the key role in the defence of Urdu during this Period.[66]

جے۔ داس گپتا نے بھی یہی خیال ظاھر کیا ھے کہ:

> In North India one of the first open rivalries between Hindus and Muslims, during the late nineteenth century, found a political expression in the rivalry between Hindi and Urdu.[67]

مختصر یہ کہ سر سید کو جس چیز نے سب سے پہلے ھندوؤں سے بدظن کیا اور اس حد تک کہ وہ مسلمانوں کو ھندوؤں سے الگ قوم خیال کرنے

۶۰ - ھماری قومی جد و جہد ۱۹۳۹ء، عاشق حسین بٹالوی، لاھور، ۱۹۶۸ء، ص ۳۳۴

۶۶ - لینگوئج، ریلیجن اینڈ پالیٹکس ان نارتھ انڈیا، ص ۱۳۷

۶۷ - لینگوئج کنفلکٹ اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ، ص ۱۰۱

لگے، وہ اردو ہندی کا قضیہ تھا۔ بقول گارسیں دتاسی بابو شیو پرشاد نے جو پتھر پھینکا تھا وہ مسلمانوں کے سر پر بہت زور سے لگا تھا۔ خاص طور پر سر سید احمد خاں تلملا اٹھے تھے۔ ان کے اندر سویا ہوا قومی جذبہ، پوری طرح جاگ اٹھا تھا اور تقریر و تحریر، میں اس کا برملا اظہار بھی ہونے لگا تھا۔ مولانا حالی نے سر سید کے سیاسی نقطۂ نظر کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے :

''اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں قومی اختلاف کا خیال زیادہ تر ان کو اس وقت ہوا جب کہ ۱۸۶۷ء میں مسلمانوں کے خلاف شمال و مغرب کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کی طرف سے نہایت سرگرمی کے ساتھ اس باب میں کوشش شروع ہوئی کہ تمام سرکاری دفتروں اور کچہریوں میں اردو زبان اور فارسی خط کی جگہ ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ پھر جس قدر ہندوؤں کی طرف سے وقتاً فوقتاً مخالفتیں ظہور میں آتی گئیں اسی قدر وہ خیال زیادہ پختہ ہوتا گیا اور آخر کار ان کو یقین ہوگیا کہ ہندوستان کی موجودہ حالت اس قابل نہیں کہ اس میں رپریزنٹیشن کے اصول پر عمل درآمد ہو سکے۔''۶۸

۶۸۔ حیات جاوید، ص ۵۷۰

هندی اردو تنازع اور مسلم قومیت کی تشکیل و تعمیر

(۱۸۷۰ء-۱۹۰۶ء)

انیسویں صدی کی ساتویں دھائی میں ، اردو کی مخالفت میں ہندوؤں کی طرف سے اپنے قومی و سیاسی مفادات کی خاطر جس قسم کی شدت اختیار کی گئی وہ بر صغیر کے مسلمانوں کے حق میں تازیانۂ بیداری ثابت ہوئی ۔ بات یہ ہے کہ اردو کی جگہ ہندی اور ناگری کے رواج سے مسلمانوں کے حق میں جو مضر نتائج مرتب ہونے والے تھے اور ان کے اجتماعی جثے پر جس قسم کی ضرب پڑنے والی تھی انہیں اس کا احساس و ادراک ہو چلا تھا ، تعلیمی پستی اور اقتصادی بد حالی کے با وصف ، ان میں سیاسی شعور جاگ اٹھا تھا اور اب وہ اپنے ملی وجود کی حفاظت کے لیے فرداً فرداً سوچنے کے بجائے اجتماعی سطح پر غور کرنے لگے تھے ، خصوصاً سرسید احمد خاں کو اس بات کا پورا یقین تھا کہ اردو پر جو وار کیا جا رہا ہے وہ در اصل مسلم قومیت اور مسلم تہذیب پر وار ہے ۔ اگر اردو مٹ گئی تو پھر مسلمان بھی ایک منفرد قوم کی حیثیت سے زندہ نہ رہ سکیں گے ۔ اس لئے انہوں نے اردو کی حفاظت و مدافعت کو قومی فریضہ جانا ۔ جب تک رہے اردو کے لئے لڑتے رہے ۔ اردو کے مخالفین سے بحث مباحثے کئے ، خط و کتابت کی ، مضامین لکھے ، جگہ جگہ اردو کی حمایت میں انجمنیں قائم کرائیں ، مسلمانوں کو مسئلے کی اہمیت و نزاکت کا احساس دلایا اور ہندوؤں کی تردید میں حکومت کو درخواستیں اور عرضداشتیں بھجوائیں ۔

لیکن سرسید کی کوئی کوشش اور مسلمانوں کا کوئی احتجاج ، اردو ھندی قضیے کے سلسلے میں فوری طور پر کارگر ثابت نہ ھوا ۔ حکومت کے جبر اور ھندوؤں کی ضد کے آگے کسی کی نہ چلی ۔ ابھی اردو ھندی کے مسئلے پر بحث و مباحثہ شدت سے جاری ھی تھا کہ بنگال کے لفٹیننٹ گورنر مسٹر جی کیمبل (G. Camble) ۷ نومبر ۱۸۷۱ء کو ایک تعلیمی عمارت کا سنگ بنیاد رکھنے کے لیے مظفر پور (بہار) آئے ۔ جلسے میں تقریریں ھوئیں ۔ ڈاکٹر فیلن اور کیمبل نے انگریزی میں اور جلسے کے سیکریٹری مولوی امداد علی نے اردو زبان میں ، کیمبل صاحب کی خدمت میں سپاسنامہ پیش کیا ۔ ظاھر ھے کہ اس قسم کے سپاسناموں میں کچھ نہ کچھ پر تکلف انداز اختیار کرنا پڑتا ھے ۔ اسلوب کو پر زور و پر شکوہ بنانے میں روز مرہ کی بول چال کے بجائے ، عربی و فارسی کے الفاظ زیادہ جگہ پا جاتے ھیں لیکن مسٹر کیمبل کو اس سپاسنامے کی زبان پسند نہ آئی ۔ انہوں نے مولوی امداد علی کا شکریہ ادا کرنے کے بعد ، اردو کے خلاف بڑی زھر آلود تقریر کی ۔ انہوں نے کہا جس زبان میں یہ ایڈرس پڑھا گیا یہ ھرگز ملکی زبان نہیں اور یہ بہار میں جاری نہیں رہ سکتی۔[۱] چند ھی روز بعد ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو مسٹر کیمبل نے اردو کو سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے خارج کرنے کے لیے ایک عجیب و غریب حکمنامہ جاری کر دیا ۔ اس حکمنامے میں اس نے جو کچھ لکھا ، اس کے بعض ٹکڑے بطور نمونہ اس جگہ نقل کیے جاتے ھیں :

”فارسی زبان کو جو کہ ھندوستان کے قدیم حکمرانوں کی پرانی زبان تھی ، کلیتاً ترک کر دیا گیا ھے ۔ سرکاری زبان کی حیثیت سے میرے (لفٹیننٹ گورنر بنگال) ھندوستان آنے سے قبل یہ زبان ترک کر دی گئی تھی ۔ میری خدمت کے ابتدائی ایام میں اس بات کی پوری طور پر کوشش کی گئی کہ سرکاری قوانین میں اس دوغلی زبان کے الفاظ مستعمل نہ ھوں جو فارسی انشا پردازوں کو بہت عزیز

۱ ۔ حیات جاوید ، ص ۱۶۴

تھے۔۲ میرا خیال تھا کہ یہ زبان بالکل متروک ہو چکی ہے اور ہمیں ایسا کرنے میں کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن پچھلے دنوں جب مجھے بہار جانے کا اتفاق ہوا تو مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ یہ دوغلی زبان پھل پھول رہی ہے اور ہمارے قوانین میں اس کے لفظ استعمال ہوتے ہیں اور مدرسوں میں بھی اس کی تعلیم کا انتظام ہے۔ بہار میں میں نے جو زبان سنی وہ نہایت خراب اور مصنوعی تھی، ایسی مصنوعی زبان میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ اس قسم کی زبان کو ہمارے مدارس میں دیسی زبان (ورنیکولر) کہا جاتا ہے۔ مولوی لوگ جو زبان مروجہ زبان کی بجائے ہمارے مدارس میں سکھاتے ہیں وہ زبان کہلانے کی مستحق ہی نہیں ہے۔ اس زبان کے لیے ''اردو'' کا لفظ بنگال کے محکمۂ تعلیمات نے رائج کیا ہے، یہ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنی متعین نہیں کیے جا سکتے۔ کتابوں میں چاہے اس زبان کے متعلق کوئی کچھ لکھے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اردو زبان اہل دربار اور دہلی کی طوائفوں کی زبان ہے۔ اس کو ملک کی مروجہ زبان نہیں کہہ سکتے۔ میں نے پورا ارادہ کر لیا ہے کہ جہاں تک میرا بس چلے گا اس زبان کی تعلیم کو جو ہمارے مدرسوں میں دی جاتی ہے روکنے کی کوشش کروں گا۔ میں فارسی زبان کے مداحوں میں ہوں۔ یہ ایک نفیس اور پر تکلف زبان ہے اگر فارسی زبان کی تعلیم دی جائے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، بشرطیکہ حالات ایسا کرنے کے موافق ہوں، لیکن بگڑی ہوئی عربی اور بگڑی ہوئی فارسی کے میل سے جو زبان تیار کی گئی ہے جس میں ہندوستانی کے کچھ تھوڑے سے

۲۔ ان الفاظ سے ہندوستانی (اردو) کے الفاظ مراد ہیں لیکن اس کو کیا کیجیے کہ خود انگریزی زبان کے اکثر الفاظ دوغلے ہیں جیسا کہ گلکرسٹ نے بار بار کہا ہے۔ اس اعتبار سے انگریزی بھی دوغلی زبان ہوئی۔

افعال و حروف فجائیہ شامل کر لیے گئے ہیں ، جسے اردو کہتے ہیں ، ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی تعلیم دی جائے۔''

''میں ناظم تعلیمات کی توجہ مندرجہ ذیل امور کی جانب مبذول کراتا ہوں :

۱۔ اردو زبان ہمارے مدرسوں اور تعلیمی اداروں میں قطعی طور پر متروک ہو چکی ہے۔

۲۔ ناظم تعلیمات اور مہتممان تعلیمات کو ہدایت کی جاتی ہے کہ وہ اس بات کو دیکھیں کہ ہمارے مدرسوں میں کوئی ایسی کتاب تو نہیں پڑھائی جاتی جو ملک کی اصلی اور خالص زبان میں نہیں لکھی گئی ہے جس کے متعلق اوپر ذکر کیا جا چکا ہے۔

۳۔ اس قسم کی کتابیں جو نصاب میں شامل کی جائیں ان کی فہرست مجھے بھیجی جائے۔

۴۔ اگر تعلیمات کے کسی شعبے میں ایسی کتب موجود نہ ہوں جو مروجہ زبان میں لکھی گئی ہوں تو اس کے متعلق مجھے خاص رپورٹ بھیجنی چاہئیے میں ان کتب کی فراہمی کا انتظام کروں گا۔''

''میں نے اوپر جو کچھ ہدایات دی ہیں ان کی تعمیل تمام سرکاری عہدہ داروں پر عائد ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے دفاتر میں سوائے مروجہ زبان کے دوسری زبان کا استعمال نہ ہونے دیں ، سوائے انگریزی زبان کے۔ انگریزی زبان جن دفاتر میں استعمال ہوتی ہے وہاں علیٰ حالہ رہے گی۔ مجھے توقع ہے کہ ہائی کورٹ بھی اس بارے میں ہمارا ہاتھ بٹائے گا۔ مجھے پورا یقین ہے کہ ہائی کورٹ کے جج میری طرح دیسی زبانوں کے غلط استعمال کے خلاف ہوں گے۔'' ۳

۳۔ مقالات گارسین دتاسی ، حصہ اول ، ص ۱۷۶ تا ۱۸۳

گارسین۹ دتاسی نے کیمبل کے اس اقدام کے متعلق لکھا ہے کہ :

" ان کے اس حکمنامے کا ہر طرف مذاق اڑایا جا رہا ہے ، انڈین ڈیلی نیوز نے بھی اس کو کوئی اہمیت نہیں دی ۔ مسٹر کیمبل کے احکام کی بلا چوں و چرا پابندی کی جائے اور بہار کے مدارس میں اردو کو ختم کر دیا جائے لیکن اور دوسرے مقامات پر اس زبان کے رواج کو کوئی نہیں روک سکتا ۔" ۴

مولوی عبدالحق کا خیال ہے کہ کیمبل ایک تو پہلے ہی مسلمانوں اور اردو کا دشمن تھا، دوسرے یہ کہ اس وقت بہار میں ڈاکٹر فیلن بہ حیثیت مہتمم مدارس اور انتھونی میکڈانلڈ بہ حیثیت کلکٹر موجود تھے ۔ یہ دونوں اردو کے سخت مخالف تھے، چنانچہ انہوں نے لفٹننٹ گورنر کیمبل صاحب کے کان بھرے ۔ اور انہوں نے ۴ دسمبر ۱۸۷۱ء کو سرکاری دفتروں سے اردو کو خارج کرنے کی ہدایت جاری کر دی ۔ اس ہدایت نامے میں اردو کے بارے میں جس قسم کی بے بنیاد اور مسلمانوں کے سلسلے میں دل آزار باتیں کہی گئی ہیں ، ان سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسٹر کیمبل کو اردو اور مسلمانوں سے کتنی نفرت تھی ۔ وہ کھلم کھلا ہندی اور ہندوؤں کی طرف داری کر رہے تھے اور حاکم ہونے کے زعم میں مسلمانوں کی زبان و ثقافت پر ضرب کاری لگا رہے تھے ۔ ۵

بنگال اور بہار سے اردو کو خارج کرانے میں ، ہندوؤں کو جو کامیابی ہوئی تھی ، اس سے ان کا حوصلہ بڑھ گیا ، چنانچہ اب انہوں نے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت کا پروپیگنڈا ، یوپی اور پنجاب کے اضلاع میں بھی شروع کر دیا ۔ ہر شہر میں ہندو سبھا اور ہندی سبھا کے نام سے انجمنیں بنائی گئیں ، الہ آباد اور لاہور کی ہندی پرچارنی سبھائیں اس سلسلے

۴ ۔ مقالات گارسین دتاسی ، حصہ اول ، ص ۱۸۳

۵ ۔ سرسید احمد خان ، مولوی عبدالحق ، انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۵۱ء ، ص ۶۱ تا ۶۴

میں بڑی فعال تھیں اور ہندوؤں کی مذہبی تحریکوں کی مدد سے ان کا حلقہء اثر روز بروز بڑھتا جا رہا تھا۔ گارسین دتاسی ۱۸۷۱ء کے واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"اردو اور ہندی کے متعلق لسانی بحث مباحثے کا سلسلہ بہ دستور جاری ہے۔ ہندوستان کے ایک اخبار میں پڑھنے میں آیا ہے کہ صوبہ شمال مغرب کے دو لاکھ رجعت پسند ہندوؤں کے دستخط سے کلکتہ کی انگریزی حکومت کے رو بہ رو ایک معروضہ پیش کیا گیا ہے۔ جس میں یہ درخواست کی گئی ہے کہ تمام سرکاری کارروائیاں بجائے عربی رسم خط کے جس میں اردو لکھی جاتی ہے، دیوناگری رسم خط میں ہونی چاہیے، جس میں سنسکرت لکھی جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس بیان میں کچھ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے غالباً مذکورہ بالا معروضے سے وہ یاد داشت مراد ہے جو بابو شیو پرشاد نے حکومت کو بھیجی تھی اور جس پر ۵ ہزار اشخاص کے دستخط تھے جن میں مدرسے کے طلبا، بابو شیو پرشاد کے ماتحت اور ان کے احباب شامل تھے۔ بابو شیو پرشاد مہتمم تعلیمات ہیں اور ہندی زبان کے زبردست حمایتی ہین۔" ۶

بابو شیو پرشاد، مہتمم مدارس تھے یعنی محکمہء تعلیم کے سارے اساتذہ اور طلبہ براہ راست، ان کے حکم کے تابع تھے، چنانچہ اردو کے خلاف ان کی مرتبہ و مرسلہ یادداشت پر دستخط کرنے والوں میں زیادہ تعداد، اساتذہ و طلبہ ہی کی تھی، بابو شیو پرشاد کی دراخوست اور اردو کے خلاف دوسرے مضامین کے جواب میں ایک مدلل مضمون ۲۰ ستمبر ۱۸۷۲ء کے "اخبار انجمن پنجاب" میں شائع ہوا۔ ۷ اس میں بابو شیو پرشاد کی درخواست کے حوالے سے مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ:

"اس خبر وحشت اثر نے سارے ہندوستان میں کھلبلی مچا دی ہے

۶۔ مقالات گارسین دتاسی، حصہ اول، ص ۱۶۰

۷۔ مقالات گارسین دتاسی، حصہ اول، ص ۱۶۱

کہ بابو شیو پرشاد نے جو پتھر پھینکا ھے وہ مسلمانوں کے سر پر بہت زور سے لگا ھے۔ کچھ عرصہ سے مسلمانوں کو کچھ امید پیدا ھو چلی تھی لیکن اب ان کی امید کا درخت جس کی شاخیں سرسبز ھو رھی تھیں پھر سے خشک ھونے لگا ھے۔"

"کیا اردو زبان کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں سے خارج کر دیا جائے گا اور اس کی جگہ دیوناگری کو دی جائے گی جو مسلمانوں کے لیے کبھی بھی قابل قبول نہ ھوگی۔ مسلمانوں کو انگریزی زبان سیکھنے کی اس واسطے ضرورت ھے کہ یہ حکومت کی زبان ھے۔ اب کیا ان کے لیے یہ بھی لازمی ھوگا کہ وہ ان کی زبان سیکھیں جو ان کے ایک زمانے کے محکوم تھے؟ ھندی زبان کا رسم خط بدنما اور بھدا ھے، اس میں سنسکرت کے الفاظ ٹھونسے جاتے ھیں جو ایک مردہ زبان ھے اور جسے مردہ زبان ھوئے ایک ھزار سال سے بھی زائد ھوئے۔ ھندی کو ترقی دے کر اردو کو فنا کیا جا رھا ھے جس کی آبیاری عربی اور فارسی جیسی زندہ زبانوں کے سرچشموں سے ھوتی ھے اور جس کا خوش نما رسم خط آسانی سے سیکھا جا سکتا ھے اور جو سینکڑوں برسوں سے ھندوستان کے ھر گوشے میں قبولیت حاصل کر چکا ھے۔ لیکن ایسا کرنے میں کامیابی حضرت مسیح کے معجزوں سے کم نہ ھوگی۔ اگر انگریزی حکومت یہ سمجھتی ھے کہ ھندی کو رواج دے کر وہ ھندوؤں کی خواھش کی ترجمانی کر رھی ھے، تو اس کو چاھیے کہ اضلاع کے مجسٹریٹوں کے ذریعے کمیٹیاں قائم کرا کے اس امر کی تحقیقات کرائے کہ آیا واقعی ھندوؤں کی اکثریت دیوناگری رسم خط کو اختیار کرنے کے موافق ھے۔ لیکن اگر ان چند ھزار اشخاص کے علاوہ جنھوں نے بابو شیو پرشاد کی عرضداشت پر دستخط کیے ھیں، دوسرے ھندو لوگ دیوناگری کی تائید میں نہیں ھیں تو حکومت کو اس کی موافقت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بابو صاحب اور ان کے ھم خیال اشخاص پر یہ ذمے داری عائد ھوتی

ہے کہ وہ یہ ثابت کریں کہ ہندوستان کی ۴۱ کروڑ مخلوق میں سے اکثریت یا کم از کم ۶ یا ۷ کروڑ دیوناگری رسم خط کی حمایت میں ہیں، اس لیے کہ صرف مدرسوں کے طلبا کے دستخطوں سے ایسے اہم معاملے کا فیصلہ نہیں ہونا چاہیے۔ بہر حال اس میں شبے کی گنجائش نہیں کہ اگر حکومت نے دیوناگری رسم خط کی حمایت کا تہیہ کر لیا تو مسلمانوں کو اس سے بڑا نقصان پہنچے گا اور وہ جہالت کے دلدل میں پھنس جائیں گے۔ اردو کے توسط سے وہ عربی اور فارسی کے سر چشموں تک بہ آسانی پہنچ جاتے ہیں جو ان کے نزدیک نہایت اہم زبانیں ہیں اور حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے ہندو بھی جو اردو زبان اور اردو رسم خط کے عادی ہیں ان درختوں کے مماثل ہو جائیں گے جن کی جڑیں کسی نے اکھاڑ دی ہوں۔"

"یہ دعوی بلند آہنگی کے ساتھ کیا جاتا ہے کہ دیو ناگری رسم خط بہ نسبت اردو رسم خط کے زیادہ واضح ہوتا ہے اور اس میں جعل سازی بہت دشوار ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اردو رسم خط میں ہر طرح کی سہولت نہ ہوتی تو صدیوں سے اس کو استعمال نہیں کیا جاتا۔ در اصل دیو ناگری رسم خط میں طوالت ہوتی ہے اور اس کی تحریر میں بہت زیادہ وقت صرف ہوتا ہے، جس تحریر کے لئے اردو میں ایک منٹ درکار ہوتا ہے اس تحریر کے لیے دیو ناگری میں چھ منٹ صرف ہوتے ہیں۔ اور جو لوگ جعل سازی کرتے ہیں انہیں نہ اردو تحریر میں ایسا کرنے سے کوئی روک سکتا ہے اور نہ دیو ناگری میں۔ اگر اردو کی جگہ دیو ناگری رسم خط حکومت نے اختیار کر لیا تو مسلمانوں کے لیے سرکاری دفاتر میں ملازمتیں باقی نہیں رہیں گی، ویسے بھی سرکاری دفاتر میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور جو مسلمان سرکاری ملازمت میں ہیں وہ ادنیٰ خدمات پر فائز ہیں۔ اگر دیو ناگری کی تجویز منظور

ہو گئی تو ان کی تعداد سرکاری دفاتر میں اتنی بھی باقی نہ رہے گی۔“ ۸

لیکن اس قسم کے انفرادی جوابی مضامین کا جب کوئی اثر کسی پر نہ ہوا تو مسلمانوں نے اس مسئلے پر اجتماعی طور پر سوچنا شروع کیا۔ سرسید احمد خاں کی زیر ہدایت ، ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو اردو کی حمایت میں ایک بڑا جلسہ ہوا اور اردو کے دفاع کے لیے ایک صدر کیٹی الہ آباد میں قائم کی گئی، جس کے سکریٹری سرسید احمد خاں مقرر ہوئے۔ گارسین دتاسی نے ۱۸۷۴ء کے مقالے میں سید عبداللہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”الہ آباد میں ۸ دسمبر ۱۸۷۳ء کو مولوی فرید الدین، پلیڈر، ہائی کورٹ، کے ساتھ مل کر، انہوں (سید عبداللہ) نے ایک جلسہ منعقد کیا جس کے صدر جعفر علی تھے جس میں الہ آباد کے مشہور مسلمان شریک ہوئے تھے ، جلسے کا مقصد یہ تھا کہ ممتاز ہندوؤں کی حکومت کے نام اس درخواست کے خلاف احتجاج کیا جائے ، جس میں دفاتر اور مدارس میں دیو ناگری رسم الخط کے رواج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس موضوع پر مباحثے کے بعد یہ طے کیا گیا کہ الہ آباد میں ایک مرکزی کمیٹی قائم کی جائے جس کے سکریٹری سید احمد خاں ہوں اور وہ مجلس کی تجویزات کے مطابق عمل کریں۔“ ۹

ڈفینس سوسائٹی، الہ آباد، کا جلسہ ۸ دسمبر کو نہیں ۹ دسمبر کو ہوا تھا اور اس سلسلے میں جو صدر کمیٹی بنائی گئی تھی اس میں الہ آباد کے تہتر ممتاز شہری شامل تھے۔ ان میں سے بیشتر کا تعلق زمینداروں اور

۸ - مقالات گارسین دتاسی ، حصہ اول ، ص ۱۶۰ تا ص ۱۶۴

۹ - مقالات گارسین دتاسی ، حصہ دوم ، انجمن ترقی اردو ، دهلی ، ۱۹۴۳ء ، ص ۴

وکیلوں کے طبقے سے تھا۔۱۰ الہ آباد کے جلسے کی پوری روئداد و قرار داد، ۱۲ دسمبر ۱۸۷۳ء کے علیگڑھ اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ وہ اس وقت میرے سامنے ہے، اس میں صدر کمیٹی کے عہدیداروں کی تفصیل اس طور پر ملتی ہے۔

۱۔ پیٹرن یعنی مربی کمیٹی: نواب مظفر حسین خان صاحب، رئیس، تعلقہ دار، الہ آباد۔

۲۔ صدر انجمن: سید جعفر علی صاحب، رئیس و تعلقہ دار، الہ آباد۔

۳۔ شریک صدر انجمن: مولوی محمد حیدر حسین صاحب، رئیس جونپور و وکیل ہائیکورٹ۔

۴۔ نائب صدر انجمن: مولوی سید فرید الدین صاحب، رئیس کٹرہ و وکیل ہائیکورٹ۔

۵۔ سکریٹری: سید احمد خاں، خان بہادر، سی۔ ایس۔ آئی

۶۔ جوائنٹ سکریٹری: منشی محمد ذکا اللہ صاحب، پروفیسر ورنیکولر، سائنس اینڈ لٹریچر، میور سنٹرل کالج، الہ آباد۔

اردو ڈیفنس کمیٹی کیوں بنائی گئی تھی؟ اس کی تفصیل، روئداد کے شروع میں اس طور پر بہ عنوان ''اطلاع'' دی ہوئی ہے۔

''یہ بات معلوم کرکے کہ تھوڑا عرصہ گزرا جو ایک عرضی باستدعائی جاری کیے جانے دیو ناگری کے سرکاری دفتروں اور مدرسوں میں ممالک مغربی و شمالی میں ہندوؤں کے دستخط ہونے کے لیے پھرائی گئی تھی وہ عنقریب گورنمنٹ کے حضور میں پیش ہونے والی ہے اور نیز اس خیال سے کہ صوبہ بہار کے اردو کے طرف داروں کے

۱۰۔ دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس (الہ آباد)، سی۔ اے بیلی، آکسفورڈ، ۱۹۷۵ء، ص ۶۶

مستعد اور آمادہ نہ ہونے کے سبب سے دیو ناگری کے جاری ہو جانے کا حکم اس ملک میں صادر ہونے تک کوئی عرضی نہ گزر سکی، ان صاحبوں نے جو اضلاع شمالی و مغربی میں اردو کو بحال رکھنا چاہتے ہیں۔ تاریخ نویں دسمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں اس غرض سے ایک جلسہ کیا کہ کسی طرح یہ کارروائی کی جائے اور اس جلسہ کے صدر انجمن سید جعفر علی صاحب، رئیس و تعلقہ دار، الہ آباد تھے۔

اس جلسے میں یہ طے پایا کہ ایک صدر کمیٹی الہ آباد میں قائم کی جائے اور اس کے سکریٹری سر سید احمد خاں ہوں اور جو باتیں اردو ڈفینس کے سلسلے میں طے پائی ہیں، ان کو ایک سرکلر کی صورت میں بطور اطلاع، صوبہ جات شمال و مغرب کے ہر ضلعے میں خاص خاص لوگوں کے پاس بھیجا جائے تاکہ ہر ضلعے میں ماتحت کمیٹیاں، قائم کی جائیں اور صدر کمیٹی کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔ غرض یہ تھی کہ اردو کی حمایت میں جس وقت حکومت کو درخواست دینے کا موقع ہو، لوگوں سے دستخط کرانے میں دیر نہ لگے۔ اس سلسلے میں جو سرکلر تیار کیا گیا وہ خاصا تفصیلی ہے، اس کے آغاز میں مندرجہ ذیل وہ تین نکتے بیان کئے گئے ہیں جن کے سبب دیو ناگری کا اجرا مسلمانوں کے نزدیک اعتراض کے قابل تھا:

اول: تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس سے نہایت سخت ضرر پہنچے گا۔

دوم: اس کے ساتھ زبان تبدیل ہوگی جس سے غالباً مروجہ زبان میں بہت زیادہ خرابی اور نقصان پیدا ہوگا۔

سوم: عام کاروبار میں سخت دقت پیش آئے گی۔

اس کے بعد، ان ہی نکتوں کی وضاحت کی گئی ہے اور دیو ناگری کے رواج سے جس قسم کے نقصانات، مسلمانوں کو اٹھانے پڑیں گے ان کا تجزیہ کیا ہے۔

اردو ڈفینس سوسائٹی ، الہ آباد اور اس کے تحت ہر ضلع میں بنائی جانے والی کمیٹیوں کی کوششیں ، اردو کے خلاف ہندوؤں کے اٹھائے ہوئے طوفان کو تو نہ روک سکیں لیکن اس کے زور کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہوئیں ۔ بہار میں بھی حکومت کے احکام پر آسانی سے عمل درآمد نہ ہو سکا ۔ مسلمانوں کی طرف سے بہار، سی پی اور بنگال میں ، اردو کی دیرینہ حیثیت کو بحال کرانے کی برابر کوششیں ہوتی رہیں ۔ ان کوششوں کا کوئی مثبت اور دیرپا نتیجہ یوں نہ نکل سکا کہ ہندوؤں سے کہیں زیادہ خود حکومت ، اردو اور مسلمانوں کے در پۓ آزار تھی اس کا مقصود ، ہندی کی طرفداری کرکے اکثریتی طبقے کو خوش کرنا اور مسلمانوں کے اس پندار کو توڑنا تھا جو کبھی سراج الدولہ ، کبھی ٹیپو سلطان ، کبھی ١٨٥٧ء کی جنگ آزادی اور کبھی وہابی تحریک کی شکل میں ان کی مزاحمت کرنے سے نہ چوکتا تھا ۔ چنانچہ اس کھلی حقیقت کے باوجود کہ اردو ، برصغیر پاک و ہند کی سب سے زیادہ مستعمل اور مقبول زبان تھی اور ہندی کا اس سے کوئی مقابلہ نہ تھا ، انگریزوں نے برطانوی مقبوضے کے ہر علاقے میں دانستہ ایسے اقدام کیے جن سے اردو کو نقصان اور ہندی کو فائدہ پہنچا ۔ مسلمانوں کی مزاحمت کے سبب ، ان اقدامات کو عملی جامہ پہنانے میں البتہ دیر لگی اور جارج کیمبل نے بہار کے دفتروں سے اردو کو خارج کرنے کے لیے جو ہدایت نامہ ١٨٧٣ء میں جاری کیا تھا وہ ١٨٨١ء سے پہلے عملاً نافذ نہ ہو سکا ۔ ١١

پھر بھی بنگال ، سی پی اور بہار میں ، ہندوؤں کو ناگری کو جاری اور فارسی کو بے دخل کرانے میں جو کامیابی ہوئی تھی ، اس نے ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے ، انہوں نے اردو کے خلاف ، اپنی مہم پوری قوت کے ساتھ جاری رکھی ۔ البتہ ان کی مہم کا رخ اب یوپی ، پنجاب ، سندھ اور سرحد کی طرف

١١ - سیپرٹ‌ازم امنگ انڈین مسلمس ، ص ٤٧

مڑ گیا تھا ، اس لیے کہ ان علاقوں میں اردو اور فارسی کے اثرات اب بھی بہت گہرے تھے اور ان میں فارسی رسم الخط ہی مروج و مستعمل تھا ۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ تعلیم کی کمی اور اقتصادی کمزوری کے سبب وہ مسلمانوں کو آسانی سے اپنی راہ پر لگا لیں گے۔ لیکن سرسید کی علیگڑھ تحریک کے زیر اثر ان علاقوں میں اسلامیہ اسکول اور اسلامیہ انجمن کے ناموں سے جدید تعلیم کی تحصیل کے ایسے ادارے قائم ہو گئے تھے جن کی معرفت وہاں مسلمانوں میں سیاسی سوجھ بوجھ پیدا ہو چلی تھی ۔ نتیجتاً کسی علاقے میں بھی ہندی کے سلسلے میں ہندوؤں کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا ۔ ہندوؤں کا یہ خیال تھا کہ ناگری کے اجرا میں اگر انہیں پنجاب اور یوپی میں کامیابی حاصل ہو گئی تو پھر دوسرے علاقوں میں کامیاب ہونے میں دیر نہ لگے گی ۔ غالباً اسی خیال سے ان کی ساری توجہ یوپی اور پنجاب پر مرکوز ہو گئی ، دونوں جگہ ان کا مقابلہ سخت تھا ، یوپی میں مسلمان اقلیت میں تھے ، اس لیے وہاں تو تقریباً بیس سال بعد انتھونی میکڈانلڈ کی صریح نا انصافی اور مسلمان دشمنی کی وجہ سے ہندوؤں کو کچھ کامیابی ہو گئی ، اس کامیابی کی تفصیل آئندہ اوراق میں آئے گی لیکن پنجاب میں ، آخر تک بھی ہندوؤں کی کوششوں کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ۔

اس ناکامی کے دو خاص سبب معلوم ہوتے ہیں ۔ اول یہ کہ صوبہ پنجاب میں اتفاق سے ڈاکٹر لائٹنر جیسے بعض ایسے صاحب اثر اور انصاف پسند یورپین افسر ، محکمۂ تدریس و تعلیم میں موجود تھے ، جن کے پیش نظر ہندوستان کی سیاست نہیں بلکہ فی الواقع علمی و ادبی خدمت تھی ۔ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے اور ان کا یقین تھا کہ برصغیر کی لینگوا فرینکا صرف اردو ہے ۔ اس لئے اس کے فروغ کی جانب قدم بڑھانے میں وہ خود کو حق بجانب سمجھتے تھے ۔ اسی کے ساتھ ساتھ انہیں مشرقی زبانوں ، خصوصاً عربی و فارسی سے بھی گہری دلچسپی تھی اور وہ ان زبانوں کو زندہ رکھنا نہ صرف مسلمانوں بلکہ ہندوستان کی پوری تہذیبی و سماجی زندگی کے لیے ضروری خیال کرتے تھے ۔ پنجاب میں اردو کے مخالفین کی ناکامیابی کا دوسرا سبب یہ تھا

کہ اہل پنجاب دوسرے علاقے کے لوگوں کی بہ نسبت مشرقی زبانوں خصوصاً اردو کے دفاع میں زیادہ سرگرم اور پرجوش تھے۔ ہر چند کہ انیسویں صدی کے ربع آخر میں آریہ سماجی ہندوؤں نے لاہور کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنا لیا تھا اور پنجاب کے اضلاع میں جگہ جگہ ان کی شاخیں قائم تھیں لیکن اہل پنجاب نے اپنے صوبے کے مسلمانوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑنے دیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے زبان و ثقافت اور مذہب و سیاست کے باب میں ہندوؤں کی بدنیتی کو پوری طرح بھانپ لیا تھا اور اپنے تحفظ و دفاع میں ہر جگہ ہندو سبھاؤں کے متوازی اپنی الگ انجمنیں بنا لی تھیں۔

پنجاب گزیٹیر برائے ۹-۱۸۸۸ء کے دیکھنے سے پتہ چلتا ہے، اس وقت صوبہ پنجاب کے ضلعوں میں بعض بڑی تنظیموں مثلاً آریہ سماج لاہور، انجمن پنجاب لاہور، اور انجمن حمایت الاسلام لاہور کے علاوہ سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مندرجہ ذیل دو درجن سماجی و ادبی انجمنیں کام کر رہی تھیں:

۱- گرو سنگھ سبھا، لاہور: یہ سکھوں کی انجمن تھی اور ان ہی کے حقوق کی حفاظت اور مذہبی عقاید کی اشاعت کے لیے بنائی گئی تھی زرعی اور تعلیمی مسائل سے بھی اسے خاص دلچسپی تھی، چنانچہ زرعی ترقی اور تعلیم نسواں کے لیے اس نے خاصا کام کیا، مذہبی عقاید کے سلسلے میں گرو نانک کی تعلیم و زندگی پر کتب و مقالات شائع کرنا بھی اس کے مقاصد میں شامل تھا۔ ہفتہ وار "پنجابی جرنل" اس سوسائٹی کا ترجمان تھا اور سوسائٹی در اصل "انجمن پنجاب" سے منسلک تھی۔

۲- انجمن اسلامیہ، لاہور: ۱۸۶۹ء میں قائم ہوئی اور انجمن پنجاب کی مدد سے اس نے ایک اینگلو محمڈن اسکول قائم کیا تھا، اس کا بنیادی مقصد، پنجاب کے مسلمانوں کی تعلیمی و سماجی خدمت انجام دینا تھا۔ لیکن اس کے دائرہ خدمت میں دوسرے مسلمان بھی شامل تھے، چنانچہ اس نے ترکی کے مصیبت

لوگوں کے لیے بیس ہزار روپے کی رقم جمع کی تھی - لاھور کی مسجدوں کی تعمیر اور مرمت کا کام بھی اس نے اپنے ذمہ لے رکھا تھا - اس کے جلسوں میں ھر طبقے کے مسلمان شریک ھوتے تھے اور ان کی سرگرمیوں کی روئداد " رسالہ " انجمن پنجاب " میں شائع ھوتی تھی - اس انجمن کا مقصد خاص، حکومت تک مسلمانوں کی آواز پہنچانا اور ان کے حقوق کے تحفظ کے لیے مناسب ذرائع اختیار کرنا تھا -

۳ - ست سبھا، لاھور : اس کا مقصد ھندوؤں میں تعلیم کو عام کرنا اور ان کے اخلاقی و سماجی حالات کو بہتر بنانا تھا -

۴ - انجمن ھمدرد اسلامیہ، لاھور : ۱۸۸۰ء میں قائم ھوئی تھی - اس کے مقاصد کم و بیش وھی تھے جو انجمن پنجاب کے تھے - اس کی رکنیت کے دروازے ھر عقیدے کے لوگوں پر کھلے ھوئے تھے - مذھبی اصلاح کے لئے " اشاعت السنت " کے نام سے ایک ماھوار رسالہ بھی اس انجمن کی طرف سے نکلتا تھا اور اس کی روئیداد، اسی میں یا انجمن پنجاب میں شائع ھوتی‌تھی -

۵ - ھندو سبھا، لاھور : یہ انجمن ۱۸۸۲ء میں بنی تھی، اس میں مذھبی و سماجی مسائل پر بحثیں ھوتی تھیں اور اس کے اجلاس راجہ ھربنس سنگھ کے مکان پر ھوا کرتے تھے -

۶ - سنسکرت پرچارنی سبھا : اس کا خاص مقصد ھندوؤں میں سنسکرت زبان کو رواج دینا تھا، یہ بھی ۱۸۸۲ء میں قائم ھوئی تھی -

۷ - بھاشا پرچارنی سبھا، لاھور : یہ ھندی زبان کی ترقی و اشاعت کے لیے ۱۸۸۲ء میں بنائی گئی تھی -

۸ - انجمن حمایت اردو، لاھور : جیسا کہ نام سے ظاھر ھے، یہ اردو کے دفاع کے لیے ۱۸۸۲ء میں وجود میں آئی تھی -

۹ - دی انڈین ایسوسی ایشن ، لاهور : یه کلکته کی ''انڈین نیشنل ایسوسی ایشن،، کی ایک شاخ کی حیثیت سے کام کر رهی تهی -

۱۰ - انجمن قصور : ۱۸۷۰ء میں غلام نبی اور منشی قادر بخش نے قائم کی تهی - اس کا مقصد تعلیم کا فروغ اور دیسی صنعتوں کی ترقی تها - اس کی طرف سے اردو کا ایک رساله بهی نکلتا تها -

۱۱ - انجمن اسلامیه ، گجرانواله : یه ۱۸۷۵ء میں قائم هوئی تهی اور اس کا مقصد مسلمانان پنجاب کی سماجی و تعلیمی بهبود کے لیے کام کرنا تها - مدرسه اسلامیه کے نام سے اس کا ایک تعلیمی اداره بهی تها جس میں لاهور اورینٹیل کالج کے نصاب کے مطابق مشرقی علوم و السنه کی تعلیم هوتی تهی -

۱۲ - انجمن عام ، گجرانوله : یه رفاحی انجمن ۱۸٦٦ء میں بنی تهی- اس کے بانیوں میں کرنل بابیج اور رائے گوپال داس شامل تهے- اس نے ایک کتب خانه اور عجائب گهر قائم کیا تها- دونوں ادارے معیاری تهے -

۱۳ - سوشل کلب : فیروز پور میں یه ایک چهوٹا سا کلب تها جس کا مقصد ، سماجی خدمت تها - هر هفتے اس کے اجلاس هوتے تهے اور تقریر و تحریر کے ذریعے اس میں ، علمی و ادبی اور تعلیمی و سماجی مسائل زیر بحث آتے تهے -

۱۴ - انجمن اسلامیه ، امرتسر : ۱۸۷۳ء میں قائم هوئی تهی اور اس کا مقصد مسلمانوں میں مذهبی تعلیم کے ساتھ ساتھ انگریزی تعلیم کو بهی رواج دینا تها - اس میں شهر کے سارے ممتاز و مقتدر مسلمان شریک هو کر اپنے مشترک مسائل پر غور کرتے تهے - اس انجمن نے ایک اسکول بهی بچوں کے لیے قائم کیا تها -

۱۵ - مجلس اسلامیه ، امرتسر : یه موحدین کی بنا کرده انجمن تهی اور ۱۸۸۲ء میں قائم هوئی تهی -

۱۶ - هندو سبھا ، امرتسر : ۱۸۸۲ء میں بنی تھی اور اس کا اصل مقصد سنسکرت کو ہر دلعزیز بنانا اور ہندوؤں کی سماجی خدمت تھا ۔

۱۷ - مجلس اخلاقیہ ، امرتسر : یہ ایک علمی و ادبی مجلس تھی اور ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی تھی ۔ ہر شخص اس کا ممبر ہو سکتا تھا اور اس کا مقصد ، عوام کی سماجی خدمت تھا ۔ اردو میں ایک رسالہ بھی اس انجمن کی طرف سے نکلتا تھا ۔

۱۸ - آریہ سماج ، امرتسر : ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی تھی خاص مقصد ، ویدمت کی تعلیمات کو عام کرنا تھا ۔

۱۹ - یونین کونسل ، امرتسر : یہ انجمن ۱۸۸۷ء میں قائم ہوئی تھی ۔ اس کے ممبر ، سماجی مسائل کے حل پر غور کرتے تھے ۔

۲۰ - سنگھ سبھا ، امرتسر : اس کا مقصد سکھ عقاید کی تبلیغ و اصلاح تھا ۔ اس کے اجلاس دربار صاحب میں ہوتے تھے ۔

۲۱ - انجمن رفاہ عام ، اسمعیل خان : یہ فروری ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی تھی ۔ اس کے جلسے ہفتہ وار ہوتے تھے اور ان میں عوام کی اخلاقی و سماجی اصلاح کے بارے میں تبادلہ خیال ہوتا تھا ۔ مضامین پڑھے جاتے تھے اور ان پر بحث و مباحثہ ہوتا تھا ۔

۲۲ - انجمن پشاور : یہ پشاور ضلع کی واحد انجمن تھی اور چند برس پہلے قائم ہوئی تھی ، ”اخبار انجمن پشاور“ کے نام سے اس کا اخبار بھی نکلتا تھا ۔

۲۳ - انجمن ہزارہ : یہ بھی ضلع ہزارہ کی واحد انجمن تھی اور اس کے مقاصد وہی تھے جو انجمن پنجاب کے تھے ۔

۲۴ - انجمن رفاہ عام ، انبالہ : اس انجمن کا مقصد ، لوگوں کی ذہنی ، اخلاقی ، سماجی اور سیاسی ، ترقی کے لیے کام کرنا

تھا - ۱۸۸۲ء میں قائم ہوئی تھی - اس میں مذہبی مباحث پر گفتگو ممنوع تھی - انجمن اپنے ممبروں کے لیے انگریزی اور اردو کے اخبار بھی منگواتی تھی - مقامی زبانوں کے لیے ایک پریس قائم کرنے اور اردو کا ایک اخبار نکالنے کی تجویزیں بھی اس انجمن کے زیر غور تھیں - "۱۲

ان میں سے بیشتر انجمنیں ، ۱۸۸۰ء اور ۱۸۸۲ء کے درمیان قائم ہوئی تھیں ، ان میں قابل توجہ بات یہ ھے کہ مسلمانوں اور ھندوؤں کی انجمنیں تعداد میں تقریباً برابر تھیں - مسلمانوں کی انجمنوں میں سبھی نے کچھ نہ کچھ اردو کے سلسلے میں کام کیا ھے لیکن جن کا حلقہ اثر ، صوبہ گیر تھا یا اس سے بھی آگے بڑھ کر ، دوسرے صوبوں تک پھیل رہا تھا - ان میں انجمن پنجاب اور انجمن حمایت الاسلام کے نام آتے ھیں ، اس جگہ انھی دونوں کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا جائے گا -

پنجاب ۱۸۴۹ء میں سکھا شاھی سے نجات پا کر برطانوی عملداری میں آیا تھا - مسلمانوں کے عہد اقتدار سے یہاں کی سرکاری زبان فارسی چلی آ رھی تھی - سکھوں نے بھی اسے اپنے دور حکومت میں برقرار رکھا - لیکن ۱۸۴۹ء کے بعد ، بعض دوسرے برطانوی مقبوضات کی طرح پنجاب میں بھی فارسی کی جگہ اردو نے لے لی ، مدارس میں بھی اردو ھی کو ذریعہ تعلیم و تدریس قرار دیا گیا - ۱۸۵۴ء میں وڈ مراسلہ (Wood Despatch) کے تحت ، باقاعدہ تعلیمی محکمے وجود میں آئے اور ۱۸۵۸ء میں ان کی عملی صورتوں پر غور کیا گیا -۱۳ ۱۸۶۴ء میں گورنمنٹ کالج ، لاھور قائم ھوا اور نصاب و امتحانات کے سلسلے میں کلکتہ یونیورسٹی سے منسلک رھا - ڈاکٹر لائٹز گورنمنٹ کالج ،

۱۲ - گزیٹیر آف دی پنجاب پراونشل والیوم ، ۸۹-۱۸۸۸ء ، مرتبہ و مطبوعہ حکومت پنجاب

۱۳ - اسٹوڈنٹ ھسٹری آف ایجوکیشن ان انڈیا (۱۸۰۰-۱۹۴۷ء) ، نور اللہ اینڈ نائک ، میکملن اینڈ کمپنی ، بمبئی ، ۱۹۵۵ء ، ص ۱۳۰

لاہور کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے لیکن وہ اس نصاب اور پنجاب کے نظام تعلیم سے مطمئن نہ تھے۔ ان کی نظر میں اہل پنجاب کی لسانی و تعلیمی ضرورتیں ، کچھ اور تھیں۔ چنانچہ انھوں نے ان ضرورتوں کے پیش نظر ''انجمن پنجاب'' کی بنیاد ڈالی۔ انجمن کا پورا نام ''انجمن اشاعت مطالب مفیدہ پنجاب'' تھا لیکن سہولت کی خاطر یہ ''انجمن پنجاب'' کہلائی۔ ۲۱ جنوری ۱۸۶۵ء کو لاہور میں اس کا ابتدائی جلسہ ہوا۔ ڈاکٹر لائٹز اس کے صدر اور منشی سکھ رائے اور بابو نوبین چندر اس کے سکریٹری مقرر ہوئے۔ اس کے ممبروں میں بیشتر تعداد ہندوؤں کی تھی وجہ یہ تھی اس وقت صرف انگریزی تعلیم یافتہ اور سرکاری عہدیدار ہی اس کے ممبر ہو سکتے تھے۔ دوسرے علاقوں کی طرح چونکہ پنجاب کے مسلمان بھی ہندوؤں کے مقابلے میں پس ماندہ تھے اور سرکاری محکموں میں ان کی تعداد انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی اس لئے انجمن پنجاب پر بھی ہندو ہی چھائے ہوئے تھے۔ انجمن کے بنیادی مقاصد پانچ تھے۔

۱۔ قدیم مشرقی علوم کا احیا

۲۔ باشندگان ملک میں دیسی زبانوں کے ذریعے علوم مفیدہ کی ترویج

۳۔ صنعت و تجارت کا فروغ

۴۔ علمی و ادبی اور معاشرتی و سیاسی مسائل پر بحث

۵۔ صوبے کے با رسوخ اہل علم حضرات اور حکومت کے افسران میں رابطہ

ڈاکٹر لائٹز اس انجمن کے سب سے اہم اور فعال رکن تھے۔ وہ پنجاب میں ایک ایسی یونیورسٹی قائم کرنا چاہتے تھے جو قدیم و جدید علوم کا سنگم ہو اور جس میں تعلیم پانے والوں کی ذہنی و اخلاقی سطح ، ایک عالم جیسی ہو۔ اس کوشش میں انہیں فوری کامیابی تو نہ ہوئی البتہ ''پنجاب یونیورسٹی کالج'' کے نام سے ایک تعلیمی ادارہ دسمبر ۱۸۶۹ء میں قائم کر دیا گیا۔ اس کے سینٹ کا پہلا اجلاس جنوری ۱۸۷۰ء میں ہوا اور ڈاکٹر لائٹز جو کہ

انجمن پنجاب کے صدر اور گورنمنٹ کالج ، لاہور کے پرنسپل تھے - اس کے پہلے رجسٹرار مقرر ہوئے - ۱۴

لیکن ڈاکٹر لائٹز اور " انجمن پنجاب " کے ارکان کے ذہن میں مشرقی زبانوں کے احیا و فروغ کا جو پروگرام تھا ، اس سے وہ غافل نہیں رہے - اس لیے انجمن کے جلسوں کے لیے انہوں نے ایک شرط یہ رکھی کہ اس میں جو مقالات پڑھے جائیں یا تقریریں کی جائیں وہ اردو میں ہوں اور اگر کوئی چیز انگریزی میں پڑھی جائے تو بحث کے لئے اس کا خلاصہ پہلے ہی سے اردو زبان میں بتا دیا جائے - اردو کے سلسلے میں انجمن کا دوسرا قابل ذکر کام " رسالہ انجمن پنجاب " کے نام سے ایک ماہوار رسالہ کا اجرا ہے ، بعد کو ایک رسالہ اگرچہ انگریزی زبان میں بھی نکلنے لگا تھا لیکن انجمن کا ترجمان خاص اردو رسالہ تھا - ۱۵ اس میں انجمن کی پندرہ روزہ اجلاس کی روئداد کے علاوہ مختلف موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے تھے -

انجمن کا جلسہ ہر پندرھویں دن ہوتا تھا ، اور اس میں تبادلہ خیال کے لیے کوئی نہ کوئی علمی و ادبی یا معلوماتی مضمون پڑھا جاتا تھا - مختلف زبانوں کے لیے الگ الگ کمیٹیاں قائم تھیں - عربی کمیٹی کے صدر ڈاکٹر لائٹز ، فارسی کے نوازش علی ، سنسکرت کے پنڈت رادھا کشن - اردو کے

۱۴ - تاریخ اورینٹل کالج ، لاہور ، ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار ، لاہور ، ۱۹۶۲ء ، ص ۱۷

۱۵ - " انجمن پنجاب " کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے :

(الف) صحیفہ ، لاہور ، بابت اپریل ۱۹۷۲ء ، ص ۱ تا ۱۷

(ب) مقالات منتخبہ اورینٹل کالج میگزین ، لاہور (۱۹۲۵ تا ۱۹۷۰ء) ، پروفیسر وقار عظیم ، لاہور ، ۱۹۷۰ء ، ص ۱۱۹ تا ۱۸۶

(ج) " انجمن پنجاب ، تاریخ و خدمات " ، (پی - ایچ - ڈی کا مقالہ قلمی) ، از ڈاکٹر صفیہ تمنائی -

دیوان بیج ناتھ اور ہندی کمیٹی کے صدر بابو نوبین چندر تھے، بابو نوبین چندر، سنسکرت کمیٹی کے بھی رکن تھے۔ اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں ان کی سرگرمیاں حد سے بڑھی ہوئی تھیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ پنجاب کے علمی و ادبی حلقوں میں اردو کے خلاف، سب سے پہلے انھی نے آواز بلند کی۔ ۲۳ فروری ۱۸۶۵ء کو انجمن پنجاب کے اجلاس میں انھوں نے ایک مقالہ بہ عنوان "فائدہ اجرائے علم ہندی در سلک پنجاب" پڑھا تھا۔ روئداد میں یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ہندی کے بارے میں پہلا مقالہ ہے جو اس انجمن میں پڑھا جائے گا۔ نوبین چندر نے اپنے مقالے میں یہ موقف اختیار کیا ہے کہ:

"اردو کی طرح ہندی کو بھی پنجاب کے سرکاری دفتروں میں رائج کیا جائے اور جس طرح اردو میں عربی، فارسی کے الفاظ بکثرت مستعمل ہیں اسی طرح ہندی میں زیادہ سے زیادہ سنسکرت کے الفاظ داخل کیے جائیں۔"

بابو نوبین چندر کے مضمون کا جواب گجرات کے اسسٹنٹ کمشنر ہادی حسین نے اگلے جلسے میں دیا تھا۔ گارسین دتاسی نے ان کی بحثوں کا ذکر کیا ہے۔۱۶ انجمن پنجاب کے ایک اور جلسے میں بھی بابو نوبین چندر نے اردو کے خلاف مضمون پڑھا اس میں انھوں نے ایک دعوی تو یہ کیا کہ:

"جو زبان (اردو) اتنے مختلف عناصر پر متشکل ہو وہ اہل ہند کے یہاں احیائے علم کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ وہ صرف دفتری، انتظامی ضرورتوں کے لیے موزوں ہے۔ اہل ہند کو اپنے جدید ادبیات کے لیے اپنی حقیقی قومی زبان استعمال کرنی چاہیے نہ کہ اردو جو کہ مسلمانوں کی زبان ہے، کیونکہ مسلمان فاتحوں نے اپنی اصلی زبانوں کے لا تعداد الفاظ داخل کر دیے ہیں۔"

۱۶ - خطبات گارسین دتاسی، حصہ دوم، ص ۵۳ اور ص ۹۶

دوسری بات نوبین چندر نے اپنے مضمون میں یہ کہی کہ :

” اردو میں صرف عشق عاشقی کی مضامین کے ترجمانی ہو سکتی ہے ، سنجیدہ علمی مضامین اس میں جگہ نہیں پا سکتے ، اس لیے اردو کے بجائے ہندی کو رواج دینا اور ناگری میں لکھنا ضروری ہے ۔“

گارسین دتاسی نے نوبین چندر کی دلیلوں کو رد کرتے ہوئے ۱۸۶۶ء کے خطبے میں لکھا ہے کہ :

” ترجیح صرف اردو کو دینی چاہیے، اس لیے کہ وہ خالص ہندوستانی زبان نہیں ہے بلکہ اسلام اور ہندو دھرم کے درمیان ایک طرح کا رشتہ اتحاد قائم کئے ہوئے ہے ۔“ ۱۷

اردو میں عشق و عاشقی کے مضامین کے سلسلے میں گارسین دتاسی نے لکھا :

” یہ قصور زبان کا نہیں بلکہ اہل زبان کا ہے ، کیا ہم بابو صاحب سے دریافت کر سکتے ہیں کہ ہندی میں سوائے ہمہ اوستی فلسفہ کی خیال آرائیوں کے ، جو لا تعداد رسالے ہیں وہ واقعی ایسے ہیں کہ اس بنا پر ثانی الذکر کو اول الذکر پر فوقیت حاصل ہو؟ بابو صاحب نے کبیر داس اور نانک کے کلام کا ذکر کیا ہے، لیکن ان کے ہاں بھی کم و بیش اسی ہمہ اوستی فلسفے کے متعلق اظہار خیال ہے ، کہیں ذرا دلچسپ ہے اور کہیں خشک و بے مزہ ۔ مالوہ اخبار کے مدیر نے اس امر کی جانب توجہ مبذول کرائی ہے کہ ہندی میں بھی عشق و عاشقی کے مضامین نادر نہیں ہیں ۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے اگر آپ ” بدر منیر “ اور ” دریائے عشق “ کو مخرب اخلاق خیال کرتے ہیں تو ” پریم ساگر “ اور ” مدھ مالت “ کے متعلق بھی یہی حکم لگائیے ۔“

۱۷ - خطبات گارسین دتاسی ، حصہ دوم ، ص ۹۷

''بابو صاحب ایک کٹر ہندو کی حیثیت سے فارسی رسم خط کو پسند نہیں کرتے - میرے خیال میں ہندی اردو کا جھگڑا کوئی اتنی اہمیت نہیں رکھتا - مشکل یہ آ پڑی ہے کہ اس مسئلے پر جب بحث کی جاتی ہے تو محض نحو پر گفتگو نہیں ہوتی بلکہ سمجھا جاتا ہے کہ ہندی ہندو دھرم کی نمائندہ ہے - وہ ہندو دھرم جس میں بت پرستی اور اس کے بدبختانہ لوازمات بنیادی عقیدے کی حیثیت رکھتے ہیں - اس کے بر عکس اردو ، اسلامی تہذیب و تمدن کی علمبردار ہے اور چونکہ اسلام میں سامی عنصر شامل ہے اور توحید اس کا اصل عقیدہ ہے اس لیے اسلامی تہذیب میں یوروپین یا مسیحی تہذیب کی خصوصیات پائی جاتی ہیں - '' ۱۸

پنجاب میں اردو پر اس طرح کے اعتراضات برابر ہوتے رہے اور ہندوؤں کی مسلسل یہ کوشش رہی ہے کہ ہندی اور دیو ناگری کو اردو کا منصب مل جائے لیکن ایسا نہ ہو سکا - وجہ یہ تھی کہ پنجاب کے مسلمانوں کی کوششیں ، اردو کے سلسلے میں صرف تقریر و تحریک تک محدود نہ تھیں بلکہ عملاً بھی وہ اس کے لیے بہت کچھ کر رہے تھے، خاص طور پر '' انجمن پنجاب '' اس سلسلے میں بڑی جرات سے کام کر رہی تھی- انجمن نے پہلا کام یہ کیا کہ ۱۸۶۵ء میں علوم شرقیہ کی ترویج کے لیے ایک مدرسہ قائم کیا اور لاہور شکما سبھا نے ۱۸۶۳ میں جو پاٹھ شالا قائم کیا تھا اسے اپنی تحویل میں لے کر ، عربی ، فارسی اور اردو کی تعلیم کا آغاز کر دیا - ۱۸۶۶ء میں تجربے کے طور پر اس میں کالج کے درجے بھی کھول دیے گئے، لیکن مالی مشکلات کی بنا پر ۱۸۶۸ء میں اسے بند کر دینا پڑا - پھر بھی ایک قرار داد کے ذریعے انجمن نے یہ طے کر دیا کہ جب بھی حالات سازگار ہوں ، مجوزہ اورینٹیل کالج کے مقاصد کے مطابق ، اس میں مدرسے اور کالج کی کلاسیں شروع کر دی جائیں - اسی اثنا میں ایک خوش آئند بات یہ ہوئی کہ ۱۸۷۰ء میں خود حکومت کی طرف سے ''پنجاب یونیورسٹی اورینٹیل اسکول'' قائم کر دیا گیا - یہ ادارہ

۱۸ - خطبات گارسین دتاسی ، حصہ دوم ، ص ۹۸

اگرچہ " انجمن پنجاب " کے اس کالج کے مقاصد کے مطابق نہ تھا، جو ۱۸۶۸ء میں بند کر دیا گیا تھا، تاہم اس سے اسی قسم کی اغراض پوری ھوتی تھیں یعنی اس میں عربی ، فارسی اور اردو کی تعلیم و تدریس کا باقاعدہ انتظام تھا ۔ پہلے یہ اورینٹیل اسکول کہلاتا تھا ۔ ۱۸۷۳ء کے بعد اورینٹیل کالج کہلایا ۔ ڈاکٹر لائٹنر اس کے پہلے اعزازی پرنسپل مقرر ھوئے ۔ ۱۸۸۲ء میں پنجاب یونیورسٹی قائم ھوئی اور اورینٹیل کالج اس کا ایک جزو بن گیا ۔ ۱۹

پنجاب میں جیسے جیسے عربی ، فارسی اور اردو کی اشاعت و ترقی کے امکانات روشن ھوتے جاتے تھے، ویسے ویسے اردو کے خلاف ھندوؤں کی سرگرمیاں تیز تر ھوتی جاتی تھیں ۔ چنانچہ ۱۸۸۲ء میں جب تعلیمی سروے کے لیے ھنٹر کمیشن قائم کیا گیا تو اردو کے خلاف ، ھزاروں کے دستخط سے متعدد عرضداشتیں ، کمیشن کے سامنے پیش کی گئیں ۔ یہ مہم یوپی اور پنجاب ، دونوں جگہ بہ یک وقت چلائی گئی ۔ پال براس نے پنجاب کے سلسلے میں لکھا ھے کہ:

> The Hindi movement in the 19th Century in the Punjab was led both by Hindi speaking and Punjabi speaking urban Hindus whose higher education had been in Urdu and English. In its origin, it was clearly a religio-political or communal movement, promoted by the Arya Samaj to displace Urdu in Persian script as the official language of the province because Urdu was associated with Muslim dominance and Hindi with Hindu religious reform and political aspirations. The Hindi-Urdu controversy in the Punjab arose for the first time in 1882, a year after the decision to substitute Hindi in the Devnagri script for Urdu in Persian script in Bihar. The demand in the Punjab by the urban, was the same and it was seen by both sides as an aspect of Hindu-Muslim communal conflicts. The Anjuman-i-Islamiya of Lahore protested against the movement which it saw as aiming a death-blow to the prospects of the Mohammadans. The famous Arya Samaj leader and Punjab politician late Lajpat Rai, who actually did not know the Hindi alphabets, entered political life in this controversy because he

۱۹ - تاریخ یونیورسٹی ، اورینٹیل کالج ، ص ۱۸ تا ۴۴

came to believe that Hindi could be the foundation for the edifice of Indian nationality. Lala Lajpat Rai learnt his first lesson in "Hindu rationalism" and became convinced that political solidarity demanded the spread of Hindi and Devanagri.[20]

''انجمن پنجاب'' کی ایک رپورٹ، انگریزی زبان میں بہ اہتمام ہرکشن داس، ۱۸۸۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے دو حصے ہیں۔ پہلا حصہ انجمن کے قواعد و ضوابط اور انتظامی امور سے متعلق ہے۔ دوسرا حصہ ۲۸ مارچ ۱۸۸۲ء کے سالانہ اجلاس کی روئداد پر مشتمل ہے۔ اشفاق انور نے اس رپورٹ کا اردو ترجمہ جولائی ۱۹۶۷ء، جنوری، اپریل اور جولائی ۱۹۶۸ء کے، ''صحیفہ'' (لاہور) میں شائع کر دیا ہے۔ اس کے دیکھنے سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے کہ پنجاب کے ہندو ۱۸۸۲ء کے ایجوکیشن کمیشن کے روبرو اردو کے خلاف بہ حیثیت گواہ پیش ہوئے تھے اور ہندی کو پنجاب میں رائج کرانے کی جان توڑ کوشش کی گئی تھی۔ منشی نوین چندر، جو کہ انجمن پنجاب کے ایک ممتاز و سرگرم رکن ہونے کے ساتھ ساتھ، اس کی انگریزی اور ہندی کمیٹی کے صدر، مالیاتی، تعلیمی اور سنسکرت کمیٹی کے رکن، اور انجمن کے انگریزی جریدہ کے مدیر بھی تھے۔[۲۱] تنہا انہوں نے ۱۸۸۱ء اور ۱۸۸۲ء کے دوران میں پنجاب کے تعلیمی نظام اور ہندی کے موضوع پر، آدھے درجن مضامین لکھے تھے۔ ان میں ایک مضمون تھا ''ہندوؤں کی زبان جس سے سرکاری اسکولوں میں بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔''[۲۲] علاوہ ازیں انہوں نے ''بھاشا پرچارنی سبھا، لاہور''، کی جانب سے ایک یاد داشت اردو کے خلاف، اپنے خط کے ساتھ تعلیمی کمیشن کے صدر ڈاکٹر ڈبلو ہنٹر کو بھجوائی تھی۔ یاد داشت پر، ہندو طبقے کے بہت سے فرد کے دستخط تھے اور اس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی کہ ''پرائمری اسکولوں میں اردو اور گورمکھی کی جگہ، ہندی

۲۰۔ لینگوئج، ریلیجن اینڈ پالیٹکس، ص ۲۸۷

۲۱۔ صحیفہ، لاہور، جنوری ۱۹۶۸ء اور جولائی ۱۹۶۸ء

۲۲۔ صحیفہ، لاہور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۸۹

کو رائج کیا جائے، خصوصاً کھتری اور برھمن طبقے کے بچوں کو ابتدائی تعلیم، ھندی اور دیو ناگری رسم الخط کے ذریعے دی جائے۔ ایسے امور میں آبادی کی تعداد مثلاً کسی خاص گاؤں کی اکثریت کی زبان کو مدنظر رکھا جائے کثیر آبادی والے علاقوں کے موجودہ پرائمری اسکولوں میں جہاں اردو اور فارسی کی تعلیم دی جاتی ھے ایک ھندی اور ایک گورمکھی پڑھانے والے استاد کا اضافہ، خواہ وہ حکومت کے خرچ سے ھو یا میونسپل کمیٹیوں اور دیگر مقامی اداروں کی طرف سے، کچھ زیادہ اخراجات کا باعث نہ ھوگا کیونکہ ایسے اساتذہ ھر جگہ تھوڑی تنخواھوں پر رکھے جا سکتے ھیں۔ ۲۳

اس عرضداشت اور خط کے جواب میں ڈاکٹر ھنٹر نے نوبین چندر کو حسب ذیل مضمون کا ایک خط لکھا:

”بھاشا پرچارنی سبھا، لاھور کی طرف سے ایک یاد داشت کے ساتھ آپ کا خط، بابت ۳۱ تاریخ ماہ حال، کل مجھے موصول ھوا۔ یہ وھی مسئلہ ھے جس میں تعلیمی کمیشن نے گہری دلچسپی لی ھے۔ متعلقہ یاد داشت، میں نے اپنے رفقائے کار کو دکھائی اور اس کے ترجمے کی نقول ان کو فراھم کیں۔ میں بھاشا پرچارنی سبھا، لاھور کے اس واضح اور عالمانہ بیان کے لیے ان کا شکر گزار ھوں اور آپ کو یقین دلاتا ھوں کہ کمیشن اس یاد داشت پر پوری توجہ سے غور کرے گا۔“

اس کمیشن کے لیے پنجاب کی صوبائی رپورٹ کی تیاری کا کام زیادہ تر مسٹر پیٹرسن، انسپکٹر مدارس برائے حلقہ انبالہ کے سپرد ھوگا۔ میں یہ تجویز کروں گا کہ اگر سبھا اس سلسلے میں مزید سلسلہ جنبانی کرنا چاھے تو اسے اپریل میں موصوف کی پنجاب میں واپسی پر ان سے براہ راست رابطہ قائم کرنا چاھیے۔“ ۲۴

۲۳ - صحیفہ، لاھور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۵۶

۲۴ - صحیفہ، لاھور، جولائی ۱۹۶۸ء، ص ۵۷

نوبین چندر نے اس طرح کی یاد داشتیں ، ہنٹر کمیشن کے دوسرے ارکان کو بھی بھجوائیں تھیں - ان میں ہندی کو دوسری زبانوں پر ترجیح دیتے ہوئے کہا گیا تھا کہ "ہندی بھاشا" سے مراد پنجاب کی عوامی زبان ہے جسے دیو ناگری رسم الخط میں لکھا جانا چاہیے - لیکن انگریز ممبروں کی طرف سے جواب دیا گیا کہ "ہندی بھاشا کو پنجاب کی عوامی زبان سے کوئی تعلق نہیں ہے" اس خیال کی تائید میں بعض ہندوؤں ، مثلاً رائے مول سنگھ ، نے بھی یہی کہا کہ ہندی بھاشا پنجاب کی بولی سے جسے پنجابی کہا جاتا ہے زیادہ مشکل ہے - ۲۵

غرض کہ نوبین چندر اور ان کے ساتھیوں کو اپنے مقصد میں کوئی کامیابی نہ ہوئی - اول اس لیے کہ پنجاب کے مسلمان ، اردو کے سلسلے میں ہر محاذ پر چوکنا اور مستعد رہے - دوسرے اس لئے کہ محکمۂ تعلیم پنجاب کے انگریز افسروں نے اس موقع پر مسلمان دشمنی سے کام نہ لیا اور اپنی رپورٹوں میں وہی لکھا جو عوامی ضرورتوں اور انصاف کا تقاضا تھا - تیسرے اس لیے کہ "انجمن پنجاب" کے علاوہ بھی ، اردو کی حمایت میں کئی انجمنیں قائم تھیں اور یہ سب کچھ نہ کچھ اپنے موقف کے دفاع میں کر رہی تھیں - یوپی میں ۱۸۸۲ء کے ایجوکیشن کمیشن سے اردو کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا، وہ بھی وقتی طور پر ٹل گیا - وجہ یہ ہوئی کہ مسلمانوں نے متحد ہو کر اردو کے مسئلے سے گہری دلچسپی لی، دوسرے یہ کہ اس وقت اتفاق سے سرسید احمد خاں وائسرائے کونسل کے ممبر تھے - انہوں نے ہنٹر کمیشن کے ارکان پر پہلے ہی واضح کر دیا تھا کہ اردو ہندی کا قضیہ ایک سیاسی قضیہ ہے ، تعلیمی کمیشن کو اس سے کوئی تعلق نہ ہونا چاہیے - ۲۶ ایجوکیشن کمیشن نے یہی کیا اور ہندوؤں کا ایجیٹیشن کامیاب نہ ہو سکا -

لیکن مسلسل ناکامیوں کے باوجود ہندوؤں نے اردو کی مخالفت میں اپنی مہم کسی نہ کسی شکل میں جاری رکھی - اس سلسلے میں اب ان کی سرگرمیاں

۲۵ - صحیفہ ، لاہور ، جولائی ۱۹۶۸ء ، ص ۵۷

۲۶ - حیات جاوید ، ص ۱۶۵

صرف ہندی کو آگے بڑھانے، یا اردو کو نقصان پہنچانے تک محدود نہ رہیں، بلکہ انیسویں صدی کی آخری دہائیوں میں انہوں نے متعدد ایسی مذہبی و سماجی تحریکوں کو جنم دیا جن کا مقصد بھی واضح طور پر ہندو کلچر کا احیا، ہندی کی ترویج، اردو کی مخالفت اور ہندوؤں کو ایک طاقتور قوم کی حیثیت سے ابھار کر، ہمیشہ کے لیے مسلمانوں پر مسلط کرنا تھا۔ اس تحریک میں قدیم ترین سماجی تحریک راجہ رام موہن رائے کی برہمو سماج (۱۸۲۸ء) تھی، جس کا تھوڑا سا ذکر پچھلے باب میں ہو چکا ہے۔ برہمو سماج کے ایک رہنما کیشوب چندر سین کی تقریروں کے زیر اثر بمبئی میں "پرارتھنا سبھا" قائم کی گئی، برہمو سماج اور پرارتھنا سبھا سے متاثر ہو کر ۱۸۷۵ء میں دیانند سرسوتی نے آریہ سماج کی بنیاد ڈالی، یہ خالصاً ہندو جماعت تھی اور کسی غیر ہندو کو اس کا ممبر بننے کی اجازت نہ تھی۔ سارے پروگرام مذہبی تعصبات پر مبنی ہوتے تھے۔ اس جماعت کا بنیادی مقصد، ہندو مذہب کو ویدوں کے مطابق ڈھالنا اور ہندوؤں کو طاقتور بنا کر، غیر ہندو کے خلاف انہیں جنگ پر آمادہ کرنا تھا۔ دیانند سرسوتی نے سنسکرت آمیز ہندی میں ایک کتاب بھی "ستیارتھ پرکاش" کے نام سے لکھی۔ اس کتاب کے ذریعے ایک طرف انہوں نے جدید ہندی کو تقویت پہنچائی، دوسری طرف مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں میں مذہبی اشتعال پیدا کیا۔ عزیز احمد نے دیانند سرسوتی کے متعلق لکھا ہے کہ:

> It is interesting that the first work written in 'pure' and highly sanskritized (Sanskrit-Nistha) Hindi, was the *Satyartha Prakash* of Dayanand Saraswoti, the founder of the aggressive revivalist Arya Samaj, who was the first to give a conscious and definite expression to the view that Hindi should be the 'Pan-Hindu Language of India'. Not very different was the analysis of Moulana Mohammad Ali arrived at from the opposite point of view: 'Hindi is the constructive work of the Advocate of Pan-Hinduism......; its first creation is the result not of comprehension and inclusion, but of elimination and exclusion.' Whereas the Arya Samajist Dayanand considered it the religious duty of every Hindu to promote Hindi, the *Arya Bhasha* (the

Aryan language), the more moderate and traditionalist movement of Hindu revivalism, the Sanatan Dharam, led by Pandit Sharda Ram, also recommended its use.[27]

''ستیارتھ پرکاش'' نامی کتاب کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ یہ سنسکرت آمیز ہندی میں ہے یا اس میں ہندو مت کی اہمیت و بزرگی بیان کی گئی ہے بلکہ اس میں دیگر مذاہب بالخصوص اسلام پر رکیک حملے بھی کئے گئے ہیں۔ دیا نند سرسوتی نے بعد کو واضح طور پر اعلان کیا کہ ہندوستان صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ مسلمانوں کو یا تو ہندوستان چھوڑ کر چلے جانا چاہئے، یا ہندو ہو جانا چاہئے۔ غرضیکہ دیا نند سرسوتی کی ''آریہ سماج'' ہندوؤں کی ایک کٹر اور مسلمان دشمن جماعت تھی۔ مسلمانوں کے خلاف اس کا پروپیگنڈا اتنا منظم اور اتنی وسعتیں لئے ہوئے تھا کہ ہندوستان سے باہر بھی اس کا ایک حلقہ اثر پیدا ہو گیا تھا۔ فرانسس رابنسن نے برھمو سماج اور پرارتھنا سماج کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :

Both these societies contributed much to the formation of a third organisation, which had its greatest impact in the Punjab, the Arya Samaj. Founded by Dayanand Sarswati in 1875, it aimed at purging Hinduism of its degenerate forms by establishing virtually a new religion which was based on a reasoned interpretation of the Vedas and supported all those social reforms urged by Western-educated Hindu Society. Sarswati's teaching so impressed the leaders of the Theosophical Society founded in New York in 1875 that, with the aim of amalgamating their movement with the Arya Samaj, they came to India. The connection with the Samaj was brief and ended in tears. In the 1880s and 1890s Arya Samajist attacked the Muslims with increasing intensity. The Leader of the crusade, Pandit Lakh Ram, condemned all forms of Islam, particularly the "Naturalist Muhammadis' that is Syed Ahmed Khan's Aligarh movements, and demanded that the Muslims should be either expelled from India or converted to Arayanism. The crusade lost vigour only after

۲۷ - اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین انوائرمنٹ، آکسفورڈ، ۱۹۶۶ء، ص ۲۵۹-۲۶۰

Lakh Ram's assassination in 1897. Such antiagonism towards the Muslims and Muslim culture resulted, almost inevitably, from the growth of a new sense of Hindu identity. It had impotant political implications. 27a

۱۸۸۲ء میں دیا نند سرسوتی ھی نے گئو رکھشا سبھا (سوسائٹی فار دی پروٹیکشن آف کاؤز) قائم کی اور گاؤ ذبیحہ کے بہانے ھندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے کے لئے ، گائے کے احترام کے بارے میں اصول و قوانین شائع کئے۔ اور آخر آخر شدھی کے نام سے انھوں نے غیر ھندو کو فرداً فرداً ھندو بنانے کی تحریک چلائی ۔۲۸

جس سال "گئو رکھشا سبھا" قائم ھوئی اسی سال یعنی ۱۸۸۲ء میں ایک بنگالی ھندو بینکم چندر چٹرجی نے ایک ناول "آنند مٹھ" یعنی "مسرت کی خانقاہ" کے نام سے لکھا ۔۲۹ جس میں ، مسلمانوں اور ھندوستان میں ان کے عہد حکومت کے خلاف، جی کھول کر زھر اگلا گیا ۔ ھندوؤں کا قومی ترانہ "بندے ماترم" اسی ناول کا حصہ ھے۔ یہ ناول ، صرف بینکم چندر چٹرجی یا ان کے عہد کی ھندو ذھنیت کا ترجمان ھی نہیں ھے، بلکہ اس سے یہ بھی پتہ چلتا ھے کہ پچھلے ڈیڑھ دو سو سال سے ، مسلمانوں کے بارے میں ھندو ، کس طرح سوچ رھے تھے ۔ اس نام و نہاد تاریخی ناول میں ، واقعات کو توڑ مروڑ کر کس طرح پیش کیا گیا ھے اور ھندو جنتا کو مسلمانوں کے خلاف کس طرح اکسایا گیا ھے ، اس کا اندازہ کرنے کے لئے اس کے پلاٹ کی ایک جھلک دیکھئے :

"بنگال میں مسلمانوں کی حکومت کا آخری زمانہ ھے ۔ ایک شخص بھاوانند ، مسلمانوں کا تختہ الٹنے کے لئے ھندوؤں کی فوج جمع کرنے نکلتا ھے ، اس کی ملاقات ایک اور شخص ، سہندر نامی سے ھوتی ھے ۔

۲۷ (الف) ۔ سیپریٹ ازم امنگ انڈین مسلمس ، ص ٦٦ تا ٦٩

۲۸ ۔ انڈین سیکولرزم ، پروفیسر شریف المجاھد ، ص ۳۲

۲۹ ۔ دی مینگ آف پاکستان ، ایف کے درانی ، لاھور ، ۱۹٦٦ء ، ص ٥٦

بھاوا نند، مہندر کو بندے ماترم کا گیت سناتا ھے۔ مہندر، خود تو اس گانے کو نہ سمجھ سکا لیکن بھاوانند نے اسے سمجھایا کہ اس گانے میں ''ماں'' کا لفظ جو بار بار آتا ھے اس کا اشارہ ملک کی طرف ھے، اور گانے کا مفہوم یہ ھے کہ ھمیں خود کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کے لئے مسلح بغاوت کرنی چاھئے۔

جب مہندر، بزدلانہ انداز میں جواب دیتا ھے کہ یہ ناممکن ھے، تو بھاوا نند غصے سے جھلا کر کہتا ھے، ھمارا دھرم گیا، ھماری ذات پات گئی، ھماری عزت و آبرو گئی، ھماری جانیں بھی خطرے میں ھیں۔ میں کہتا ھوں جب تک مسلمانوں کو ختم نہیں کیا جائے گا ھندو دھرم محفوظ نہیں رہ سکتا۔ مہندر جواب دیتا ھے۔ کیا تم اکیلے مسلمانوں کو نکال سکتے ھو۔ بھاوا نند کہتا ھے کہ جس وقت سات کروڑ ھندو نعرہ لگائیں گے اور چودھا کروڑ ھاتھوں میں تلواریں ھوں گی تو کیا اس وقت بھی تم ماں کو کمزور خیال کرو گے؟

مہندر، پھر بھی بغاوت پر آمادہ نہیں ھوتا اور کہتا ھے کہ ایسا نہیں ھو سکتا، مسلمان بڑے جنگجو ھیں۔ بھاوا نند اس کی ھمت بڑھاتے ھوئے کہتا ھے ''مسلمان تو انتہائی بزدل ھیں، انگریز میدان چھوڑ کر نہیں بھاگتے، چاھے ان کو جان کا خطرہ کیوں نہ ھو، لیکن مسلمان تو معمولی خطرے میں بھی پیٹھ دکھا جاتا ھے۔ اگر ایک گولہ بھی ان کے قریب گر جائے تو پوری قوم جان بچا کر بھاگ نکلتی ھے۔

مہندر، اس پر بھی رضامند نہ ھوا۔ اب بھاوا نند، اسے آنند مٹھ میں لے جاتا ھے اور برھمچاری کی معرفت مندر میں داخل کر دیتا ھے۔ مندر میں ھر طرف اندھیرا چھایا ھوا ھے۔ مہندر کو اچانک وشنو کا بڑا بت نظر آتا ھے۔ اس کے چار لمبے لمبے بازو ھیں، ھاتھوں میں

ایک سنکھ ، ایک چکر ، ایک ڈنڈا ، ایک کنول کا پھول اور گود میں ایک خوبصورت بت ہے ۔ سامنے دو کٹے ہوئے خون آلود سر پڑے ہیں ۔ دائیں بائیں سرستی اور لکشمی کی مورتیاں ہیں ۔ برھمچاری ، مہندر سے پوچھتا ہے کہ یہ بت جو وشنو کی گود میں ہے جانتے ہو کہ اصل میں کیا ہے ؟ مہندر ، نفی میں جواب دیتا ہے تو برھمچاری کہتا ہے کہ یہ ہماری ماں ہے اور ہم سب اس کے بچے ہیں ۔

اب برھمچاری ، مہندر کو دوسرے کمرے میں لے جاتا ہے ۔ جہاں جگ دھرتی کا ایک بڑا ہی خوبصورت بت رکھا ہے ۔ برھمچاری بتاتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے پہلے ماں کی یہ شان و شوکت تھی ۔ اس پر مہندر بڑے ادب سے دھرتی ماتا یعنی ماں کو پرنام کہتا ہے ۔ اس کے بعد برھمچاری ، مہندر کو ایک ایسی تاریک اور بھیانک کوٹھڑی میں لے جاتا ہے جہاں ایک برہنہ بت رکھا ہے ، برھمچاری ، کہتا ہے دیکھو ، مسلمانوں نے ''ماں'' یعنی وطن کا کیا حال کر دیا ہے ۔ مہندر پوچھتا ہے کہ دیوی ماتا نے اپنے ہاتھ میں یہ ہتھیار کیوں اٹھا رکھے ہیں ۔ برھمچاری جواب دیتا ہے کہ ہم ماتا کے بچے ہیں' ہمیں نے اس کو ہتھیاروں سے مسلح کیا ہے ، کہو بندے ماترم ۔

بعد ازاں ، مہندر ایک اور کمرے میں داخل ہوا ۔ اس میں دس بازوؤں والی ''درگا دیوی'' کا بت رکھا ہے ۔ برھمچاری بت کی طرف اشارہ کر کے مہندر سے کہتا ہے کہ جب ہم اپنے دشمن مسلمانوں کے سر کچل ڈالیں تو ماں (وطن) پر دوبارہ یہ جوبن آجائے گا ۔ مہندر ، آخر کار ، بھاوا نند کا ہم خیال ہو جاتا ہے ۔ دونوں مل کر فوج تیار کرتے ہیں تا کہ ماں یعنی وطن کو دشمنوں (مسلمانوں) سے آزاد کرایا جا سکے ۔ فوج کے تمام سپاہی ، مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کے لئے حلف اٹھاتے ہیں اور مستی میں بندے ماترم کا گانا گاتے ہیں ۔

پھر ہندوؤں کی مسلح فوج ، نہتے مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتی ہے ، ہر طرف قتل و غارت کا بازار گرم ہوتا ہے ۔ مسلمان ، ادھر ادھر ، جان بچانے کے لئے مارے پھرتے ہیں ۔ ہندو ، ان کے گھروں کو لوٹتے ہیں اور آگ لگاتے ہیں ۔ خوشی میں ناچتے گاتے ہیں اور وشنو کے مندر میں جا کر ماں کی خدمت کا از سر نو حلف اٹھاتے ہیں ۔ جیسے ہی ہندو فوج مسلمانوں کا تختہ الٹنے کے لئے بغاوت کرتی ہے ، ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج اس بغاوت کو فرو کرنے کے لئے سامنے آجاتی ہے ۔ باغی ہندوؤں کا سرغنہ ''ستیہ نند'' تھا ، اس کی ملاقات ، ایک وید (طبیب) سے ہوتی ہے جو حقیقت میں ایک ہندو اوتار ہے ستیہ نند ، اس طبیب سے نا امیدی کے عالم میں پوچھتا ہے ، گروجی کیا ہو رہا ہے، ہم نے مسلمانوں کو تو ہر طرح تباہ کر دیا لیکن ہندو راج قائم نہ ہو سکا ، مسلمانوں کے بجائے، کلکتے پر انگریز قابض ہیں ۔

طبیب جواب دیتا ہے کہ ہندو راج ابھی قائم نہیں ہوگا ۔ ستیہ نند گھبرا کر پوچھتا ہے ۔ مہاراج بتائیے پھر ہم پر کون راج کرے گا؟ کہیں مسلمان تو دوبارہ حاکم نہیں بن جائیں گے ۔ طبیب جواب دیتا ہے ''گھبرانے کی بات نہیں ، انگریز تو ہمارے دوست اور خیر خواہ ہیں ۔ مسلمان تباہ ہو چکے ہیں اب وہ دوبارہ برسر اقتدار نہیں آسکتے ۔ قسمت میں یہ لکھا ہے کہ پہلے کچھ مدت انگریز حکومت کریں گے اس کے بعد حکومت ، ہندوؤں کے ہاتھ میں آجائے گی ۔'' ۳۰

۳۰ ۔ (الف) ہماری قومی جدوجہد (۱۹۳۸ء)، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، لاہور، ۱۹۶۶ء ، ص ۲۴۸ تا ۲۵۲

(ب) دی مییننگ آف پاکستان ، ایف کے درانی ، لاہور ، ۱۹۴۴ء ، ص ۵۶ تا ۶۱

پورے ناول میں مسلمانوں کو جی کھول کر گالیاں دی گئی ہیں۔ ان کے خلاف نفرت پھیلائی گئی ہے، اور انگریزوں کی تعریف و خوشامد کی گئی ہے۔ اس طرح کی باتیں بار بار کہی گئی ہیں کہ:

"سچے مذہب کی تجدید کی اس وقت تک امید نہیں کی جا سکتی جب تک کہ اہل برطانیہ کا اقتدار ہم پر مستحکم نہ ہو جائے، ان ملچھوں (مسلمانوں) نے ہمارے مذہب کا نام ہندو رکھا ہے، انگریز سائنس میں بہت ترقی یافتہ ہیں اور قابل استاد ہیں، اس لئے ان ہی کو ہمارا بادشاہ ہونا چاہئے۔ جب تک ہندو علم، صداقت اور طاقت میں اوج کمال کو نہ پہنچ جائیں اس وقت تک برطانوی سلطنت کو قائم رکھنا ضروری ہے۔ اس کے ماتحت عوام مسرت کی زندگی بسر کریں گے اور بغیر مداخلت اپنے مذہبی شعائر کو پورا کر سکیں گے۔ ہمارا دشمن (اسلامی عہد حکومت) اب کہاں ہے، وہ ختم ہو چکا ہے برٹش اقتدار ہمارا دوست ہے۔"[۳۱]

لیکن پلاٹ اور واقعات سے کہیں زیادہ ہندوؤں کی فرقہ وارانہ ذہنیت کا غماز، اس ناول کا وہ گانا ہے جو "بندے ماترم" کے نام سے مشہور ہوا اور بعد کو ہندوؤں کا قومی ترانہ قرار پایا، "بندے ماترم" کا مطلب ہے "مادر وطن شاد باد"۔ لووٹ کے نزدیک مادر، استعارہ ہے دراصل کالی دیوی کا اور اس سے کالی دیوی کی دھرتی مراد ہے۔ بینکم چندر چٹرجی نے اس کو اپنے وطن خاص سے تعبیر کیا ہے۔ اس گانے میں، کالی دیوی یعنی دھرتی ماتا کو اس طور پر مخاطب کیا گیا ہے۔

"نہ ہمارا کوئی باپ ہے نہ ماں، نہ بیوی ہے نہ بچہ،

نہ ہمارے پاس طاقت ہے نہ گھر،

ہمارے پاس کچھ نہیں ہے

۳۱۔ اے ہسٹری آف دی انڈین نیشنل مومنٹ، ورنی لووٹ، لندن، ۱۹۶۸ء، ص ۲۶۰

همیں بچالو ، دھرتی ماتا
هم آپ کے بھجن گاتے ھیں ،
آپ همارا دھن ھیں ،
آپ همارا دل ھیں ،
هماری زندگی ، هماری روح ، سب آپ کی ھے ،
هماری روح ، همارا جذبہ پرستش ، همارا علم و فن
سب آپ کے قدموں پر نچھاور ھیں ۔''۳۲

یہ گانا ، جیسا کہ ان سطور سے ظاهر ھے ، مسلمانوں کے عقاید کے بالکل خلاف تھا، اس میں بت پرستی کی کھلی هوئی ترغیب ھے ۔ جس ناول کا یہ جزو ھے ، وہ صریحاً ایسے واقعات و جذبات پر مبنی ھیں جو مسلمانوں میں اشتعال پیدا کرنے والے ھیں ۔ بایں همه هندوؤں کی تقریباً ساری مذھبی، سماجی اور سیاسی جماعتوں نے اسے اپنا قومی نغمہ قرار دیا اور اس نغمے کو برصغیر کے گلی کوچوں میں مسلمانوں کے جذبات سے کھیلنے کے لئے گایا گیا ۔ هر چند کہ کانگریس کو دعویٰ تھا کہ وہ ایک سیکولر جماعت ھے اور هندو مسلمان دونوں کی نمائندگی کرتی ھے ، لیکن خود اس نے بھی ، مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ کئے بغیر ، بندے ماترم کو قومی نغمے کے طور پر اپنا لیا اور جیسے ھی بر سر اقتدار آئی ، اسے سرکاری حیثیت دے دی ۔ حیرت هوتی ھے کہ مولانا ابوالکلام آزاد اور بعض دوسرے مسلمان بزرگوں نے بھی ، کانگریس کے رکن اور عہدیدار کی حیثیت میں ، بندے ماترم کو خوش دلی کے ساتھ گایا اور عام مسلمانوں کو اس کو گانے کی ترغیب دیتے رھے ۔ حالانکہ بینکم چندر چٹرجی کا ناول ''آنند مٹھ'' جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ھے ، سراسر مسلمان دشمنی پر مبنی تھا ۔ گاندھی جی ، پنڈت جواهر لال نہرو اور دوسرے هندو زعما اگرچہ معصوم بن کر یہی سمجھاتے رھے کہ بندے ماترم میں کوئی بات مسلمانوں کے خلاف نہیں ھے ۔ لیکن اس میں هندو غیر هندو کا سوال نہیں ،

۳۲ - اے هسٹری آف دی انڈین نیشنل موومنٹ ، ص ۶۳

خود ناول کا پلاٹ اور اس کی کہانی، پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف نفرت و اشتعال پھیلانے کے لئے لکھی گئی ہے۔ خود وزیر ہند لارڈ زیٹ لینڈ (Lord Zetland) نے وائسرائے ہند کے نام ایک خط میں ۱۱ جنوری ۱۹۴۰ء کو لکھا تھا کہ :

''بینکم چندر چٹرجی نے جب یہ گیت اپنے ناول آنند مٹھ میں گوایا ہے تو یہ چھپانے کی ہرگز کوشش نہیں کی گئی کہ یہ ایک ''دھارمک'' بھجن (مذہبی دعا) ہے، گیت نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ گیت بھی نہیں بلکہ اعلان جنگ ہے جو ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی تحریک چلانے کے لئے وضع کیا تھا۔ ناول پڑھ لیجئے، یہ بات واضح ترین الفاظ میں عیاں ہو جاتی ہے کہ جب ہندوؤں نے اپنے غنیم پر فتح پائی تو اس رات، ملک کا وہ حصہ ہری رام کے نعروں سے گونج اٹھا اور ہر شخص کی زبان پر تھا کہ مسلمانوں کو شکست ہوئی اور ملک ہندوؤں کو واپس مل گیا۔ کہو ''ہری ہری۔''۳۳

ہندوؤں کی اس قسم کی تحریکیں، جن کا مقصد بظاہر مذہب کی اصلاح اور حقیقت میں ہندو قومیت کا سیاسی فروغ تھا، یکے بعد دیگرے وجود میں آ رہی تھیں کہ انگریزوں کی حسب منشا ایک رٹائرڈ انگریز آئی۔ سی۔ ایس افسر مسٹر ہیوم (Hume) کی تجویز پر ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے نام سے ہندوؤں کی ایک ملک گیر سیاسی جماعت بھی منظر عام پر آ گئی۔ اگرچہ بقول مولانا حسن ریاض ''ہندوؤں کے پاس پہلے ہی سے بہت سی انجمنیں تھیں، مثلاً انڈین ایسوسی ایشن بمبئی، مدراس میں مہاجن سبھا اور پونا میں سروجنک سبھا۔ ہندوؤں میں تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے جو انجمنیں قائم کر رہے تھے اور چلا رہے تھے، مگر سب صوبائی، پورے ہندوستان کی ایک

۳۳۔ ہماری قومی جدوجہد (۱۹۳۸ء)، ص ۲۰۰

انجمن کوئی نہ تھی۔''۳۴ کانگریس کے قیام نے اس کمی کو پورا کر دیا، کانگریس نے کیوں اور کس پس منظر میں جنم لیا اس کا احوال خود کانگریس کے ممتاز لیڈر، پٹابھئی سیتا رمیا نے اس طور پر بیان کر دیا ہے:

''مسٹر ہیوم برطانوی عہدہ دار تھے، ان کو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بے چینی ہے اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ کہیں یکایک شورش پھیل جائے، پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے۔ اس پر ہیوم کو خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام قائم ہونا چاہئے جس سے برطانوی حکومت ان سازشوں سے محفوظ رہ سکے۔''۳۵

کانگریس کا پہلا اجلاس ۱۸ دسمبر ۱۸۸۵ء کو بمبئی میں ہوا۔ اس میں ستر ہندو اور صرف ایک مسلمان نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں جی کھول کر انگریزوں کی تعریف کی گئی۔ ہونا بھی یہی چاہئے تھا اس لئے کہ کانگریس کا وجود، انگریزوں ہی کا مرہون منت تھا۔ ہیوم کے علاوہ اس زمانے کے کئی ممتاز انگریز جو کہ برطانوی پارلیمنٹ کے رکن یا ہندوستان میں افسر اعلیٰ رہ چکے تھے، کانگریس کی تحریک و تنظیم میں شریک تھے۔ شروع میں کئی سال تک، سالانہ جلسوں کی صدارت بھی یہی انگریز کیا کرتے تھے۔ جب کوئی ممتاز انگریز، انگلستان سے آتا تھا تو اس کو شاندار استقبالیہ دیا جاتا تھا اور بعض انگریز محسنوں مثلاً لارڈ رپن کی سالگرہ منائی جاتی تھی اور مبارکباد کا ریزولیوشن منظور کیا جاتا تھا۔۳۶

سر سید احمد خاں چونکہ ہندوؤں کی چالوں سے اچھی طرح واقف تھے، اس لئے انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دیا۔ اس سلسلے میں ان پر خود غرضی اور برطانیہ نوازی کے بے بنیاد الزامات لگائے گئے،

۳۴۔ ''پاکستان ناگزیر تھا''، شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ، کراچی یونیورسٹی، اشاعت دوم، ۱۹۷۰ء، ص ۳۱

۳۵۔ دی ہسٹری آف دی کانگریس، جلد اول، مدراس، ۱۹۳۵ء، ص ۸

۳۶۔ دی ہسٹری آف دی کانگریس، جلد اول، ص ۷۹

اور بعض دوستوں نے انھیں مختلف طریقوں سے کانگریس کا ہم نوا بنانے کی کوشش کی، لیکن انھوں نے اپنے دلائل سے سب کو لا جواب کر دیا۔ سر سید کا اختلاف بے سبب نہیں تھا، وہ جانتے تھے کہ کانگریس کے سامنے دو بنیادی مقاصد ہیں:

۱۔ برصغیر کے سارے باشندوں کو خواہ وہ بلحاظ مذہب و عقیدہ اور تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے کتنے ہی مختلف کیوں نہ ہوں، ایک قومیت کے نام سے ہندو قومیت میں ضم کرنا۔

۲۔ ایک قومی نظریے اور مخلوط طریقۂ انتخاب کے ذریعے مقامی خود مختاری کے اداروں میں اور مقابلے کے امتحان کے ذریعے سرکاری دفتروں میں، ہندوؤں کو زیادہ سے زیادہ داخل کر کے، حکومت میں شریک ہونا۔

یہ دونوں باتیں مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ تھیں، برصغیر میں اکثریت چونکہ ہندوؤں کی تھی اس لئے مخلوط انتخاب کے ذریعے، کسی مسلمان کا منتخب ہونا مشکل تھا اور اگر کوئی ہوتا تو وہ ہندوؤں کے رحم و کرم کی بدولت ہوتا۔ مقابلے کے امتحانات میں عام طور ہندو ہی کامیاب ہوتے، اس لئے کہ اس وقت امتحانات انگریزی زبان میں لئے جاتے تھے، اور ہندوؤں کی بہ نسبت مسلمان جدید تعلیم میں اتنے پس‌ماندہ تھے کہ وہ ہندوؤں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ ایسی صورت میں مناسب یہی تھا کہ آبادی کی نسبت سے خود مختار اداروں اور سرکاری دفتروں میں مسلمانوں کا جو حصہ بنتا تھا، وہ ان کو دے دیا جاتا اور کانگریس کے تجویز کردہ مخلوط انتخاب اور مقابلے کے امتحانات کی زد سے ان کو بچایا جاتا، سر سید احمد خاں نے یہی کیا۔ انھوں نے لکھنؤ میں ۲۸ دسمبر ۱۸۸۷ء کی ایک تقریر میں کہا:

''آپ خیال کریں، کیا حال انتخاب کا ہے؟ کسی ضلع میں ہندو مسلمان برابر نہیں ہوتے، آپ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان، ہندوؤں کو دبا دیں گے اور سیلف گورنمنٹ کے مالک ہو جائیں گے۔ ابھی کلکتے میں ایک بڑے بزرگ، خاندانی داڑھی والے مسلمان مجھ سے

ملے اور انھوں نے کہا ۔ غضب ہو گیا ہمارے شہر میں میونسپل کونسل کے لئے اٹھارہ مسلمان ممبر منتخب ہونے والے تھے کوئی منتخب نہ ہوا ۔ سب ہندو منتخب ہو گئے ۔ اب گورنمنٹ سے کسی مسلمان کا تقرر ہونا چاہئے ۔ یہی حال سب شہروں کا ہے ۔ علی گڑھ میں اگر ایک خاص قاعدہ مقرر نہ ہو جاتا تو ہمارے مولوی خواجہ محمد یوسف بھی جو نہایت معزز ہیں بہ مشکل اپنے منتخب ہونے کے لئے ووٹ حاصل کر سکتے اور آخر کو گورنمنٹ کی طرف سے تقرر کے متوقع رہتے ۔

اگر کونسل کے ممبر انتخاب سے مقرر ہوں تو کسی طرح مسلمانوں کی تعداد ، ہندوؤں کے برابر نہیں ہو سکتی کیونکہ ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں بمقابلہ مسلمانوں کے چوگنی ہے پس جو طریقہ انتخاب کا قرار دیا جائے گا اس سے اگر ایک مسلمان ممبر ہوگا تو چار ہندو ہوں گے اور بفرض محال دونوں قوموں کے برابر رہیں تو موجودہ حالت میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ نکلے گا جو وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے قابل ہو ۔

مقابلے کا امتحان اس ملک میں ہو سکتا ہے جہاں اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک سب ایک قوم کے آدمی ہوں یا مختلف قومیں بہ سبب تعلیم و تربیت مل جل کر ایک ہو گئی ہوں، مگر ہندوستان میں جہاں مختلف قومیں آباد ہیں اور ایک قوم دوسری قوم سے بالکل مختلف ہے ، کسی طرح مقابلے کا امتحان قرین مصلحت نہیں ۔ پھر تعلیم و تربیت کے لحاظ سے ہندوستان کی حالت اس قدر متضاد ہے کہ بہت سی قومیں ، جیسے مسلمان ، راجپوت ، سکھ اور جاٹ وغیرہ موجودہ حالت میں کبھی مقابلے کے امتحان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتے ۔،،۳۷

اسی طرح ۱۶ مارچ ۱۸۸۸ء میں لکھنؤ کی ایک تقریر میں سر سید نے کہا :

,,آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ مدت سے ہمارے بنگالی (ہندو)

۳۷ - سر سید کے لیکچروں کا مجموعہ ، ص ۲۹۹

دوست پولیٹکل معاملات میں نہایت گرم جوشی ظاہر کر رہے ہیں۔ تین برس ہوئے کہ انہوں نے بہت بڑی مجلس قائم کی ہے جس کا جا بجا اجلاس ہوتا ہے اور اس کا نام انہوں نے نیشنل کانگریس رکھا ہے۔

ہماری قوم اب تک چپ چاپ بیٹھی تھی ، اس کو غرض نہیں کہ بنگال کے بابو اور شمالی و مغربی اضلاع کے ہندو کیا کر رہے، ہیں۔ مگر انہوں نے بعض اضلاع میں مسلمانوں پر کانگریس میں شریک ہونے کے لئے دباؤ ڈالا ہے۔

کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا کہ دو چار مسلمان جو ممالک مغربی و شمالی کے ان کے ساتھ ہوئے ، وہ کون ہیں ، ان کی حقیقت بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہ کرائے کے آدمی ہیں۔“۳۸

۱۸۸۸ء ہی کے دوران میں مسٹر ہیوم اور طیب جی نے سر توڑ کوشش کی کہ سر سید احمد خاں ، کانگریس میں شریک ہو جائیں۔۳۹ لیکن سر سید کو وہ قائل نہ کر سکے ، چنانچہ سر سید احمد نے طیب جی کو ایک خط کے جواب میں لکھا :

”میں نیشنل کانگریس کے الفاظ کا مفہوم سمجھنے سے قاصر ہوں۔ کیا یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہندوستان میں جو مختلف ذاتیں ، فرقے اور مذاهب کے افراد رهتے بستے ہیں، ایک قوم کے افراد ہیں یا یہ کہ ایک قوم بن سکتے ہیں ، اوران کے مقاصد و اغراض دینی و ملی بھی یکساں اور ایک ہی ہو سکتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ چیز بالکل نا ممکنات میں سے ہے اور جب یہ نا ممکن ہے تو پھر نیشنل کانگریس جیسی بھی کوئی چیز نہیں ہو سکتی، نہ یہ ساری قوموں کے لئے یکساں طور پر سود مند ہو سکتی ہے۔ آپ غلط نام

۳۸ - سرسید کے لیکچروں کا مجموعہ ، ص ۳۰۱

۳۹ - پاکستان منزل بہ منزل ، ص ٦٩

یافتہ نیشنل کانگریس کی سرگرمیوں کو ہندوستان کے لئے سود مند تصور کرتے ہیں، لیکن بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ان سرگرمیوں کو میں نہ صرف اپنے ہم مذہبوں کے لئے مہلک اور مضرت رساں سمجھتا ہوں بلکہ ہندوستان کے لئے بھی من حیث المجموع ، باعث زیاں ہی خیال کرتا ہوں ۔ میں ہر اس کانگریس کا مخالف ہوں خواہ وہ کسی ہیئت اور وضع کی ہو جو ہندوستان کو ایک قوم واحد قرار دیتی ہو۔"۴۰

آگے چل کر ۱۸۹۳ھ میں ، سرسید احمد خاں نے ، اپنے سیاسی خیالات کی مزید وضاحت اس طور پر کر دی کہ :

Long before the idea of founding the Indian National Congress was mooted, I had given thought to the matter whether representative Government is suited to the conditions of India. I studied John Stuart Mill's views in support of representative Government. He has dealt with this matter exceedingly well in great detail. I reach the conclusion that the first requisite of a representative government is that the voters should possess the highest degree of homogeneity. In a form of Government which depends for its functioning upon majorities, it is necessary that the people should have no differences in the matter of nationality, religion, ways of living, customs, modes, culture and historical traditions. These things should be common among the people to enable them to run a representative Government properly. Only when such homogeneity is present can a representative government work or prove beneficial. It should not even be thought of when these conditions do not exist.

In a country like India where homogeneity does not exist in any of the fields, the introduction of representative government cannot produce any beneficial results; it can only result in interfering with the peace and prosperity of the land. I sincerely hope that whichever party comes into power in Great Britain—be they the Conservatives, the Liberals, the Unionists, or the Radicals—they will remember

۴۰ - انڈین مسلمس ، ص ۶۷ ، بحوالہ پاکستان منزل بہ منزل ، ص ۶۹

that India is a continent, it is not a small and homogeneous country like England, Scotland, Wales or Ireland. India is inhabited by different peoples, each one of whom is numerically large and different from the others in its culture, its moral code, its social organisation, its political outlook, its religion, its physique, and its historical associations. These peoples have never been united since the downfall of the Muslim Empire. Instead of being able to organise some other form of Government they have just indulged in mutual fighting and internecine wars.

The aims and objects of the Indian National Congress are based upon an ignorance of history and present day realities; they do not take into consideration that India is inhabited by different nationalities; they presuppose that the Muslims, the Marathas, the Brahmins, the Kashatriyas, the Banyas, the Sudras, the Sikhs, the Bengalees, the Madrasees and the Peshawarees can all be treated alike and all of them belong to the same nation. The Congress thinks that they profess the same religion, that they speak the same language, that their way of life and customs are the same, that their attitude to History is similar and based upon the same historical traditions.... I considered the experiment which the Indian National Congress wants to make, fraught with dangers and sufferings for all the nationalities of India, specially for the Muslims. The Muslims are in minority, but they are a highly united minority. Atleast traditionally they are prone to take the sword in hand when the majority oppresses them....The Congress cannot rationally prove its claim to represent the opinions, ideals and aspirations of the Muslims.[41]

سر سید کے کانگریس سے الگ رہنے اور دوسروں کو الگ رکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس شروع ہی سے عملاً ایک ہندو جماعت رہی، عام مسلمانوں نے کبھی اسے اپنی نمائندہ جماعت نہیں سمجھا۔ کچھ مسلمان، البتہ کسی ترغیب یا جبر سے اس کے ممبر بن گئے تھے، ورنہ سر سید کے پرانے دوستوں اور مسلمانوں کے ملی رہنماؤں میں، سبھی نے کانگریس کی مخالفت کی — مولانا حالی، محسن الملک، ڈپٹی نذیر احمد اور وقار الملک نے قوم اور قومیت

۴۱ - بیسک ڈاکومنٹس ان دی ڈیولپمنٹ آف ماڈرن انڈیا اینڈ پاکستان، ص ۳۱-۳۲

کے سلسلے میں سرسید احمد کی پیروی کی۔ صرف یہی نہیں کہ انڈین نیشنل کانگریس کو صرف ہندوؤں کی نمائندہ جماعت جانا، بلکہ ہندوؤں سے الگ، مسلمانوں کو ایک قوم کی حیثیت سے منظم و مضبوط کرنے کی صورتوں پر بھی غور کرنا شروع کر دیا۔ مولانا حالی کی مشہور مسدس "مدوجزر اسلام" جسے ہندوستان کے مسلمانوں کا مرثیہ کہا جاتا ھے اور جس میں انھوں نے مسلمانوں کو غیرت دلا کر دوبارہ زندہ کرنا چاھا ھے، حقیقت میں اسی پر آشوب دور کی یادگار ھے۔ جس میں انگریز اور ہندوؤں کی متحدہ سازش نے مسلمانوں کی جان ضیق میں کر دی تھی۔ مولانا حالی نے اپنی کئی نظموں میں اس طرف اشارہ کیا ھے، ان کی مشہور نظم "شکوۂ ہند" جو ۱۸۸۸ء میں یعنی مسدس کے دس سال کے بعد لکھی گئی۔۳۲ ھے اور جس کا ذکر، حالی کے مبصروں اور تذکرہ نگاروں نے، ان کے احوال میں بہت کم کیا ھے، خاص طور پر مطالعہ کے لائق ھے۔ اس نظم کا پہلا ھی شعر:

رخصت! اے ہندوستاں اے بوستان بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ہم بدیسی میہماں

اس سارے تاریخی ماحول کی ایک جھلک دکھا دیتا تھا، جس میں اردو کی جگہ ہندی، فارسی رسم الخط کی جگہ دیو ناگری کو رائج کرنے، ذبیحہ گاؤ پر پابندی لگوانے، سیاسی طور پر مسلمانوں کو پوری طرح مغلوب کرنے، اور آریہ سماج جیسی بعض کٹر جماعتوں کی طرف مسلمانوں کو بدیسی ثابت کرنے کی کوششیں شدومد سے جاری تھیں۔ مولانا حالی عملاً کوئی سیاسی شخصیت نہ تھے۔ ان کے دوست دشمن، سب نے یکساں طور پر اعتراف کیا ھے کہ وہ حد درجہ شریف النفس، صلح جو اور انسان دوست تھے۔ اپنی اس خوبی کی بدولت وہ ہر حال اور ہر ماحول میں آسانی سے مطابقت پیدا کر لیتے تھے اور لوگوں کی چیرہ دستیوں سے بے نیازانہ گذر جاتے تھے۔ لیکن ان کی اردو شاعری جسے قومی شاعری بھی کہہ سکتے ھیں، ظاھر کرتی ھے کہ وہ اندر

۳۲۔ کلیات نظم حالی، جلد دوم، ص ۱۸۲

سے کتنی چوٹ کھائے ہوئے تھے اور مسلمانوں پر جو کچھ بیت رہی تھی اس سے وہ کتنے برگشتہ خاطر اور مضمحل تھے۔ مثال میں ان کا مسدس اور ان کی مشہور نعت و مناجات :

اے خاصۂ خاصان رسل وقت دعا ہے
امت پہ تیری آکے عجب وقت پڑا ہے۔ ۴۳

بھی پیش کی جا سکتی ہے لیکن اس جگہ صرف ان کی طویل نظم ”شکوۂ ہند“ کے چند اشعار دیکھئے :

رخصت اے ہندوستاں ! اے بوستان بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن ، ہم بدیسی میہماں

نقش ہیں دل پر ہمارے سب مداراتیں تیری
ہم نہ بھولیں گے کبھی دن تیرے اور راتیں تیری

تھی ہماری قوم و ملت ، رسم و عادت سب جدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا

بول چال اپنی الگ تھی اور زباں تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی ، اور ہم سے تو نا آشنا

ہم میں اے ہندوستاں گو بوئے جنسیت نہ تھی
تو نے لیکن اپنی آنکھوں پر لیا ہم کو بٹھا

نبھ سکیں لیکن نہ آخر تک یہ خاطر داریاں
جو دیا تھا تو نے وہ آخر کو سب رکھوا لیا

یاد ہوگا تجھ کو یاں آئے تھے ہم کس شان سے
تجھ کو سوگند اپنے ست جگ کی بتا ایمان سے

ترکمانی صولت اور مغلی جلالت ہم میں تھی
عزم کردی ہم میں تھا، بدوی حمیت ہم میں تھی

۴۳ - کلیات نظم حالی ، جلد دوم ، ص ۱۷۷

ضرب کراری و حرب خالدی رکھتے تھے ہم
سطوت حمزی و فاروقی جلالت ہم میں تھی
پھوٹ سے واقف نہ تھے ہم تیری اے ہندوستاں
احمدی اخلاق و اسلامی اخوت ہم میں تھی

چھین لی سب ہم سے یاں شان عرب آن عجم
تو نے اے غارت گر اقوام و اکال الامم
سیرتیں تو نے بدل دیں مسخ کر دیں صورتیں
آبرو تو نے ڈبو دی کھو دیا تو نے وقار

کر دیا شیروں کو تو نے گوسفند اے خاک ہند
جو شکار افگن تھے آ کر ہو گئے یاں خود شکار
تھا یقیں ہم کو، کہ شامت رفتہ رفتہ آئے گی
ہم کو تو اے خاک ہند آخر یونہی کھا جائے گی

دیکھتے ہیں اب وھی آنکھوں سے صبح و شام ہم
جو مداراتوں کا سمجھے تھے تری انجام ہم
توڑ ڈالے جلد تو نے عہد اور پیمان سب
بے وفا سنتے تھے سچ اے ہند تیرا نام ہم

جب تک اے ہندوستاں ہندی نہ کہلاتے تھے ہم
کچھ ادائیں آپ میں، سب سے جدا پاتے تھے ہم
حال اپنا، سخت عبرت ناک تو نے کر دیا
آگ تھے اے ہند، ہم کو خاک تو نے کر دیا

تیرے سائے سے رھے اے ہند جب تک دور ہم
اپنی یک رنگی رھی، ضرب المثل بین الامم
تھی ھماری دولت، اے ہندوستاں، فضل و هنر
آ گیا تیری بدولت اپنی دولت کو زوال

ہم کو ہر جوہر سے یوں بالکل معرا کر دیا
تو نے اے آب و ہوائے ہند یہ کیا کر دیا

ہیں یہ باتیں بھول جانے کی مگر کیوں کر کوئی
بھول جائے رات کا سب صبح ہوتے ہی سماں

بزم کو برہم ہوئے مدت نہیں گزری بہت
اٹھ رہا ہے گل سے شمع بزم کے اب تک دھواں

کہہ رہے ہیں نقش ہائے رہرواں، اے خاک ہند
یاں سے گذرا ہے ابھی اک با تجمل کارواں

گو یقیں ہے، رفتہ رفتہ یاد ایام سلف
دل سے چھوڑے گی مٹا کر گردش دور زماں

بھول جائیں گے کہ تھے کن ڈالیوں کے ہم ثمر
ٹوٹ کر آئے کہاں سے اور بکے جا کر کہاں

ہر زمانے میں رہیں گے، تا قیامت یادگار
جو کئے برتاؤ تو نے ہم سے اے ہندوستاں

ماجرا ہوگا ہمارا، عبرت اوروں کے لئے
چیت جائیں گے بہت سن کر ہماری داستاں

سانپ سے جس طرح رہتا ہے سپیرا دور دور
حکمراں تیرے یونہی تجھ سے رہیں گے برکراں

برکتیں یاں چھوڑ کر ہم اپنی جائیں گے بہت
ہم نہ ہوں گے پر نصیحت ہم سے پائیں گے بہت۴۴

اگر آدمی کو انیسویں صدی کے آخری ایام کے تاریخی و سیاسی حالات کا علم ہو تو پھر ان اشعار کے حقیقی مفہوم تک پہنچنے میں دقت نہیں ہو سکتی، اس نظم میں، مولانا حالی نے جس ترش و تلخ لہجے میں، ہندوستان و اہل

۴۴ - کلیات نظم حالی، جلد دوم، ص ۱۸۲ تا ۱۹۶

ہندوستان کو مخاطب کیا ہے ، وہ مولانا حالی کے جذبۂ ملی اور اس کی شدت کا صاف پتہ دیتا ہے ورنہ اس لہجے میں بات کرنا ان کی طبیعت کا جزو نہ تھا۔ اپنے مشہور مسدس میں بھی انھوں نے حد درجہ نرم اور المیہ لہجہ اختیار کیا تھا لیکن اس نظم میں ان کے یہاں غم و غصہ اور ہندوستان سے بیزاری کی لہر پائی جاتی ہے ۔ یہ لہر یقیناً وہی ہے جو ۱۸۸۵ء یعنی کانگریس کے قیام کے بعد ہندوؤں کی مسلم دشمنی کے سبب مسلمانوں میں پیدا ہو چکی تھی ۔

تحریک آزادی ، دو قومی نظریہ اور کانگریس سے سر سید احمد کے اختلاف پر قلم اٹھانے والوں نے عموماً ڈپٹی نذیر احمد کے نام کو بھی نظر انداز کیا ہے، حالانکہ نذیر احمد بھی کانگریس کے مخالفین میں تھے ، انھوں نے ایک پورا لکچر اس موضوع پر دیا تھا کہ مسلمانوں کو کانگریس سے کس کس قسم کے نقصانات ہو سکتے ہیں ، یہ لکچر ۱۸۸۸ء کا ہے اور اسی سال ''لکچر در مخالفت و اظہار مضرت انڈین نیشنل کانگریس'' کے عنوان سے چھپا ہے ۴۵ اس کی ایک کاپی ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس کراچی کے کتب خانے میں موجود ہے ۔ اس میں انھوں نے کہا :

''کانگریس کی شرکت ہم مسلمانوں کے حق میں مہلک ہے۔ خرابی اور بڑی خرابی ہم مسلمانوں کی ہے کہ ہم مذہب رکھتے ہیں محکم ، مضبوط اور استوار کہ انقلاب دنیا کی آندھیاں اس کو جنبش بھی نہیں دے سکتیں ہمارے پاس لٹریچر ہے جس نے ایک وقت تمام روئے زمین کو ہلا مارا وہ ہمارے دلوں کی تسلی ہے ، ہماری جان کی توانائی ، ہماری آنکھوں کا نور ہماری روحوں کا سرور۔ ہمارے پاس علوم ہیں ۔ اگرچہ ان میں سے اکثر انگریزوں نے اپنی زبان میں ترجمہ کر لئے ہیں ۔ مگر مٹے نہیں ۔ میرا انر بلیف (دلی یقین) ہے اور یہ مبنی ہے ساری عمر کے تجربے پر کہ کارفرمائی جیسی ایک

۴۵ ۔ لیکچر در مخالفت و اظہار مضرت ، انڈین نیشنل کانگریس ، ڈپٹی نذیر احمد ، مفید عام ، آگرہ ، ۱۸۸۸ء ص ۱ تا ۱۷ ،

مسلمان کر سکتا ہے ہندوؤں سے نہیں ہو سکتی، ہرگز نہیں۔ ہمارا کیس ایک اسپیشل کیس ہے اس کی روئداد، کسی طرح ہندوؤں کی روئداد سے نہیں ملتی۔ ہندو جب زور دیں گے کثرت اور انگریزی دانی پر۔ پس ہم کو ہندوؤں کی رفاقت ضرر پہنچائے گی۔ نیشنل کانگریس کا انجام کچھ ہی کیوں نہ ہو ہماری حمیت تو گوارا نہیں کر سکتی کہ ہندوؤں کے طفیلی بن کر کوئی دنیوی مفاد حاصل کریں۔ گو، وہ مفاد کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو۔''۴۶

نواب محسن الملک تو کھل کر اور شروع ہی سے کانگریس کے سلسلے میں سر سید کے ہم خیال تھے، چنانچہ ایک دفعہ حیدر آباد دکن کے ایک اخبار میں جب یہ خبر غلطی سے شائع ہو گئی کہ وہ کانگریس میں شامل ہوگئے ہیں تو انھوں نے محمد اسمعیل خان کے ذریعہ اس کی تردید شائع کرائی اور کہا کہ کوئی ذی عقل اشراف مسلمان نیشنل کانگریس کو پسند نہیں کر سکتا اور نہ اس میں شریک ہو سکتا ہے۔۴۷

محسن الملک کی طرح نواب وقار الملک نے بھی کانگریس میں مسلمانوں کی شرکت کو ملی مفادات کے خلاف قرار دیا انھوں نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ:

''سر سید مرحوم نے نیشنل کانگریس کے بڑھتے ہوئے اثر سے متاثر ہو کر نہایت زور کے ساتھ اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کی بہتری اور ان کی حفاظت اس میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو کانگریس میں شریک ہونے سے باز رکھیں اور یہ رائے اس قدر صائب تھی کہ

۴۶۔ لیکچر درمخالفت و اظہار مضرت، انڈین نیشنل کانگریس، ڈپٹی نذیر احمد، مفید عام، آگرہ، ۱۸۸۸ء، ص ۱ تا ۱۷

۴۷۔ تاریخ نظریۂ پاکستان، پیام شاہجہان پوری، لاہور، ۱۹۷۰ء، ص ۱۳۸

مسلمانوں کی عام رائے اس وقت وہی ہے ۔''۳۸

اسی زمانے میں ، اردو کے ناسور ادیب ناول نگار، مورخ اور ''دلگداز'' و ''مہذب'' کے مدیر ، مولانا عبدالحلیم شرر نے ہندوؤں کی پے در پے زیادتیوں کے پیش نظر ۱۸۹۰ء میں یہاں تک لکھ دیا کہ :

''اوقات کچھ ایسے ہیں کہ ایک قوم کی مذہبی عبادات ، اس وقت تک ادا نہیں کی جا سکتیں جب تک کہ دوسری قوم کے زود اثر جذبات کو ٹھیس نہ لگائیں اور نہ صبر و تحمل کا ایسا کوئی عنصر موجود ہے جو اہانت کو نظر انداز کرے ۔ اگر نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے تو پھر عقلمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان کو ہندو صوبوں اور مسلمان صوبوں میں منقسم کر دیا جائے اور آبادیوں کا تبادلہ ہو جائے ۔ ہندو بظاہر اس خیال کے حامی نظر آتے ہیں کہ انہیں مسلمانوں کو بہ حیثیت پڑوسی رہنے کی اجازت نہیں دینی چاہئے ۔ نہ ہی انہیں یہ بات پسند ہے کہ ان کے مندروں کے ناقوس کی آوازیں ، مسلمان کافروں کے کانوں میں گونجیں اور نہ وہ خود اذان کی آواز سننا پسند کرتے ہیں ۔ یقیناً یہ حل مسلمانوں کے لئے قابل قبول ہوگا ۔ اس لئے کہ وہ بھی ہندوؤں سے غالباً تنگ آچکے ہیں ۔''۳۹

شرر کے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ سر سید احمد خاں نے اردو ہندی تنازع کے حوالے سے ۱۸۶۷ء میں جس دو قومی نظریے کی طرف اشارہ کیا تھا وہ انیسویں صدی کے آخر تک ، پورے طور پر ایک اہم سیاسی مسئلہ بن چکا تھا اور اس مسئلے کے حل کی عملی صورتوں پر غور کیا جانے لگا تھا ۔

۳۸ - وقار حیات ، ص ۶۷۳ ، اکرام اللہ خان ندوی ، مطبع مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ ، ۱۹۲۵ء

۳۹ - پاکستان منزل بہ منزل، ص ۷۶-۷۷ ، از شریف الدین پیرزادہ ، گلڈ انجمن کتاب گھر ، ۱۹۶۵ء

بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی و اقتصادی حالات کچھ اس طرح کے تھے کہ وہ ہندوؤں سے یا ہندوؤں کی سرپرست برطانوی حکومت سے صف آرائی کی سکت نہ رکھتے تھے ۔ اس لئے وہ بہ حیثیت مجموعی صلح و مفاہمت ہی کی کوششیں کرتے رہے ۔ مسلمانوں کی اس صلح جوئی کا کوئی نتیجہ نہ نکلا ، ہندوؤں کی جارحیت روز بروز بڑھتی گئی ، وجہ یہ تھی کہ ہندوؤں نے نیشنل کانگریس کے نام سے جس نئی تنظیم کو ۱۸۸۵ء میں جنم دیا تھا اور جسے ہندوستان کی پوری آبادی کی نمائندہ ظاہر کیا جا رہا تھا وہ بھی اپنی روح میں ہندو قومیت اور اس کی جارحانہ ذہنیت ہی کی ترجمان تھی ، ایف ۔ کے درانی نے کانگریس کے سلسلے میں پٹابھائی سیتارسیہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ :

It was admittedly a culmination of Hindu revivalism. Pattabhai Sitaramayya, writing as late as 1938, says:

> "All these movements (*viz.*, Brahmo Samaj, Prarthana Samaj, Arya Samaj, Mrs. Besant's Theosophical Movement with its centre at Benares, the holy city of India, and the Ramakrishna Mission) were really so many threads in the strand (sic) of Indian Nationalism, and the Nation's duty was to evolve a synthesis so as to be able to dispel prejudices and superstition, to renovate and purify the old faith, the Vedantic idealism, and reconcile it with the Nationalism of the new age. The Indian National Congress was destined to fulfil this great mission".
>
> Clearly then, it was a Hindu Organisation with ideals of purely Hindu Nationalism, for the realisation of which it would have been wholly irrelevent and absurd for the Muslims to join it.[50]

"مسلمانوں کے خلاف اس جارحیت کی ایک مثال مشہور کانگریس لیڈر بال گنگا دھر تلک کی وہ تحریک ہے جو ۱۸۹۳ء میں نمودار ہوئی ۔[۵۱] گنگا دھر تلک صرف ہندوؤں کو ہندوستان کا

۵۰ ۔ دی مینںگ آف پاکستان ، ص ۷۰ ، ۷۱

۵۱ ۔ انڈین مسلمس (اے پولیٹیکل ہسٹری) ، ص ۸۷

باشندہ اور مسلمانوں کو غیر ملکی یا بدیسی سمجھتے تھے ۔ انھوں نے ہندوؤں میں مسلمانوں کے خلاف ، نفرت اور جنگی جذبہ پیدا کرنے کی غرض سے ہر سال ہندو دیوتا گنیش کی پوجا کا میلہ لگانا شروع کیا ۔ یہ میلہ جو کہ گنپتی میلہ (Ganpati Mela) کہلاتا تھا دس دن تک جاری رہتا تھا ۔ اس میں اس قدر اشتعال انگیز ، تقریروں ، ڈراموں اور نعرہ بازیوں سے کام لیا جاتا تھا کہ ہندو، مشتعل ہو کر مسلمانوں پر حملے شروع کر دیتے تھے ۔ چنانچہ اس میلے کے سبب مختلف شہروں میں بلوے ہوئے ، مسلمانوں کو قتل و غارت کا نشانہ بنایا گیا اور مسجدوں کی بے حرمتی کی گئی۔۵۲

یہی نہیں تلک نے ایک اور تحریک شروع کی اور وہ یہ تھی کہ انھوں نے شیواجی کو ہندوؤں کا ہیرو قرار دیا ۔ اس کے سمادھ کی مرمت کرائی اور شیواجی نے مسلمانوں کے خلاف ، بدعہدی اور فریب دھی کے جو کام کئے تھے، انھیں اس کے مثالی کارناموں سے تعبیر کیا گیا ۔ تاریخی واقعہ یہ ہے کہ شیواجی نے دوستی کے رنگ میں افضل خان کو بغل گیر ہوتے ہوئے دھوکا دے کر قتل کر ڈالا تھا ۔ تلک نے شیواجی کے اس بزدلانہ اور غیر اخلاقی فعل کا جواز یہ کہہ کر پیدا کر لیا کہ اگر چور گھر میں گھس آئے اور اس کا مقابلہ نہ کیا جا سکے تو اسے گھر میں بند کر کے جلا دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ انھوں نے انسداد گاؤ کشی کے لئے بھی ایک سوسائٹی قائم کی اور ذبیح گاؤ کے خلاف تحریک چلائی ۔ اپنے ان پروگراموں کو کامیاب بنانے کے لئے دو اخبار بھی نکالے ۔ ایک کیسری (Kesari) کے نام سے مرہٹی زبان میں ، دوسرا انگریزی میں ''دی مرہٹہ،، (The Maratha) کے نام سے۵۳ دونوں میں مذہبی تعصبات پر مبنی اشتعال انگیز مضامین شائع کئے جاتے تھے ۔

لیکن بال گنگا دھر تلک کا بنا کردہ گنپتی میلہ ، ہندوؤں کے قومی و مذہبی تعصبات کے مظاہروں کے سلسلے میں نیا نہ تھا ۔ اس سے بہت پہلے بنگال کے

۵۲ - مسلمانوں کا روشن مستقبل ، ص ۲۷۰

۵۳ - اے ہسٹری آف دی انڈین نیشنلسٹ موومنٹ ، ص ۳۸

ہندوؤں نے اسے شروع کر دیا تھا اور انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے کئی سال قبل سے خود کو ایک الگ اور برتر قوم متصور کرنے لگے تھے ۔ ڈاکٹر اشوک موجمدار کا بیان ہے کہ :

"Rajnarayin Bose initiated the Hindu-Mela which met annually from 1867 to 1880 and for which Tagore wrote two charming songs. Inspired by the Hindu-Mela, the "National Society" was founded in 1870 to promote unity and national feelings among the Hindus. When objection was taken to the use of word 'National' for 'Hindu Organisation', the "National Paper", the organ of the Hindu-Mela replied: "We do not understand why our correspondent takes exception to the Hindus who certainly form a nation by themselves and as such a society established by them can very properly be called a National Society."[54]

جس سال گنگا دھر تلک نے گنپتی میلہ کی بنا ڈالی ، اسی سال کانگریس کے ایک اور مشہور لیڈر پنڈت مدن موھن مالویہ نے بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا ، قائم کی ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے اس کا مقصد ناگری کی حمایت اور اردو کی مخالفت کا پروپیگنڈا تھا ، ہندو قومیت اور اس کے نقطۂ نظر کو قبول عام بنانا بھی اس کے دائرۂ عمل کا ایک حصہ تھا ۔ ۵۵ غایت یہ تھی کہ جلد سے جلد برصغیر پر ہندوؤں کا سیاسی تسلط قائم کر کے ، مسلمانوں کی ثقافتی اور ملی انفرادیت کو ختم کر کے واحد قومیت میں ضم کر دیا جائے ۔

ہندوؤں کی ان سیاسی و سماجی اور مذہبی انجمنوں نے ، مسلمانوں کو مغلوب کرنے کی کوشش میں، انھیں بیدار بھی کر دیا ۔ چنانچہ مسلمانوں نے بھی اپنی علمی و ادبی اور ثقافتی و مذہبی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے ملی ادارے اور انجمنیں بنانا شروع کیں ۔ سر سید احمد خاں کی تعلیمی تحریک کے زیر اثر جگہ جگہ اسلامیہ اسکول اور کالج قائم ہوئے جن میں مذہبی تعلیم

۵۴ - اڈونٹ آف انڈپنڈنس ، ص ۳۹-۴۰ ، بحوالہ ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان ، ص ۳۴۵

۵۵ - سپریٹزازم امنگ انڈین مسلمس ، ص ۶۷

کے ساتھ انگریزی پڑھانے کا بھی انتظام کیا گیا۔ اس قسم کی انجمنوں میں پنجاب کی ''انجمن حمایت اسلام'' کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں کہ اس کا حلقۂ اثر صرف پنجاب تک محدود نہ تھا بلکہ برصغیر کے ہر علاقے کے مسلمانوں کو اس نے متاثر کیا تھا اور سب اس کے بہی خواہ تھے۔ انجمن کی مذہبی و سماجی اور تعلیمی و سیاسی سرگرمیوں کے پیش نظر بعض کا یہ خیال کہ ''اس انجمن نے سابق پنجاب میں وہی کام کیا ہے جو شمالی ہند میں سر سید احمد خاں اور ان کی تحریک نے'' بڑی حد تک درست ہے۔٥٦ ایسا ہونا شاید اس لئے بھی ممکن ہوا کہ یہ انجمن سر سید تحریک کے اثر سے وجود میں آئی تھی اور پنجاب میں اسی لگن سے کام کر رہی تھی جس طرح شمالی ہند میں سر سید کر رہے تھے۔ ڈاکٹر رضی واسطی نے انجمن حمایت اسلام کے قیام کو سرسید کی تعلیمی و قومی کوششوں کا بدیہی نتیجہ قرار دیا ہے اور بجا قرار دیا ہے۔٥٧ اپریل ۱۹۰۳ء میں انجمن کے سالانہ اجلاس میں، جس میں علامہ اقبال بھی شریک تھے، مولانا حالی نے ''انجمن حمایت اسلام'' کے عنوان سے ایک نظم پڑھی تھی اس کے ایک شعر میں انھوں نے انجمن کو مسلمانوں کی دایہ اور پنجاب کی ماں قرار دیا تھا۔

تجھ سے امیدیں ہیں وابستہ بہت احباب کی
قوم کی دایہ ہے تو اور ماں ہے تو پنجاب کی ٥٨

مولوی عبدالحق نے اپنی ایک تقریر میں اہل پنجاب کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ:

٥٦ - تاریخ نظریۂ پاکستان، ص ۱۲۹، از پیام شاہجہان پوری، مطبوعہ انجمن حمایت اسلام، لاہور، ۱۹۷۰ء

٥٧ - دی پولیٹکل ٹرائی اینگل ان انڈیا (۱۸۵۸ء تا ۱۹۲۴ء)، ص ۲۷، مطبوعہ پیپل پبلشنگ ہاؤس، لاہور، ۱۹۷٦ء

٥٨ - کلیات نظم حالی، جلد دوم، ص ۲۸۱، مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی، مطبوعہ مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۰ء

''یہ انجمن آپ کی سرزمین پر ابر رحمت کی طرح چھائی ہوئی ہے۔ اس کے ادارے بڑھتے جاتے ہیں۔ اس کے کارنامے ترقی پر ہیں۔ اس کے مقاصد میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا اثر اور اس کی وقعت مسلم ہے۔''۵۹

انجمن حمایت اسلام ، اس خاص زمانے میں قائم کی گئی جبکہ عام ہندوؤں نے اردو کے خلاف ، ہر طرف سے شور غوغا بلند کر رکھا تھا اور مسلمانان پنجاب ، تعلیمی و معاشی کمزوریوں کے سبب ، ان کی چیرہ دستیوں کا شکار ہو رہے تھے حتیٰ کہ ۱۸۸۳ء میں پنجاب کی ایک سید زادی نے اپنے تین بچوں کے ساتھ ، عیسائی مذہب قبول کر لیا۔ اس واقعہ نے مسلمانوں کی ملی حمیت و اسلامی غیرت کے لئے تازیانے کا کام کیا۔ چنانچہ وہ اپنا دفاع کرنے کے لئے مجبور ہو گئے۔۶۰

خواجہ محمد حیات نے انجمن کے قیام کے بارے میں لکھا ہے کہ :

''چودھویں صدی ھجری کا پہلا سال یعنی ۱۳۰۱ھ میں مسلمانان پنجاب کی تعلیمی ترقی کی تاریخ میں زریں حروف سے لکھا جائے گا کیوں کہ اس سال شروع ماہ جمادی الاول مطابق مارچ ۱۸۸۴ء میں لاہور کے چند مسلمان جن کے دل قومی درد اور اسلامی جذبے سے معمور تھے ایک جگہ اکٹھے ہوئے تاکہ عیسائی مشنریوں کی مخالف اسلام ریشہ دوانیوں اور نئی جاری شدہ آریہ سماج کی تازہ معاندانہ سرگرمیوں کی روک تھام کا انتظام کیا جائے اور اس کے ساتھ ھی مسلمانان ہندوستان کے قائداعظم جناب سر سید احمد خاں بہادر علیہ الرحمۃ کی انھائی ہوئی آواز پر کہ ''قوم کی پستی کا علاج دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ مروجہ تعلیم کے اجراء میں مضمر ہے'' غور کیا جائے۔ اس مجلس مشاورت کا نتیجہ ایک جماعت کی تشکیل

۵۹ - خطبات عبدالحق ، ص ۴۳

۶۰ - برصغیر پاک و ہند کے علمی و ادبی اور تعلیمی ادارے ، ص ۱۳۱

ہو جس کا نام انجمن حمایت اسلام لاہور رکھا گیا۔"۶۱

انجمن حمایت اسلام کے بانی، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کے دادا قاضی حمید الدین تھے، انھی نے انجمن کے قیام کی غرض سے مارچ ۱۸۸۴ء میں لاہور کے ممتاز مسلمانوں کا ایک جلسہ بلایا تھا اس میں دوسروں کے علاوہ ان کے شاگرد اور ریاست فرید کوٹ کے وزیر مالیات غلام اللہ قصوری نے بھی شرکت کی تھی۔۶۲ اور حویلی کرنل سکندر خان میں ایک چھوٹا سا مکان ڈھائی روپے ماہوار کرائے پر لے کر انجمن کے قیام کا باقاعدہ اعلان ایک پبلک جلسے میں ستمبر ۱۸۸۴ء میں کیا گیا۔ قاضی حمید الدین اس کے پہلے صدر، غلام اللہ قصوری جنرل سکریٹری اور منشی عبدالرحیم خازن منتخب ہوئے۔ ساتھ ھی تبلیغ اسلام کے لئے دھلی کے سید احمد علی شاہ کو بہ حیثیت مبلغ، ملازم رکھا گیا۔ ایک سال کے اندر اس انجمن کے ممبروں کی تعداد دو سو سے بڑھ کر چھ ہزار ہوگئی۔۶۳

ابتدا میں جن لوگوں نے اس کے قیام و استحکام میں خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا ان میں مذکورہ بالا عہدیداروں کے علاوہ منشی چراغ دین، خلیفہ عماد الدین، میاں کریم بخش، میاں نظام الدین، ڈاکٹر محمد الدین ناظر، منشی نجم الدین، شیخ خدا بخش، مولوی احمد دین وکیل، شمس الدین شائق، سید امیر شاہ، مولوی عبداللہ وغیرہ کے نام قابل ذکر ھیں۔۶۴ جن لوگوں نے عیسائیوں اور آریہ سماجیوں کے مقابلے میں انجمن حمایت اسلام کے نمائندگان

۶۱ - مختصر تاریخ انجمن حمایت اسلام، بحوالہ تاریخ نظریہ' پاکستان، ص ۱۲۹

۶۲ - اے ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ، جلد سوم، ۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء، حصہ دوم، ص ۲۱-۲۲۴، مطبوعہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی، کراچی، ۱۹۶۳ء

۶۳ - تاریخ نظریہ' پاکستان، ص ۱۳۰

۶۴ - دی پولیٹکل ٹرائی اینگل ان انڈیا، ص ۲۸

خاص کی حیثیت سے تبلیغ اسلام میں نمایاں حصہ لیا ان میں مولوی سید احمد علی، منشی شمس الدین ، مولانا عبدالمجید دهلوی ، مولانا غلام محی الدین ، صوفی مولوی عبداللہ دهلوی ، مولانا محمد ابراهیم ، میاں اللہ دیا ، سید محمد شاہ گیلانی اور مولوی محمد مبارک وغیرہ کے نام آتے ہیں - ان بزرگوں نے مذہبی امور پر غیر مسلم مبلغین سے مناظرے کئے ، ان کے استدلال کی تردید میں تقریریں کیں، مقالے اور کتابچے لکھے اور مسلمانوں کو عیسائیت اور ہندو مت کے اثرات سے محفوظ رکھا -

انجمن حمایت اسلام ، حسب ذیل مقاصد کے تحت وجود میں آئی تھی -

الف - اسلام کی تبلیغ کرنا اور اسلام پر اعتراض کرنے والوں کو تقریر و تحریر کے ذریعے مدلل جواب دینا -

ب - مسلمان لڑکے لڑکیوں کی مروجہ اور اسلامی تعلیم کا معقول و مناسب انتظام کرنا -

ج - نادار اور یتیم مسلمان بچے بچیوں کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کر کے ، انھیں دوسروں کے دست نگر ہونے سے بچانا اور خود کفیل بنانا -

د - مسلمانوں کی سماجی و ذہنی ترقی کے لئے راہیں ہموار کر کے ان میں بھائی چارہ کا جذبہ پیدا کرنا اور اتحاد باہمی کو مستحکم کرنا -

ان مقاصد کے حصول کے لئے انجمن نے طے کیا کہ وہ اشاعت اسلام کے مبلغین کا ایک عملہ رکھے گی - تعلیمی ادارے اور یتیم خانے کھولے گی ، ایک ماہانہ رسالہ جاری کرے گی ، عام مسلمانوں میں تبلیغی اشتہارات اور کتابچے تقسیم کرے گی ، جلسے جلوس کے ذریعے تقریر و وعظ کا اہتمام کرے گی اور اس طرز کے بعض دوسرے اشاعتی وسائل کو کام میں لائے گی - انجمن نے ان مقاصد کو فی الواقع پورا کیا - چند برسوں میں اس کا حلقۂ اثر بہت وسیع

ہو گیا۔ اور صوبہ پنجاب سے آگے بڑھ کر وہ برصغیر کے سارے مسلمانوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ہر علاقے کے مسلمانوں نے اپنی بساط بھر اس کی مالی مدد کی اور اس کے منصوبوں کو کامیاب بنانے میں ھاتھ بٹایا۔ مسلمان، راجہ، نواب، امرا، رؤسا، علماء و ادبا، مزدور و کسان، شاعر و صحافی اور اساتذہ و طلبہ سب نے اس کے کاموں میں دلچسپی لی۔ نتیجتاً، انجمن حمایت اسلام، پنجاب میں عیسائی اور ھندو مذھبی جماعتوں کی اسلام دشمن سرگرمیوں کا سد باب ثابت ہوئی۔ صرف یہی نہیں کہ بھولے بھالے غریب و جاھل مسلمان، گمراہ ہونے سے محفوظ ہوگئے بلکہ، انجمن نے تبلیغ اسلام اور اشاعت تعلیم کا کام کچھ ایسے سلیقے اور بلند سطح سے کیا کہ بعض ممتاز، غیر مسلم بھی مسلمان ہوگئے۔ مثال کے طور پر ملتان کے دیوان مولراج کے خاندان کے ایک رکن دیوان رام سروپ ۱۹۲۶ء میں مسلمان ہوگئے۔ ان کا اسلامی نام صوفی غلام محی الدین رکھا گیا اور انھوں نے اپنی ساری زندگی انجمن کی خدمت کے لئے وقف کر دی۔ اس واقعہ کا یہ اثر ھوا کہ جو غریب مسلمان اسلام سے منحرف ہوگئے تھے وہ پھر مسلمان ہو گئے۔۶۵ عیسائی مشنریوں نے اپنی بعض رپورٹوں میں انجمن کے ان اثرات کا بطور خاص ذکر کیا ھے اور اس کی کوششوں کو اپنے حق میں نقصان دہ قرار دیا ھے۔۶۶

انجمن حمایت اسلام نے اپنی سرگرمیوں کے لئے دو خاص رخ متعین کر لئے تھے ایک تعلیمی، دوسرا تبلیغی ۔۔ تعلیم کے سلسلے میں جگہ جگہ دینی مدرسے قائم کئے گئے پھر ان میں مروجہ تعلیم کو داخل کر کے مڈل اسکول، ھائی اسکول اور کالج تک پہنچایا گیا۔ چونکہ عیسائی مشنری کی شکار عام طور پر جاھل عورتیں ہو رھی تھیں اس لئے انجمن نے لڑکوں کی تعلیم کے ساتھ ساتھ، تعلیم نسواں کی طرف بھی پوری توجہ دی اور مسلمان بچے بچیوں کے لئے الگ الگ مدرسے قائم کئے۔ دو تین سال کے اندر ان مدرسوں کی تعداد پچاس کے اوپر ہو گئی اور ایک اسکول، جو بعد کو اسلامیہ ھائی اسکول

۶۵ - دی پولیٹیکل ٹرائی اینگل ان انڈیا، ص ۳۰
۶۶ - دی پولیٹیکل ٹرائی اینگل ان انڈیا، ص ۳۱

شیرانوالہ گیٹ کے نام سے مشہور ہوا ۱۸۸۹ء میں ہائی اسکول ہو گیا۔ سنہ ۱۸۹۲ء میں طلبہ کے لئے ایک اسلامیہ کالج قائم کیا گیا اور سنہ ۱۹۰۷ء میں افغانستان کے امیر حبیب اللہ خان نے اس کی نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ یہ اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے نام سے مشہور ہوا۔ سنہ ۱۹۰۰ء میں جب یہ ڈگری کالج ہو گیا تو اس میں شیخ سر عبد القادر، میاں عبدالعزیز، شیخ عبدالعزیز وغیرہ نے اعزازی لکچر دئے، بعد کو علامہ علاؤ الدین صدیقی، علامہ عبداللہ یوسف علی، ڈاکٹر تاثیر، پروفیسر ایم۔ ایم شریف، پروفیسر علم الدین سالک، خواجہ دل محمد، خواجہ عبدالحئی فاروقی اور پروفیسر حمید احمد خاں جیسی ممتاز شخصیتوں نے اس کالج میں بہ حیثیت استاد کام کیا۔ شیخ عبد اللہ (کشمیر) سردار ابراھیم اور خواجہ دل محمد وغیرہ اس کے طالبعلم رہے۔۶۷ بعد کو اس انجمن نے مدرسوں کے علاوہ زنانہ کالج، یتیم خانے، انڈسٹریل ہوم، عربی مکتب اور حافظ خانے بھی قائم کئے اور پنجاب کے مسلمانوں کی دینی و دنیاوی تعلیمی ترقی کے لئے پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم عمل رہی۔

تبلیغی کاموں کے سلسلے میں انجمن نے، مبلغین کے تقرر کے ساتھ ساتھ دینیات کی کتابیں بھی مرتب کروائیں اور اپنے مدرسوں کے لئے اپنا نصاب خود مقرر کیا۔ اسلامی تاریخ، سیرت، سوانح، تعلیم اور تہذیب و ثقافت کے موضوعات پر مقالے اور کتابیں لکھوا کر شائع کرائیں۔ سنہ ۱۸۸۵ء میں "حمایت اسلام" کے نام سے ایک ماہنامہ جاری کیا۔ سنہ ۱۹۲۶ء سے یہ ہفت روزہ ہو گیا۔ سالانہ جلسوں کے لئے خصوصی اہتمام کیا گیا اور ملک کے گوشے گوشے سے شرکت کے لئے اکابر ملت کو دعوت دی گئی۔ چنانچہ اس کے سالانہ جلسوں میں سر سید احمد خاں، مولانا حالی، ڈپٹی نذیر احمد، نواب محسن الملک اور علامہ اقبال جیسی عظیم شخصیتوں نے شرکت کی۔

ملک کے نامور صحافی، ادیب اور شاعر مثلاً ابوالاثر حفیظ جالندھری، سعادت حسن منٹو، رشید اختر ندوی، وقار انبالوی، نشتر جالندھری، مولانا

۶۷۔ نقوش، "لاھور نمبر"، بابت فروری ۱۹۶۲ء، مرتبہ محمد طفیل، ص ۲۰۱ تا ص ۲۰۷۔

صلاح الدین احمد ، ابو صالح اصلاحی اور شیر محمد اختر وغیرہ ، انجمن کے رسالے حمایت اسلام کے شعبۂ ادارت سے منسلک رہے - ۶۸ قاضی خلیفہ حمیدالدین ، شیخ خدا بخش ، مفتی عبداللہ ٹونکی ، سر محمد شفیع ، سر شیخ عبدالقادر ، ڈاکٹر سر محمد اقبال ، ڈاکٹر شجاع الدین اور غلام محی الدین خان قصوری جیسے صاحبان فکر و نظر ، انجمن حمایت اسلام کے صدر رہے انجمن کا ایک اعزاز خاص یہ بھی ہے کہ اس کے بنا کردہ اسلامیہ کالج کے طلبہ مارچ ۱۹۴۰ میں قائد اعظم کو ایک شاندار جلوس کی شکل میں منٹو پارک تک لے گئے - قائد اعظم نے پاکستان کے مجوزہ پرچم کو لہرانے کی رسم اسلامیہ کالج گراؤنڈ میں ادا کی - پنجاب مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی تشکیل و تعمیر میں بھی اسلامیہ کالج کے طلبہ نے خاص کردار ادا کیا -۶۹

مختصر یہ کہ انجمن حمایت اسلام نے برصغیر کے مسلمانوں خصوصاً پنجاب کے مسلمانوں کی سیاسی و سماجی بیداری میں گراں قدر خدمات انجام دیں - ان خدمات کی اہمیت تاریخ میں یوں اور بڑھ جاتی ہے کہ یہ اس وقت انجام دی گئیں جبکہ برصغیر کے مسلمان بے دلی ، مایوسی ، ذہنی پستی ، تعلیمی پسماندگی ، اقتصادی بد حالی اور مذہبی گمراہی کا شکار ہو رہے تھے - ان کے دین ، ان کے عقائد ، ان کی ثقافت ، ان کا مذہب اور ان کے علوم و فنون کو ہندو قومیت کی تحریکوں نے چاروں طرف سے نرغے میں لے رکھا تھا لیکن انجمن حمایت اسلام کے مستعد و محنتی اور مخلص و جاں باز کارکنان نے ، مخالفین کو ہر محاذ پر شکست دی -۷۰ کم از کم پنجاب کے مسلمانوں کو تو انہوں نے ہندو تحریکوں کی زد سے پوری طرح بچا لیا - ہندوؤں نے پنجاب کے

۶۸ - تاریخ نظریۂ پاکستان ، ص ۱۳۲

۶۹ - حصول پاکستان ، ص ۶۰ ، از پروفیسر احمد سعید ، مطبوعہ ایجوکیشنل امپوریم ، لاہور ، ۱۹۷۵ء

۷۰ - تعلیمی مسائل (پس منظر و پیش منظر) ، ص ۸۴ ، از سید الطاف علی بریلوی ، مطبوعہ آل پاکستان ایجوکیشن کانفرنس ، کراچی

سرکاری دفتروں اور عدالتوں سے اردو کو خارج کرانے اور اس کی جگہ ہندی اور ناگری کو رواج دینے کی سر توڑ کوشش کی تھی لیکن انجمن پنجاب اور انجمن حمایت اسلام کی سرگرمیوں اور مزاحمتوں کے سبب انھیں کامیابی نہ ہوئی۔

اب ہندو تحریکوں کے تشدد و جارحیت کا نشانہ صرف یوپی کا علاقہ تھا۔ بنیادی اور نمایاں اختلاف کا سبب، وھی ہندی اردو کا قضیہ تھا۔ ہندو چاہتے تھے کہ سی پی اور بہار کی طرح، یوپی میں بھی اردو کی جگہ ہندی کو سرکاری اور عدالتی زبان بنا دیا جائے۔ اس کے لئے ان کی کوششیں پچھلے چالیس سال سے جاری تھیں لیکن ۱۸۸۵ء میں کانگریس کے قیام کے بعد، ان کوششوں میں مزید تیزی و توانائی پیدا ہوگئی۔ مدن موھن مالویہ کی "ناگری پرچارنی سبھا" سب سے زیادہ فعال اور جارح تھی اور اسے انڈین نیشنل کانگریس کی حمایت و ہمدردی بھی حاصل تھی۔ پنڈت مدن موھن مالویہ، ایک طرف کانگریس کے انتہا پسند ممبر تھے دوسری طرف "ناگری پرچارنی سبھا بنارس" کے بانی اور پرجوش کارکن بھی۔ انھوں نے اردو کے خلاف ایسا زبردست پروپیگنڈا شروع کیا اور اکثریت کی بنیاد پر ہندوؤں کو اتنا بدظن و مشتعل کیا کہ جگہ جگہ ناگری پرچارنی سبھا کی شاخیں قائم ہوگئیں اور اردو کو دفتروں اور اسکولوں سے خارج کر کے ہندی کو ناگری رسم الخط میں، جگہ دینے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ اتفاق سے اسی زمانے یعنی ۱۸۹۵ء میں اردو کے جانی دشمن اور مسلمانوں کے مخالف انتھونی میکڈانلڈ، صوبہ شمالی و مغربی و اودھ کے لفٹیننٹ گورنر ہوگئے۔ اب کیا تھا۔ ہندوؤں کی دلی مراد بر آئی۔ انھوں نے میکڈانلڈ سے مل کر اردو کے خلاف ایسا زبردست دھماکہ کیا کہ جس نے نہ صرف یوپی بلکہ برصغیر کے سارے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ مولانا حالی کا بیان ھے کہ میکڈانلڈ کے آتے ھی ہندوؤں کی طرف سے اردو کی مخالفت اور ہندی کی حمایت میں پھر آواز اٹھائی گئی اور مارچ ۱۸۹۸ء میں ایک طویل محضر نامہ لفٹیننٹ گورنر کو اس غرض سے پیش کیا گیا کہ عدالت اور سرکاری دفتروں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے

بجائے ہندی اور ناگری رسم الخط کو رائج کیا جائے۔۱؎

مارچ ۱۸۹۸ء میں جبکہ یہ محضر نامہ حکومت کو پیش کیا گیا، سر سید احمد خاں اگرچہ بستر مرگ پر تھے، پھر بھی انھوں نے اردو پر جو بے جا الزامات لگائے گئے تھے، ایک طویل مقالے کی صورت میں ان کا جواب لکھا۔ یہ مقالہ ان کی وفات سے صرف نو دن پہلے ۱۹۔ مارچ ۱۸۹۸ء کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوا۔ علاوہ ازیں الہ آباد میں اردو کے لئے جو ڈفنس کمیٹی بنائی گئی تھی اسے بھی سر سید احمد نے کچھ مفید مشورے دئے۔ اپنے مضمون کے شروع میں سر سید احمد خاں نے لکھا:

"غالباً اس وقت، ان کے (ہندوؤں کے) اس جوش سے اٹھنے کا سبب یہ ہے کہ اس صوبے کے ہز آنر لفٹیننٹ گورنر بہادر، اس زمانے میں جبکہ صوبہ بہار میں کیتھی حروف اور بہاری زبان، بعوض اردو زبان اور فارسی خط کے جاری ہوئی تھی، کلکٹر و مجسٹریٹ، معاون اس تجویز کے تھے۔ پس ان صوبوں میں بھی ہندی و ناگری حروف جاری ہوئے ہیں۔ تامل نہ فرمائیں گے اور شاید یہ غلط خیال بھی اس پرانے مردہ مضمون کے اٹھانے کا باعث ہوا کہ ان دونوں گورنمنٹ کی نظر عنایت، مسلمانوں کی نسبت کم ہے اور وہ ان کو ناشکرا سمجھتی ہے۔"۲؎

ان ابتدائی سطور کے بعد سر سید احمد خاں نے، اردو پر کئے جانے والے اعتراضات کے مسکت و مدلل جوابات دے۔ اس سلسلے میں اور بھی مضامین مختلف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے، لیکن مولوی وحید الدین سلیم نے جو ایک، ماہوار علمی رسالہ "معارف" کے نام سے علی گڑھ سے نکالا تھا اور جو یکم جولائی ۱۸۹۸ء تا دسمبر ۱۹۰۱ء یعنی صرف ساڑھے تین سال جاری رہ سکا۔۳؎ اس میں کئی نہایت اہم مضامین شائع ہوئے۔ خود وحید الدین سلیم نے بھی اپنا ایک جامع مضمون بہ عنوان "ہندی کے حامیوں کا مغالطہ"

۱؎۔ حیات جاوید، ص ۱۶۵

۲؎۔ حیات جاوید، ص ۱۶۶

ستمبر ۱۹۰۰ء کے پرچے میں شائع کیا - ان مضامین میں ایک مضمون مولوی رشید احمد سالم کا ھے اور اپریل ۱۸۹۹ء کے شمارے میں چھپا ھے - یہ مضمون دس صفحوں پر مشتمل ھے - اس میں فاضل مقالہ نگار رشید احمد سالم نے بہ عنوان ''اردو ناگری بحث اضلاع شمال و مغرب و اودھ'' پہلے ، ھندوؤں کی عرضداشت کے اعتراضات اور دعوے ، مختصراً نقل کئے ھیں پھر ایک ایک دعوے اور اعتراض کا مدلل جواب لکھا ھے ، بحث کی اھمیت کے پیش نظر اس مقالے کے خاص خاص نکتے حد درجہ اختصار کے ساتھ اس جگہ درج کئے جا رہے ھیں -

عرضداشت میں ایک دعویٰ کیا گیا تھا کہ جن وجوہ کی بنا پر بہار اور ممالک متوسط (سی - پی) میں ناگری حروف ، عدالتوں میں جاری کئے گئے ھیں وھی دلائل اضلاع شمال و مغرب و اودھ کے لئے قابل تسلیم اور قابل عمل ھیں - اس کے جواب میں مقالہ نگار نے لکھا کہ :

''یہ کسی طرح صحیح نہیں ھے، خود گورنر کے قول کے مطابق بہار میں اردو رسم الخط کی جگہ کیتھی حروف کو جاری کرنے میں خاصا وقت لگا ھے اور یہ طول امل ھر شخص کے لئے بہت تکلیف دہ تھا ، یہ اس علاقے کے متعلق بات تھی ، جہاں اردو اور فارسی خط کی قدامت و اھمیت ، یوپی کے مقابلے میں بہت کم تھی ، اس لئے ظاھر ھے کہ صوبہ متحدہ میں ایسا کرنے سے سخت دقت اور مشکل پیش آئے گی ، علاوہ ازیں ، بموجب اصول علم اللسان کے دو زبانوں کے درمیان اگر گرامر کا بین اختلاف ھے تو ان میں سے ھر زبان مستقل سمجھی جائے گی اور اگر ایسا اختلاف نہیں ھے تو ان دونوں زبانوں کو ایک ھی زبان کی دو شاخیں تصور کریں گے - انگلستان کی نسبت کون انکار کر سکتا ھے کہ وھاں اس سرے سے اس سرے تک

۷۳ - وحید الدین سلیم: حیات اور ادبی خدمات ، (پی - ایچ - ڈی کا مقالہ) ، ڈاکٹر منظر عباس نقوی ، مطبوعہ علیگڑھ یونیورسٹی ، ۱۹۶۹ء ، ص ۲۹ تا ص ۳۱

انگریزی زبان مستعمل ہے حالانکہ اس ملک کے ہر ضلع میں ایک دوسرے سے مختلف بولیاں بولی جاتی ہیں مگر ان کو انگریزی زبان سے علیحدہ کوئی زبان تصور نہیں کیا گیا بلکہ وہ انگریزی ہی کی شاخیں قرار دی گئی ہیں۔ انگریزی میں عام زبان کو لینگوئج اور اس کی شاخوں کو جن میں گرامر کا بین اختلاف نہیں پایا جاتا ڈائی لکٹ (بولی) کہتے ہیں۔ پس صوبہ متحدہ کی لینگوئج یعنی عام زبان اردو ہے اور وہ زبانیں جن کو ڈاکٹر گریرسن ہندی یا ہندی جیسی کوئی زبان خیال کرتے ہیں اردو زبان کی ڈائی لیکٹ یعنی مختلف بولیاں ہیں۔ شہروں میں پڑھے لکھوں کی زبان جن میں عربی اور فارسی الفاظ کی زیادہ آمیزش ہے۔ شستہ مہذب اور خالص اردو سمجھی جاتی ہے جبکہ دیہات اور قصبات کے جاہلوں کی زبان، غیر شستہ بے محاورہ اور غیر خالص اردو خیال کی جاتی ہے۔ ان دونوں قسم کی زبانوں میں باعتبار بناوٹ اور صرف و نحو کے کوئی بین فرق نہیں ہے اور اسی لئے وہ علیحدہ اور مستقل زبانیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی زبان کی دو شاخیں ہیں، جن میں سے ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ ہے، جب یہ امر پایہ ثبوت کو پہنچ گیا کہ صوبہ جات متحدہ کی عام زبان اردو ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ ممالک متوسط اور بہار کی نسبت جو دلائل پیش کئے جائیں وہ ان صوبجات کی حالت پر صادق آئیں۔"

عرضداشت میں دوسری بات یہ کہی گئی تھی کہ:

عدالتوں کی کارروائی اور بحث کو آسان بنانے کے لئے ناگری خط کو عدالتوں میں جاری کیا جائے اور مروجہ زبان سے عربی و فارسی کے سارے الفاظ نکال دئے جائیں کیونکہ ان کے پڑھنے میں تمام آدمیوں کو دقت ہوتی ہے۔"

اس کے جواب میں کہا گیا کہ:

"ہمارے نزدیک ناگری حروف کو عدالتوں کی کارروائی کے لئے پسند

کرنے کی وجہ بھی کافی نہیں کیونکہ عدالتوں کی کارروائیاں جس زبان میں لکھی جاتی ہیں وہ قانونی زبان ہے ۔ قانونی زبان عام بول چال سے ہمیشہ علیحدہ سمجھی جاتی ہے اور اس کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو اس کو سمجھنا چاہیں اور جن کو اس کے سمجھنے کی ضرورت پیش آئے۔ کسی ملک کے عام آدمی قانون یا سیاسی یا علمی زبان کو عام طور پر نہ بول چال میں استعمال کرتے ہیں نہ اس کو سمجھ سکتے ہیں۔ جس طرح ہر انگریز انگریزی زبان کی قانونی اصطلاحات سے واقف ہونے کا مدعی نہیں ہو سکتا اسی طرح صوبہ جات متحدہ کا ہر باشندہ اردو کی قانونی کارروائیوں اور قانونی الفاظ سے آگاہ تصور نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ امر بھی مسلم ہے کہ علمی یا قانونی الفاظ اگر عام بول چال سے اخذ کئے جائیں تو ان کے وہی معنی عام طور پر سمجھے جائیں گے جو بول چال میں سمجھے جاتے ہیں نہ کہ وہ معنی جو علما یا واضعان قانون قرار دیتے ہیں ۔ اسی بنا پر یورپ کے علما اور واضعان قوانین نے علمی اور قانونی الفاظ کا ان زبانوں سے لینا اختیار کیا ہے جو مردہ ہو چکی ہیں اور جن کے الفاظ کے اصلی معنی لوگوں کے ذہنوں اور دماغوں میں گردش نہیں کرتے ۔ اردو زبان میں بھی ، عربی اور فارسی سے قانونی علمی الفاظ لئے گئے ہیں ۔ اگر عدالتوں کی زبان وہی ہو جو جاہلوں یا پڑھے لکھوں کی عام بول چال ہے تو قانونی کارروائیوں کے سمجھنے میں نہایت پیچیدگی پیش آئے گی ۔ اردو زبان میں تمام قوانین مروجہ کا ترجمہ ہو چکا ہے اور قانونی اصطلاحیں مقرر ہو چکی ہیں ہندی بھاشا جس کے زندہ کرنے کا خیال چند صاحبوں کو منظور ہے نہ اتنی وسیع ہے نہ اتنی نازک و بلیغ کہ قانون کی باریکیوں اور عدالتوں کی موشگافیوں کو کماحقہ ادا کر سکے ۔ اور اگر سنسکرت کی مدد سے اس کا دائرہ وسیع کیا جائے گا تو جدید اصطلاحوں کے قائم کرنے میں عدالتوں اور ان لوگوں کو جن کو عدالتوں سے سابقہ پڑتا ہے عام اس سے کہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان ، نہایت تکلیف اور

مصیبت کا سامنا کرنا ہوگا۔ اگر یہ کہا جائے کہ ناگری حروف جاری کرنے میں بھی وہی عربی اور فارسی کی قانونی اصطلاحات قائم رکھی جائیں گی جو اس وقت تک قائم ہو چکی ہیں، مگر عام زبان جس میں مقدمات کی مسلیں مرتب کی جاتی ہیں اب کی نسبت زیادہ سہل اور زیادہ عام فہم ہو جائیں گی تو یہ خیال صحیح نہیں ہے کیونکہ عربی اور فارسی کے الفاظ کو کثرت سے استعمال کرنے والے زیادہ تر وہی لوگ ہیں جو تعلیم یافتہ اور مہذب ہیں۔ اگر عربی اور فارسی کے قانونی الفاظ ناگری حروف میں لکھے جائیں گے تو ان حروف کے لئے جو سیمیٹک زبانوں سے مخصوص ہیں مثلاً ث، ذ، ص، ض، ط، ظ ع، غ، ق نئے حروف ناگری ایجاد کرنے پڑیں گے حالانکہ ناگری کی نسبت دعویٰ کیا گیا ہے کہ وہ ان تمام آوازوں کو ادا کر سکتی ہے جو انسان کے گلے سے نکلنی ممکن ہیں۔"

اس شکایت کے جواب میں کہ فارسی حروف میں لکھے ہوئے، استغاثوں، درخواستوں اور دستاویزوں کو بیشتر لوگ نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ فارسی حروف گورکھ دھندے کے مثل ہیں۔ مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:

"ناگری حروف کی تائید اس سے بھی نہیں ہوتی کیونکہ استغاثوں، درخواستوں اور دستاویزوں اور سمنوں کے پڑھنے کے لئے، پڑھا لکھا ہونا ضروری ہے خواہ یہ کاغذات فارسی حروف میں ہوں یا ناگری میں۔ اس وقت اس کا علاج یہ نہیں کہ ناگری حروف جاری کئے جائیں بلکہ اصل علاج یہ ہے کہ تعلیم کو وسعت کے ساتھ جاری کرنے کی کوشش کریں۔"

گارسین دتاسی کا بیان ہے کہ:

"اردو میں دو قسم کا خط ہوتا ہے۔ ایک خوشخط دوسرا شکستہ۔ مگر ہندی میں علاوہ ان خطوں کے جو ایک ہی قسم کی زبانوں سے مخصوص ہوتے ہیں، کئی قسم کے خط ہوتے ہیں خود ہندوؤں

کو اپنی خاص تحریر پڑھنے میں ایسی ہی دقت معلوم ہوتی ہے۔ گویا وہ غیر زبان کے پڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔(اردو کا) شکستہ خط تھوڑی سی مشق سے پڑھ لیا جاتا ہے اور اس کے جاننے والے ہر عدالت میں موجود ہیں، ہم نے کبھی نہیں سنا کہ کسی فیصلے کی اپیل اس بنا پر کی گئی ہو کہ کاغذات مقدمہ میں کوئی لفظ صحیح نہیں پڑھا گیا۔ کوئی عبارت کیسی ہی شکستہ خط میں کیوں نہ ہو اس کا سیاق و سباق خود بتا دیتا ہے کہ اس کے الفاظ کیا ہیں اور وہ کس مطلب کے لئے لکھے گئے ہیں۔''[۴۷]

عرضداشت میں ایک دعویٰ یہ بھی کیا گیا تھا کہ فارسی رسم الخط، تعلیمی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، صوبہ بہار اور ممالک متوسط میں جب سے ناگری حروف جاری ہوئے ہیں وہاں کے اسکولوں میں طلبہ کی تعداد بڑھ گئی ہے، اس کے جواب میں مقالہ نگار نے لکھا ہے کہ:

''ہر صوبے میں دیسی زبان اور دیسی خط کا رواج نہیں ہے اور تعلیم کی ترقی یا تنزل کے اسباب مختلف ہیں۔ اگر صوبہ بہار اور ممالک متوسط میں، جہاں ناگری حروف عدالتوں میں جاری کئے گئے ہیں، ابتدائی تعلیم کی ترقی کا اندازہ اس وقت سے نہ کیا جائے جبکہ وہاں سررشتۂ تعلیم قائم ہوا تو یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ جائے گا کہ ناگری حروف کے اجرا سے پہلے اور بعد کے زمانے میں ابتدائی تعلیم کی رفتار میں اسی قدر زیادتی ہوئی ہے جس قدر کہ ہر صوبے میں بلحاظ مقامی اسباب اور اقتضائے زمانہ کے ہونی چاہئے۔''[۵۰]

اپریل ۱۸۹۹ء ہی کے 'معارف' میں خلیفہ محمد حسین، ممبر لیجسلیٹو کونسل، صوبہ پنجاب اور فارن منسٹر ریاست پٹیالہ کا بھی ایک مضمون اردو ہندی قضیے پر شائع ہوا ہے عنوان وہی ہے۔ جو مولوی رشید احمد سالم کے مضمون

۴۷ و ۵۰۔ ''معارف''، علیگڑھ، شمارہ نمبر ۱، جلد اول، بابت اپریل ۱۸۹۹ء، مطبع مفید عام، آگرہ، ص ۲۹۸ تا ۳۰۷

کا ہے ، فرق یہ ہے کہ سالم کے مضمون کا تعلق یوپی کے مسائل سے اور خلیفہ سید محمد حسین کے مقالے کا صوبہ پنجاب سے ۔ یہ مضمون اٹھارہ صفحوں میں پھیلا ہوا ہے اور اس میں فاضل مقالہ نگار نے پنجاب کے مختلف ضلعوں میں زبان کی صورت حال کے پیش نظر ، اردو کی حمایت اور ناگری کے رد میں نہایت قوی دلیلیں دی ہیں ۔ ''معارف'' کے مدیر مولوی وحید الدین سلیم نے اس مضمون پر نوٹ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ :

''اردو ہندی یا ناگری کی بحث کئی دفعہ اب سے پیشتر ، اضلاع شمال و مغرب و اودھ اور صوبہ پنجاب میں ایک ساتھ چھڑی تھی اور اگرچہ اس وقت تک یہ بحث اضلاع شمال و مغرب و اودھ ہی تک محدود ہے مگر ممکن ہے کہ پنجاب میں بھی اس کے بعد اس قسم کی درخواست پیش کی جائے اس لئے مضمون مندرجہ ذیل جو نہایت کاوش و تحقیقات سے لکھا گیا ہے ، معارف میں درج کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے ۔ اگر پنجاب میں یہ بحث دوبارہ زندہ کی گئی تو یہ مضمون خاص کر اہل پنجاب کے لئے مفید ہوگا ورنہ بہت سے دلائل اس میں ایسے ہیں جو اضلاع شمال و مغرب و اودھ کے لئے بھی کار آمد ہو سکتے ہیں ۔''۷۶

ہندوؤں کی عرضداشت کے جواب میں اس طرح کے متعدد مقالے چھپے ، کئی درخواستیں حکومت کو مختلف علاقوں سے بھجوائی گئیں ۔ احتجاجی جلسے ہوئے اور اردو ہندی ، ناگری کے رواج سے پیدا ہونے والی ، قباحتوں کی طرف ارباب اقتدار کی توجہ مبذول کرائی گئی لیکن حکومت اور میکڈانلڈ پر کسی چیز کا کوئی اثر نہ ہوا ۔ لفٹیننٹ گورنر میکڈانلڈ نے ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء کو ہندوؤں کے مطالبے کو تسلیم کر لیا ، ہندی اور ناگری کو عدالت میں بازیابی حاصل ہو گئی۔۷۷ میکڈانلڈ کے اس فیصلے نے مسلمانوں میں غم و غصہ کی ایک

۷۶ - ''معارف''، علیگڑھ ، شمارہ نمبر ۱۰ ، جلد اول ، بابت اپریل ۱۸۹۹ء ، ص ۳۰۷ تا ص ۳۲۳

۷۷ - حیات جاوید ، ص ۱۶۶

لہر سی دوڑا دی ۔ محمد امین زبیری کے الفاظ میں ، سبب یہ تھا کہ :

''مسلمانوں کے لئے من حیث القوم یہ ریزولیوشن (میکڈانلڈ کا حکمنامہ) سخت مضر تھا تعلیم اور وسیع و ترقی پذیر لٹریچر ، عدالتی و تجارتی اور تمدنی کاروبار ، ہندو مسلم اتحاد ، غرض سب ہی اس کی زد میں تھے ۔''۷۸

مجبوراً سر سید احمد خاں کے بعد ، ان کے رفقا ، اور دوسرے مسلمان ، سینہ سپر ہو کر اردو اور مسلمانوں کے دوسرے قومی مفادات کے تحفظ کے لئے میدان میں آگئے ۔ نواب محسن الملک نے اپنی کوٹھی پر ایک مختصر سا جلسہ ۲ مئی ۱۹۰۰ء کو منعقد کیا ۔۷۹ جس میں آئندہ کے لئے پروگرام طے کیا گیا اور اس کے مطابق ۱۳ مئی ۱۹۰۰ء کو علی گڑھ میں نواب لطف علی خان کی صدارت میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا ۔ اس میں نواب محسن الملک نے ایک پرزور و پرجوش تقریر کی جس کی تمہید میں حاضرین کو اعتدال و صبر و تحمل اور ادب و احترام کو ملحوظ رکھ کر کارروائی کرنے کی ہدایت کی گئی ۔ آخر میں انہوں نے کہا :

''میں نہیں کہتا نہ کہہ سکتا ہوں کہ جو کوشش کی جائے گی ، اس میں پوری پوری کامیابی ہوگی یا ہمارے خیالات سے گورنمنٹ کے خیالات ، ہر بات میں متفق ہوں گے ۔ کیونکہ ممکن ہے کہ بوجہ اس کے کہ اس معاملے میں ہمارے اغراض شامل ہیں رائے قائم کرنے میں ہم سے خطا ہو یا بعض دلائل ہمارے ضعیف ہوں مگر اس مقولہ کو ہمیشہ یاد رکھو کہ ہمارا کام ہے کوشش کرنا اور خدا کا کام ہے اس کو پورا کرنا ، پس ہم سب کو چاہئے کہ اس قومی کام کو دانشمندی اور استقلال سے کریں اور بذریعہ ایک معزز

۷۸ - حیات محسن ، مسلم یونیورسٹی پریس ، علیگڑھ ، ۱۹۳۴ء ، ص ۱۵۳

۷۹ - تذکرہ محسن ، ص ۹۵ ، محمد امین زبیری ، دھلی ، ۱۹۳۵ء

ڈپوٹیشن کے ایک میموریل ھز آنر سر انتھونی میکڈانلڈ ھی کے حضور میں پیش کریں۔ اگر ھم کامیاب ھوئے تو فھوالمراد ۔ اگر ناکام رھے تو ھمارا دل اس خیال سے مطمئن رھے گا کہ ھم نے اپنا حق ادا کیا اور آئندہ آنے والی نسلیں اس بات کو دیکھ کر ھماری شکر گذار ھوں گی کہ ھم نے ان کی بہبودی کے لئے کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا ۔

پس اے مسلمانو آؤ اور خدا کے کرم اور گورنمنٹ کے انصاف پر بھروسہ کر کے اس قومی کام میں بلا خیال اس کے کہ تم جیتو گے یا ھارو گے آخری کوشش کرلو تا کہ کہنے کو یہ بات رہ جائے کہ :

شکست و فتح نصیبوں سے ھے ولے اے میر
مقابلہ تو دل ناتواں نے خوب کیا ،، ۸۰

علی گڑھ کے جلسے میں نواب محسن الملک کی تقریر کے بعد ، اس سلسلے میں ایک عرضداشت مرتب کرنے اور لکھنؤ میں مسلمانوں کے جلسۂ عام بلانے کی تجویز منظور ھوئی یہ کام بھی نواب محسن الملک ھی کے سپرد ھوا۔۸۱

میکڈانلڈ کو علی گڑھ کا یہ احتجاجی جلسہ اور اس کی کارروائی بہت ناگوار گزری انھوں نے اپنی تقریر اور بعض خطبوں میں اس پر سخت نکتہ چینی کی اور اس میں شریک مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے ڈرایا دھمکایا ۔ چنانچہ اس کے بہت سے شرکا نواب محسن الملک اور ان کے مرتب کئے ھوئے پروگرام سے علیحدہ ھوگئے ۔۸۲ ان مرعوب شدہ اشخاص میں علی گڑھ والے جلسے کے صدر نواب لطف علی خان خاص طور پر قابل ذکر ھیں ۔ انھوں نے لفٹیننٹ گورنر سے معذرت کرتے ھوئے کہا :

۸۰ - حیات محسن ، ص ۱۵۵

۸۱ - موج کوثر ، شیخ محمد اکرم ، فیروز سنز لمیٹڈ ، لاھور ، ۱۹۶۸ء ، ص ۷-۱۶۶

۸۲ - تذکرۂ محسن ، ص ۱۰۲

''چونکہ ان کو واقعات غلط بتائے گئے تھے اس لئے انھوں نے پریسڈنسی منظور کی تھی، مگر جب ان کو اصل واقعات معلوم ہوگئے تو انھوں نے استعفیٰ دے دیا اور اپنا تعلق ہر قسم کی کمیٹی سے الگ کر لیا۔''۸۳

لکھنؤ کے جلسے میں نواب محسن الملک نے نواب لطف علی خان کے اس بیان کو صریح جھوٹ قرار دیا اور اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے کہا:

''علی گڑھ میں جو جلسہ اس ریزولیوشن (میکڈانلڈ کے بیان) کی مخالفت میں گذشتہ مئی میں ہوا تھا اس کے صدر انجمن ایک معزز رئیس بنائے گئے تھے پھر وہ مستعفی ہوگئے۔ ان کے علیحدہ ہونے کا چرچا ہوا تو انھوں نے ہز آنر سے کہا کہ ان کو واقعات غلط بتائے گئے تھے اس لئے انھوں نے صدارت قبول کی تھی مگر اصل واقعات معلوم ہوگئے تو استعفیٰ دے دیا۔ یہ بات لائق افسوس ہے۔ اصل واقعہ یوں ہے کہ اس ریزولیوشن کے متعلق کارروائی کرنے کے لئے ایک مجلس میرے مکان پر منعقد ہوئی۔ میں نے خاص خاص لوگوں کو رقعے بھیجے۔ یہ رقعہ نواب لطف علی خان کے نام بھی گیا وہ تشریف لائے اور مجلس کا چیئرمین بننا قبول کیا۔ اس میں صرف یہ طے ہوا کہ ۱۳ مئی کو علی گڑھ ہال میں ایک جنرل میٹنگ کی جائے۔ چنانچہ ۱۳ مئی کو جلسہ ہوا۔ اس میں وہی صاحب (نواب لطف علی خاں) صدر انجمن تجویز ہوئے۔ انھوں نے خوشی سے منظور کیا۔ ساری کارروائی ان کے سامنے ہوئی اسی دن تار، ہز آنر کو بھیجا گیا اس تار کا جواب آنے پر ۱۶ مئی کو ایک اجلاس تار کا جواب لکھنے کے لئے بلایا گیا۔ تار کا جواب بھی نواب لطف علی خان صاحب نے منظور کیا۔''۸۴

۸۳ - حیات محسن، ص ۱۵۶

۸۴ - مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، حصہ اول، نواب محسن الملک، مرتبہ فضل دین ککے زئی، نول کشور پریس، لاہور، ۱۹۰۴ء، ص ۳۷۹ تا ص ۳۹۴

وجه کچھ بھی رہی ہو نواب محمد لطف علی خان کا استعفی اردو کے بہی خواہوں کے لئے بہر حال ایک حوصلہ شکن واقعہ تھا لیکن نواب محسن الملک پر اس کا یا میکڈانلڈ کی دھمکیوں کا کوئی اثر نہیں ہوا ۔ انھوں نے حکومت کی ناراضگی کے باوجود لکھنؤ میں ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو ایک عظیم الشان جلسہ منعقد کیا اس میں پہلے انھوں نے ایک ریزولیوشن ، میکڈانلڈ کے حکمنامے کے سلسلے میں منظور کروایا ۔ ریزولیوشن یہ تھا :

''اس مجمع کی یہ ہرگز رائے نہیں ہے کہ سر انتھونی میکڈانلڈ صاحب بہادر نے ریزولیوشن مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۰۰ء در بارہ نفاذ ناگری عمداً کسی فریق کی طرفداری یا کسی نا منصفانہ کارروائی سے دانستہ اہل اسلام کو ضرر پہنچانے کی نیت سے پاس کیا ہے ۔ بلکہ جیسا کہ صاحب ممدوح کے بیان سے ظاہر ہوگا ان کا ریزولیوشن صرف کثرت اہالیان ممالک مغربی و شمالی و اودھ کے فائدے پر مبنی ہے ، گو یہ جلسہ ہز آنر کی رائے سے متفق نہیں ہو سکتا ۔''۸۵

اس ریزولیوشن کے الفاظ سے اس خوف و ہراس کا اندازہ کرنا مشکل نہیں رہ جاتا جو میکڈانلڈ کی دھمکیوں کے سبب مسلمانوں پر چھایا ہوا تھا اس کے باوجود نواب محسن الملک نے صدر جلسہ کی حیثیت سے ایک طویل اور پر جوش تقریر کی ۔ اس تقریر کے بعض ٹکڑے دیکھئے :

''یہ ریزولیوشن بھی جو گورنمنٹ نے جاری کیا ہے ۔ ایسا ہی ہے کہ مسلمانوں کو اس کی شکایت ہے ۔ اور ہم اس میں اپنا نقصان دیکھتے ہیں اور ہم اس پر اعتراض کرنے کو آمادہ ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ ہم مسلمان تعلیم میں دوسری قوموں سے کم ہیں ۔ مگر

۸۵ ۔ (الف) مجموعہ لیکچر و اسپیچز ، حصہ اول ، ص ۲۷۹

(ب) تذکرہ محسن ، محمد امین زبیری ، دھلی ، ۱۹۳۵ء ، ص ۹۴

اور باتوں میں جن سے گورنمنٹ وقت پر ہم سے کام لے سکتی ہے۔ کم نہیں ہیں۔

گو ہمارے ہاتھ میں قلم نہیں۔ اور ہمارے قلم میں زور نہیں۔ اور اسی وجہ سے ہم دفتروں میں کم نظر آتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاتھ میں تلوار پکڑنے کی قوت ابھی باقی ہے۔" (چیئرز)

مجھے ہرگز یقین نہیں ہے کہ گورنمنٹ ہماری زبان کو مرنے دے گی۔ بلکہ اس کو زندہ رکھے گی اور وہ کبھی مرنے نہ پائے گی۔ اگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کوشش اس کے مارنے کی دوسری طرف سے ہو رہی ہے اگر وہ برابر جاری رہی تو آئندہ کسی وقت ہماری زبان کو صدمہ پہنچے گا۔ یہی خوف ہے، جس کے لئے یہ کوششیں ہو رہی ہیں تاکہ ہم اپنی زبان کو زندہ رکھ سکیں۔ اور اگر خدا نخواستہ وہ وقت آوے، کہ اس کو زندہ نہ رکھ سکیں اور اس کا جنازہ دھوم سے نکالیں۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔"

میں اس موقع پر سرسید مرحوم کے ایک ریمارک کو نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ جو انہوں نے ۱۸۷۳ء کے ایک سرکلر میں شائع کیا تھا۔ ہمارے معزز لیڈر نے لکھا کہ:

"تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ناگری حروف اور ہندی زبان جاری ہونے سے بڑا نقصان ہوگا۔ درحقیقت جس قدر نقصان کہ مسلمانوں کو ہونا ممکن ہے وہ ہوگا کہ اس سے بڑھ کر بجز دین سے محروم کر دینے کے اور کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔"[۸۶]

۸۶۔ مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، حصہ اول، نواب محسن الملک سید مہدی علی خان، مرتبہ ملک فضل دین ککے زئی، نول کشور پریس، لاہور، ۱۹۰۴ء، ص ۳۷۹ تا ص ۳۹۴

نواب محسن الملک کی تقریر اور اردو کی مدافعت میں ان کی دوسری کوششوں سے میکڈانلڈ سخت برہم ہو گئے، وہ خود علی گڑھ گئے اور ۲۶ اگست ۱۹۰۰ء میں علی گڑھ مسلم کالج کے ٹرسٹیوں کا جلسہ طلب کیا۔ تقریر فرمائی اور اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کے خلاف ناراضگی کا اظہار کیا۔ یہ الزام لگایا کہ اس تحریک کی تائید میں کالج کے طلبہ سے پروپیگنڈا کرایا گیا۔ کالج کے اساتذہ، آنریری سکریٹری اور بعض ٹرسٹیوں نے اس میں نمایاں حصہ لیا۔ بالآخر یہ دھمکی دی کہ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو کالج کو گورنمنٹ سے جو امداد ملتی ہے وہ بند کر دی جائے گی۔ صرف یہی نہیں انھوں نے صوبے کے بعض اضلاع کا دورہ کر کے مسلمان رئیسوں کو تنبیہ کی اگر انھوں نے اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کی تائید کی تو ان کے لئے اچھا نہ ہوگا۔ کالج کو حکومت کے قہر سے بچانے کے لئے نواب محسن الملک نے آنریری سکریٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا۔۸۷ لیکن کالج کی خاطر، مسلمانوں کے اصرار سے استعفیٰ واپس لے لیا اور اردو ڈفینس ایسوسی ایشن سے مستعفی ہو گئے۔

اوپر نواب محسن الملک کی جس تقریر کا حوالہ دیا گیا ہے اس کا نمبر ان کے مجموعۂ تقاریر میں ۵۲ ہے اور اس کا عنوان اس طور پر درج ہے:

> "اسپیچ جو ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء کو سنٹرل اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کے اجلاس اول لکھنو میں بہ حیثیت پریذیڈنٹ ہونے کے ریزولیوشن نمبر ۱ کی تحریک کرتے ہوئے فرمائی۔"۸۸

اس عنوان اور دوسری متعدد شہادتوں سے یہی پتہ چلتا ہے کہ لکھنؤ کے جلسۂ عام کی صدارت نواب محسن الملک نے کی تھی۔ لیکن بعض نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ لکھنؤ کے جلسے کی صدارت میر انیس کے بیٹے میر خورشید علی نفیس نے کی تھی۔۸۹ یہ بات یکسر بے بنیاد معلوم ہوتی ہے البتہ یہ ممکن

۸۷ - پاکستان ناگزیر تھا، ص ۴۷

۸۸ - مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، ص ۳۷۹

۸۹ - مقدمہ انگریزوں کی لسانی پالیسی، ص ۲۲

ہے کہ نفیس نے اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کے سلسلے کے کسی اور مقامی جلسے کی صدارت کی ہو اس لئے کہ اردو ڈفینس ایسوسی ایشن پچھلے کئی برسوں سے قائم تھی اور اس کی بنیاد سر سید احمد خان نے ۱۸۷۳ء میں بمقام الہ آباد ڈالی تھی اور اس کی شاخیں جگہ جگہ قائم کی گئی تھیں ۔ علاوہ ازیں ۱۸ اگست ۱۹۰۰ء میں سنٹرل اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کی طرف سے جو بڑا جلسہ لکھنؤ میں ہوا تھا اور جس میں میکڈانلڈ کے حکمنامے کے خلاف قرارداد منظور کی گئی تھی ، اس سے بہت پہلے بھی ، لکھنؤ میں اردو ایسوسی ایشن کے جلسوں کے انعقاد کا سراغ ملتا ہے ۔ چنانچہ ۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء کے اجلاس کی روئداد دیکھنے سے پتہ چلتا ہے اس کی صدارت شیخ علی عباس کی تحریک اور احتشام علی کی تائید پر جلال الدین شاہ اسمعیل مرزا صفوی نے کی تھی اور اتفاق رائے سے چھ آدمیوں کو ''ابتدائی کمیٹی حمایت اردو'' کا جوائنٹ سکریٹری مقرر کیا گیا تھا ۔ ان چھ میں ایک نام عبدالحلیم شرر کا بھی تھا ۔ اس میں بالاتفاق رائے یہ امور بھی طے پائے تھے کہ :

(۱) جہاں جہاں کمیٹیاں ، حمایت اردو کے واسطے قائم ہوئی ہیں وہاں خط و کتابت کر کے تمام حالات دریافت کئے جائیں تا کہ ان کمیٹیوں میں اتحاد پیدا کیا جائے اور بعد دریافت حالات ، یہ تجویز کیا جائے کہ یہ کمیٹی سنٹرل کمیٹی قرار پائے کہ جس کے ماتحت اور کمیٹیاں رہیں یا یہ کہ یہ کمیٹی خود کسی اور سنٹرل کمیٹی کے ماتحت ہو ۔

(۲) صوبہ اودھ کے خاص سربر آوردہ اصحاب سے کمیٹی کی ممبری کی درخواست کی جائے اور جو ان میں منظور کریں انھیں ممبر کیا جائے ۔

(۳) جو تار حسب تجویز جلسہ، بخدمت لفٹینٹ گورنر بحضور وائسرائے ہند بھیجے گئے ہیں ان کے مضامین پڑھے گئے اور منظور ہوئے ۔

(۴) اس کمیٹی میں سات آدمیوں کا کورم ہو۔

(۵) جو تار بھیجے گئے ہیں ان کے مصارف کے لئے چندہ کیا جائے اور جمیع ممبران کی خدمت میں فہرست چندہ بھیجی جائے۔

(۶) سید ظہور احمد صاحب جوائنٹ سکریٹری کو ٹریزرار مقرر کیا گیا۔

(۷) اگلا جلسہ اس کمیٹی کا ۱۵ مئی کو بوقت ۵ بجے شام اسی مقام پر ہو۔''۹۰

۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء کی مندرجہ بالا روئیداد کی پیشانی پر جلسہ ''ابتدائی کمیٹی اردو'' درج ہے لیکن اس کے علاوہ ایک اور اجلاس کی نا مکمل رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ شیخ رضا حسین کی تجویز اور نواب مہدی حسن فتح نواز جنگ بیرسٹر ایٹ لا اور نواب سید مہدی حسین کی تائید پر ایک تجویز یہ قرار پائی تھی کہ:

''ایک خاص کمیٹی اس غرض سے منتخب کی جائے کہ وہ ان تمام امور کا انتظام و انصرام کرتی رہے جو خاص مسئلہ ناگری و اردو کے متعلق پیش آتے ہیں یا ضروری سمجھتے ہیں۔''

اس کمیٹی میں اڑتیس آدمیوں کے نام دئے ہوئے ہیں۔ پہلا نام نواب مہدی حسین فتح نواز جنگ کا ہے اور آخری سید خورشید حسن کا۔ اس کمیٹی کو یہ بھی اختیار دیا گیا تھا کہ:

''وہ حسب ضرورت اس کے ممبروں میں اضافہ کر سکتی ہے۔ نیز نواب مہدی حسین کی تحریک پر یہ طے پایا تھا کہ ایک جلسہ کمیٹی منتخب شدہ کا، کل پانچ بجے شام مکان انجمن رفاہ عام میں ابتدائی اصول طے کرنے کے لئے منعقد ہو اور جلسہ کمیٹی میں پانچ حاضرین کا کورم ہو۔''

۹۰۔ سیاسی تنظیموں کی ابتدائی روئیدادیں، جلد اول، بابت ۱۹۰۰ء، ۱۹۰۳ء اور ۱۹۰۴ء، مخزونہ آرکایوز آف فریڈم موومنٹ، کراچی یونیورسٹی، ص ۱۰

جس اجلاس کا یہ ذکر ہے وہ لائل ٹاؤن ہال میں ہوا تھا - ۹۱ لیکن تاریخ و دیگر تفصیلات کا پتہ یوں نہیں چلتا کہ روئیداد نا مکمل ہے اور اس کے صرف دو صفحے محفوظ ہیں - ایک جلسہ لائل ٹاؤن ہال میں ۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء کو ہوا تھا اسے جلسہ دوم کمیٹی حمایت اردو کا نام دیا گیا ہے لیکن چند ناموں کے علاوہ کوئی چیز رپورٹ میں محفوظ نہیں ہے - ۹۲

اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کی طرف سے یہ ساری کارروائیاں حقیقت میں نواب محسن الملک کی ہمت اور قیادت کے سبب عمل میں آ سکیں - انھوں نے صرف جلسے جلوس اور یاد داشت بھیجنے پر اکتفا نہیں کی بلکہ ایک وفد کی صورت میں لفٹیننٹ گورنر سے ملنے اور صورت حال کی وضاحت کرنے کی اجازت بھی چاہی - لیکن میکڈانلڈ نے اس کی اجازت نہ دی اور سکریٹری سے کہلوا دیا کہ خط و کتابت ہی کافی ہے - ہر چند کہ یہ عمل ، حد درجہ توہین آمیز تھا اور اس سے میکڈانلڈ کی خفگی بھی ظاہر ہوتی تھی لیکن محسن الملک ، اس کی پرواہ نہ کرکے اردو کے دفاع کے لئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے- میکڈانلڈ نے ان پر الزام لگایا کہ انھوں نے حکومت کو اطلاع کئے بغیر اور عام مسلمانوں کی رائے معلوم کئے بغیر ، ان کے حکم کے خلاف ایجی ٹیشن شروع کر دیا - ساتھ میں گورنر نے ان کے نام کے ساتھ "محسن الملک" لکھنا بھی چھوڑ دیا، حالانکہ یہ خطاب انھیں ۱۸۸۷ء میں گورنر جنرل کی طرف سے ملا تھا اور سرکاری مراسلات میں ان کے نام کے ساتھ برابر استعمال ہوتا تھا اور میکڈانلڈ کو اسے محذوف کرنے کا اختیار نہ تھا - ۹۳

۹۱ - سیاسی تنظیموں کی ابتدائی روئیدادیں ، مخزونہ آرکاہوز آف فریڈم مومنٹ ، کراچی یونیورسٹی ، ص ۱۰

۹۲ - سیاسی تنظیموں کی ابتدائی روئیدادیں ، مخزونہ آرکایوز آف فریڈم مومنٹ ، کراچی یونیورسٹی ، ص ۱۰

۹۳ - ماڈرن مسلم انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان ، لاہور، ۱۹۶۵ء، ص ۸۷

یہ سب کچھ نواب محسن الملک اور دوسرے مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے اور اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کو ختم کرنے کے لئے کیا جا رہا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ نواب محسن الملک وقتی طور پر، اردو ایجی ٹیشن سے کنارہ کش تو ہو گئے لیکن جیسے ہی حالات بدلے اور میکڈانلڈ صاحب صوبہ شمال اور مغرب و اودھ سے گئے وہ اردو کی حمایت میں پھر اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب انھوں نے اس سے زیادہ مضبوط و دیرپا دفاعی صورتوں پر غور کرنا شروع کیا، شیخ محمد اکرام لکھتے ہیں کہ :

> "Mohsin-ul-Mulk also did not allow his love for Urdu to die out. When the angry heat of personal controversy had subsided and Sir Anthony MacDonald had left the province, he organized Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu as a wing of Mohammadan Educational Conference."[94]

اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی اردو کے سلسلے میں مسلمانوں کی جدوجہد کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ میکڈانلڈ نے ہندی اور ناگری کے حق میں جو حکم صادر کر دیا تھا وہ بحال رہا۔ صرف اس قدر ہوا کہ ہندی اور ناگری کے ساتھ اردو اور اس کا رسم خط بھی عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں برقرار رکھا گیا۔ اس لحاظ سے ۱۸۶۷ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی اور اس کے ترجمان اردو زبان پر جو پے در پے حملے کئے گئے تھے وہ نتائج کے اعتبار سے کارگر ثابت ہوئے۔ ۱۸۵۰ء سے پہلے، ہندی اور ناگری کا عملی زندگی میں کہیں کوئی وجود نہ تھا، اب پنجاب کو چھوڑ کر بنگال، بہار، سی پی اور یوپی ہر جگہ ہندی اور ناگری کا راج تھا۔ بعد ازاں اگرچہ ہندوؤں نے پنجاب اور سندھ میں بھی ناگری رسم الخط کو رواج دینے کی کوششیں جاری رکھیں لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی۔ پنجاب میں اردو ہی کا سکہ چلتا رہا اور سندھی کے لئے بھی فارسی رسم الخط ہی مقبول رہا۔

۹۴ - ماڈرن مسلمس آف انڈیا اینڈ دی برتھ آف پاکستان، ص ۸۹

اردو کی جگہ ھندی اور ناگری برصغیر کے کئی صوبوں میں رواج تو پا گئی لیکن پچھلے پچیس برسوں میں حکومت نے ھندو اکثریت کو خوش رکھنے کے لئے زبان کے قضیے کے سلسلے میں جس صریح نا انصافی اور طرفداری سے کام لیا۔ اس نے نہ صرف بنگال، بہار، سی پی اور یوپی کے مسلمانوں کو حد درجہ مضطرب و کبیدہ خاطر کیا بلکہ برصغیر کے سارے مسلمانوں کو زبان کے مسئلے نے دل برداشتہ کر دیا۔ اول اس لئے کہ جو صوبے دیوناگری کی زد سے محفوظ رہ گئے، وہاں بھی ھندو اسے جاری کرنے کی پوری کوششیں کر چکے تھے۔ دوسرے یہ کہ اردو ان کے لئے فارسی کا بدل اور باھم رابطہ خیال کا واحد وسیلہ تھی اور ان کے علمی و ادبی کارنامے اور مذھبی و ثقافتی آثار و نقوش سب سے زیادہ اردو ھی زبان میں محفوظ تھے۔

مسلمانوں کے برعکس زبان کے مسئلے میں حکومت کی طرفداری اور کامیابی کے سبب ھندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے، آریہ سماج، برھمو سماج، گئو رکھشا سبھا، گنپتی میلہ اور اس طرح کی دوسری ھندو جماعتیں، ھندو قومیت کو فروغ دینے کے لئے ایسے فرقہ وارانہ اقدامات سے کام لے رھی تھیں جو مسلمانوں کے عقائد کے خلاف اور ان کے لئے دل آزار تھے۔ ھندوؤں کی سیاسی تنظیم "کانگریس" کی عمر بھی اب پندرہ سال ھو چکی تھی اور وہ مقامی خود مختاری کے اداروں اور صوبائی کونسلوں میں مقامی باشندوں کی نمائندگی کے سوال پر حکومت سے سودے بازی کرنے لگی تھی۔ لیکن صرف مذکورہ بالا سیاسی و سماجی جماعتوں کو کافی نہیں سمجھا گیا بلکہ اسی سال یعنی ۱۹۰۰ء میں جبکہ اردو کے سلسلے میں مسلمان احتجاج کر رہے تھے ھندوؤں کی ایک اور مذھبی جماعت "بھارت منڈل" کے نام سے وجود میں آ گئی،۹۵ اس کے روح رواں ابتداً مہاراجہ دربھنگہ تھے بعد میں یہی جماعت "ھندو مہاسبھا" میں ڈھل گئی اور کانگریس کے تقریباً سارے اھم لیڈروں کی ھمدردیاں اس کے ساتھ رھیں۔ غرضیکہ مسلمانوں کے مفادات کے خلاف ھندوؤں نے حکومت کے ساتھ گٹھ جوڑ کرکے جو محاذ قائم کر لیا تھا وہ

۹۵ - تاریخ نظریۂ پاکستان، ص ۱۳۶

بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں تک مضبوط تر ہو گیا۔

اس درمیان میں حکومت نے اپنی انتظامی ضرورتوں کے لئے ایک کام ضرور ایسا کیا جو کسی نہ کسی طور پر مسلمانوں کے اطمینان کا سبب ہوا۔ بنگال ایک بہت لمبا چوڑا صوبہ تھا اور ایک صوبائی انتظامیہ کے تحت اسے بحسن و خوبی چلانا دقت طلب تھا۔ اس لئے اس کو دو حصوں میں بانٹ دینے پر پچھلے کئی برسوں سے غور ہو رہا تھا، آخرکار ۱۹ جولائی ۱۹۰۵ء کو لارڈ کرزن کے حکم سے اس کو دو صوبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔۹۶

(۱) مشرقی بنگال اور آسام، جس کا دارالخلافہ ڈھاکہ قرار پایا۔

(۲) مغربی بنگال جس کا دارالخلافہ کلکتہ ہی رہا۔

اس تقسیم سے یہ ہوا کہ مشرقی بنگال کے صوبے میں بلحاظ آبادی مسلمانوں کی اکثریت ہو گئی اور ایک ایسا صوبہ وجود میں آ گیا جہاں خود مختار اداروں کی انتظامیہ پر مسلمان غالب رہ سکتے تھے۔ لیکن ہندوؤں نے صرف اس بنا پر کہ اس سے مسلمانوں کے حقوق ہندو اکثریت کے ہاتھوں پامال ہونے سے محفوظ رہتے تھے، تقسیم بنگال کی مخالفت کی اور اس میں کانگریسی اور غیر کانگریسی سارے ہندو شریک رہے اس مخالفت سے مسلمانوں کو پورا اندازہ ہو گیا کہ صرف زبان کے مسئلے میں نہیں بلکہ ہندوستانی سیاست کے ہر شعبے میں ہندوؤں کا نقطۂ نظر اور طرز عمل سراسر غیر جمہوری اور غیر منصفانہ رہے گا، ان کی کوششوں کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ ہندوستان کے ہر علاقے کے مسلمانوں پر بربنائے اکثریت انہیں غلبہ حاصل رہے اور جمہوریت کے اس اصول کے تحت جس میں بقول علامہ اقبال۔

بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

انہیں مسلمانوں پر حکومت کرنے کا موقع مل جائے ہر چند کہ سرسید احمد خان کو ان خطرات کا اندازہ بہت پہلے ہو گیا تھا اور انہیں خطرات کی بنا پر

۹۶ - پاکستان منزل بہ منزل، ص ۹۶

انھوں نے ۱۸۶۷ء میں اردو ہندی تنازع کے حوالے سے جو یہ کہا تھا کہ "اب ہندو اور مسلمان مل کر نہیں رہ سکتے اور مسلمانوں کا فائدہ اس میں ہے کہ وہ ہندوؤں سے الگ رہ کر کام کریں۔" بالکل صحیح کہا تھا۔

اس لئے اب مسلمانوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کا ایک نیا احساس پیدا ہوا۔ انھوں نے ضروری جانا کہ ہندوؤں کے جارحانہ عزائم اور متعصبانہ طرز عمل کی زد سے بچنے کے لئے ایک باقاعدہ سیاسی تنظیم قائم کی جائے جو مسلمانوں کی نمائندہ و ترجمان ہو۔ چھوٹے پیمانے پر اگرچہ اس طرح کا کام بعض رہنماؤں کی طرف سے پہلے بھی کیا گیا تھا لیکن دیرپا ثابت نہ ہوا۔ اب کے ملک گیر پیمانے پر مسلمانوں کو ایک سیاسی پلیٹ فارم پر جمع کرنے اور اس کے ذریعے اپنے حقوق کے لئے جد و جہد کرنے کے لئے ایک سیاسی تنظیم کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۳۰ دسمبر ۱۹۰۶ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر ڈھاکہ میں مسلمانان برصغیر کا ایک اجتماع ہوا۔ نواب سلیم اللہ خان آف ڈھاکہ نے اس اجتماع کے لئے پروگرام مرتب کیا۔ نواب وقار الملک نے جلسے کی صدارت کی اور اس میں مسلمانوں کی پہلی سیاسی جماعت آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔[۹۷] مسلم لیگ کا پہلا سالانہ اجلاس دسمبر ۱۹۰۷ء کو کراچی میں ہوا۔[۹۸] اور جس تنظیم کی بنا ڈھاکے میں ڈالی گئی تھی وہ اپنے پورے لوازم کے ساتھ تکمیل کو پہنچ گئی۔ اب برصغیر کی سیاسی بساط پر ہندوؤں کی نمائندہ جماعت کانگریس اور مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ تھی۔ چنانچہ ۱۹۰۶ء کے بعد ہندو مسلم سیاست اور اردو ہندی تنازع کی ساری جنگ انھیں دو پلیٹ فارموں سے لڑی گئی۔

مولوی محمد بشیر الدین نے جو کہ اردو ہندی تنازع سے گہری دلچسپی لے رہے تھے اور جنھوں نے میکڈانلڈ کے حکم نامے کے رد عمل میں اردو کی

۹۷ - مسلم لیگ یسٹرڈے اینڈ ٹوڈے، اے بی راجپوت، لاہور، ۱۹۴۸ء، ص ۱۹

۹۸ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۶

موافقت اور ناگری کی مخالفت میں متعدد مضامین اپنے رسالہ ''البشیر'' اٹاوہ میں چھاپے تھے۔ ۹۹ مسلم لیگ کے جواز و قیام کے سلسلے میں لکھا ہے کہ :

''میکڈانلڈ بہ حیثیت پیٹرن، محمڈن کالج، علیگڑھ آئے اور انھوں نے ٹرسٹیوں کو جمع کرکے اس ایجی ٹیشن پر جو اردو ڈفینس کے ذریعے سے کی جاتی تھی۔ سخت ناراضگی کا اظہار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ڈفینس ایسوسی ایشن بند ہو گئی، تاہم میکڈانلڈ کی مخالفت زبان اردو، اور نیز مسلمانوں کو ملازمت نہ دینے کی پالیسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری پیدا ہوئی اور اسی وقت پولیٹکل ایسوسی ایشن قائم کرنے کی بحث بھی اخبارات میں شروع ہوئی جس کا نتیجہ مسلم لیگ کی صورت میں ظاہر ہوا۔'' ۱۰۰

نواب وقار الملک کے متعلق بھی ان کے تذکرہ نگار محمد امین زبیری نے یہی لکھا ہے کہ :

''۱۹۰۰ء میں جب صوبہ متحدہ کی گورنمنٹ نے ہندی کے اجرا کے متعلق اپنا ریزولیوشن صادر کیا تو نواب صاحب اس سے بہت متاثر ہوئے اور اب ان کے لئے زمانہ کے تغیرات اور سیاسی خیالات و حالات سے بے تعلق رہنا دشوار ہو گیا اور اس ریزولیوشن کی احتجاجی کارروائیوں میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا۔ لکھنؤ کی مشہور میٹنگ میں شریک ہوئے پر زور تقریر کی اور اسی وقت سے ان کو قومی حقوق کے تحفظ کا خیال پیدا ہو گیا۔ ایک پولیٹکل آرگنائزیشن کو قائم کرنے کی تحریک شروع کر دی۔'' ۱۰۱

۹۹ - حیات محسن، حاشیہ ص ۱۵۹

۱۰۰ - حیات محسن، حاشیہ ص ۱۶۰

۱۰۱ - تذکرہ وقار الملک، مطبوعہ اسلامیہ ہائی اسکول، اٹاوہ، ۱۹۲۵ء، ص ۴۲

سر رضا علی نے بھی یہی خیال ظاہر کیا ہے کہ:

''اردو کے سلسلے میں میکڈانلڈ کے رویے کو مسلمانوں میں سیاسی بیداری کا اصل سبب اور آل انڈیا مسلم لیگ قائم ہونے کی بنیاد سمجھنا چاہئے۔

۱۹۰۰ء میں میکڈانلڈ نے جو بیج بویا تھا۔ اس نے چھ سال کے عرصے میں زمین کے اندر جڑ پکڑلی اور ۱۹۰۶ء میں ایک پودے کی صورت میں ظاہر ہوا۔''[۱۰۲]

۱۰۲۔ اعمال نامہ، ہندوستانی پبلشرز، دہلی، ۱۹۴۳ء، ص: ۸۵ اور ص ۱۱۰

ہندی اردو تنازع ، افق سیاست پر

(۱۹۰۶ء تا ۱۹۳۶ء)

۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کے نام سے ، مسلمانان پاک و ہند کی جو قومی جماعت وجود میں آئی تھی اس کے دو خاص مقصد تھے ، ایک سیاسی دوسرا ثقافتی ۔ سیاسی مقصد کی غایت یہ تھی کہ مقامی خود مختاری کے اداروں میں ، مقامی باشندوں کو جو نمائندگی دی جا رہی ہے وہ مخلوط انتخاب کے ذریعے نہیں ، جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر دی جائے یعنی مسلمانوں کو ہندوؤں سے الگ ایک قوم تسلیم کر کے نمائندگی کے لئے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس میں ہندوؤں کو صرف ہندو اور مسلمانوں کو صرف مسلمان ووٹ دے سکیں یا پھر ملک کی آبادی کے تناسب سے ، ہندو اور مسلمانوں کی نشستیں ، ہر ادارے کے لئے محفوظ کر دی جائیں ۔ دوسرا اہم مقصد یہ تھا کہ اس جمہوری نظام میں جس کے آثار بر صغیر میں پیدا ہو چلے تھے اور جس میں اہم سے اہم ملکی و قومی فیصلے اکثریت کی رائے سے ہوتے ہیں ، اس میں مسلمانوں کے مذہب ، ان کے عقاید ، ان کے ملی ڈھانچے ، ان کی تعلیم و تاریخ ، ان کی تہذیبی زندگی ، ان کے رسوم و آداب ، ان کی ثقافتی اقدار اور زبان و ادب کے تحفظ و ترقی کی آزادانہ کوشش کی جا سکے ۔ غور کیا جائے تو یہ دوسرا مقصد جسے سہولت کے لئے ثقافتی کہا گیا ہے دراصل ، سیاسی مقاصد ہی کے تابع تھا اس لئے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے بغیر ثقافتی مقاصد کی حفاظت و ترقی کا خیال عملاً ایک بے معنی سی بات تھی ۔

مسلمانوں کے یہ مقاصد ، جنھیں لے کر مسلم لیگ آگے بڑھی تھی ، نئے نہ تھے بلکہ پچھلے پچاس سال سے ان کے حصول کی کوشش ہو رہی تھی ۔ خاص طور پر ۱۸۶۷ء کے بعد ہندی اردو تنازع نے جو صورت اختیار کر لی تھی ،

اس سے سر سید احمد خاں بہت بد دل تھے اور انھوں نے مسلمانوں کے سیاسی و ثقافتی مقاصد کے حصول کے لئے اسی وقت سے کچھ نہ کچھ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اس نوع کی کوششوں میں سب سے اہم اور دور رس نتائج کا حامل کام ''محمڈن ایجوکیشنل کانگریس''[۱] کا قیام تھا۔

''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' ۱۸۸۶ء میں یعنی آل انڈیا نیشنل کانگریس (۱۸۸۵ء) سے ایک سال بعد قائم ہوئی اور جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے۔ اس کا بنیادی مقصد، مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ دلانا تھا لیکن اس سے سیاسی مقاصد کے حصول کی صورتیں بھی پیدا ہوگئیں۔ اس لئے کہ یہی پہلی ملک گیر جماعت تھی جس میں مختلف علاقے کے مسلمانوں کو ایک ساتھ مل بیٹھنے اور اپنے مشترک مقاصد پر تبادلۂ خیال کا موقع ملتا تھا۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا پہلا اجلاس دسمبر ۱۸۸۶ء میں بمقام علی گڑھ سمیع اللہ خان کی زیر صدارت ہوا تھا۔ اس میں سر سید نے اپنے خطبے میں کانفرنس کے مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا تھا۔

> ''اس وقت ہمارا یہ حال ہے کہ گو، ہم ایک قوم مسلمان کہلاتے ہیں، مگر ایک جگہ کے رہنے والے، دوسری جگہ کے رہنے والوں سے ایسے نا واقف ہیں جیسے کوئی اجنبی قوم، ایک دوسرے کے حال سے نا واقف ہو، ہم نہیں جانتے کہ پنجاب کے لوگوں کا قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت کیا خیال ہے اور انھوں نے کیا کیا ہے اور کیا کرنا چاہئے، پنجاب تو ایک دوسرا صوبہ ہے ہم کو اپنے ہی صوبے کے ایک ضلعے کے رہنے والے، دوسرے ضلع کے رہنے والوں کے حال سے محض نا واقف ہیں۔ کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں کہ مختلف اضلاع کے لوگ کسی موقع پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں۔

۱۔ ابتدائی نام یہی تھا بعد میں ''محمڈن'' کا لفظ ''مسلم'' سے اور ''کانگریس'' کا لفظ ''کانفرنس'' سے بدل دیا گیا اور پورا نام ''مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' ہو گیا۔

ایک کے حال سے دوسرے کو آگاہی ہو، ہم مل جل کر اپنے خیالات، جو قومی تعلیم اور قومی ترقی کی نسبت ہوں، دوسروں پر ظاہر کر سکیں، ایک دوسرے کے خیالات سے تبادلہ ہو۔ ان ہی خیالات سے تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہر سال مسلمانوں کی تعلیم و ترقی پر غور کرنے کے لئے ایک جگہ جمع ہوا کریں اور ایک صوبے اور ایک ضلع کے لوگوں کے ذریعے سے دوسرے صوبے اور ضلع کے مسلمانوں کو حالات معلوم ہوتے رہیں اور جو تدابیر ان کی بھلائی اور ترقی کی نسبت سوچی جائیں ان پر بحث مباحثہ ہو کر جو تدبیر عمدہ قرار پائے اختیار کی جائے۔"۲

واقعہ یہ ہے کہ کانفرنس کا قیام، سر سید کے خوابوں کی عملی تعبیر ثابت ہوا۔ مسلمان کو، کانفرنس میں پہلی بار اس کا موقع ملا کہ وہ باہم تبادلۂ خیال کے ذریعے اپنے قومی مسائل کا حل تلاش کر سکیں۔ اس یکجائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کی قومی زندگی میں ایک انقلاب اور ان کے سیاسی شعور میں ایک تحرک پیدا ہو گیا۔ بقول الطاف علی بریلوی:

"ایجوکیشنل کانفرنس نے برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں قومی یکجہتی و ہم آہنگی کا وہ صور پھونکا کہ تمام ملک خواب غفلت سے بیدار ہو گیا اور از بنگال تا سرحد اور از پنجاب تا مدراس و دکن، مسلمانوں کو اپنی قومی و اجتماعی تعلیم و ترقی کا احساس ہو گیا اور اسی بیداری کے نتیجے میں آگے چل کر ملکی سیاست اور تحریک آزادی میں مسلمانوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کانفرنس نے علاقائی، صوبائی اور طبقاتی حد بندیوں کو نظر انداز کر کے ملک گیر قومی احساس پیدا کیا۔ ملک کے منتخب اہل الرائے اور مشاہیر نے کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

۲۔ علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، سید الطاف علی بریلوی، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ، ۱۹۷۰ء، ص ۲۰

اس کے اجلاس یوپی ، دھلی ، پنجاب ، بنگال، سندھ ، بمبئی ، سی پی ، مدراس ، بہار ، اجمیر تمام صوبوں میں منعقد ہوئے اور ہر علاقے ہر طبقے کے مسلمان مشاہیر نے اس کے اجلاسوں کی صدارت کی۔"۳

مسلم لیگ کا قیام ، در اصل اسی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا توسیعی عمل تھا ، جو لوگ اس کانفرنس کے تخیل کے محرک و بانی تھے اور جن کی کوششوں سے یہ ایک فعال جماعت بن گئی تھی ان ھی کی توجہ اور ان ھی کے ھاتھوں مسلم لیگ وجود میں آئی۔ اسی لئے دونوں جماعتیں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلتی رھیں اور بہت دنوں تک ان کے سالانہ اجلاس بھی ایک جگہ اور ایک ھی وقت میں منعقد ہوتے رہے۔ مسلم لیگ کے قیام سے تین سال پہلے یعنی ۱۹۰۳ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے اپنی ایک اور شاخ "شعبۂ علمیہ" کے نام سے قائم کر دی تھی اور مقصد کی صراحت کے لئے اس کا نام "انجمن ترقی اردو" رکھا تھا۔ انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مولانا شبلی نعمانی اور پہلے صدر ٹامس آرنلڈ تھے۔۴ "انجمن ترقی اردو" کا قیام در اصل میکڈانلڈ کے اس قہر و غضب کا عملی جواب تھا جو اس نے اردو کے حق میں بپا کر رکھا تھا۔ مولانا شبلی کے اثر سے بہت سے اھل قلم انجمن کے رکن بن گئے اور وہ اردو کی مدافعت و ترقی کے لئے ایک محاذ کے طور پر کام کرنے لگے لیکن اس میں جان اس وقت پیدا ہوئی جب ۱۹۱۲ء میں مولوی عبدالحق اس کے سکریٹری مقرر ہوئے اور اس نے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے الگ ایک مستقل ادارے کی صورت اختیار کر لی۔

اب برصغیر کے مسلمانوں کے پاس بعض صوبائی تنظیموں کے علاوہ قومی

۳۔ مقدمہ علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں ، سید الطاف علی بریلوی ، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ، کراچی ، ۱۹۷۰ء ، ص ۲۰

۴۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ھاشمی فرید آبادی ، مطبوعہ انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۵۳ء ، ص ۱۳

سطح پر تین بڑی جماعتیں تھیں :

(۱) مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ء)

(۲) انجمن ترقی اردو (۱۹۰۳ء)

(۳) مسلم لیگ (۱۹۰۶ء)

ان میں بنیادی ادارہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس تھا ، ابتداً قومی سطح کے مسائل پر مسلمانوں نے اسی کے سالانہ جلسوں میں غور و فکر کیا ، جب مسائل پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہونے لگے اور کانفرنس پر کام کا بوجھ بہت ہو گیا تو ہر مسئلے کے حل کے لئے الگ الگ اداروں کے قیام کا سوال پیدا ہوا۔ ہندی اور اردو کے قضیے میں حکومت کی کھلی ہوئی نا انصافی ، ہندو اکثریت کی جارحیت اور ہندی پرچارنی سبھا بنارس کی بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے نتیجے میں "۱۹۰۳ء میں انجمن ترقی اردو قائم ہوئی اور اردو کی ترقی و ترویج اور حفاظت کا کام اس کے سپرد ہوا۔" کانگریس کی سیاسی زیادتیوں اور چیرہ دستیوں سے نبٹنے کے لئے "مسلم لیگ" وجود میں آئی اور تعلیمی ترقی کے سلسلے کی ذمہ داریاں بدستور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پورا کرتی رہی لیکن ان اداروں یعنی کانفرنس، مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو میں جو رشتہ اتحاد پہلے دن قائم ہو گیا تھا وہ آخر تک برقرار رہا۔ بہت دنوں تک مسلم لیگ اور کانفرنس کے سالانہ جلسے ساتھ ساتھ ہوتے رہے اور انجمن ترقی اردو جیسا کہ ابھی کہا گیا کانفرنس کی ذیلی شاخ کی حیثیت ھی سے بہت دنوں تک کام کرتی رہی۔

سچ یہ ہے کہ اردو ، ہندی تنازع میں اردو کی اہمیت اور قومی زبان کی حیثیت سے اس کو اپنانے کا احساس مسلمانوں میں اول اول مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی معرفت میں پیدا ہوا ، صرف یوپی ، دھلی یا بہار کے مسلمانوں میں نہیں ، برصغیر کے ہر صوبے کے مسلمانوں نے جداگانہ قومیت کے ساتھ ساتھ ایک قومی زبان کی ضرورت محسوس کی ، ہندی کے حامیوں اور اردو کے خلاف حکومت کے رویوں نے خاص طور پر انہیں چونکا دیا۔

چنانچہ فارسی کے ختم ہو جانے کے بعد ان کی توجہ اردو پر مرکوز ہو گئی۔ اردو ایک ترقی یافتہ زبان تھی فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی تھی، برصغیر کے مسلمانوں کی تہذیبی زندگی اور ثقافتی ورثے کی ترجمان تھی اور باہم تبادلۂ خیال کا وسیلہ ہونے کے سبب سب میں مقبول تھی۔ اس لئے ہر صوبے کے مسلمانوں نے اردو کو باہمی افہام و تفہیم کی غرض سے اپنا لینے اور پورے برصغیر کی مشترکہ زبان (لینگوافرینکا) منوانے پر زور دیا۔

۱۸۹۹ء کے سالانہ اجلاس میں جسٹس سید امیر علی نے کہا:

”یہ امر جس کو میں ضروری سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ اردو زبان کو بنگال اور بمبئی کے اسکولوں میں بطور اختیاری زبان کے رہنا چاہئے۔“ ۵

۱۹۰۸ء میں کانفرنس کا جو اجلاس امرتسر میں زیر صدارت نواب سلیم اللہ خان منعقد ہوا اس میں رسالہ ”مخزن“ کے مدیر سر شیخ عبدالقادر نے پنجاب سے متعلق اردو کے بارے میں حسب ذیل تجویز پیش کی:

”اس کانفرنس کی رائے میں، اردو صوبہ پنجاب میں تعلیمی اغراض کے لئے بالعموم اور ابتدائی تعلیم کے لئے بالخصوص نہایت مناسب اور موزوں زبان ہے اور بہ حیثیت زبان درسی جو مرتبہ اسے مدارس میں حاصل ہے، اسے قائم رکھنا ترقی کے لئے ضروری ہے۔“ ٦

یہ ریزولیوشن نتیجہ تھا، اس شور و غوغا کا، جو پنجاب کے ہندوؤں خصوصاً آریہ سماجیوں نے اس زمانے میں اردو کے خلاف برپا کر رکھا تھا اور جس کا مقصد اردو کی جگہ ہندی کو ناگری رسم الخط میں رائج کروانا تھا۔ اسی اجلاس میں سر محمد شفیع نے ایک اور تجویز

۵۔ خطبات عالیہ، جلد اول، مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ، ۱۹۲۷ء، ص ۱۴۱۔

٦۔ علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص ۲۳

پیش کی :

”یہ کانفرنس ڈاکٹر پی - سی چٹرجی سی - آئی - ای کی اس تجویز سے جو انھوں نے حال میں پنجاب یونیورسٹی کے جلسہ کانووکیشن میں پیش کی ہے کہ زبان پنجابی کا کورس صوبے میں بجائے اردو کے رواج دیا جائے ، اختلاف کرتی ہے اور اس تجویز کو بلحاظ قلت لغات پنجابی و اختلاف محاورہ نا ممکن العمل اور اس صوبے کے حق میں سخت مضر سمجھتی ہے - “ ۷

کلکتہ کے ایک اور اجلاس میں مولوی محمد اسمعیل حاجی برہان کی تجویز پر اور فضل رحیم کی تائید سے یہ تجویز منظور ہوئی :

”یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ جن طلبہ کی مادری زبان اردو نہیں ہے ، ان کے لئے بطور سیکنڈ لینگوئج صوبہ بنگال و بمبئی میں اردو کو لینگوئج کی فہرست میں شامل کیا جائے - “ ۸

غرض کہ جن صوبوں کی عام زبان اردو نہ تھی، وہاں اردو کو مقبول بنانے میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس برابر کوشاں رہی - لیکن ان باتوں کے علاوہ ایک اور بڑا فائدہ اردو کو مسلم کانفرنس سے پہنچا - چونکہ اس کے جلسوں کی ساری کارروائی اردو میں ہوتی تھی یعنی تجاویز ، خطبات، سرکلر ، نظمیں سب اردو میں پڑھی جاتی تھیں اور بعد کو تبادلۂ خیال بھی اردو میں ہوتا تھا اور چونکہ تبادلۂ خیال کے لئے جو مسائل و مباحث پیش ہوتے تھے وہ ٹھوس علمی و ثقافتی اور تعلیمی و سیاسی موضوعات سے متعلق ہوتے تھے اس لئے اردو نثر کا دامن اظہار خیال کے لئے وسیع سے وسیع تر اور وقیع سے وقیع تر ہوتا رہا - نیز کانفرنس کی کوششوں سے برصغیر کے مختلف علاقوں میں

۷ - علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں ، ص ۲۴

۸ - خطبات عالیہ ، حصہ اول ، مرتبہ انوار احمد زبیری ، ۱۹۲۷ء ، ص ۲ تا ص ۱۸

مسلمانوں کے لئے بہت سے مدرسے قائم کئے گئے ، اخبار جاری ہوئے اور مختلف صوبوں میں اردو کی ترقی اور رواج کی راہیں ہموار ہو گئیں ۔ ۹

انجمن ترقی اردو کی الگ حیثیت قائم ہو جانے اور مسلم لیگ کے وجود میں آنے کے بعد یہ ضرور ہوا کہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی زیادہ توجہ اپنے اصل کام یعنی مسلمانوں میں تعلیمی ترقی کی طرف مبذول رہی لیکن چونکہ کانفرنس کے بنیادی کاموں میں تعلیم کی ہر سطح پر اور ہر جگہ اردو کو ترقی دینے اس کو ذریعہ تدریس بنانے اور اس کے علمی و ادبی معیار کو بلند کرنے کی ذمہ داریاں بھی شامل تھیں اس لئے کانفرنس کا کوئی عمل اور کوئی اقدام اردو کے دفاع اور اشاعت کی کوششوں سے خالی نہ تھا ، البتہ اردو کی لسانی اور تاریخی حیثیتوں کو متعین کرنے ، اس کے علمی و ادبی ذخیرے میں تیزی سے اضافہ کرنے ، سیاسی نوعیت کی تحریکات و اصلاحات میں اردو کو جائز مقام دلوانے اور اسے اس کے دشمنوں سے بچانے ، نیز عوامی سطح پر ہندی اردو تنازع میں اردو کی وکالت و پیروی کرنے کی بھاری ذمہ داریاں انجمن ترقی اردو کو سونپی گئیں ، جنہیں مولوی عبدالحق نے ۱۹۱۲ء کے بعد بدرجہ اتم پورا کیا ۔ سر سید احمد خاں کی طرح مولوی عبدالحق بھی اردو کے لئے عمر بھر لڑتے رہے ۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اردو ہندی کا جو قضیہ ، سر سید کے زمانے میں اٹھا تھا اور اس کی ابتدائی منزلوں میں سرسید نے جس سرگرمی سے حصہ لیا تھا ، مولوی عبدالحق نے اسی سرگرمی سے اس قضیے کے آخری مرحلوں میں حصہ لیا اور جس مشن کو سر سید نے شروع کیا تھا ، اسے مولوی صاحب نے تکمیل کو پہنچایا ۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس ، اور انجمن ترقی اردو کے ساتھ ساتھ خالص سیاسی سطح پر ، اردو کے مقدمے کی پیروی مسلم لیگ نے اپنے ذمے لی ۔ ۱۹۰۶ء میں جن لوگوں نے مسلم لیگ کی بنا ڈالی تھی اور جو لوگ اس کے پہلے اجلاس میں شریک ہوئے اور شروع شروع میں بڑے ذوق و شوق سے

۹ - حیات جاوید ، ص ۲۶۴

اس کے رکن بنے ، ان میں بیشتر وہ تھے جو مسلم لیگ کے قیام سے پہلے بھی اردو کی حمایت میں پیش پیش رہ چکے تھے اور جنھوں نے اردو کے خلاف ہندو اور انگریز کی متحدہ کوششوں کا مقابلہ کیا تھا، بعد ازاں جب ملک گیر پیمانے پر مسلم لیگ کی تنظیم کی گئی اور اس کی شاخیں مختلف صوبوں اور ضلعوں میں قائم کی گئیں تو ان ضلعی اور صوبائی مسلم لیگ کمیٹیوں کے اولین ارکان میں بہت سے وہی یا ان کے خاندان کے وہ لوگ تھے جو ۱۸۷۳ء میں اردو ڈفینس ایسوسی ایشن ، الہ آباد اور ۱۹۰۰ء میں اردو ڈفینس ایسوسی ایشن ، لکھنؤ میں سرگرم حصہ لے چکے تھے - سی - اے - بیلی نے ہندو مسلم سیاست کی جڑوں کو الہ آباد کے ضلعے میں تلاش کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

Syed Ahmad's Urdu Defence Association of 1873 had a central council composed of seventy-three Allahabad professional men and middling land owners. It claimed Government favour because of the historical importance of the community. This organisation was significant because some of the descendants of the members of the central council of 1873 were associated with the Urdu Defence Association of 1899 and at least fifteen with Allahabad district Muslim League, after 1906.[10]

اردو ڈفینس ایسوسی ایشن ، الہ آباد اور لکھنؤ کا ذکر پچھلے باب میں قدرے تفصیل سے آچکا ہے ، ان کے بعض اجلاسوں کی روئداد اور ابتدائی ممبروں کی فہرست بھی ہماری نظر سے گزری ہے ، ان کے بعض اجزا من و عن تاریخی دستاویز کے طور پر اس کتاب کے آخر میں بطور ضمیمہ بھی دے دئے گئے ہیں ان کے دیکھنے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ابتدائی اجلاسوں اور ان کے ممبروں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ سی - اے بیلی نے جو کچھ لکھا صحیح لکھا ہے - وہ ایک جگہ اور الہ آباد ضلع مسلم لیگ کے ذکر میں قدرے وضاحت سے لکھتا ہے کہ :

۱۰ - دی لوکل روٹس آف انڈین پالٹیکس (الہ آباد ، ۱۸۸۰ء تا ۱۹۲۰ء) ، آکسفورڈ ، ۱۹۷۵ء ، ص ۶۶

"Its antecedents were the Urdu Defence Association of 1873, and 1900. Indeed, with the exception of Abdul Baqi Khan, contractor, and two others, the forbearers of all the thirteen men who appeared as patrons of the local league in 1912, had been members of the central committee of Urdu Defence Association of 1873."[11]

ان باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم لیگ کو مسلمانوں میں مقبول اور ہر دلعزیز بنانے میں ابتداً زیادہ تر انہی لوگوں نے حصہ لیا ہے جو اس سے پہلے اردو کے دفاع میں بھی سامنے رہ چکے تھے - ہونا بھی یہی چاہئے تھا اس لئے کہ مسلمانوں نے مسلم لیگ کے ذریعے سیاسی سطح پر ہندوؤں سے یا آل انڈیا نیشنل کانگریس سے قومیت کے جس مسئلے کو بنیاد بنا کر اختلاف رائے کیا تھا اس میں مسلم قومیت کے ثقافتی و تہذیبی عناصر کو بڑا دخل تھا اور ان عناصر کی ترجمان و محافظ چونکہ عام طور پر اردو زبان تھی اس لئے ضروری تھا کہ برصغیر کے مسلمان اپنی جداگانہ قومیت کو منوانے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے ہر سطح پر اردو کے تحفظ کو اپنے مقاصد کا جزو خاص بناتے - مسلم لیگ نے یہی کیا - سیاسی سطح پر وہ اردو کے سلسلے میں آخر تک لڑتی رہی اور اس مسئلے پر انجمن ترقی اردو اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے اس کا رشتہ اتحاد ایسا استوار رہا کہ اس میں کبھی کمزوری پیدا نہیں ہوئی ، تینوں ادارے اپنی اپنی سطح پر اردو کے لئے جو کچھ بن سکا ، کرتے رہے - چنانچہ ۱۹۰۶ء سے لے کر ۱۹۳۷ء کے کانگریس راج سے قبل تک تیس سال میں ان میں سے ہر ادارے نے غیر معمولی خدمات انجام دیں - ہم ان خدمات کا ذکر کریں گے لیکن مناسب یہ ہوگا کہ پہلے ان سیاسی تبدیلیوں اور ہندوؤں کی ان سیاسی و سماجی سرگرمیوں کا مختصر جائزہ لے لیا جائے جن سے مسلمانوں کا اس عرصے میں سامنا رہا -

انیسویں صدی کے آخری پچاس سال مسلمانوں کے لئے سخت آزمائش و ابتلا کے سال تھے لیکن اس سے یہ ہوا کہ وہ خواب غفلت سے جاگ اٹھے

۱۱ - دی لوکل روٹس آف انڈین پالیٹکس ، ص ۲۲۲

اور بیسویں صدی کے ابتدائی برسوں تک، ان میں قومی حیثیت سے خود کو منظم اور اپنا دفاع آپ کرنے کا شعور پیدا ہو گیا۔ بیسویں صدی کا آغاز بھی میکڈانلڈ کی اردو دشمنی کے سبب مسلمانوں کے لئے بڑا حوصلہ شکن اور صبر آزما تھا پھر بھی دو واقعات ایسے رونما ہوئے جو کسی نہ کسی طور پر ان کی تقویت و خوشی کا باعث ہوئے۔ ایک واقعہ تو وہی بنگال کی تقسیم کا تھا جس کے ذریعے ۱۹۰۵ء میں "مشرقی بنگال" کے نام سے وہاں کے مسلمانوں کو اپنی اکثریت کا ایک صوبہ ہاتھ آیا تھا اور جس کا ذکر پچھلے باب میں آچکا ہے۔ دوسرا اہم واقعہ یہ ہوا کہ مقامی خود مختاری کے اداروں اور صوبائی و مرکزی کونسلوں میں مقامی باشندوں کی نمائندگی کے لئے جداگانہ انتخاب کا جو مطالبہ مسلمانوں کی طرف سے پچھلے کئی برسوں سے کیا جا رہا تھا، اسے ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے تحت برطانوی حکومت نے تسلیم کیا۔۱۲ اس طرح وہ دو قومی نظریہ، جس کا ذکر پہلے پہل سر سید نے ہندی اردو تنازع کے سلسلے میں کیا تھا اور جسے مسلمان اپنی سیاسی حکمت عملی کا بنیادی اصول بنائے ہوئے تھے۔ ہندو مسلم سیاست کی بساط پر کھلی اور ٹھوس حقیقت کی شکل میں سامنے آگیا۔

یہ دونوں واقعات، ہندوؤں کو اور ان کی قومی سیاسی جماعت آل انڈیا انڈین نیشنل کانگریس کو بڑے گراں گذرے اور انہوں نے اسی وقت سے کسی نہ کسی بہانے ان کی مخالفت شروع کر دی، بنگال کی تقسیم اگرچہ مسلمانوں کے مطالبے پر نہیں بلکہ خود انتظامیہ کی ضرورتوں کے تحت عمل میں آئی تھی، لیکن چونکہ اس سے بنگال کے مسلمانوں کو اکثریت کا ایک صوبہ مل جاتا تھا اور اس میں انہیں ہندوؤں کے سیاسی و اقتصادی شکنجوں سے نجات حاصل ہو رہی تھی، اس لئے جمہوری اصولوں کو یکسر نظر انداز کرکے ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی بڑی شد و مد سے مخالفت شروع کر دی۔ مخالفانہ پروپیگنڈے کو موثر اور تیز تر بنانے کے لئے متعدد محاذ قائم کئے گئے۔ جس

۱۲۔ پاکستان موومنٹ ہسٹارک ڈاکومنٹس، جی الانہ، کراچی، ص ۲۴

دن بنگال تقسیم ہوا، اسی دن یعنی ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۵ء کو ہندوؤں نے قومی پیمانے پر غم منایا۔ دو سو پچاس سے زیادہ تعداد میں صرف بنگال میں احتجاجی جلسے ہوئے۔ ہندوؤں نے ماتمی لباس پہنا۔ کاروبار بند رکھا۔ عزم و اتحاد کو مضبوط کرنے کے لئے راکھی بندھن کی رسم ادا کی گئی۔ بی این دت (B.N. Dutt) نے "یوگا منتر" نام کا ایک اخبار نکالا۔ اس میں ہندوؤں کو مذہبی اور سیاسی ہدایات کے لئے مسلسل کالم لکھے گئے اور تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لئے چھ نکاتی پروگرام مرتب کیا گیا۔ ۱۳ ایک ہندو لیڈر مہاراجہ مہندرا چندر نے کہا:

"اس نئے صوبے میں مسلمانوں کی اکثریت ہوگی اور بنگالی ہندو اقلیت میں ہو جائیں گے، ہم اپنے شہر میں اجنبی بن جائیں گے۔ میں اس کے اثرات سے بے حد خائف ہوں اور اپنی قوم کے بارے میں تشویش محسوس کرتا ہوں۔" ۱۴

سریندر ناتھ بنرجی نے کہا:

"ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ہماری توہین کی گئی ہے، ہمیں ذلیل کیا گیا ہے اور فریب سے کام لیا گیا ہے۔ ہم نے یوں محسوس کیا ہے جیسے ہمارا مستقبل خطرے میں پڑ گیا ہے اور بنگالی زبان بولنے والوں کے پندار اور ان کے بڑھتے ہوئے اتحاد کو ضرب لگائی گئی ہے۔" ۱۵

آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ایک سالانہ اجلاس میں تقسیم بنگال کو ہندو قومیت کے حق میں ضرب کاری اور پہلے سے سوچی سمجھی ایک نا معقول اسکیم سے تعبیر کیا گیا، انتہا پسند کانگریسی لیڈروں کی طرف سے تو ایسی

۱۳۔ ٹو نیشن تھیوری، ڈاکٹر شفیق اللہ خان، مرکز شعور و ادب، حیدر آباد دکن، ۱۹۷۳ء، ص ۳۴۲

۱۴۔ ہسٹری آف دی فریڈم موومنٹ، جلد سوم، حصہ دوم، کراچی، ۱۹۶۳ء، بحوالہ حصول پاکستان، ص ۸۰

طعن و تعریض اور بیہودہ گوئی و تحقیر کے ساتھ مسلمانوں پر حملے کئے گئے کہ انصاف پسند ہندو اسکالروں کو بھی یہ کہنا پڑا کہ بنگال کی تقسیم کا واقعہ ہندو ذہنیت اور اس کی بڑھتی ہوئی قومی طاقت کے اظہار و احتجاج کے لئے محض ایک بہانہ تھا۔ ۱۶

اس کے بہانے ہندوؤں نے مسلمانوں کو پھر چرکے لگانا شروع کئے ایک طرف بنگالی مسلمانوں میں یہ کہہ کر پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی گئی کہ بنگال کی تقسیم ان کے قومی اتحاد کے لئے مضر ھے، دوسری طرف اپنی تنظیموں میں اتحاد پیدا کرکے جائز و ناجائز طریقوں سے حکومت پر دباؤ ڈالا گیا اور مسلمانوں کو مختلف طریقوں سے خوف زدہ کیا گیا۔ ایک تحریک ”سودیشی تحریک“ کے نام سے سامنے لائی گئی۔ اس کا مقصد برطانوی مصنوعات و پارچہ جات کا بائیکاٹ کرکے حکومت سے اپنے مطالبات کو منوانا تھا، چنانچہ سودیشی تحریک کے کارکنوں کی طرف سے مانچسٹر چیمبرز آف کامرس کو ایک تار اس مضمون کا دیا گیا کہ:

> ”اگر وہ برطانوی مصنوعات کے لئے برصغیر میں اپنا بازار قائم رکھنا چاھتے ھیں تو انھیں تقسیم بنگال کی تنسیخ میں مدد کرنی چاھئے۔“۱۷

اخبارات میں ایسے مضامین شائع کئے گئے جو مسلمانوں کے لئے بڑے تکلیف دہ اور دل آزار تھے۔ ایسے سوانگ اور ایسے ڈرامے دکھانے کا سلسلہ شروع کیا گیا جن سے مسلمانوں میں خواہ مخواہ کا اشتعال پیدا ھوتا تھا۔

۱۵ - اے نیشن ان دی میکنگ، سریندر ناتھ بنرجی، آکسفورڈ، ۱۹۲۵ء، ص ۱۸۷-۱۸۸

۱۶ - اے سروے آف انڈین ھسٹری، کے ایم پانیکر، دھلی، ۱۹۵۷ء، ص ۲۱۹

۱۷ - مسلم سیپریٹ ازم ان انڈیا اینڈ پاکستان، عبدالحمید، لاھور، ۱۹۶۷ء

بینکم چندر چڑجی کا پرانا ناول جس میں مسلمانوں کے خلاف زھر اگلا گیا ھے اور جس کا ذکر پہلے بھی کسی باب میں آ چکا ھے مسلمانوں کا دل جلانے کے لئے جگہ جگہ پڑھا اور سنایا جاتا اسکول کے چھوٹے بچوں تک کو مسلمانوں کے خلاف ورغلایا جاتا اور ان کے دلوں میں مسلمان دشمنی کا بیج بویا جاتا۔ نراد سی چودھری نے ذاتی مشاھدے اور تجربے کی بنا پر لکھا ھے کہ :

"ھم ابھی پڑھنا بھی نہیں جانتے تھے کہ ھمیں بتلایا جاتا تھا کہ مسلمانوں نے ھم پر حکومت کی تھی اور ھم پر بے حد مظالم ڈھائے تھے۔ انھوں نے اپنے مذھب کو ایک ھاتھ میں تلوار اور ایک ھاتھ میں قرآن لے کر پھیلایا ھے۔ مسلمان حکمرانوں نے ھماری عورتوں کو اغوا کیا، ھمارے مندروں کو منہدم کیا اور ھماری مذھبی عبادت گاھوں کی بے حرمتی کی لیکن ۱۹۰۶ء کے آخر میں مسلمانوں کے خلاف نفرت کی ایک نئی شکل ھمارے سامنے آئی، ھم اپنے بزرگوں سے یہ سننے لگے کہ مسلمان اعلانیہ طور پر تقسیم بنگال کی حمایت کر رھے ھیں اور برطانیہ کے ساتھ ھیں۔ نواب سلیم اللہ خان کو خاص طور تمسخر و استہزاد کا نشانہ بنایا گیا جن کو ھم حقارت سے کانا کہتے تھے۔ ھمارے بزرگ حقارت سے یہ قصہ سناتے تھے کہ جونہی ایک ھندو کے گھر سے نواب پر فائر کیا گیا وہ اپنی جان بچا کر ڈھاکہ بھاگ گیا۔ مسلمانوں کے خلاف نفرت ھمارے دلوں میں گھر کر چکی تھی جس نے ھمارے اور ان کے درمیانی تعلقات کو یکسر ختم کر دیا تھا اور اس کی واضح مثال کشور گنج میں پیش آئی جہاں اسکول کے ھندو طلبہ نے مسلمان طلبہ کے ساتھ بیٹھنے سے انکار کر دیا چنانچہ کلاس کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔"[۱۸]

۱۸۔ دی آٹوبایو گرافی آف این ان نون انڈین، لندن، ۱۹۵۱ء، بحوالہ "حصول پاکستان"، ص ۸۴

سردار علی نے تقسیم بنگال کے سلسلے میں ہندوؤں کے مسلسل احتجاج اور ہنگاموں کے متعلق بہت صحیح لکھا ہے کہ:

"یہ تمام شور و غل جو تقسیم کے خلاف مچایا جا رہا ہے اور یہ تمام محب وطن تحریکیں جو شروع کی گئی ہیں ان کا اس کے سوا کوئی اور مقصد نہیں کہ اس صوبے میں جہاں ہندو اقلیت میں ہیں وہاں ان کی طبقاتی برتری کو بحیثیت ایک جماعت کے برقرار رکھا جائے۔ ان تحریکوں کا مادر وطن سے کوئی تعلق نہیں۔"۱۹

ہندوؤں کے اٹھائے ہوئے اس طوفان کو مشرقی بنگال کے گورنر سر بمپ فیلڈ فلر نے روکنے کی کوشش کی، تو حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے استعفیٰ دینے پر مجبور کر دیا گیا، آخر کار ۱۲ دسمبر ۱۹۱۱ء کو یعنی صرف چھ سال بعد بنگال کی تقسیم کا حکم واپس لے لیا گیا اور ہندوؤں کو دوبارہ پورے بنگال میں وہی برتری حاصل ہو گئی جو اس سے پہلے حاصل تھی۔ بنگالی ہندو اس فیصلے سے اتنے خوش ہوئے کہ جب جارج پنجم اس اعلان کے بعد کلکتہ پہنچے تو بعض اخباروں نے یہاں تک لکھا کہ:

"بادشاہ اور ملکہ کو ہندوؤں کے مقدس دیوتاؤں میں شامل خیال کیا جائے۔"۲۰

تنسیخ تقسیم بنگال کے سلسلے میں ہندوؤں خصوصاً کانگریس کے رویے نے مسلمانان برصغیر کو حد درجہ بد دل کیا۔ ہندوؤں کے ساتھ اتحاد و یگانگت کی جو امید کبھی بندھتی تھی وہ یکسر ختم ہو گئی۔ حکومت نے بے وقت اور بے ضرورت تقسیم بنگال کو کالعدم قرار دے کر مسلمانوں کو بدظن اور مایوس کیا۔ مولانا محمد علی نے اس سلسلے میں کہا کہ:

۱۹۔ انڈیا آف ٹوڈے، بمبئی، ۱۹۰۸ء، بحوالہ حصول پاکستان، ص ۸۱

۲۰۔ انڈیا انڈر منٹو مارلے، ایم این داس، لندن، ۱۹۶۴ء، بحوالہ حصول پاکستان، ص ۸۷

”تاریخ میں بے وفائی اور غداری کی اس سے ذلیل تر مثال ملنا مشکل ہے جس میں وفاداری کا بدلہ نئے حاصل شدہ حقوق کی محرومی سے ملا ہو اور قناعت کی سزا ایک بد ترین جرم سمجھ کر دی گئی ہو۔“۲۱

وقار الملک نے کہا:

”یہ تو نصف النہار کی طرح اب روشن ہے کہ ان واقعات کے بعد جو اس وقت مشاہدے میں آئے ہیں یہ مشورہ دینا کہ مسلمانوں کو گورنمنٹ پر بھروسہ کرنا چاہئے، لا حاصل مشورہ ہے۔ اب زمانہ اس قسم کے مشوروں کا نہیں رہا۔ خدا کے فضل و کرم کے بعد جس پر ہم کو بھروسہ کرنا ہے وہ ہماری قوت بازو ہے اور اس کی نظیر جو ہمارے قابل احترام ابنائے وطن نے پیش کی ہے ہمارے سامنے موجود ہے۔“ ۲۲

نواب سلیم اللہ خان نے ۱۹۱۲ء کے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا:

”ہم مسلمانوں کے لئے تنسیخ کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو اپنی ترقی کے جو مواقع ملے تھے وہ ختم کر دئے گئے اور اس نقصان نے ہم کو بہت رنج پہنچایا ہے اور خاص طور سے اس لئے کہ یہ تبدیلی جو کچھ بھی ہوئی ہم کو نہ تو اس کا وہم و گمان تھا اور نہ ہم کو بتلایا گیا اور نہ ہم سے پوچھا گیا۔ اگر مشرقی بنگال کے مسلمان بھی اسی قسم کی ایک شورش برپا کر دیتے تو بادشاہ معظم کا

۲۱۔ ”سلیکٹڈ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف محمد علی، لاہور، ۱۹۴۴ء، بحوالہ حصول پاکستان، ص ۹۱

۲۲۔ وقار حیات، اکرام اللہ ندوی، مطبوعہ علیگڑھ، ۱۹۲۵ء، ص ۶۹۳

یہ اعلان بے کار ہو جاتا۔" ۲۳

لارڈ منٹو نے جن کے زمانے میں بنگال کو یکسر انتظامی بنیادوں پر تقسیم کیا گیا تھا ایوان زیریں میں اس فیصلے کے خلاف سخت تنقید کرتے ہوئے کہا :

" ہندوستانی ماہرین سیاست میں کسی ایک شخص نے بھی تقسیم بنگال کی تنسیخ کا خیال نہ کیا ہوگا مگر تنسیخ بنگال نے یہ ثابت کر دیا کہ یہ بھی انسانی امکان میں تھا۔" ۲۴

اسی طرح کا رد عمل برصغیر کے سارے مسلمانوں کی طرف سے ہوا۔ بڑی بے چینی اور بد دلی پیدا ہوئی لیکن اس سے دو فائدے ہوئے ایک تو یہ کہ ان پر کانگریس کا بھرم کھل گیا اور وہ سمجھ گئے کہ کانگریس صرف ایسی جمہوریت کی تلاش میں ہے جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہو اور ان کے مفادات کو مسلمانوں کے مفادات پر برتری حاصل رہے۔ دوسرے یہ کہ اب تک مسلمان حکومت پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کر رہے تھے، تقسیم بنگال کی تنسیخ کے بعد ان کی اس روش میں تبدیلی پیدا ہوئی اور انہوں نے حکومت کے رحم و کرم پر جینے کے بجائے اپنے زور بازو سے بھی کام لینا شروع کیا۔

ہندو اور کانگریسی لیڈر ۱۹۰۹ء کی منٹو مارلے اصلاحات سے بھی خوش نہ تھے۔ ان اصلاحات میں جو بات انہیں سب سے زیادہ ناگوار تھی وہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کو تسلیم کرنا تھا۔ چنانچہ اس کی مخالفت میں بھی ہر طرف سے شور برپا کیا گیا، عام ہندوؤں سے لے کر، ہندو سیاسی رہنماؤں اور مفکروں تک نے جداگانہ انتخاب کو نا پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا۔ کے ایم پانیکر نے جداگانہ انتخاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

The institution of separate electorates for the Muslims, was the first expression of the pernicious Two-Nation Theory, which ultimately resulted in the foundation of Pakistan.

۲۳ - تاریخ مسلم لیگ، مرزا اختر حسین، بمبئی، ۱۹۴۰ء، ص ٦٦

۲۴ - سیاست ملیہ، محمد امین زبیری، آگرہ، ۱۹۴۱ء، ص ۸۹ تا ص ۹۱

India took over 40 years to get rid of this vicious system and that too at the cost of a partition."[25]

گاندھی جی نے جداگانہ انتخاب کے بارے میں کہا کہ :

" اس نے ہمیں تباہ کر دیا اگر یہ نہ ہوتا تو اب تک ہمارے مسائل حل ہو جاتے ۔" ۲۶

پنڈت جواہر لال نہرو نے برصغیر کی سیاست میں جداگانہ انتخاب کو سد راہ قرار دیتے ہوئے اس کو ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کے لئے بھی مضر ثابت کرنے کی کوشش کی۔۲۷ کانگریس کے پلیٹ فارم سے تقریروں اور قرار دادوں کی صورت میں بار بار جداگانہ انتخاب کے اصول کو مطعون کیا گیا۔ ۱۹۰۹ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک لگا تار کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں اس کے خلاف تجویزیں منظور کی گئیں ۔ ۲۸ اور اسے جلد سے جلد منسوخ کرانے کی کوشش تیز سے تیز تر کر دی گئیں ۔

اسی دوران یعنی ۱۹۱۳ء میں مچھلی بازار کانپور کی مسجد کا ایک حصہ سڑک چوڑی کرنے کے بہانے حکومت کے حکم سے منہدم کرا دیا گیا ۔ چونکہ یہ اقدام ہندوؤں کے دباؤ سے سڑک پر واقع ایک مندر کو بچانے کے لئے کیا گیا تھا، اس لئے مسلمانوں نے اس کی مزاحمت کی، حکومت نے گولی چلانے کا حکم دے دیا اور بہت سے مسلمان شہید کر دئے گئے ۔ اس واقعہ نے برصغیر کے مسلمانوں کو ہلا کر رکھ دیا ۔ علما، وکلا، سیاسی رہنما اور صحافی و ادیب سارے مسلمانوں نے اس واقعے کے خلاف احتجاج کیا ۔ حادثے کے زخمیوں کے لئے طبی اور شہیدوں کے ورثا کے لئے مالی امداد کے

۲۵ - ایشیا اینڈ ویسٹرن ڈامیننس ، لندن ، ۱۹۵۹ء، ص ۱۲۰

۲۶ - کانسٹی ٹیوشنل ہسٹری آف انڈیا، وی ڈی مہاجن، دھلی، ۱۹۶۲ء، ص ۷۲

۲۷ - دی ڈس کوری آف انڈیا ، ص ۳۰۶ تا ۳۰۷

۲۸ - ٹو نیشن تھیوری ، ص ۷۵

انتظامات کئے گئے ۔ مسلم لیگ کی طرف سے مولانا محمد علی اور سید وزیر حسن اس معاملے کو پارلیمنٹ کے ارکان تک پہنچانے کے لئے انگلستان گئے ۔۲۹ لیکن کسی بات کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا ۔ بجز اس کے کہ حکومت کی مسلمان دشمنی کے سبب مسلمانوں کے دل میں نفرت کے جذبات زیادہ گہرے ہو گئے ۔ بقول سر رضا علی اس واقعہ سے مسلمانوں پر ثابت ہو گیا کہ حکومت صرف یہی نہیں کہ :

"ان کے ساتھ نا انصافی کرتی ہے بلکہ انہیں دوسری قوموں کے سامنے ذلیل و خوار بھی کرنا چاہتی ہے ۔"۳۰

مولانا شبلی نے حادثہ کانپور سے متاثر ہو کر متعدد قطعات اور نظمیں کہی تھیں ۔۳۱ ان میں سے ذیل کی مختصر نظم جس کے بعض اشعار اور مصرعے ضرب المثل بن چکے ہیں ، واقعات کی منظر کشی اور اثر پذیری کے لحاظ سے بڑی دل دوز ہے اور ہماری ملی شاعری کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گی :

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں

کچھ طفل خوردہ سال ہیں جو چپ ہیں خود مگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں

آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں

کچھ نوجواں ہیں بے خبر نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحب عقل و شعور ہیں

۲۹ - پاکستان ناگزیر تھا ، ص ۶۳

۳۰ - اعمال نامہ ، دھلی ، ۱۹۴۵ء ، ص ۳۰۹

۳۱ - کلیات شبلی (اردو) ، مرتبہ علامہ سلیمان ندوی ، معارف پریس ، اعظم گڑھ ، ۱۹۴۰ء ، ص ۵۶ تا ص ۱۰۶

اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے مگر ہم ضرور ہیں

سینہ پہ ہم نے روک لئے برچھیوں کے وار
از بسکہ مست بادۂ ناز و غرور ہیں

ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناس ذوق دل نا صبور ہیں

کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جوخاک و خون میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں

پوچھا جو میں نے کون ہو تم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں ۳۲

اسی دوران میں جبکہ تقسیم بنگال کی ناگہاں تنسیخ اور حادثۂ کانپور کے صدموں سے مسلمان نڈھال تھے، بیرون ملک بھی بعض ایسے واقعات رونما ہوئے جو حکومت کے خلاف مسلمانوں کی بے اطمینانی و اضطراب کا سبب ہوئے۔ ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی نے طرابلس پر جہاں تیرہ سو سال سے ترکوں کی حکومت قائم تھی، بغیر کسی سبب کے اچانک حملہ کرکے قبضہ کر لیا۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کی ہمدردی میں اٹلی کے سامان کا بائیکاٹ کیا، اخبارات میں کالم اور مضامین لکھے، مالی امداد کے لئے چندہ جمع کیا، ابھی طرابلس کے سلسلے میں ترکی اور اٹلی کی جنگ جاری ہی تھی کہ ۱۹۱۲ء میں بلقان کی ریاستوں نے متحد ہو کر ترکی پر حملہ کر دیا، مقصد یہ تھا کہ ترکی اور اسلام کو یورپ کی سر زمین سے بالکل خارج کر دیا جائے۔ ترکی پر یہ حملے یورپین ریاستوں اور برطانیہ کی ساز باز سے ہوئے تھے اس لئے ترکی کے خلاف حکوست کا یہ اقدام مسلمانوں کی ناراضگی کا سبب ہوا۔ اس موقع پر بھی برصغیر کے مسلمانوں نے ترکوں کی ہمدردی اور برطانیہ کے رویے کے خلاف آواز

۳۲ - کلیات شبلی، ص ۸۰

بلند کی۔ مولانا شوکت علی نے مولانا عبدالباری کے تعاون سے ۱۹۱۳ء میں "خدام کعبہ" کے نام سے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی ، جس کا حقیقی مقصد یہ تھا کہ "اسلام کے اماکن مقدسہ ، مکہ مدینہ اور بیت المقدس کو غیر مسلموں کے ھاتھوں میں جانے سے بچائے اور اگر ایسا موقع آجائے تو اس مقصد کے حصول کے لئے ھر طرح کی قربانیاں پیش کرنے کے عزم صمیم پر مسلمانوں کو متحد کرے۔"۳۴

۱۹۱۴ء میں برطانیہ اور جرمنی کے درمیان پہلی عالمگیر جنگ چھڑ گئی جس میں ترکی باقاعدہ جرمنی کا حلیف بن گیا۔۳۵ گویا بالواسطہ برطانیہ اور ترکی کے درمیان بھی جنگ کا آغاز ھو گیا۔ اس سے مسلمانان برصغیر بڑے اضطراب میں مبتلا ھو گئے۔ اس موقع پر لندن ٹائمز نے "ترکوں کی پسند" کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا اور اس میں ترکی کو حد درجہ توھین آمیز لہجے میں جنگ سے الگ رھنے کا مشورہ دیا اس کے جواب میں "کامریڈ" کے ایڈیٹر مولانا محمد علی جوھر نے اسی عنوان سے ایک بھرپور مقالہ لکھا اور ترکوں کو اپنے موقف میں حق بجانب بتایا،۳۶ اس پر مولانا جوھر کو گرفتار کر لیا گیا۔ دوسرے مسلمان رھنماؤں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا۔ مسلمانوں کے اھم اخبارات مثلاً کامریڈ ، ھمدرد ، زمیندار ، الہلال اور البلاغ سب بند کر دئے گئے۔ اس تشدد کا نتیجہ یہ ھوا کہ مسلمان ، انگریزوں سے متنفر ھوتے گئے اور اس طرح خود بخود ھزار اختلاف کے باوجود ھندو اور مسلمان کے درمیان اتحاد کی راہ ھموار ھو گئی اگرچہ یہ اتحاد دیرپا ثابت نہ ھوا۔ ۱۹۱۵ء میں بمقام بمبئی کانگریس اور مسلم لیگ کے اجلاس منعقد ھوئے اور آئندہ برصغیر کی آزادی کے لئے مل کر کام کرنے کی تجویزیں طلب کی گئیں۔ نومبر ۱۹۱۶ء میں ان تجویزوں کو کلکتہ میں آخری شکل

۳۳ - پاکستان ناگزیر تھا ، ص ۶۱

۳۴ - برعظیم پاک و ھند کی ملت اسلامیہ ، ص ۳۰

۳۵ - پاکستان ناگزیر تھا ، ص ۶۳

۳۶ - برعظیم پاک و ھند کی ملت اسلامیہ ، ص ۶۳

دی گئی اور دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ نے اپنے اپنے سالانہ اجلاسوں منعقدہ لکھنؤ میں ان تجویزوں کو اتفاق رائے سے منظور کر لیا۔ یہی معاہدہ تحریک پاکستان کی تاریخ میں ''میثاق لکھنؤ'' یا ''لکھنؤ پیکٹ'' کے نام سے مشہور ہے اس معاہدے کی دو دفعات مسلمانوں کے نقطہ نظر سے بہت اہم تھیں:

الف۔ مرکزی اسمبلی کے منتخب ممبروں میں ایک تہائی ارکان مسلمان ہونگے۔

ب ۔ ممبروں کا انتخاب جداگانہ انتخاب کے اصول پر ہوگا اور مسلمان اپنے نمائندوں کا انتخاب خود کریں گے۔

ان میں آخری دفعہ کی اہمیت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ حکومت نے اگرچہ جداگانہ انتخاب کے اصول کو ۱۹۰۹ء میں مان لیا تھا لیکن کانگریس اور ہندو رہنما، برابر اس کی مخالفت کر رہے تھے۔ برصغیر کی سیاسی تاریخ کا یہ پہلا موقع تھا کہ کانگریس نے بھی ''میثاق لکھنؤ'' کے ذریعے مسلمانوں کے اس پرانے مطالبے کو تسلیم کرلیا۔ یہ مسلمان کی سیاسی جد وجہد کی دوسری بڑی کامیابی تھی۔

میثاق لکھنؤ کے بعد ہندو اور مسلمان کی کوششوں سے برصغیر کے مطالبۂ آزادی میں تازہ جان پیدا ہو گئی۔ جنگ عظیم کے موقع پر، مقامی باشندوں نے اس وعدے پر برطانیہ کے ساتھ تعاون کیا تھا اور اس کی فوجی مہمات میں حصہ لیا تھا کہ جنگ کے بعد اہل ہند کو حق خود اختیاری دینے میں تامل نہ کیا جائے گا، لیکن لڑائی میں جرمنی کی شکست کے بعد حکومت کی نظریں بدل گئیں، آئینی اصلاحات جاری کرنے کی تجویزیں، پارلیمنٹ میں ضرور پیش ہوئیں اور جون ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمس فورڈ اصلاحات یا ''قانون حکومت ہند'' کے نام سے انہیں جاری بھی کر دیا گیا لیکن جو مراعات دی گئی تھیں وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی توقعات سے بہت کم تھیں، اس لئے ان سے عوام میں حکومت کا اعتماد کیا بحال ہوتا، الٹا بد دلی اور نفرت میں

اضافہ ہو گیا۔ اصلاحات کے نفاذ سے چند روز پہلے، حکومت کا ایک اور بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا اور یہ باشندگان برصغیر کے لئے جون ۱۹۱۹ء کی اصلاحات سے بھی زیادہ نفرت انگیز ثابت ہوا۔ یہ بدنام زمانہ بل ''رولٹ ایکٹ'' کے نام سے جاری ہوا۔ یہ ایک طرح کا ڈفینس ایکٹ تھا اور اس کا مقصد بظاہر برصغیر میں برطانیہ کے خلاف خفیہ سازشوں کا پتہ لگانا اور بغاوتوں کا سد باب کرنا تھا لیکن حقیقت میں اس ایکٹ کے بہانے، اہل ہند کو ان سرگرمیوں کی سزا دینا تھا جو انہوں نے جنگ عظیم کے درمیان روا رکھی تھیں اور جن سے مجبور ہو کر حکومت نے ان سے حق خود اختیاری اور دوسری مراعات کا وعدہ کیا تھا۔ چونکہ رولٹ ایکٹ اور ۱۹۱۹ء کی اصلاحات تقریباً ساتھ ساتھ سامنے آئیں اس لئے حکومت کے خلاف نفرت و بے اعتمادی کے جذبات کو بھڑکانے کے باب میں دو آتشہ ثابت ہوئیں۔ ہندو اور مسلمان اس موقع پر متحد تھے ہی، ہر طرف سے احتجاج و بغاوت کے نعرے بلند ہونے لگے۔ اس سلسلے کا سب سے دل دوز اور سنگین واقعہ امرتسر میں رونما ہوا۔ پنجاب کے دو مشہور لیڈر ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور ڈاکٹر ستیہ پال کو رولٹ ایکٹ کے خلاف ہونے والے ہنگاموں کے بہانے گرفتار کر لیا گیا۔۳۷ عوام نے اس کے خلاف احتجاجی جلسے کئے اور جلوس نکالے۔ ایک بڑا اجتماع ۱۳ اپریل ۱۹۱۹ء کو جلیانوالہ باغ میں ہوا۔ جنرل ڈائر نے ایک فوجی دستے کو نہتے اور بے گناہ مجمع پر گولی چلانے کا حکم دے دیا۔ سینکڑوں آدمی مارے گئے، ہزاروں زخمی ہوئے، بے شمار آدمیوں کو بغاوت کے جرم میں سزائیں دی گئیں اور طرح طرح کی جسمانی و روحانی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ پورا پنجاب جلیانوالہ باغ کے واقعات کے زیر اثر مشتعل ہو گیا اور مارشل لا کے تحت وہاں کے مسلمانوں پر ایسے مظالم ڈھائے گئے کہ ہلاکو اور چنگیز خان کی بربریت کو مات کر گئے۔

انہیں ایام میں ترکی خلافت کو بحال کرانے اور مسلمانوں کے مقدس مقامات کو بے حرمتی سے بچانے کے لئے خلافت کمیٹی قائم کی گئی۔ خلافت کمیٹی

۳۷۔ حصول پاکستان، پروفیسر احمد سعید، لاہور، ۱۹۷۵ء، ص ۱۳۶

اپنے خاص عہد میں ، مسلم لیگ اور کانگریس سے بھی زیادہ فعال جماعت رہی اور دو سال کی قلیل مدت میں ، ہندو مسلم اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کے سلسلے میں ایسا اہم کردار ادا کیا کہ برطانوی حکومت اسے اپنے حق میں ایک طرح کا خطرہ محسوس کرنے لگی ۔ خلافت کمیٹی کا پہلا اجلاس مولوی فضل الحق کی صدارت میں بمقام دھلی نومبر ۱۹۱۹ء میں ہوا تھا ۔۳۸ اس میں کہا گیا کہ جرمنی اور ترکی کے خلاف برطانیہ کے جشن فتح مندی میں مسلمان اس وقت تک شریک نہیں ہوں گے جب تک ان کے مطالبات تسلیم نہ کر لئے جائیں ۔ چونکہ مسلمانوں کے ساتھ ، اس تحریک میں ہندو بھی شریک ہو گئے تھے اور ترک موالات کے ریزولیوشن کے تحت کانگریس بھی حکومت سے عدم تعاون کر رہی تھی اس لئے خلافت تحریک نے حکومت کو ہلا کر رکھ دیا ۔ اسی زمانے میں برصغیر کے بعض حریت پسندوں مثلاً مولانا عبیداللہ سندھی ، مولانا محمودالحسن شیخ الجامعہ دیو بند ، مولوی برکت اللہ ، شیام جی کرشن ورما ، لالہ ہر دیال اور مہندر پرتاب وغیرہ نے ہندوستان سے باہر جا کر دوسرے ملکوں کی مدد سے ہندوستان کو حکومت برطانیہ کی غلامی سے نجات دلانے کی کوششیں کیں ۔ یہ کوششیں اس وقت تو بظاہر ناکام رہیں تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کوششوں کے نتیجے میں آگے چل کر برصغیر کی آزادی کے لئے راہیں تیزی سے ہموار ہو سکیں ۔ بقول مولانا حسن ریاض :

> "اس تحریک سے برصغیر کے مسلمانوں نے حکومت کے مقابلے میں اپنے دعووں پر اصرار کرنا سیکھا ۔ ان میں سیاسی فکر پیدا ہوئی ۔ ان کے مذہبی تصورات بیدار ہوئے ۔ غیر ممالک کے مسلمانوں کے ساتھ ان کے روابط قائم ہوئے اور بیرونی ممالک میں ان کا وقار بڑھا ۔ اردو زبان ، ہندوستان کے بعید ترین گوشوں میں بولی اور سمجھی جانے لگی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کے مسلمانوں کے درمیان اس سے رشتۂ اخوت استوار ہو گیا ۔"۳۹

۳۸ - پاکستان ناگزیر تھا ، ص ۸۶

۳۹ - پاکستان ناگزیر تھا ، ص ۱۴۳

لیکن ہندو اور مسلمانوں کا یہ اتحاد زیادہ عرصے تک قائم نہ رہ سکا۔ خلافت تو یوں دم توڑنے لگی کہ خود ترکی حکومت نے مصطفیٰ کمال پاشا کی قیادت میں اپنے یہاں سے خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ دوسری طرف تحریک خلافت اور ترک موالات کی تحریکات نے عوام کو اتنا پرجوش بنا دیا تھا کہ موپلوں کی بغاوت اور چورا چوری کا حادثہ رونما ہو گیا۔ موپلے، بمبئی کے ساحلی علاقے مالا بار کے عربی النسل باشندے ہیں۔ خلافت تحریک میں انھوں نے بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا اور جب حکومت نے پکڑ دھکڑ شروع کی تو وہ حکومت کے خلاف نبرد آزمائی کے لئے میدان میں نکل آئے۔ ان کی تعداد بھی تھوڑی تھی اور اسلحہ بھی نہ تھا۔ حکومت نے فوجی کارروائیوں کے ذریعے انھیں کچل کر رکھ دیا۔ ادھر گورکھپور کے ایک موضع چورا چوری کے عوام نے اشتعال میں آ کر ایک پولیس چوکی کو آگ لگا دی اور اس میں کئی سپاہی جل کر خاک ہو گئے۔ ان تشدد آمیز واقعات کی طرف حکومت نے سختی سے توجہ کی اور بے شمار آدمیوں کو مختلف قسم کی سزائیں دی گئیں۔ گاندھی اور کانگریس کے دوسرے رہنماؤں نے ان واقعات کو بہانا بنایا اور انگریزوں کے اشارے پر، ترک موالات و عدم تعاون کی تحریک سے یوں ہاتھ کھینچ لیا کہ حکومت نے بڑی گہری سیاسی چالوں کے ساتھ، ہندو مسلم اتحاد کے زمانے میں برطانیہ کے خلاف ہونے والے ہنگاموں اور واقعات کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال دی اور ہندو زعما نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے حکومت کی ہم نوائی شروع کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہی ہندو جو ہندو مسلم اتحاد کا دم بھرتے تھے اور جن پر اعتماد کر کے، بعض سے مسجدوں میں تقریریں کروائی گئی تھیں، مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے۔

ہندو مسلم اتحاد کی علامت کے طور پر کانگریس اور مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس ۱۹۱۵ء سے ۱۹۲۲ء تک ساتھ ساتھ ہوئے۔۴۰ لیکن اب یہ صورت باقی نہ رہی، کانگریس اور مہا سبھا کے بعض لیڈروں کی انتہا پسندانہ کارروائیوں نے مسلمانوں اور ان کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو اپنی صفوں کو

۴۰۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۷۳ (حاشیہ)

دوبارہ اپنے طور پر منظم کرنے پر مجبور کر دیا ۔ حکومت کی سختیوں کے سبب ، عوام میں برطانوی اقتدار سے نفرت بڑھتی گئی اور ہر سیاسی جماعت کی طرف سے آزادی کا مطالبہ شدت اختیار کرتا گیا ، چنانچہ سیاسی اصلاحات کے مسئلے پر غور کرنے کے لئے حکومت نے سائمن کمیشن قائم کیا چونکہ اس کمیشن میں کوئی مقامی ممبر شامل نہ تھا اس لئے ہر سیاسی جماعت نے اس کا بائیکاٹ کیا ، اس پر برطانوی وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے ، ہندوستانیوں کو یہ دعوت دی کہ حکومت کی جاری کردہ اصلاحات پر ہمیشہ تنقید کرنے کے بجائے وہ خود کوئی دستور بنا کر پیش کریں ۔ اس دعوت کو قبول کر لیا گیا اور مارچ ۱۹۲۸ء میں پہلی آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں طلب کی گئی ، کچھ امور طے پائے اور کچھ پر غور کرنے کے لئے ملتوی شدہ اجلاس ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کو بمبئی میں بلایا گیا ، اس میں مسلمان ممبروں کی مخالفت کے باوجود ، ہندوستان کا آئندہ دستور مرتب کرنے کے لئے پنڈت موتی لال نہرو کی صدارت میں ایک کمیٹی مقرر کر دی گئی ۔ اس کمیٹی کی رپورٹ جو کہ ''نہرو رپورٹ'' کے نام سے مشہور ہے ، جیسے ہی مکمل ہوئی اگست ۱۹۲۸ء میں اس پر غور کرنے کے لئے پھر آل پارٹیز کانفرنس طلب کی گئی ، مسلمانوں کے دونوں اہم رہنما یعنی مولانا محمد علی جوہر اور محمد علی جناح انگلستان میں تھے، پھر بھی مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت نے اس کانفرنس کے مباحث میں حصہ لے کر مسلمانوں کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا ۔ دونوں نے نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کی توقعات کے بالکل برعکس بتایا ۔ بایں ہمہ نہرو رپورٹ من و عن منظور کر لی گئی اور اس کی توثیق کے لئے کلکتے میں آل پارٹیز کنونشن بلایا گیا اس میں مولانا جوہر نے خلافت کمیٹی کے نمائندے اور محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے شرکت کی اور بہت سی ترمیموں کے لئے تجویزیں پیش کیں ، لیکن ایک بھی نہ سنی گئی ۔ دونوں ، نہرو رپورٹ سے حد درجہ مایوس ہوئے ۔ بعد میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں مسلم لیگ ، خلافت کمیٹی، جمیعۃ العلما ہند اور دوسری مسلم جماعتوں کی طرف سے متفقہ طور پر ، نہرو رپورٹ کو مسلمانوں کے مفادات کے خلاف بتایا گیا ۔

نہرو رپورٹ سے مسلمانوں کے اختلاف کا خاص سبب یہ تھا کہ مولانا محمد علی جوہر اور قائد اعظم کی کوششوں سے مختلف مکتبۂ خیال کے مسلمانوں نے اتفاق رائے سے جو چودہ نکات آئندہ آئینی اصلاحات میں شمولیت کے لئے منظور کئے تھے اور جنھیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی ۱۵ مئی ۱۹۲۷ء کے اجلاس (بمبئی) میں تسلیم کر لیا تھا۔ وہ نکات، کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس (دسمبر ۱۹۲۷ء) میں گاندھی جی کے اشارے پر نظر انداز کر دئے گئے اور بعد میں آل پارٹیز کانفرنس اور نہرو رپورٹ میں بھی انہیں لائق توجہ نہیں سمجھا گیا۔ ایسا دو سبب سے ممکن ہو سکا ایک یہ کہ مسلمانوں کی صفوں میں اس وقت سخت انتشار تھا اور ان کی سب سے بڑی سیاسی جماعت مسلم لیگ، خود بھی دو ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی، دوسرے یہ کہ آل انڈیا مہاسبھا، اس وقت تک مضبوط سیاسی جماعت کی حیثیت سے سامنے آگئی تھی اور انڈین نیشنل کانگریس نے مسلم لیگ کے بجائے مہا سبھا کی سیاسی قوت کا سہارا لینا مفید و ضروری خیال کیا تھا۔ ۱۴ لیکن کانگریس اور ہندو مہا سبھا کا یہ گٹھ جوڑ جو ''نہرو رپورٹ'' کی شکل میں سامنے آیا، مسلمانوں کو چونکانے میں مدد گار ثابت ہوا۔ اس رپورٹ پر غور کرنے کے لئے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے مختلف اجلاس پے در پے طلب کئے گئے اور نہرو رپورٹ کو متحدہ طور پر رد کرکے، قائد اعظم کے پیش کردہ چودہ نکات کو تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی لیکن مسلمانوں کے اس متحدہ مطالبے کو ہندو اکثریت اور اس کی نمائندہ کانگریس نے کوئی اہمیت نہ دی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد جو پچھلے چند برسوں میں مثالی صورت اختیار کر گیا تھا ہمیشہ کے لئے پارہ پارہ ہو گیا، کے کے عزیز نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

''خلافت تحریک کے ختم ہوتے ہی ہندوؤں اور مسلمانوں کا مختصر ہنی مون (Honey Moon) ختم ہو گیا اور مخالفت و عناد نے ایک بار

۱۴ - دی آل انڈیا مسلم کانفرنس (۱۹۲۸ تا ۱۹۳۵ء)، مرتبہ کے کے عزیز، نیشنل پبلشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص ۱

پھر سر اٹھایا لیکن اب کے اس میں شدت زیادہ تھی اور دوبارہ یکجا ہونے کے امکانات نہ تھے۔ نہرو رپورٹ نے اس کشیدگی پر مہر لگا دی اور ہندوستان میں امن ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔"۴۲

ادھر کانگریس نے یہ اعلان کیا کہ اگر "نہرو رپورٹ" کو حکومت نے نا منظور کیا تو پورے ملک میں سول نافرمانی شروع کر دی جائے گی، چنانچہ مارچ ۱۹۳۰ء میں گاندھی جی کی قیادت میں اس تحریک کا آغاز ہوگیا، بہت سے سیاسی رہنما جیل گئے اور پورے ملک میں ایک شورش برپا ہو گئی لیکن مسلم لیگ اور اس کے رہنما اس سے الگ تھلگ رہے۔ اب برطانوی حکومت نے سائمن کمیشن کی رپورٹ اور نہرو کمیٹی کی رپورٹ کی روشنی میں کسی تصفیے تک پہنچنے کے لئے نومبر ۱۹۳۰ء میں ایک گول میز کانفرنس طلب کی۔ کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کیا، البتہ دوسری گول میز کانفرنس میں جو کہ ۷ ستمبر ۱۹۳۱ء سے یکم دسمبر ۱۹۳۱ء تک جاری رہی، کانگریس نے شرکت کی۔ لیکن گاندھی جی کی ضد کے سبب یہ گول میز کانفرنس بھی نتیجے کے اعتبار سے ناکام رہی، اب حکومت نے اپنے طور پر اگست ۱۹۳۲ء کو "کمیونل ایوارڈ" کے نام سے ایک آئینی اصلاحی ڈھانچے کا اعلان کر دیا۔ اس میں مسلمانوں کے پرانے مطالبے "جداگانہ انتخاب" کو برقرار رکھا گیا اور جن صوبوں میں مسلمان یا ہندو اقلیت میں تھے وہاں وہاں انہیں ویٹیج کے تحت زیادہ نمائندگی دے دی گئی اس پر بھی کانگریس کی طرف سے شور غوغا بلند ہوا۔ گاندھی جی نے مرن برت رکھا، آخر کار نومبر ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس بلائی گئی، کانگریس نے اس میں بھی شرکت نہ کی تو حکومت نے تینوں کانفرنسوں کی سفارشات پر مبنی جولائی ۱۹۳۵ء میں ایک آئین جاری کر دیا جو "ایکٹ آف ۱۹۳۵ء" کے نام سے مشہور ہوا۔

اس ایکٹ میں چونکہ گورنر جنرل اور صوبائی گورنروں کو لامحدود اختیارات حاصل تھے۔ اور مرکزی و صوبائی قانون ساز اسمبلیوں کو ان کے

۴۲۔ برٹین اینڈ مسلم انڈیا، لندن، بحوالہ حصول پاکستان، ص ۱۸۰

رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا تھا اس لئے کوئی سیاسی جماعت اس ایکٹ سے خوش نہ تھی لیکن ہندو مسلم اختلاف نے ایسی شدت اختیار کر لی تھی کہ حکومت اس سے پورا فائدہ اٹھا رہی تھی اور زیادہ لچکنے کو تیار نہ تھی اس لئے چار و ناچار اسے قبول کرنا پڑا۔ مارچ ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہوئے، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے حصہ لیا۔ مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی، ہندوؤں میں اکثریتی قوت کا نشہ پہلے کیا کم تھا اور زیادہ ہو گیا۔ پنڈت نہرو نے اعلان کیا کہ:

”ہندوستان میں صرف دو جماعتیں ہیں ایک کانگریس، دوسری برطانوی حکومت۔“

اس کے جواب میں قائد اعظم نے کہا:

”ایک تیسری جماعت بھی ہے اور وہ مسلمان ہیں۔“ ۴۳

لیکن طاقت کے غرور نے اس تیسری جماعت کو درخور اعتنا نہیں جانا۔ کانگریس کسی صوبے میں بھی جہاں اس کی اکثریت تھی مخلوط وزارت بنانے پر رضا مند نہیں ہوئی نتیجتاً ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں جولائی ۱۹۳۷ء میں ان کی من مانی حکومت قائم ہو گئی اور سوا دو سال کے قریب یعنی اکتوبر ۱۹۳۹ء تک قائم رہی۔ یہ سوا دو سال برصغیر کی ہندو مسلم سیاست کی تاریخ میں کانگریس راج کے نام سے مشہور ہیں اور اپنے اثرات و نتائج کے اعتبار سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں ان کا تفصیلی ذکر آئندہ باب میں آئے گا۔

اب تک جن اہم واقعات کا مختصراً ذکر کیا گیا، ان کا تعلق عام طور پر حکومت کے آئینی اقدامات اور اہل ہند پر ان کے رد عمل سے تھا۔ ہندو اور مسلمانوں کے باہمی تعلق کے حوالے سے ۱۹۱۸ء اور ۱۹۲۲ء کے درمیانی چار سال اگرچہ تاریخ میں یادگار رہیں گے لیکن سچ یہ ہے کہ جن بنیادوں

۴۳ - برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء، محمد الیاس فارانی، ادارہ مطبوعات پاکستان، ۱۹۶۸ء، ص ۱۷۹

پر یہ رشتہ اتحاد قائم کیا گیا تھا وہ اصلاً بہت کمزور تھا۔ کانگریس نے وقتی مصلحتوں اور بعض مجبوریوں کے تحت خلافت تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا لیکن ان کے سیاسی عزائم مسلمانوں کے خلاف وہی رہے جو پہلے دن تھے۔ ایک طرف کانگریس خود آئینی مسائل کی بحثوں میں ہمیشہ مسلمانوں کے حقوق و مفادات کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتی رہی ، دوسری طرف جس سال مسلمانوں کی سیاسی جماعت ''مسلم لیگ'' قائم ہوئی ، اسی سال ''ہندو مہا سبھا'' کے نام سے اس کے مقابلے میں ایک اور ہندو سیاسی جماعت منظر عام پر آ گئی۔ ۱۹۰۶ء میں یعنی مسلم لیگ کے قیام اور اس کی سرگرمیوں کے دوش بدوش ، ''ہندو مہاسبھا'' کو زبردست پروپیگنڈے کے ساتھ بروئے کار لانے کا خاص مقصد تھا۔ مسلمان شروع ہی سے ''کانگریس'' کو صرف ہندوؤں کی نمائندہ سیاسی جماعت کہتے تھے ، وہ اس بات کو ماننے کو تیار نہ تھے کہ کانگریس مسلمانوں کی بھی نمائندہ ہے۔ اس کے برعکس کانگریس اس بات کی مدعی تھی کہ وہ ایک ملک گیر قومی جماعت ہے اور مذہبی عقاید و ثقافتی اقدار سے قطع نظر برصغیر کے سارے باشندوں کی نمائندہ ہے چنانچہ جب ''مسلم لیگ'' قائم ہوئی تو ہندوؤں نے لفظ ''مسلم'' کی آڑ لے کر اسے فرقہ وارانہ جماعت سے موسوم کیا اور ''ہندو مہا سبھا'' کو جنم دے کر یہ باور کرانے کی کوشش کی گئی کہ ''مسلم لیگ'' بھی ''ہندو مہا سبھا'' کے طرز کی ایک فرقہ وارانہ جماعت ہے۔ حالانکہ ہندو مہا سبھا کوئی نئی جماعت نہ تھی۔ ''مہا منڈل'' کے نام سے یہ ۱۹۰۰ء سے قائم تھی۔۴۴ صرف یہ ہوا کہ مسلم لیگ کے قیام کے بعد اس نے اپنے نام میں تبدیلی کر لی تھی اور مسلمانوں کے خلاف اس کی سرگرمیاں زیادہ شدید اور تیز ہو گئی تھیں۔

''ہندو مہا سبھا'' نے کھلم کھلا اس بات کا اعلان کرنا شروع کر دیا کہ برصغیر صرف ہندوؤں کے لئے ہے۔ آزادی ملنے پر یہاں صرف ہندوؤں کی حکومت قائم کی جائے گی اور قومی زبان ہندی ہوگی۔ حقیقت میں یہی عزائم

۴۴۔ تاریخ نظریہ پاکستان۔ ص ۱۳۶-۱۳۷

کانگریس کے تھے - اپنی سیاسی حکمت عملی کے لحاظ سے ہندو مہاسبھا ، کانگریس سے مختلف نہ تھی ، کئی ہندو لیڈر کانگریس اور مہاسبھا دونوں کے سرگرم رکن تھے - پنڈت مدن موہن مالویہ جنہیں کانگریس میں امتیازی مقام حاصل تھا مہاسبھا کے بانیوں میں تھے - ابتداً ان ہی کی کوششوں سے مہاسبھا کو سیاسی و سماجی مسائل میں اہمیت حاصل ہوئی - سر بی سی چڑ جی ، لالہ لال چند ، لالہ لاجپت رائے ، پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے کئی کانگریسی رہنما اس کے معاونوں میں تھے ، خود گاندھی جی نے اس کی ایک شاخ ”بھارت ورشیہ ہندو سبھا“ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ہردوار میں جس کی صدارت مدن موہن مالویہ نے کی تھی شرکت کی - ۳۵ مالویہ جی مسلمانوں کے متعلق کس قسم کی رائے رکھتے تھے اس کا اندازہ اس بیان سے کیا جا سکتا ہے کہ :

”میں یورپین اور مسلمانوں پر چماروں کو ترجیح دیتا ہوں اگر مجھے کسی ایسے ملک میں جانے کا اتفاق ہو جہاں اچھوتوں اور مسلمانوں اور یورپینوں کے بغیر اور کوئی نہ ہو تو میں یورپین اور اور مسلمانوں کے ہاتھ کا پانی پینے کے بجائے چماروں اور اچھوتوں کا پانی پینا پسند کروں گا کیونکہ اچھوت میرے دھرم بھائی ہیں -“۳۶

پنڈت مدن موہن مالویہ کے ساتھ دوسرے اہم مہا سبھائی لیڈروں نے بار بار اس طرح کے بیانات شائع کئے کہ :

”جب تک ہندوؤں کو فوجی تربیت دے کر ہندو راج نہ قائم کیا جائے گا اور سرحد و افغانستان کے علاقوں کو فتح کرکے وہاں کے مسلمانوں کو ہندو نہ بنالیا جائے گا ، ہندوؤں کا مستقبل تاریک رہے

۳۵ - روزنامہ ملاپ ، بابت ۵ اگست ۱۹۲۵ء ، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان ، ص ۱۴۷

۳۶ - روزنامہ ملاپ ، بابت ۱۹ مارچ ۱۹۲۶ء ، بحوالہ تاریخ نظریۂ پاکستان ، ص ۱۴۷

گا ۔ مسلمانوں کو اسی صورت میں یہاں رہنے کی اجازت دی جا سکتی ھے کہ وہ ہندوانی نام اختیار کریں ہندوؤں کی مذہبی تقریبوں میں شرکت کریں ، ہندوؤں کے قومی ترانے گائیں، ہندوانی لباس پہنیں ، ان کی رسومات کو اپنائیں اور خود کو مسلمان کہلوانا چھوڑ دیں ۔ اس کے باوجود اگر وہ اپنے مذہبی عقاید پر قائم رہنا چاھیں تو انہیں اپنے طریقہ پر عبادت کرنے کی اجازت دی جا سکتی ھے لیکن انہیں "محمدی" ہندو کہا جائے گا ۔"[۴۷]

ہندو مہاسبھا اور کانگریس کا اصل روپ ، تحریک خلافت اور ترک موالات کی ناکامی کے بعد دیکھنے میں آیا ، لالہ لاجپت رائے اور پنڈت مدن موھن مالویہ نے مسلمانوں کے خلاف اشتعال و نفرت کو از سر نو ہوا دی ، ڈاکٹر مونجے اور شردھانند نے مسلمانوں کو مشتعل و مضطرب کرنے کے لئے ہر قسم کا حربہ استعمال کیا ۔ تقریر ، تحریر اور احتجاجی مظاھرے اور فسادات ۱۹۲۴ء کے بعد آئے دن کا معمول بن گئے ۔ بات یہ ھے کہ اس سے پہلے تک ہندو مہاسبھا عملاً ایک مذہبی جماعت تھی ۔ ۱۹۲۴ء میں اس نے اپنے دائرہ عمل میں سیاست کو بھی داخل کر لیا اور ۱۹۲۶ء میں کانگریس کے بعض امیدواروں کو انتخاب میں شکست دے کر ہندوؤں کی سب سے زیادہ طاقتور جماعت بن گئی تھی ۔ کانگریس کے کئی بڑے لیڈر پہلے ھی اس کے مددگار تھے انتخاب میں کامیابیوں کے بعد کانگریس بھی مارے خوف کے اس کی گود میں آ گری اور دونوں کی حکمت عملی میں کوئی فرق نہ رہا ۔[۴۸]

مرہٹوں کے رہنما ڈاکٹر مونجے نے ۱۹۲۲ء میں سنگھٹن کے نام سے مسلمانوں کے خلاف ایک تحریک چلائی ۔[۴۹] اس کا مقصد یہ تھا کہ

۴۷ ۔ تحریک آزادی، صلاح الدین ناسک، عزیز بک ڈپو، لاھور، ۱۹۷۲ء، ص ۳۲۹

۴۸ ۔ تحریک پاکستان ، صاحبزادہ عبدالرسول ، ایم آر برادرز، لاھور ، ۱۹۷۲ء، ص ۱۵۰

۴۹ ۔ برعظیم پاک و ھند کی ملت اسلامیہ ، ص ۳۶۳

ہندوؤں کو اچھی طرح منظم کرکے ایک طاقتور قوم بنا دیا جائے۔ ظاہر یہ کیا جاتا تھا کہ یہ تحریک انگریزوں کے خلاف کام کر رہی ہے لیکن حقیقت میں ایسا نہیں تھا، بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس تنظیم نے جس لائحۂ عمل کی پیروی کی اس کو دیکھ کر ذہن میں ذرہ بھر شبہ باقی نہیں رہ سکتا کہ یہ تحریک مسلمانوں کے خلاف نہ تھی۔ ہندوؤں کو ایسے اسلحہ کے استعمال کی تربیت دی گئی جو مسلمانوں کے خلاف فسادات میں ہر وقت کام آسکتے تھے۔ مثلاً لاٹھیاں، اینٹوں کے ٹکڑے اور بنوٹ، اس کے ساتھ ساتھ مسلم دکانداروں، دست کاروں اور کاریگروں کا معاشی مقاطعہ شروع کر دیا گیا۔۵۰ شہروں میں ہر جگہ کلب قائم کئے گئے جن میں جسمانی ورزش کا اہتمام ہوتا۔ نوجوانوں کو لاٹھی اور خنجر کے استعمال کی مشق کرائی جاتی۔ مسلمانوں کے خلاف بڑا مکروہ پروپیگنڈا کیا جاتا، انہیں بدنام کرنے کے لئے ان کی تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا جاتا۔ انہیں جرائم پیشہ اور ظالم قوم بتایا جاتا۔ گؤ رکھشا کو ہندوؤں کا مذہبی فریضہ بتا کر ہندوؤں کو مسلمانوں کے قتل و غارت پر آمادہ کیا جاتا۔ سنگھٹن تحریک کے سربراہ ڈاکٹر مونجے برملا کہتے کہ :

"جس طرح انگلستان انگریزوں کا، فرانس فرانسیسیوں کا اور جرمن جرمنیوں کا ہے، اسی طرح ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے۔"۵۱

سنگھٹن کے ساتھ ساتھ ایک اور ہندو تحریک "شدھی" کے نام سے قائم کی گئی، اس کے بانی بنارس کے ایک ہندو اور پولیس کے رٹائرڈ تھانیدار سوامی شردھا نند تھے۔ یہ وہی شردھا نند ہیں جنہیں رولٹ ایکٹ کے خلاف احتجاج کے وقت مسلمان اپنے کاندھوں پر دہلی کی جامع مسجد میں لے گئے تھے

۵۰۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۶۳

۵۱۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، بحوالہ تحریک پاکستان، ص ۱۴۸

اور ان سے منبر پر تقریر کروائی تھی ۔ ۵۲

"شدھی" کا مطلب نو مسلموں کو ہندو بنانا تھا، چنانچہ اس کام کو آگرے کے نواحی علاقے "ملکانہ" سے شروع کیا گیا ۔ "شدھی" تحریک کے ترجمان روزنامہ پرتاب نے اپنی ۱۰ جنوری ۱۹۲۷ء کی اشاعت میں لکھا :

"اس ملک میں حکومت کی بنیاد تعداد پر ہے ۔ شدھی ہندوؤں کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ بن گئی ہے ۔ مسلم قوم کی تعداد بڑھ کر سات کروڑ ہو چکی ہے ۔ سات کروڑ مسلمانوں کی وجہ سے بائیس کروڑ ہندوؤں کا جینا دوبھر ہو گیا ہے ۔ اگر ان کی تعداد مزید بڑھ گئی تو خدا ہی جانتا ہے کیا ہوگا ۔" ۵۳

ہندو مہا سبھا اور آریہ سماجی نقطۂ نظر کے ترجمانی کرنے والے اخبارات ارجن دہلی (ہندی)، تیج ، دہلی ۔ ملاپ ، لاہور اور پرتاب، لاہور میں اس طرح کے بیانات اور خبریں برابر شائع ہوتی تھیں اکثر بیانات شردھا نند اور بعض دوسرے لیڈروں کے دستخط کے ساتھ شائع ہوتے تھے ۔ ہردیال نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا کہ :

"ہندوستان کی ہندو نسل اور پنجاب کا مستقبل ان چار ستونوں پر قائم ہے :

۱ ۔ ہندو سنگھٹن

۲ ۔ ہندو راج

۳ ۔ مسلمانوں کی شدھی

۴ ۔ افغانستان اور سرحد کے علاقے کی فتح اور شدھی ۔

جب تک یہ چار چیزیں حاصل نہیں ہو جاتیں ہندوؤں کی آئندہ

۵۲ ۔ (الف) مارشل لا سے مارشل لا تک ، ص ۴۸

(ب) برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ ، ص ۳۶۵

۵۳ ۔ ہسٹری آف فریڈم موومنٹ ، بحوالہ تحریک پاکستان ، ص ۱۴۸

نسل خطرے میں رہے گی۔۵۴

چونکہ شدھی تحریک کے بانی شردھانند نے آنحضرت کی شان میں گستاخیاں شروع کر دی تھیں اس لئے عبدالرشید نامی ایک مسلمان نے مشتعل ہو کر انہیں قتل کر دیا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے ان کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا تھا :

”ان کی تصویر میری آنکھوں کے سامنے رہتی ہے اور میرے دل میں گھر کر چکی ہے۔“ ۵۵

اسی دوران میں لاہور کے ایک آریہ سماجی پروفیسر نے ”رنگیلا رسول“ کے نام سے ایک کتاب لکھی اور اس میں حضور کی ذات مبارک پر رکیک حملے کئے۔ یہ کتاب راج پال نامی ناشر نے شائع کی تھی اس لئے اس کے خلاف مقدمہ دائر کیا گیا لیکن ہندوؤں کے زیر اثر عدالت نے اسے بری کر دیا، نتیجتاً اسے بھی علم الدین نامی ایک مسلمان نے جذبات سے مغلوب ہو کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

اس طرح کے اور نہ جانے کتنے واقعات ہیں جو ۱۹۰۶ء اور ۱۹۳۵ء کے درمیانی عرصے میں مسلمانوں کی دل آزاری کا سبب بنے۔ ہندوؤں نے اکثریت کے زعم میں جگہ جگہ مسلمانوں پر حملے کئے، گئو رکھشا کے بہانے مسلمانوں کے گھروں کو لوٹا۔ آگ لگائی اور ان کے خون سے ہولیاں کھیلیں۔ ہندوستان کے طول و عرض میں فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، تاریخی شہادتوں کے مطابق پہلا ہندو مسلم بلوہ ۱۹۰۹ء میں بنارس میں ہوا تھا۔۵۶ اس وقت سے یہ سلسلہ کسی نہ کسی طور پر جاری رہا۔ ۱۹۱۷ء میں بہار کے اضلاع اور شاہ آباد کے اندر مسلمانوں پر عام اجتماعی حملے ہوئے۔ ۱۹۱۸ء میں

۵۴۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ص ۳۶۴ (حاشیہ)

۵۵۔ میری کہانی، حصہ اول، ص ۲۷۲

۵۶۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۶۳

ہردوار میں کئی مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ ۱۹۲۱ء میں موپلوں کی بغاوت کو بہانا بنا کر امرتسر، سہارنپور اور مالا بار کے علاقوں کے مسلمانوں کو لوٹا مارا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں ملتان میں فساد ہوا۔ ۱۹۲۴ء میں ایک سنگین واقعہ کوہاٹ میں ہوا، جس میں مسلمانوں کو شدید جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ ۱۹۲۶ء میں چھتیس بلوے مختلف جگہوں پر ہوئے۔ پھر یہ تعداد سال بہ سال بڑھتی گئی۔ ۱۹۲۹ء میں بمبئی میں سخت قسم کا فساد اور ۱۹۳۱ء میں کانپور میں ہنگامہ ہوا اور کئی دن تک جاری رہا۔ ان ہی فسادات کے دوران ۱۹۲۶ء میں ہندوؤں کی خفیہ جنگ جو جماعت راشٹریہ سیوک سنگھ کے نام سے وجود میں آئی، اس میں اسکول اور کالجوں کے طلبہ کو ممبر بنایا جاتا تھا اور وقت آنے پر مسلمانوں کے خلاف لڑنے اور ان پر حملہ کرنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ یہ جماعت پہلے زمین دوز رہ کر اپنا کام کرتی رہی، قیام پاکستان سے کچھ دنوں پہلے اچانک کھلے عام مسلمانوں سے برسر پیکار ہوئی اور اس کی سرگرمیوں کے سبب مسلمانوں کا بڑا کشت و خون ہوا۔ ان واقعات نے ایسی فضا پیدا کر دی کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان سیاسی مفاہمت کی کوئی صورت باقی نہ رہی اور ان کے موقف ہمیشہ کے لئے ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو گئے۔

شدھی اور سنگھٹن کی سرگرمیوں کا دفاع مسلمانوں نے "تبلیغ" اور "تنظیم" کے ذریعے کیا۔ تحریک "تبلیغ" کا صدر دفتر انبالہ میں تھا اور اس کے سکریٹری اور پرجوش کارکن اردو کے مشہور شاعر و ادیب غلام بھیک نیرنگ تھے۔ جن علاقوں میں شدھی کا زور ہوتا تھا وہاں "تبلیغ" کی طرف سے بحث و مناظرہ کے لئے مسلمان مبلغ بھیجے جاتے تھے۔ مولانا الیاس اس میں بہت کامیاب تھے۔۵۹ "تنظیم" کے بانی امرتسر کے مشہور مسلمان رہنما

۵۷۔ پاکستان اینڈ دی پارٹیشن آف انڈیا، بی آر امبیدکر، بمبئی، ۱۹۴۷ء، ص ۱۵۲

۵۸۔ برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۶۶

۵۹۔ تحریک پاکستان، ص ۱۵۰

ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے اور اس کا آغاز انھوں نے ۱۹۲۳ء کے اوائل میں کیا تھا۔ تنظیم کی تحریک " تبلیغ " کے مقابلے میں زیادہ فعال تھی اور اسے مسلم سیاسی جماعتوں خصوصاً مسلم لیگ کی حمایت بھی حاصل تھی، مسلم لیگ کا سولھواں اجلاس دسمبر ۱۹۲۳ء میں بمقام بمبئی میں ہوا تھا، اس میں " تنظیم " کے وجود کو ضروری خیال کیا گیا تھا اور ایک قرارداد کے ذریعے اسے منظم کرنے کی مسلمانوں سے درخواست کی گئی تھی۔ ۶۰ سترھویں اجلاس منعقدہ دسمبر ۱۹۲۵ء میں جلسے کے صدر عبدالرحیم نے کہا کہ:

" تنظیم مسلمانوں کو عوامی سطح پر منظم کرنے اور شدھی و سنگھٹن کے حملوں سے انہیں محفوظ کرنے کے لئے بنائی گئی ہے، ڈاکٹر کچلو اس کے بانی ھیں اور اس میں پوری کوشش کر رہے ھیں۔ یہ ایک اھم اور بڑا کام ھے اور مجھے یقین ھے کہ لوگ اس کی مدد کریں گے۔ " ۶۱

سر شیخ عبدالقادر نے بھی مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ دھلی ۱۹۲۶ء میں بہ حیثیت صدر جلسہ " تحریک تنظیم " کے سلسلے میں ڈاکٹر کچلو کی کوششوں کو سراھا۔ ۶۲ ساتھ ھی یہ بھی کہا کہ:

" تنظیم " نے خاطر خواہ ترقی نہیں کی وجہ یہ ھے کہ لوگ نہ تو تربیت یافتہ ھیں اور نہ اس میں زیادہ دلچسپی لے رہے ھیں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں یعنی خلافت، جمعیت اور تنظیم کے کاموں میں باھم مطابقت پیدا ھونی چاھئے اور اپنی رقابتیں اور اختلافات ختم کرنا چاھئیں۔ "

مسلمانوں کی بے حسی کی اصل وجہ یہ تھی کہ ۱۹۲۰ء اور ۱۹۳۰ء کے درمیانی برسوں میں مسلمانان برصغیر کی صفوں میں بڑا انتشار تھا۔ خلافت کمیٹی،

۶۰ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص ۱۹ اور ص ۲۹
۶۱ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص ۶۵
۶۲ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص ۹۱-۹۲

جمیعت العلمائے ھند اور مسلم لیگ سب میں اختلاف رائے تھا ، جماعت کے اندر جماعتیں بنی ہوئی تھیں ، کانگریسی مسلمان ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنائے ہوئے تھے اور کوئی جماعت ہندوؤں کی ناراضگی مول لینے کو تیار نہ تھی - صرف مسلم لیگ کا ایک گروہ تبلیغ و تنظیم کا حامی تھا اور ان ھی کے سہارے یہ تحریکیں تھوڑا بہت کام کر رہی تھیں- جیسے جیسے مسلمان منظم ہوتے گئے ، " تنظیم " بھی جاندار ہوتی گئی - ۱۹۳۰ء میں " تنظیم " کی کارکردگی کی ایک رپورٹ متعلقہ جولائی ۱۹۳۰ء تا دسمبر ۱۹۳۰ء شائع ہوئی تھی - اس کے دیکھنے سے پتہ چلتا ھے کہ اس سال " انجمن تنظیم " خاصی متحرک رھی اور اس کو از سر نو منظم و مرتب کیا گیا تھا ، حاجی سید محمد حسین بیرسٹر ، " مجلس تنظیم صوبہ متحدہ " کے صدر تھے اور ان ھی نے آل انڈیا مجلس تنظیم کانفرنس منعقدہ الہ آباد ، کی روئداد مجلس عاملہ کی منظوری کے بعد سبحان اللہ پریس ، الہ آباد سے چھپوا کر ، باھتمام شاہ حفیظ عالم شائع کی تھی - اس روئداد کا مطالعہ یہ بھی بتاتا ھے کہ مجلس تنظیم ضلع الہ آباد کے صدر مولانا ولایت حسین تھے ، صوبائی مجلس تنظیم کے سکریٹری بیرسٹر ظہور احمد اور آل انڈیا مجلس تنظیم کانفرنس کے صدر صوبہ سندھ کے سیٹھ حاجی عبداللہ ھارون تھے - شیخ ذوالفقار اللہ تنظیم کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر تھے اور غضنفر اللہ خان ، خازن تھے - ۲۹-۳۰-۳۱ دسمبر ۱۹۳۰ء کو تنظیم کی ایک آل انڈیا کانفرنس زیر صدارت حاجی عبداللہ ھارون منعقد ہوئی تھی اور اس میں پنجاب ، بہار ، ممالک متوسط ، بمبئی اور یوپی کے بہت سے نمائندوں نے شرکت کی تھی -۶۳ تنظیم کو زیادہ موثر بنانے کے لئے ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے " تنظیم " کے نام ایک

۶۳ - رپورٹ کارکردگی تحریک تنظیم ، از ابتدا ماہ جولائی ۱۹۳۰ء ، دسمبر ۱۹۳۰ء ، مع مختصر روئیداد ، سبحان اللہ پریس ، الہ آباد ، ۱۹۳۰ء ، مخزونہ کتب خانہ ، آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، کراچی ، ص ۱ تا ص ۲۴

اخبار بھی جاری کیا تھا۔۶۴ ان کوششوں کے باوجود بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، مسلمان چونکہ اس وقت آپس ھی میں الجھ رہے تھے اور ھندوؤں کے مقابلے میں ان کے وسائل بھی بہت کمزور تھے اس لئے ان جوابی تحریکوں کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ھوئی۔۶۵

ابھی جن آئینی اصلاحات، فرقہ وارانہ فسادات اور سیاسی تبدیلیوں کا ذکر مختصراً کیا گیا ھے ان کا پس منظر، ھندی اردو تنازع سے خالی نہ تھا۔ بیسویں صدی کا آغاز اردو پر ھندی کی فتح مندی سے ھوا تھا۔ سی پی، بہار اور یوپی کی عدالتوں اور سرکاری دفتروں میں ناگری اور ھندی کو باریابی حاصل ھو گئی تھی، اور اب ھندوؤں کی کوششیں یہ تھیں کہ ھندی کو پورے برصغیر کی لینگوافرینکا تسلیم کرایا جائے۔ ھندی ساھتیہ سمیلن، الہ آباد، ھندی پرچارنی سبھا، بنارس اور آل انڈیا ھندو مہاسبھا نے کھل کر یہ کام شروع کر دیا تھا۔ کانگریس کے بعض لیڈر مثلاً پنڈت مدن موھن مالویہ تو خیر ھندی کے پرچار کے لئے تیغ بکف نکلے ھی ھوئے تھے اور مذکورہ بالا چاروں جماعتوں کے سرگرم رکن تھے۔۶۶ لیکن دوسرے کانگریسی لیڈروں کا نقطۂ نظر بھی زبان کے سلسلے میں مالویہ جی سے مختلف نہ تھا۔ مالویہ جی کی طرف سے ۱۹۲۱ء کی مردم شماری کے موقع پر یہ کوشش کی گئی کہ زبان کے کالم میں ھندوؤں کے لئے ”ھندی“ اور مسلمانوں کے لئے ”اردو“ لکھا جائے۔ مالویہ جی کا اس کوشش سے در پردہ مقصد یہ تھا کہ:

”ھندی کو سرکاری سطح پر ھندوؤں کی زبان، دوسرے لفظوں میں برصغیر کی اکثریت کی زبان تسلیم کرا لیا جائے۔“

۶۴۔ اے ھسٹری آف دی فریڈم مومنٹ، جلد سوم، حصہ دوم (۱۷۰۷ تا ۱۹۴۷ء) کراچی، ۱۹۶۳ء، ص ۳۶۱

۶۵۔ برعظیم پاک و ھند کی ملت اسلامیہ، ص ۳۶۵

۶۶۔ اسٹڈیز ان اسلامک کلچر ان دی انڈین انوائرنمنٹ، ص ۲۶۱

لیکن یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ لنگوسٹک سروے آف انڈیا کے مصنف ڈاکٹر گریرسن نے جو کہ مردم شماری کمیشن کے چیرمین تھے اس مطالبے کو تسلیم نہ کیا اور ”ہندی“ ”اردو“ کے بجائے زبان کے کالم میں ”ہندوستانی“ کے لفظ کا اندارج کرایا۔ ۶۷

لسانی اور سیاسی جماعتوں کے علاوہ، ہندو مذہب اور قومیت کی دو اصلاحی تحریکیں آریہ سماج اور سناتن دھرم، ہندی کی تبلیغ میں سب سے نمایاں اور جارح کردار ادا کر رہی تھیں، انھوں نے صرف یہی نہیں کہ ہندی کے فروغ کو اپنے مقاصد خاص میں شامل رکھا بلکہ سوامی دیانند سرسوتی نے ”ہندی“ کو ”آریہ بھاشا“ سے موسوم کرکے، اس کی اشاعت و ترقی کو ہندو کا مذہبی فریضہ قرار دے دیا۔۶۸ ہندی ساہتیہ سمیلن نے سالانہ جلسوں کے اہتمام کے علاوہ جگہ جگہ اس کی شاخیں قائم کیں اور پنڈت مدن موھن مالویہ، سمپورنا نند، پرشوتم داس ٹنڈن، کاکا کالیکر، وی ڈی ساورکر، اور ہر دیال جیسے انتہا پسند ہندو قومیت پرست لیڈروں نے، دیو ناگری اور فارسی رسم الخط کی بحثوں سے آگے بڑھ کر ہندی کو پورے ہندوستان کی قومی زبان بنانے کی مہم چلائی۔ کانگریس کے اعتدال پسند لیڈروں میں گاندھی جی، پنڈت جواھر لال نہرو، اور راجندر پرشاد وغیرہ نے بھی اس مسئلے سے گہری دلچسپی کا اظہار کیا لیکن کانگریسی رہنماؤں کی کوششیں، عام طور پر گاندھی جی کے اشاروں اور ان کی لسانی حکمت عملی کی تابع رہیں بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ گاندھی جی، کانگریس اور ہندوؤں کے پہلے بڑے رہنما تھے، جنھوں نے برصغیر کے سیاسی مسائل میں لسانی مسئلے کو بھی اہم خیال کیا اور اس موضوع پر وہ بیسویں صدی کی دوسری دھائی سے لے کر قیام پاکستان تک کچھ نہ کچھ کہتے رہے، سب سے پہلے انھوں نے ۱۹۱۷ء میں گجرات ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے کہا

۶۷ - اے ہسٹری آف دی فریڈم مومنٹ، جلد سوم، حصہ دوم، ص ۳۶۵

۶۸ - ”اردو ہندی ہندوستانی“، سجاد ظہیر، کتب پبلشرز لمیٹڈ، بمبئی، ۱۹۴۷ء، ص ۳۴-۳۵

تھا کہ :

”برصغیر کی قومی زبان بننے کی اہل صرف ہندی ہے اور ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو ناگری اور اردو دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے۔“ ۶۹

۱۹۱۸ء میں ساھتیہ سمیلن کی صدارت کرتے ہوئے بھی انھوں نے اسی موقف کو دھرایا۔ ۷۰ اور ہندی اور اردو کے لئے ایک مشترک نام ”ہندوستانی“ کا استعمال کرنے لگے۔ اس موقف میں ان کے پیش نظر یہ بات تھی کہ ہندی کو ناگری رسم الخط میں کچھ دنوں کے بعد مقبولیت حاصل ہو جائے گی اور وہ اکثریت کی زبان بن جائے گی اور اردو خود بخود اپنی وہ حیثیت کھو بیٹھے گی جو اسے حاصل ہے، چنانچہ گاندھی جی کے اشارے پر ۱۹۲۵ء میں ۷۱ کانگریس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کراچی میں، یہ قرارداد منظور کی گئی کہ آئندہ ہندوستان کی قومی زبان یا لنگوافرینکا، ”ہندوستانی“ ہوگی۔ اور وہ ”ناگری اور فارسی دونوں رسم الخط میں لکھی جائے گی“، کانگریس اور گاندھی جی نے اس قراداد میں بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ نام کی تبدیلی سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان زبان کے مسئلے پر جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور چونکہ اکثریت ناگری کو استعمال کرے گی اس لئے اردو کی برتری بتدریج ختم ہو جائے گی لیکن کانگریس کی اس قرارداد سے نہ ہندو مطمئن ہوئے اور نہ مسلمان۔ مسلمانوں نے اصولی طور پر بات تو مان لی لیکن معروف و مستقل نام ”اردو“ کو ہٹا کر ”ہندوستانی“ کی ایجاد ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی، ان کا خیال تھا کہ یہ غیر ضروری تبدیلی

۶۹۔ ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹگریشن، جی رام ناتھن، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۴

۷۰۔ ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹگریشن، جی رام ناتھن، ۱۹۶۴ء، ص ۱۲۴

۷۱۔ دی پرابلم آف ہندوستانی، ڈاکٹر تارا چند، الہ آباد، ۱۹۴۴ء، ص ۱۵

کسی نہ کسی سیاسی مصلحت کے تحت کی گئی ہے اور یہ خیال غلط نہ تھا لیکن مشکل یہ ہوئی کہ کانگریس کے انتہا پسند ارکان اور ہندوؤں کی دوسری سماجی و مذہبی جماعتیں جو کہ بزعم اکثریت اردو کی جگہ " ہندی " کو بالاعلان اور جلد سے جلد پورے ملک کی قومی زبان بنا دینا چاہتی تھیں ، وہ بھی قرارداد سے خوش نہ ہوئیں ۔ بقول سجاد ظہیر وہ یہ کہتے تھے کہ :

" ہمیں ڈر ہے کہ ہندوستانی کا مبہم نام لے کر ملک پر اردو نہ ٹھونس دی جائے ۔ " ۷۲

نتیجتاً ہندو اور مسلمان دونوں کی طرف سے " ہندوستانی " کے سلسلے میں خدشات کا اظہار کیا گیا اور گاندھی جی سے " ہندوستانی " کی وضاحت چاہی گئی ۔ پہلے تو وہ ادھر ادھر کی باتوں میں لوگوں کو ٹالتے رہے اور زبان کے معنی میں لفظ " ہندوستانی " کی قدامت ثابت کرکے نہ جانے کیا کیا سمجھاتے رہے ۔ اس موضوع پر انہوں نے صرف یہی نہیں کہ جگہ جگہ تقریریں کیں اور اخبارات کو بیان دئے بلکہ " ینگ انڈیا " اور " ہنس " میں لگاتار کئی مضامین بھی لکھے ۔ ان مضامین کو اگست ۱۹۴۲ء میں آنند ٹی ہینگورانی نے کراچی سے " اور لینگوئج پرابلم" کے نام سے شائع کر دیا ہے اس میں پہلا مضمون " کل ہند رسم الخط " کے عنوان سے ہے اور یہ پہلے پہل ۱۴ جولائی ۱۹۲۷ء کے " ینگ انڈیا " میں چھپا تھا ۔۷۳ اس میں گاندھی جی نے جن خیالات کا اظہار کیا ، وہ مختصراً یہ تھے :

"ہندوستان کی ساری زبانوں کے لئے صرف ایک رسم الخط ہونا چاہئے اور اس کے لئے موزوں ترین رسم الخط دیوناگری ہے ، ہندو اور مسلمانوں کا اختلاف یقیناً اس کی راہ میں حائل ہوگا لیکن ناگری کو ہر دل عزیز اور سب کے لئے قابل قبول بنانے تک یہ ضروری ہے کہ ہندوستان میں مروج ساری سنسکرت آمیز زبانوں کو ایک رسم الخط

۷۲ ۔ اردو ہندی ہندوستانی ، ص ۵

۷۳ ۔ اور لینگوئج پرابلم ، ص ۱

میں لکھنے کے لئے لوگوں کو ذہنی طور پر آمادہ کیا جائے۔ ابھی تک بنگالی، پنجابی، سندھی، اڑیا، گجراتی، تلگو، تامل اور مالیالی وغیرہ مختلف حروف میں لکھی جاتی ہیں، اگر یہ سب ایک رسم خط یعنی دیوناگری میں لکھی جائیں تو ہندو انڈیا کے مختلف صوبوں کو ایک دوسرے سے قریب تر لانے میں آسانی ہو جائے گی۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ جو مشترک رسم الخط آسانی سے اپنایا جا سکتا ہو اپنا لیں اور اس کے لئے موزوں ترین دیوناگری ہی ہے۔ یہ کام اگرچہ ہو رہا ہے لیکن رفتار بہت سست ہے، جب تک ہندو اور مسلمانوں کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف بھڑکے ہوئے ہیں، ناگری اوز فارسی رسم الخط دونوں چلتے رہیں گے۔ کچھ دنوں بعد جیسے جیسے ہندو مسلمان ایک دوسرے کے قریب آتے جائیں گے، دونوں رسم الخط خود بخود ایک دوسرے میں ضم ہو کر ایک بن جائیں گے۔ میں نے دیکھا ہے کہ اس قسم کی کوششیں شروع کر دی گئی ہیں، گیتا انجلی، دیوناگری میں چھاپی گئی ہے لیکن اس کام کو وسیع پیمانے پر ہونا چاہئے۔ جو لوگ ہندو مسلم اتحاد پر یقین رکھتے ہیں ان کو چاہئے کہ اس مسئلے پر غور کریں، ہندو اردو سیکھیں اور مسلمان ہندی۔''[۴۷]

اس خلاصے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زبان اور رسم الخط کے سلسلے میں گاندھی جی کا جھکاؤ کس طرف تھا؟ وہ کوئی ایسا نسخہ تلاش کرنا چاہتے تھے جس سے اردو کو ختم کر کے ہندی کو رائج کیا جائے لیکن اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہ ہونے پائے اور وہ کانگریس کے ساتھ متحدہ ہندوستان کی آزادی کا نعرہ لگا کر، ہندوؤں کو اپنی خوشی سے اپنے اوپر آپ مسلط کر لیں۔ لیکن مشکل یہ ہوئی کہ گاندھی جی، اپنی نیت کو بہت دنوں تک لوگوں کی نظروں سے چھپائے نہ رہ سکے۔

۴۷۔ اور لینگوئیج پرابلم، از مہاتما گاندھی، مرتبہ آنند ٹی ہنگورانی، کراچی، ۱۹۴۲ء، ص ۱ تا ص ۳

''ہندی ساہتیہ سمیلن'' نے اپنے ایک اجلاس میں کانگریس کی منظور کردہ قرار داد میں ''ہندوستانی'' کی جگہ ''ہندی ہندوستانی'' کر دیا اور ۱۹۳۵ء میں بمقام اندور، ساہتیہ سمیلن کا جو سالانہ اجلاس خود گاندھی جی کی صدارت میں ہوا اس میں اس کی توثیق کر دی۔ گویا گاندھی جی نے ۱۹۲۵ء میں اردو یا ہندی کے بجائے ''ہندوستانی'' کو اور ۱۹۳۵ء میں ''ہندوستانی'' کے بجائے ''ہندی ہندوستانی'' کو برصغیر کی مشترک زبان قرار دیا۔ یہ تبدیلی معمولی نہ تھی اس نے ہندوؤں کے عزائم اور گاندھی جی کی چالوں کو پوری طرح واضح کر دیا اور اس کے بعد زبان کے مسئلے نے ایسی سنگین صورت اختیار کر لی کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد کا امکان ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر تارا چند نے بہت صحیح لکھا ہے کہ:

"Sammelan unfortunately modified the resolution of the Congress and suggested that Hindi-Hindustani should be lingua franca of India. The decision created a great deal of stir, specially among the nationally minded Muslims, who keenly desired a settlement but were disappointed by the resolution. At Indore the decision of Sahitya Sammelan was confirmed with the result that the communal tangle became much worse. The establishment of the Hindi Parchar Sabha and the intensification of attempts to propagate Sanskritized Hindi, led to a reaction and the Muslim League decided that Urdu should be considered the lingua franca of India."[75]

ہندی ساہتیہ سمیلن اندور کے اجلاس (۱۹۳۵ء) میں کانگریس کی قرار داد میں جو رد و بدل ہوا وہ گاندھی جی کے خاص منشا سے ان ہی کی صدارت میں ہوا اور اس پر انہوں نے بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ ۴ مئی ۱۹۳۵ء کے ''ہریجن'' میں انہوں نے لکھا:

"The Hindi Sahitya Sammelan, recently held at Indore passed some useful resolutions. Among them was one, giving a definition of Hindi and other expressing the opinion that all the languages that had descended from or had been largely influenced by Sanskirt should be written in Dewnagri script.

۷۵- دی پرابلم آف ہندوستانی، ص ۱۶

The authorized script of the Sammelan 'still remains Dewnagri'. The propagation of the Dewanagri script among Hindus of the Punjab, as elsewhere, will still continue. The resolution in no way detracts from the value of Dewnagri script."[76]

ہندی ساھتیہ سمیلن ، اندور کے جلسے میں جو تجویزیں' ہندی اور ناگری کے سلسلے میں منظور کی گئی تھیں ان پر تبصرہ کرتے ہوئے مولوی عبدالحق لکھتے ھیں :

"انڈین نیشنل کانگریس نے یہ قرار داد منظور کی تھی کہ ھندوستان کی زبان ھندوستانی ھوگی، خواہ وہ ناگری حروف میں ھو یا فارسی حروف میں، یہ فیصلہ معقول تھا، لیکن ان صاحبوں کے اطمینان کے لئے کافی نہ تھا جن کا منشا کچھ اور تھا ، انھوں نے اس ریزولیوشن کو وقعت نہ دی اور دوسری ادھیڑ بن میں لگ گئے ۔ ان کی کوششوں کا نتیجہ اپریل ۱۹۳۵ء میں ظہور میں آیا یعنی ھندی سمیلن کا سالانہ جلسہ اندور میں منعقد ھوا جس کی صدارت مہاتما گاندھی نے فرمائی ۔ اسی جلسے میں بالاتفاق یہ قرار داد منظور ھوئی :

"ھندوستان کے ان ادیبوں میں جو اپنے صوبوں کی زبان میں کام کر رہے ھیں ، ارتباط پیدا کرنے کی غرض سے نیز ھندی زبان کے ارتقا میں ان کا اتحاد حاصل کرنے کی غرض سے یہ کانفرنس اصحاب ذیل کی ایک کمیٹی قائم کرتی ھے ۔"

چنانچہ اس کمیٹی نے فوراً کام شروع کر دیا اور ماھانہ ھندی رسالہ "ھنس" اس ادارے کے تحت آگیا ، یہ ادارہ "بھارت ساھتیہ پریشد" کے نام سے مشہور ھے (یعنی انجمن ادب ھند) اور "ھنس" اب اس کا رسالہ ھے ۔ منشی پریم چندر کے ساتھ گجراتی زبان کے مورخ و ادیب مسٹر کنھیا لال منشی اس کی اڈیٹری میں شریک ھو گئے ۔ مہاتما گاندھی جی اس تحریک کے دینی باپ

۷۶ ۔ اور لینگوئج پرابلم ، ص ۳

اور مسٹر کنہیا لال اس کے روح رواں ہیں ۔۷۷

گویا ، ہندی ساہتیہ سمیلن کے تعاون سے بلکہ اس کی نگرانی میں گاندھی جی نے ہندی کے فروغ کے لئے ایک اور نئی انجمن ''بھارت ساہتیہ پریشد،، کے نام سے قائم کر دی ۔ اس انجمن کا مقصد یہ تھا کہ برصغیر کے ہر علاقے کے ادیبوں کو اس کا ممبر بنایا جائے اور انھیں یکجا کر کے ، ان قرار دادوں کی توثیق کرالی جائے جو ہندی کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں ہندی ساہتیہ سمیلن نے منظور کی تھیں ، چنانچہ اس کام کے لئے ۲۴-۲۵ اپریل ۱۹۳۶ء کو ناگپور میں ایک اجلاس بلایا گیا اور ہر زبان کے ادیبوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی گئی ، جلسہ جس نیت اور جس غرض سے بلایا گیا تھا ، اس اعتبار سے اس میں مدعو کئے جانے والے اور شرکت کرنے والے عموماً وہی لوگ تھے جو زبان کے مسئلے میں ، ہندی ساہتیہ سمیلن اور ''بھارت ساہتیہ پریشد،، کے ہم خیال تھے، پھر بھی اس میں اردو کے متعدد ادیبوں نے شرکت کی جن میں انجمن ترقی اردو کے مولوی عبدالحق خصوصیت سے قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے اس کی بحثوں میں پورا حصہ لیا اور اردو والوں کی نمائندگی کا حق ادا کر دیا ۔

اجلاس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کاکا کالیکر نے ''بھارت ساہتیہ پریشد،، کا پس منظر و مقصد بیان کرتے ہوئے کہا کہ اس انجمن کا خیال پہلے پہل ۱۹۱۹ء میں مہاراشٹ ساہتیہ سمیلن منعقدہ بڑودہ میں پیدا ہوا تھا ۔ کراچی میں کانگریس کے اجلاس کے موقع پر بھی مسٹر کنہیا لال منشی سے اس مسئلے پر میری بات ہوئی تھی ۔ پچھلے سال جب اندور میں ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس مہاتما گاندھی کی صدارت میں ہوا تو ایک مفصل تجویز اس کے متعلق منظور کی گئی جسے عمل میں لانے کے لئے کنہیا لال منشی ، ہری ہر شرما اور گردھا شرما کی ایک کمیٹی بنائی گئی ، اس انجمن کے دو خاص مقصد قرار پائے :

۷۷ - خطبات عبدالحق ، ص ۵۱-۵۲

۱ - هندوستان کے سب پرانتوں کی بھاشاؤں کے ساھتیوں (ادبوں) اور ساھتکاروں (ادیبوں) میں آپس میں میل کرنا اور اس نام سے بھارتیہ ساھتیوں کی ترقی اور پھیلاؤ میں مددگار ہونا۔

۲ - اس سبھا کا کام، ہندی ہندوستانی میں ہوا کرے گا۔"۷۸

مولوی عبد الحق کے بیان کے مطابق بھارتیہ ساھتیہ پریشد کا پہلا اجلاس، ۲۴ اپریل ۱۹۳۶ء صبح دس بجے شروع ہوا، کاکا کالیکر کے استقبالیہ خطبہ کے بعد صدر انجمن مہاتما گاندھی کا مطبوعہ ایڈریس حاضرین میں تقسیم کر دیا گیا اور گاندھی جی نے اس سے الگ زبانی تقریر کی۔ تقریر کے بعد زیادہ تر بحث دوسرے ریزولیوشن کے الفاظ، "ہندی یعنی ہندوستانی" پر ہوئی، جب ان سے یہ پوچھا گیا کہ کانگریس کے ریزولیوشن میں تو قومی زبان کو صرف "ہندوستانی" سے موسوم کیا گیا تھا، اب اسے "ہندی ہندوستانی" کہا جا رہا ہے تو گاندھی جی نے فرمایا: "کانگریس کا ریزولیوشن بھی میں نے ہی بنایا تھا"، اس پر مولوی عبدالحق نے کہا: "لیکن اس وقت یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ 'ہندوستانی' کے معنی 'ہندی' کے ہیں۔"۷۹ گاندھی جی نے جواب دیا: "اب میں نے اس کے معنی بتا دئے ہیں"۔ جب گاندھی جی سے سوال کیا گیا کہ: "ہندی ہندوستانی سے آپ کا کیا مطلب ہے؟" تو فرمایا: "وہ ہندی جو آگے چل کر ہندوستانی ہونے والی ہے۔"

مولوی عبد الحق نے "بھارتیہ ساھتیہ پریشد" کے اجلاس کی تفصیلی روئداد اسی وقت اپریل ۱۹۳۶ء کے رسالہ "اردو" میں شائع کر دی تھی۔ بعد کو یہ کئی موقر اردو پرچوں میں نقل ہوئی۔۸۰ مناسب یہ ہوگا کہ مختصر ترین

۷۸ - نگار (لکھنؤ)، بابت جولائی ۱۹۳۶ء، ص ۱۰

۷۹ - نگار (لکھنؤ)، بابت جولائی ۱۹۳۶ء، ص ۱۰-۱۱

۸۰ - نگار (لکھنؤ)، بابت جولائی ۱۹۳۶ء میں مولوی عبدالحق کا یہ مضمون شائع ہوا۔

لفظوں میں ، یہ روئداد مولوی عبد الحق کی زبان سے سنتے چلئے :

''سہ پہر کے جلسے میں پھر یہی بحث چھڑی ، اس وقت پنڈت نہرو بھی موجود تھے اور خیال تھا کہ وہ بہ حیثیت صدر کانگریس ، ضرور میری (یعنی کانگریس کی قرارداد) کی تائید کریں گے' لیکن مجھے افسوس اور کسی قدر مایوسی ہوئی کہ انھوں نے ایک لفظ بھی نہ کہا اور خاموش بیٹھے رہے' اور ایک نہیں وہاں اکھٹے تین کانگریس کے صدر موجود تھے (دو سابق اور ایک حال) مگر کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔

اب اس کارروائی پر میں مختصر سا تبصرہ کرنا چاھتا ھوں آپ نے یہ دیکھ لیا کہ ھندوستانی کو ھندی میں اور ھندی کے معنی ھندوستانی بتانے میں ، پھر ''ھندی ھندوستانی'' کے جدید لفظ کی اختراع میں اور آخر میں ''ھندی اتھوا ھندوستانی'' کے الفاظ میں کیسے کیسے پہلو بدلے ھیں ۔ پہلے اردو کا لفظ ترک کرکے ''ھندوستانی'' اختیار کیا گیا تھا ۔ یہاں تک کچھ مضائقہ نہ تھا اور اس پر ھم بھی رضامند تھے اور ھمارے بعض مستند ادیبوں اور اھل الرائے اصحاب نے یہ لفظ لکھنا شروع کر دیا تھا بلکہ ان کا اصرار تھا کہ اب اردو کے بجائے ''ھندوستانی'' لکھا جائے اور اس پر ایک حد تک عمل بھی ھونے لگا تھا ۔ فریقین نے یہ سمجھوتہ تسلیم کر لیا تھا لیکن اب ھندوستانی کا لفظ بھی متروکات میں داخل ھوگیا اور صرف ''ھندی'' رہ گیا ۔

اجلاس کے دوران میں جب کہ زبان کی بحث چھڑی ہوئی تھی مہاتما گاندھی نے ایک ایسی بات کہی جسے سن کر مجھے بے حد تعجب اور افسوس ھوا انھوں نے کہا : ''اردو زبان مسلمانوں کی مذھبی زبان ھے ، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ھے اور مسلمان بادشاھوں نے اسے بنایا ، پھیلایا ۔ مسلمان چاھیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں ۔''

حیرت ہے کہ جس شخص کی صحبت میں مدتوں مولانا محمد علی (جوہر) مرحوم ، مولانا ابوالکلام آزاد اور ڈاکٹر سید محمود جیسے لوگ رہے ہوں اپنی زبان سے ایسی بات نکالے جو سراسر غلط ، بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ میں ہر چند یہ توجیہہ کر کے اپنی تسلی کرنا چاہتا ہوں کہ مہاتما جی نے یہ بات ناواقفیت کی بنا پر کہی لیکن دل نہیں مانتا۔

ایک دن وہ تھا کہ مہاتما گاندھی نے ہندوستانی یعنی اردو زبان اور فارسی حروف میں اپنے دست خاص سے حکیم اجمل خاں کو خط لکھا تھا اور آج یہ وقت آ گیا ہے کہ اردو تو اردو تنہا "ہندوستانی" کا لفظ بھی سننا اور لکھنا پسند نہیں کرتے۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں جو بر سر اجلاس تھی ایک بار نہیں بار بار فرمایا کہ اگر ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھا گیا تو اس کا مطلب اردو سمجھا جائے گا لیکن ان کو نیشنل کانگریس کے ریزولیوشن میں تنہا ہندوستانی کا لفظ رکھتے ہوئے یہ خیال نہ آیا۔

آخر اس تبدیلی ماہیت قلب کی کیا وجہ ہے ، کون سے ایسے نئے اسباب رونما ہوئے ہیں جو اس حیرت انگیز انقلاب کا باعث ہوئے۔ غور کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس تمام تغیر ، تبدل ، توڑ جوڑ اور داؤں پیچ کا باعث ہمارے ملک کا بدنصیب پالیٹکس ہے۔ جب تک مہاتما گاندھی اور ان کے رفقا کو یہ توقع تھی کہ مسلمانوں سے کوئی سیاسی سمجھوتہ ہو جائے گا ، اس وقت تک وہ ہندوستانی ہندوستانی پکارتے رہے ، جو تھپک کر سلانے کے لئے اچھی خاصی لوری تھی لیکن جب انھیں اس کی توقع نہ رہی یا انھوں نے ایسے سمجھوتے کی ضرورت نہ سمجھی تو ریا کی چادر اتار پھینکی اور اصل رنگ میں نظر آنے لگے۔ وہ شوق سے ہندی کا پرچار کریں وہ ہندی نہیں چھوڑ سکتے تو ہم بھی اردو نہیں چھوڑ سکتے۔"[81]

۸۱- نگار (لکھنؤ)، جولائی ۱۹۳۶ء، ص ۹ تا ص ۱۷

''بھارتیہ ساھتیہ پریشد'' کے جلسے میں مولوی عبدالحق کے ساتھ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے بھی شرکت کی تھی اور ''ھندی ھندوستانی'' کی بحث میں حصہ لیتے ہوئے بعض ترمیموں کا مطالبہ کیا تھا لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ ''ھندی ھندوستانی'' کو ناگری میں قومی زبان بنانے اور اسے زندگی کے ہر شعبے میں بروئے کار لانے کی تجویز من مانے طور پر منظور کرلی گئی۔ ہندوؤں کے سارے مذہبی اور سیاسی حلقوں کی طرف سے ان فیصلوں کو سراھا گیا، کاکا کالیکر نے تو جلسے ھی میں اعلان کر دیا کہ ''جن لوگوں نے اس تحریک کی ابتدا کی ھے انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا ھے کہ ھمارا سارا کاروبار راشٹر بھاشا ھندی ھندوستانی میں چلے گا۔ ھماری کوشش ھے کہ تمام ھندوستانی بھاشاؤں کی ابجد ایک ھی ھو اور سب میں ناگری لپی (رسم خط) جاری ھو جائے۔ علاوہ ازیں اس جلسے میں جو فیصلے ہونے والے تھے ان سے کانگریس کے لیڈر اور ممتاز ھندو پہلے ھی سے باخبر تھے۔'' بابو راجندر پرشاد نے ھندی ساھتیہ سمیلن ناگپور کی صدارت کرتے ہوئے پہلے ھی کہہ دیا تھا کہ ''خوشی کی بات ھے کہ اس کمیٹی کی کوشش سے بھارتیہ ساھتیہ پریشد کی بنیاد ڈالی جا رھی ھے اور اس کا پہلا اجلاس اسی ناگپور میں مہاتما گاندھی کی صدارت میں ھو رھا ھے۔ اس کے ذریعے ایک فائدہ یہ ھوگا کہ ھندی کے پرچار کے متعلق لوگوں میں جو غلط فہمی پھیلی ہوئی ھے وہ بھی دور ھو جائے گی اور ھمیں امید ھے کہ ھندی پرچار میں مدد ملے گی۔''[۸۲]

بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے پہلے اجلاس منعقدہ ناگپور کے سلسلے میں جامعہ ملیہ، دھلی کے پروفیسر محمد مجیب کا ایک خط بھی قابل ذکر ھے، یہ طویل خط انگریزی زبان میں، مہاتما گاندھی کے نام تھا اور جلسے میں پنڈت جواھر لال نہرو نے پڑھ کر سنایا تھا۔ اس خط میں اردو، ھندی، ھندوستانی اور رسم الخط کے متعلق بہت اھم سوال اٹھائے گئے تھے اور بڑے مدلل انداز میں لسانی حکمت عملی کی طرف گاندھی جی کی توجہ دلائی گئی تھی لیکن جلسے میں سنی ان سنی کر دی گئی۔ خط کے کسی پہلو اور

۸۲ - نگار (لکھنؤ)، جولائی ۱۹۳۶ء، ص ۱۳

کسی نکتے کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ بعد کو، ۹ مئی ۱۹۳۶ء کے ”ہریجن“ میں ”ہندی یا ہندوستانی“ کے نام سے گاندھی جی کا جو مضمون شائع ہوا ھے، اور جس کا آغاز اس طور پر ہوتا ھے:

"Elsewhere, the reader will find a deeply interesting letter from an esteemed friend which was read to the delegates who recently assembled in Nagpur and who inaugurated the Akhil Bharatya Sahitya Parished."[83]

گاندھی جی نے اپنے مضمون کے بین السطور مجیب صاحب کا پورا خط نقل کر دیا ھے، اس کا ضمنی تذکرہ مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ ”اردو“ اپریل ۱۹۳۶ء میں کیا ھے۔ اس طویل خط میں پروفیسر مجیب نے ہندی، ہندوستانی اور اردو کے اختلاف کی تاریخ کو دھراتے ہوئے اس میں پیچیدگیاں پیدا کرکے ہندو مسلم اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی ساری ذمہ داری کانگریس کے علاوہ پرشوتم داس ٹنڈن، کنھیا لال منشی، رسالہ ”ہنس“ کی زبان اور خود گاندھی جی کی غلط لسانی پالیسی پر ڈالی ھے۔ آخر میں مجیب صاحب نے اس توقع پر کہ گاندھی جی ان کے مطالبات کو مان لیں گے اور عوام میں ان کا اعلان کر دیا جائے گا، بطور خلاصہ ان امور کی طرف اشارات کئے کہ ہندی کے بجائے ہندوستانی کو ملک کی مشترک زبان قرار دیا جائے۔ ہندوستانی کا کسی فرقے کی مذہبی روایات سے کوئی تعلق نہ ہو، لفظ کی صحت و غلط کا معیار دیسی یا بدیسی ہونے پر نہیں بلکہ رواج عام سے قائم کیا جائے، اردو میں اب تک جو الفاظ مستعمل ہیں وہ ”ہندوستانی“ کے الفاظ شمار ہوں، اصطلاح سازی میں سنسکرت کی اصطلاحات کو ترجیح دینے کے بجائے اردو، ہندی اور سنسکرت کے فطری انتخاب کی گنجائش رکھی جائے۔ ہندوستانی، عربی اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جائے اور جن اداروں کو ہندوستانی کی ترقی کا کام سونپا جائے انھیں ہدایت کی جائے کہ دونوں رسم الخط کو سیکھنے کے لئے یکساں سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مجیب صاحب نے اپنے خط میں

۸۳۔ اور لینگوئج پرابلم، ص ٦

ان خطرات کا بھی ذکر کیا جو ان مطالبات کو نظر انداز کرنے سے پیدا ہو سکتے ھیں اور پر زور الفاظ میں گاندھی جی سے ان پر بطور خاص توجہ دینے کی گذارش کی۔ تقریباً ڈھائی ھزار الفاظ پر مشتمل ، اس خط کی آخری چند سطریں دیکھئے کہ اس سے پورے خط کے تیور کو سمجھنے میں آسانی ھو جائے گی۔

"That the Hindi-Urdu question is an imminent danger of becoming a communal issue is evident from the speech of Mr. Purshottamdass Tandon, delivered at the opening ceremony of the Hindi Museum at Benares, in the first week of this month. He declared that next to Chinese, Hindi was the most widely spoken language in Asia. This means, in other words, that the problem of a common language is solved; it is going to be Hindi, because Hindi is spoken by the majority of Indians. Those who clamour for Hindustani can be outnumbered, therefore they cannot matter. But the counting of heads is no more a remedy than breaking of heads. Whatever Mr. Tandon may have really meant, it seems to me that ground is being prepared for another such indignity as the Communal Award.

It is only your prestige and the confidence inspired by your personality that can rescue us. I am giving below a number of points which, in my humble opinion, are rational in themselves and provide a sound basis for a common language. If you consider them and find them worthy, not in your own estimation only but also of the cause they are meant to serve, you may make them known to others. What I am dreaming of just now is that they might become the basis of a public pronouncement by you. The points are:

1. That our common language shall be called 'Hindustani' not 'Hindi.'
2. That Hindustani shall not be considered to have any peculiar association with the religious traditions of any community.
3. That the test of 'foreign' and 'indigenous' shall not be applied to any word, but only the test of currency.

4. That all words used by Hindu writers of Urdu and Muslim writers of Hindi shall be deemed current. This, of course, shall not apply to Urdu and Hindi as sectional languages.
5. That in the choice of technical terms, specially political terminology, no preference be given to Sanskrit terms as such, but as much room as possible be allowed for natural selection from among Urdu, Hindi and Sanskirt terms.
6. That the Dewanagri and the Arabic scripts shall both be considered current and official, and that in all institutions whose policy is directed by the official promoters of Hindustani, facilities shall be provided for learning both scripts.

"There may be friends to whom these suggestions will look like Muslim demands. They are not. But I know that unless an assurance of some such kind is given by you and the Parishad, there can be no question of Muslim literary effort being harnessed in the cause of a common language. So I have submitted these suggestions to you. If they are extravagant, I know you will pardon me, and if they are unjustified, they will not offend you. So far as I am concerned, I have only wanted to do my duty, and to show, by an appeal to you, my unlimited respect for your judgment and my confidence in your deep feeling of justice and tolerance."[84]

گاندھی جی نے اس خط کو ” پریشد “ کے جلسے میں نظر انداز کر دیا تھا۔ بعد کو غور و فکر کے بعد دو قسطوں میں اس کا جواب لکھا، اور ہندی، ہندوستانی کے سلسلے میں ایسی تاویلات بے جا سے کام لیا کہ مسلم لیگ یا انجمن ترقی اردو ہی کو نہیں برصغیر کے سارے مسلمانوں اور انصاف پسند ہندوؤں کو بھی بڑی الجھن میں ڈال دیا۔ دو قوموں کے درمیان نفرت و بد دلی کی جیسی وسیع اور گہری خلیج ان تاویلات سے پیدا ہو گئی، اس سے پہلے نہ تھی بھارتیہ ساہتیہ پریشد میں گاندھی جی کی تقریر کے بعد

۸۴ - اور لینگوئج پرابلم، ص ۱۲ تا ص ۱۳

ہندی ، ہندوؤں کی اور اردو ، مسلمانوں کی زبان قرار پائی اور اس نے اس دو قومی نظرئیے کو تقویت پہنچائی جس کی حمایت مسلمان پچھلی صدی سے کر رہے تھے اور جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے پہلے کی طرح اب بھی جاری تھی ۔ سید ہاشمی فرید آبادی نے بہت صحیح لکھا ہے کہ :

" بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے اجلاس اور گاندھی جی کے پے در پے بیانات کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں میں ایک ہنگامہ بپا ہو گیا ۔ گاندھی جی کے طرز عمل پر سخت نکتہ چینی کی گئی اور اختلافات کی فہرست میں زبان کا قضیہ جلی عنوان بن گیا ۔ " ۸۰

ہمایوں کے مدیر بشیر احمد نے ایک گراں قدر مقالہ اس سلسلے میں لکھا اور ہندی اردو قضیے کا تاریخی جائزہ لے کر اردو کو ترقی دینے کے لئے بعض ٹھوس تجویزیں پیش کیں ، انھوں نے اپنے مقالے میں لکھا :

" اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے ۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اگر ہمارے ملک کی کوئی قومی زبان ہو سکتی ہے تو وہ اردو ہے ۔ یہ ہماری بد قسمتی ہے کہ کچھ مدت سے یہ بحث چھڑ گئی ہے کہ ملک کی قومی زبان کونسی ہو اور واقعات کو مصنوعی طور پر اس طرح ڈھالا جاتا ہے کہ اردو سے اس کا رتبہ چھین کر کسی دوسری زبان کو دے دیا جائے بلکہ ہو سکے تو بتدریج اردو کو مٹانے اور ملیامیٹ کرنے کی تدبیریں عمل میں لائی جائیں ۔

اردو کوئی مسلمانوں کی زبان نہ تھی ۔ مسلمان جب پہلے پہل ہندوستان میں آئے تو ان کی مذہبی زبان عربی اور تمدنی زبان فارسی تھی، رفتہ رفتہ جب ہندوؤں اور مسلمانوں کا میل جول شروع ہوا تو ملک کے مختلف حصوں میں مختلف زبانوں میں عربی ، فارسی کے الفاظ داخل ہونے شروع ہوئے اور اس سلسلے میں اردو وجود میں آئی ۔ جہاں جہاں مسلمان گئے انھوں نے بالعموم فارسی کو

۸۰ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۶۴

درباری اور دفتری زبان قرار دیا لیکن جوں جوں یہاں کے باشندوں سے ان کے تعلقات بڑھے، انھوں نے روزمرہ کے استعمال کے لئے ایک ایسی زبان اختیار کی جس کی بنیاد ہندوانی اور جس کی باقی ساخت کچھ ہندوانی اور کچھ مسلمانی تھی - اس زبان کا رسم الخط فارسی تھا لیکن اس کے قواعد اور اس کے لفظوں کا بیشتر ذخیرہ ہندوستان کی پیداوار تھا - لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اکثر ملکی بھائی اس حقیقت سے روز بروز دور ہوتے جا رہے ہیں اور اس زبان سے جسے انہیں فطری طور پر لگاؤ ہونا چاہئے، مصنوعی طور پر بیگانگی برت رہے ہیں - ہر سچے محب وطن کے لئے یہ امر انتہائی تاسف اور رنج کا باعث ہے -

ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اردو کو چھوڑ کر ہندی کے حلقے میں داخل ہو رہی ہے - مسلمان اس کے جواب میں یہ کر سکتے تھے کہ وہ پھر اپنی تمدنی زبان فارسی کی طرف منہ پھیر لیتے لیکن ایسا کرنا ایک خلاف فطرت مصنوعی فعل ہوتا - وہ بدستور اردو کے حامی رہے اور رہیں گے اگر بعض ہندوؤں کو اس سے انکار ہے کہ اردو ہندوستان کی قومی زبان ہے تو مسلمان اس بات پر اصرار کریں گے کہ اردو کم از کم ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی زبان ضرور ہے -"٨٦

"بھارتیہ ساھتیہ پریشد" کے قیام اور اس کے بعد کانگریس اور مہاسبھا کے رہنماؤں اور عام ہندوؤں نے قومی زبان کے مسئلے پر اپنے رویے میں جو تبدیلی کی اور جو موقف اختیار کیا وہ بظاہر نیا اور اچانک معلوم ہوتا تھا لیکن حقیقتاً ایسا نہیں تھا - جیسا کہ پچھلے ابواب میں جگہ جگہ ذکر آیا ہے ہندوؤں نے در پردہ یہ موقف روز اول سے اختیار کر رکھا تھا - کانگریس صرف اس غرض سے کہ مسلمان کسی طرح دو قومی نظریے، جداگانہ انتخاب اور تقسیم ہند کے مطالبے سے دست بردار ہو جائیں ، ابتداً زبان کے سلسلے میں

٨٦ - نگار (لکھنؤ) ، بابت جون ۱۹۳٦ء، ص ۹ ص ۲۷

"ہندی" کا نام قدرے تکلف سے لیتی تھی، خاص طور پر گاندھی جی اپنی میٹھی باتوں سے بہت سے مسلمانوں کا دل لبھا لیتے تھے لیکن ان کی نیت شروع ہی سے خراب تھی بابو راجندر پرشاد نے اپنی آپ بیتی میں بہ عنوان "ہندی اور کار خدمت" اور "قومی زبان کا سوال" جو کچھ لکھا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہندو مہاسبھا، ہندی پرچارنی سبھا اور ہندی ساہتیہ سمیلن کے انتہا پسند کارکنان بیسویں صدی کے اوائل ہی سے ہندی اور ناگری کو آگے بڑھا کر اردو کو ختم کرنے کے لئے جو کچھ کر رہے تھے، اس میں کانگریس کے نامور لیڈر مثلاً راجندر پرشاد، مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ شریک تھے۔۸۷ لیکن بعض مصلحتوں کی بنا پر یہ کام بہت دنوں تک ڈھکا چھپا کر کیا گیا۔ لیکن جب بیسویں صدی کی تیسری دھائی کے آخر اور چوتھی دھائی کے شروع میں مسلمان اپنے باہمی اختلاف کے سبب سیاسی طور پر کمزور ہو گئے اور ۱۹۳۵ء کے انتخاب میں ہندوؤں کا مستقبل واضح طور پر روشن نظر آنے لگا، تو انھوں نے حکومت اور اکثریتی قوت کے زعم میں آ کر بالاعلان یہ کہہ دیا کہ ہندوستان کی قومی زبان اردو یا ہندوستانی نہیں، ہندی ہندوستانی یعنی ہندی ہوگی۔ مولانا نیاز فتح پوری نے بھارتیہ ساہتیہ پریشد اور اس کے بعد کے واقعات کا تجزیہ کرتے ہوئے جولائی ۱۹۳۶ء کے نگار میں آٹھ صفحے کا ایک پر زور اداریہ لکھا تھا اس میں مہاتما گاندھی اور کانگریس کے رہنماؤں کی لسانی و سیاسی سازش اور مسلمانوں کی غفلت و بے نیازی کا بڑے دکھ کے ساتھ تذکرہ کیا گیا ہے، صرف ایک اقتباس دیکھئے:

"جب ہندی اردو کی نزاع شروع ہوئی اسی وقت سے باہمی مفاہمت کا خیال بھی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوا لیکن اس سلسلہ میں ہندو، مسلمان دونوں کے طریق کار میں زمین و آسمان کا فرق رہا ہے

۸۷۔ "اپنی کہانی"، از راجندر پرشاد، مترجم گوپی ناتھ امن، ساہتیہ اکیڈمی، نئی دھلی، ۱۹۶۱ء، طبع اول، ص ۱۶۱ تا ص ۱۶۲ اور ص ۷۵۷ تا ص ۷۶۶

غالباً یہ کہنا حقیقت سے بعید نہ ہوگا کہ ہندوؤں نے کبھی اپنے حقیقی مقصود کو ظاہر ہونے ہی نہیں دیا اور مسلمان نے جو تدبیریں اختیار کیں وہ سب جہل و لا علمی کی حالت میں حریف کی چال کو سمجھے بغیر اختیار کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو منزل سے قریب تر ہوتے گئے اور مسلمان بجائے آگے بڑھنے کے اور پیچھے ہٹنے لگے۔"

ارباب نظر سے مخفی نہیں کہ اول اول جس وقت اردو کے ساتھ ہندی رسم الخط کا رواج شروع ہوا تو کم از کم صوبہ متحدہ، پنجاب، بہار اور وسط ہند کے بالائی حصہ میں ہر پڑھا لکھا ہندو اردو زبان بولتا تھا اور اردو رسم الخط میں مراسلت کرتا تھا لیکن جونہی قومی تحریکات اور مذہبی عصبیت کے سلسلہ میں ہندی رسم خط کا سوال پیدا ہوا تو ہر چہار طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اردو زبان میں چونکہ فارسی، عربی کے ایسے ثقیل الفاظ بہ کثرت پائے جاتے ہیں جن کا سمجھنا ہندوؤں کے لئے دشوار ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہندی کو رائج کیا جائے جو اس ملک کے باشندوں کی صحیح زبان ہے۔

مسلمانوں کی قوم جس نے سیاسی چالوں کے سمجھنے میں کبھی اپنی دانائی و فراست کا ثبوت پیش نہیں کیا، ہندوؤں کے اس بیان پر ایمان لے آئی اور صرف اس خیال سے کہ اردو سے ہندوؤں کا تعلق باقی رہے، اس نے مصالحت و مفاہمت کی یہ صورت پیدا کرنا چاہی کہ اردو زبان سے عربی، فارسی کے الفاظ نکال کر اس کو زیادہ آسان بنایا جائے۔ گویا اس کے نزدیک اصل نزاع صرف زبان سے متعلق تھی نہ کہ رسم الخط سے اور ہندو چاہتے بھی یہی تھے کہ مسلمان ان کے حقیقی مقصود سے بے خبر رہ کر اپنی تمام تر قوت ایک ضمنی مسئلہ پر صرف کرتے رہیں، چنانچہ مسلمانوں کی مختلف ادبی انجمنوں کی طرف سے یہ صدا بلند ہونے لگی کہ اردو کو عربی، فارسی الفاظ سے پاک کرکے زیادہ آسان و یسیر الفہم بنانا چاہئے اور آج بھی جبکہ یہ حقیقت روز روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ ہندوؤں کا حقیقی مدعا کیا ہے، یہ

کوشش برابر جاری ہے ۔ پھر اگر ہندوؤں کا مقصود واقعی یہی ہوتا کہ وہ اردو زبان کو سہل و آسان دیکھنا چاہتے ہیں تو انہیں اس تحریک کا خیر مقدم کرکے کوئی عملی حصہ اس میں لینا چاہئے تھا ، لیکن انھوں نے مطلق کوئی التفات اس طرف نہیں کیا اور آہستہ آہستہ انھوں نے اردو رسم الخط کو ترک کرکے اس کی زبان و انشا کو بھی بدلنا شروع کیا اور ٹھیک اس وقت جبکہ مسلمان اردو سے عربی ، فارسی کے الفاظ نکالنے کی کوشش میں مصروف تھے ہندوؤں نے سنسکرت کے ثقیل الفاظ استعمال کرنے شروع کر دئے ۔ یہاں تک کہ وہی ہندو جو زبان کی سادگی کا دلدادہ تھا ”لیکن“ اور ”مگر“ ایسے ہلکے اور کثیر الاستعمال الفاظ بھی بھول گیا اور ان کی جگہ اس کو ”پرنتو“ زیادہ سلیس و عام فہم نظر آنے لگا ۔ ہندی کے میگزین جاری ہوئے ، کتابیں تصنیف ہونے لگیں ، سمیلنیں (انجمنیں) قائم ہوئیں ، سبھائیں رچائی گئیں ، یہاں تک کہ ہندی کالجوں کی بنیاد پڑی ، جن میں سے ہر ایک کا مقصد ہندوستان کی قدیم مذہبی سنسکرت کو رائج کرنا ہے ۔ لیکن مسلمان اور احمق مسلمان ہنوز ، یہ آس لگائے ہوئے ہیں کہ ممکن ہے وہ اردو سے عربی و فارسی کے الفاظ نکال کر ہندوؤں کو پھر اردو کی طرف مائل کر سکیں ۔

میں اس سے قبل بھی بارہا اس باب میں اظہار خیال کر چکا ہوں اور اب پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ ہندوؤں کو مخالفت اردو زبان سے نہیں بلکہ اردو رسم خط سے ہے ، چنانچہ اس کا سب سے بڑا ثبوت گاندھی جی کا وہ فقرہ ہے جو ناگپور کی بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے جلسہ میں ان کی زبان سے بے اختیارانہ نکل گیا یعنی یہ کہ :

”اردو زبان مسلمانوں کی مذہبی زبان ہے ، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان بادشاہوں نے اسے بنایا اور پھیلایا ، مسلمان چاہیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں ۔“

یہ ہے وہ اصل ذہنیت جو ابتدا ہی سے ہندوؤں میں کام کر رہی تھی اور جس کا اعلان انھوں نے اس وقت تک صرف اس لئے نہ کیا تھا کہ وہ مسلمانوں

کو قصداً دھوکے میں رکھنا چاہتے تھے اور اس کا اظہار کرکے وہ سیاسی مسائل میں پیچیدگی پیدا کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن اب جبکہ ان دونوں کی سیاسی راہیں بالکل علیحدہ قائم ہو چکی ہیں اور ان کے باہم مل کر کام کرنے کا سوال باقی نہیں رہا، کوئی وجہ نہ تھی کہ گاندھی جی کے دل کا کانٹا زبان پر نہ آتا۔ میں اسے کانٹا اس لئے کہتا ہوں کہ گاندھی جی ایسی شخصیت کے لئے اس سے زیادہ سخت لفظ استعمال کرنا اچھا معلوم نہیں ہوتا، ورنہ ذہنیت کی اس پستی و ذلت کا اظہار اور وہ بھی ایک ایسی ذمہ دار ہستی کی طرف سے، ہر ممکن لعنت و ملامت کا مستحق ہے ــــ بہر حال اب یہ بات بالکل واضح ہو چکی ہے کہ اصل نزاع زبان کی نہیں ہے، رسم خط کی ہے یعنی ہندوؤں کا مطالبہ یہ نہیں ہے کہ زبان کو عام فہم بنایا جائے کیونکہ وہ خود اس کے لئے تیار نہیں ہیں اور اس کے بالکل برعکس اسے اور زیادہ مشکل بناتے جا رہے ہیں بلکہ اصل مدعا یہ ہے کہ وہ رسم خط ان کی نگاہ کے سامنے نہ آئے جس میں قرآن لکھا جاتا ہے اور جو کسی وقت مسلم بادشاہوں نے رائج کیا تھا ــــ پھر اب میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں نے اردو سے عربی، فارسی کے الفاظ بالکل نکال بھی دئیے (جس کا کوئی امکان نہیں ہے) تو کیا وہ ہندوؤں کو اپنی طرف مائل کر سکیں گے اور کیا ان کی یہ ذہنیت بدلی جا سکتی ہے کہ قرآنی حروف کا مطالعہ ان کے دھرم کو بھرشٹ کر دینے والا ہے؟

یقیناً اب راستہ بالکل صاف ہو گیا ہے اور ہم کو پھر از سر نو، اس مسئلہ پر غور کرنا ہے کہ اردو زبان کی بقا و اصلاح کے لئے ہم کو کیا طریق عمل اختیار کرنا چاہئے۔" ۸۸

ان واقعات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہندو اور ان کی قومی جماعتوں کی کوشش سے ہندی اور ناگری کے مطالبے کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا گیا تھا، بھارتیہ ساھتیہ پریشد کی کارروائیوں سے صاف کھل گیا تھا کہ ہندی کے سوا کسی اور زبان کو قومی زبان بنانے کے لئے ہندو تیار نہ ہوں گے۔ بات یہ ہے کہ پچھلے پچاس برسوں میں، حکومت کی واضح طرفداری کے سبب

۸۸ - نگار (لکھنؤ)، بابت جولائی ۱۹۳۶ء، ص ۴ تا ص ۶

لسانی مسائل میں انھیں خاصی کامیابی ہوئی تھی۔ موجودہ پاکستان، یعنی پنجاب، سندھ، سرحد اور بلوچستان کو چھوڑ کر بیشتر صوبوں اور ریاستوں میں اردو کی کرسی، ہندی کو دے دی گئی تھی یا دلوانے کی کوشش کی جا رہی تھی، راجپوتانہ کی ریاستوں کے حکمران اگرچہ زیادہ تر ہندو تھے لیکن عام و خاص کی سہولت کی خاطر درباری و سرکاری کام اردو زبان میں ہوتا تھا۔ ہندوؤں کی قومی جماعتوں نے بیسویں صدی کی پہلی تین دہائیوں میں ان ریاستوں پر جائز و ناجائز زور ڈالنا شروع کیا، نتیجہ یہ ہوا کہ ان ریاستوں میں بھی اردو کی جگہ ہندی براجمان ہو گئی۔ جے پور، بھرت پور، دھولپور، بیکانیر، جودھپور اور اودے پور، سب میں ہندو مہاسبھا اور کانگریس کے دباؤ سے ناگری اور ہندی کا رواج ہو گیا۔۸۹ ان باتوں نے ہندی کے حامیوں کا دل بڑھا دیا۔ ان کی سیاسی قوت اور قومی یکجہتی بھی بڑھ گئی تھی، اس لئے ان کی نظر میں مسلمان اور ان کے مطالبات زیادہ قابل توجہ نہ تھے۔

اردو کے بہی خواہ بھی اس کی مدافعت سے غافل نہ تھے، اپنے وسائل کے مطابق جو کچھ کر سکتے تھے کر رہے تھے، میکڈانلڈ نے یوپی میں ہندی اور ناگری کو رواج دے کر، اپنی سمجھ میں اردو اور اردو کے ہمدردوں کا خاتمہ کر دیا تھا، لیکن اردو کی سخت جانی اور اس کے بہی خواہوں کی حوصلہ مندی کے سبب ایسا نہ ہو سکا۔ مسلمانوں نے اب دوسروں پر بھروسہ کرنے کے بجائے اپنے ہی طور پر کچھ کرنے کی ہمت کر لی تھی، ابتداً چند آدمی اس کام کے لئے آگے بڑھے تھے پھر ”لوگ ساتھ آتے گئے اور کارواں بنتا گیا“، پوری ملت اسلامیہ اس کام میں شریک ہو گئی، مسلم لیگ، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس، خلافت کمیٹی، جمیعت العلمائے اسلام اور انجمن ترقی اردو سبھی نے اردو کو برصغیر کے مسلمانوں کی ثقافتی رگ سمجھ کر اس کو بچانے کی کوشش کی۔ مسلم لیگ نے سیاسی سطح پر اردو کا دفاع کیا اور اپنے مطالبات میں اردو کی حفاظت کو بھی شروع ہی سے پیش نظر رکھا۔

۸۹ - تفصیل کے لئے دیکھئے ”انگریزوں کی لسانی پالیسی“، ص ۲۸۹ تا ص ۳۰۸

"لارڈ میکڈانلڈ کے جانشین سر جیمز لاٹوش کے زمانے میں یہ جھگڑا وقتی طور پر ختم ہو گیا تھا۔ ۱۹۰۹ء میں پھر اس فتنے نے سر اٹھایا اس موقع پر مسلم لیگ آگے بڑھی اور اس نے اردو زبان کی تائید میں قراردادیں منظور کیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا تیسرا اجلاس جنوری ۱۹۱۰ء میں زیر صدارت پرنس آف ارکاٹ، دھلی میں ہوا اور اس میں اردو کے مسئلے پر خاص توجہ دی گئی۔ صدر جلسہ نے اپنی تقریر میں کہا :

"اتحاد ملی کے لئے اردو کی اشاعت بھی بہت ضروری ہے کیونکہ اردو ہر علاقے میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قومی یکجہتی میں زبان نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے اور اردو اس کے لئے موزوں ترین ہے۔ اردو میں مشرقی زبانوں کے سارے اوصاف جمع ھیں اور اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ پوری ملت اس کی ترقی کی طرف توجہ کرے۔ یہ بات بہر حال خوش آئند ہے کہ اردو کا حلقۂ اثر روز بروز بڑھتا جا رہا ہے حتیٰ کہ مدراس کے لوگوں میں جہاں تامل، تلگو، ملیالم اور کنڑی وغیرہ مادری زبانوں کی حیثیت سے بولی جاتی ھیں، وھاں بھی اردو کو مقبولیت حاصل ہے۔ اس رجحان کو فروغ دینے اور اردو کو پورے برصغیر کی قومی زبان بنانے کی سخت ضرورت ہے۔" ۹۰

اس جلسے میں اردو کے سلسلے میں مندرجہ ذیل قرارداد پاس ہوئی :

"آل انڈیا مسلم لیگ ان کوششوں کو جو بعض حلقوں کی طرف سے ہندوستان کی خاص الخاص زبان اردو کو نقصان پہنچانے کی غرض سے کی جا رہی ھیں غم و غصے کی نظر سے دیکھتی ہے اور اردو زبان کی بقا و ترقی کو ملک کے عام مفاد و ترقی کے لئے ضروری خیال کرتی ہے۔" ۹۱

۹۰ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۰۸

۹۱ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۳۲

مخزن کے مدیر اور اردو کے مشہور ادیب سر شیخ عبدالقادر نے مندرجہ بالا قرارداد پیش کرتے ہوئے کہا :

"قومی معاملات و مقاصد کی تشکیل و تعمیر میں جتنا اہم کردار تنہا اردو نے ادا کیا ہے کسی اور چیز نے نہیں کیا۔ یہ واحد زبان ہے جو ہندوستان کے سارے طبقوں میں سمجھی جاتی ہے۔ اس کے مقابلے میں کسی دوسری مقبول عام زبان کی تلاش ایسا ہی ہے جیسے سامنے گنگا بہہ رہی ہو اور کوئی شخص کنواں کھودنا شروع کر دے۔ اردو کی ضرورت تاجروں اور سیاحوں میں بڑے پیمانے پر محسوس کی گئی ہے، عملی ضرورتوں کے لئے اس سے بہتر کوئی زبان نہیں ہو سکتی۔ اردو بیرونی اور ملکی زبانوں پر برابر اثر ڈال رہی ہے۔ ہندی سے بہت سے الفاظ اردو میں لئے جا رہے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ صرف اردو ایسی زبان ہے جو ہندو اور مسلمان دونوں میں یکساں مقبول ہے۔ اس کو نقصان پہنچانا ہندوستان کے مفادات کا خون کرنا ہے۔"[92]

شیخ عبدالقادر کی تقریر کے بعد قاضی کبیر الدین نے قرارداد کی تائید کرتے ہوئے کہا :

"اردو کی تعلیم کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئیے اور تمام ایسی کوششوں کا جو اردو کے مفاد کے خلاف کی جا رہی ہیں، مقابلہ کرنا چاہئے۔ یہ بات حب الوطنی اور جذبۂ ملی، دونوں کے لحاظ سے ضروری ہے اور مشترک وسیلہ اظہار کے لئے وقتاً فوقتاً جلسے کئے جائیں اور اس کی حفاظت کے لئے انجمنیں قائم کی جائیں۔"[93]

"پیسہ" اخبار کے اڈیٹر مولوی محبوب عالم نے بھی قرار داد کی تائید کی انہوں نے اپنی تائیدی تقریر میں کہا :

۹۲ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۳۳

۹۳ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۳۳

''اردو ہندوستان کی لینگوا فرینکا ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے اردو کا سخت سے سخت مخالف بھی نہیں جھٹلا سکتا۔ مسلمانوں کے لئے ملی ترقی اور اردو کا تحفظ دونوں ہم معنی ہیں۔''۹۴

۱۹۱۰ء ہی کے آخری مہینے دسمبر میں آل انڈیا مسلم لیگ کا چوتھا سالانہ اجلاس بمقام ناگپور ہوا۔ اس جلسے کی صدارت سید نبی اللہ نے کی اور اپنے خطبے میں کہا:

''اس وقت ایک اور اہم مسئلہ جو مسلمانوں کی فوری توجہ کا مستحق ہے، وہ اردو ہندی اورپنجابی کا مسئلہ ہے۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ اردو ہندوستان کی لینگوا فرینکا ہے اور قومی ضرورتوں کو پورا کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ ہر چند کہ ہر طرف سے رکاوٹیں پیدا کی جاری ہیں، پھر بھی وہ روز بروز مقبول ہو رہی ہے۔ مدراس، نیپال، آسام اور بنگال تک میں وہ روز مرہ کی زندگی میں اور اسکولوں میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ جو زبان اتنی مقبول اور اہم ہو، مسلمانوں کو اس کی حفاظت اور ترقی کے لئے ٹھوس قدم اٹھانا چاہئے۔''۹۵

اس اجلاس کی تیسری نشست ۳۰ دسمبر کو سر آغا خاں کی صدارت میں ہوئی اس میں اردو کے متعلق مندرجہ ذیل قرار داد اتفاق رائے سے منظور کی گئی:

''آل انڈیا مسلم لیگ ان پے بہ پے کوششوں کو جو مختلف شکلوں میں، اس غرض سے کی جا رہی ہیں کہ صوبہ جات آگرہ و اودھ اور پنجاب میں، ہندوستان کی لینگوا فرینکا اردو کو ہٹا کر ہندی اور پنجابی کو رواج دیا جائے، غم و غصہ کی نگاہ سے

۹۴۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۳۳

۹۵۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۳۳

۹۶۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، ص ۱۴۷، ۱۴۸

دیکھتی ہے اور اس خیال سے کہ اردو زبان و ادب کا تحفظ ملک کے مفاد عامہ خصوصاً شمالی ہند کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ حکومت سے درخواست کرتی ہے کہ وہ ان کوششوں کی حمایت نہ کرے جو اردو کو نقصان پہنچانے کے لئے کی جا رہی ہیں۔"۹۷

شیخ ظہور احمد نے قرار داد پیش کرتے ہوئے اس کی وضاحت اور تائید میں ایک لمبی اور پر زور تقریر کی اور کہا کہ ہندی اردو تنازع روز بروز جڑ پکڑتا جا رہا ہے اور ہندو اور مسلمانوں کے درمیان نہایت خطرناک اختلاف پیدا کر دیا ہے۔ اردو شاہجہاں کے وقت سے ہندوستان کی لینگوا فرینکا چلی آ رہی ہے، اور اس کو رہنا چاہئے۔ اس کے مقابلے میں ہندی کا دعویٰ بے بنیاد ہے اور محض دو قوموں کے درمیان نفرت پیدا کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ اردو، اپنے مزاج اور کردار میں مسلم ثقافت کی ترجمان ہے اور اس کو بلا اختلاف رائے برٹش حکومت میں بھی شروع سے ہندوستان کی مشترک زبان تسلیم کیا گیا ہے۔ تقریباً ساری دیسی ریاستوں میں اردو کا چلن ہے۔ لیکن پچھلے کچھ دنوں سے ہندی کی حمایت کر کے بے سبب فرقہ وارانہ جذبات کو بھڑکایا جا رہا ہے، اردو میں ہندو اور مسلمانوں، دونوں کا حصہ ہے اور اس کی نثر و نظم کی ترقی میں میں دونوں برابر کے شریک رہے ہیں، دیا شنکر نسیم اور سرور جہاں آبادی کی زبان اتنی ہی شستہ اور پاکیزہ ہے جتنی میر تقی میر اور اکبر الہ آبادی کی۔ رتن ناتھ سرشار اتنے ہی بڑے ناول نگار ہیں جتنے عبد الحلیم شرر۔ آج بھی 'ادیب' اور 'زمانہ' جیسے اردو ادبی رسالے ہندوؤں کی ادارت میں نکلتے ہیں اور اپنے معیار کے اعتبار سے مثالی ہیں۔

اردو ہندی کا اختلاف ۱۸۶۷ء میں شروع ہوا تھا جبکہ ایک خاص گروہ کو حکومت کی حمایت کے سبب اس میں کامیابیاں حاصل ہوئیں۔ اب اسی ہندی کو جو کہ ایک بولی کی حیثیت رکھتی ہے، ہندوستان کی مشترک زبان

۹۷۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۹۳

تسلیم کرانے کی کوشش کی جا رہی ہے - یوپی اور پنجاب دونوں جگہ پڑھے لکھے طبقے کی زبان اردو ہے اور وہاں کے سارے ممتاز اخبارات و رسائل اردو ہی میں نکلتے ہیں - اردو ، ہندو و مسلم اتحاد کا واحد ذریعہ ہے اور اگر اسے ختم کیا گیا تو یہ اتحاد بھی برقرار نہ رہ سکے گا -۹۸

قرارداد کی تائید میں محمد یعقوب ، مولوی رفیع الدین احمد اور مولانا محمد علی جوہر نے بھی تقریریں کیں - مولانا محمد علی جوہر جو کہ ہندو مسلم اتحاد کے اس وقت علمبردار تھے اور کانگریس کے ہندو لیڈروں سے جن کا رشتۂ دوستی بہت استوار تھا ، کہا :

''اس وقت جبکہ ہندو مسلم اتحاد کی راہیں نکلی ہیں ہمارا کسی مسئلے پر الجھنا نقصان دہ ہوگا - جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے ، ہندوؤں کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے - مسلمان زبان کے سلسلے میں کسی طرح کا تعصب نہیں رکھتے - وہ جہاں جہاں گئے وہاں کی زبانوں کو صرف یہی نہیں کہ تباہ ہونے سے بچایا بلکہ انہیں ترقی دی - اردو کو مسلمان باہر سے نہیں لائے ، یہ ہندوستان ہی کی زائیدہ و پروردہ ہے - ہم بہت دنوں سے کہہ رہے ہیں کہ اردو کے عربی ، فارسی الفاظ کو بدیشی کہہ کر ان سے نجات پانے کی کوشش کی جا رہی ہے یہ بالکل ایسی بات ہے جیسے کوئی ساہوکار سونے چاندی کے قیمتی سکے ، صرف اس خیال سے کہ ان پر عرب اور ایران کی مہر لگی ہے ، گندے نالے میں ڈال دے - خاص طور پر اس قوم (ہندو) کا جو کہ کفایت شعاری میں شہرت رکھتی ہو ایسا کرنا بعید ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا ہو رہا ہے - پنڈت مدن موہن مالویہ نے کانگریس کے حالیہ سشن میں جو تقریر کی تھی ، اس میں سنسکرت الفاظ کی ایسی بھرمار تھی کہ سامعین میں مسلمان کیا خود ہندو بھی نہ سمجھ سکے کہ مالویہ صاحب کیا

۹۸ - فاؤنڈیشن آف پاکستان ، جلد اول ، ص ۱۹۰ تا ۱۹۷

کہہ رہے ہیں اس وقت اردو پر ہر طرف سے حملے ہو رہے ہیں اور ان سے دونوں طبقوں میں نفرت کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی ہے۔"۹۹

مولانا محمد علی کے بعد ابراہیم رحمت اللہ اور اسحاق علی نے بھی قرارداد کی تائید میں تقریریں کیں اور مجمع نے اسے بلا کسی اختلاف کے منظور کر لیا۔

اسی زمانے میں یعنی ۲۷ جولائی ۱۹۱۲ء کے کامریڈ میں مولانا محمد علی جوہر نے اردو ہندی کے مسئلے پر ایک طویل مقالہ بھی انگریزی زبان میں لکھا۔ اس میں انھوں نے کہا ہے کہ:

"اردو کو مسلمانوں کی زبان کہہ کر ہندو بڑی زیادتی کر رہے ہیں۔ مسلمان کا ایثار یہ کیا کم ہے کہ انھوں نے اپنے ساتھ لائی ہوئی زبانوں، ترکی اور فارسی اور اپنی مذہبی زبان عربی کو چھوڑ کر ہندوؤں کی خاطر مقامی زبان اردو کو اپنا لیا۔ اردو برصغیر کی مشترک زبان ہے اور ہندوؤں کا اس کے خلاف احتجاج ملک کے لئے کسی طرح بھی مفید نہیں ہو سکتا، اب ضرورت اس بات کی ہے کہ صرف باتیں نہیں بلکہ اردو کی ترقی و ترویج کے لئے عملاً کچھ کیا جائے، اس کی علمی و ادبی حیثیت اتنی مضبوط کر دی جائے کہ ناگری اور ہندی کا طوفان اٹھانے والے اسے کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں۔"۱۰۰

مارچ ۱۹۱۲ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پانچواں سالانہ اجلاس کلکتے میں ہوا اور اس میں یہ قرارداد منظور کی گئی کہ مسٹر گوکھلے نے، ابتدائی تعلیم سے متعلق پارلیمنٹ میں جو بل پیش کیا ہے مسلم لیگ اصولی طور پر اس سے متفق ہے، بشرطیکہ اس سے مسلمانوں کے مفاد کو کوئی نقصان نہ پہنچے اور یہ شرط اس لئے لگائی گئی تھی کہ ابتدائی تعلیمی بل کے قانون

۹۹۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد اول، ص ۱۹۹

۱۰۰۔ سلکٹڈ رائٹنگز اینڈ اسپیچز آف مولانا محمد علی جوہر، افضل اقبال ص ۲۹ تا ۵۰

بن جانے کے بعد بقول محمد شفیع ، اس بات کا خطرہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ، اردو کے مقابلے میں ہندی کو زیادہ اہمیت حاصل ہو جائے۔۱۰۱

اردو کے سلسلے میں ایک قرارداد ۱۹۱۶ء میں مسلم لیگ کے نویں سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں بھی منظور کی گئی ، یہ اجلاس قائد اعظم محمد علی جناح کی صدارت میں ہوا تھا۔ قرار داد کے مجوز واحد حسین اور موید آل نبی و ظہور احمد تھے۔ اس قرار داد میں کہا گیا کہ :

"آج کل مختلف حلقوں کی طرف سے جو کوششیں اردو کے خلاف ، اس کو ہندوستان کی لینگوا فرینکا کے جائز مقام سے محروم کرنے کے لئے کی جا رہی ہیں۔ مسلم لیگ ان کو تشویش کی نظر سے دیکھتی ہے اور ان تمام لوگوں پر جو کہ ہندوستانی قومیت کی تشکیل سے دلچسپی رکھتے ہیں ، زور دیتی ہے کہ وہ اردو کی حمایت کریں کیونکہ صرف یہی زبان ایسی ہے جو ملک کی مشترک زبان ہو سکتی ہے۔"۱۰۲

دسمبر ۱۹۱۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا دسواں سالانہ اجلاس کلکتے میں ہوا اس میں متعدد قراردادیں منظور کی گئیں ، پندرھویں قرار داد ، حسب ذیل تھی:

"آل انڈیا مسلم لیگ ، ملت اسلامیہ کی اس شدید خواہش کے پیش نظر کہ اس کے مفادات کو قانونی تحفظ دیا جائے ، حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ جو آئینی اصلاحات آنے والی ہیں ان میں ان باتوں کو ضرور شامل کیا جائے :

۱۔ مسلمانوں کو سرکاری ملازمتوں میں مناسب نمائندگی دی جائے۔

۲۔ مسلمانوں کو صوبائی لیجسلیٹو کونسل میں جو نمائندگی حاصل ہے وہی انہیں سرکاری یونیورسٹیوں میں ملنی چاہئے۔

۱۰۱۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان ، جلد اول ، ص ۲۰۳۔

۱۰۲۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان ، جلد اول ، ص ۳۸۴

۳ - اردو اور اس کے رسم الخط کو ان صوبوں کی عدالتوں اور سرکاری دفتروں جہاں وہ رائج ہیں ، برقرار رہنا چاہئے اور ان صوبوں کے ابتدائی مدارس میں اسے ذریعۂ تعلیم بھی ہونا چاہئے۔

۴ - مسلمانوں کو ان باتوں کی سہولت ، تحفظ اور اعانت حاصل ہونی چاہئے کہ وہ مذہبی تقریبات اور بقرعید و محرم کے موقعوں کی رسوم ، بغیر کسی مداخلت کے ادا کر سکیں ۔''[۱۰۳]

بعد ازاں مارچ ۱۹۲۹ء میں قائد اعظم محمد علی جناح کی طلب کردہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا اجلاس دھلی میں ہوا ، اس میں وہ چودہ نکات ایک قرار داد کی صورت میں منظور ہوئے جو ''قائد اعظم کے چودہ نکات'' کے نام سے مشہور ہیں اور جن مطالبات کی بنیاد پر تحریک پاکستان کی جنگ آخری منزلوں تک لڑی گئی ۔ ان چودہ نکات میں جہاں یہ باتیں شامل تھیں کہ (۱) آئندہ آئین وفاقی ہو (۲) تمام صوبے مساوی سطح پر خود مختار ہوں (۳) صوبوں کی اقلیت کو موثر نمائندگی حاصل ہو (۴) مرکز میں ایک تہائی مسلمان ہوں (۵) جداگانہ انتخاب کا طریقہ جاری رہے (۶) اگر کبھی علاقائی تبدیلیاں ہوں تو اس میں صوبہ پنجاب ، بنگال اور سرحد کے مسلمان متاثر نہ ہوں (۷) کوئی ایسا بل منظور نہ کیا جائے جو اقلیتی فرقوں کی رائے عامہ کے خلاف ہو (۸) سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے (۹) صوبہ سرحد اور بلوچستان کو دوسرے صوبوں جیسے حقوق دئے جائیں (۱۰) مسلمانوں کا سول ملازمتوں میں تناسب ہو (۱۱) مرکزی اسمبلی میں کوئی کابینہ ایسی نہ بنائی جائے جس میں مسلمان ایک تہائی سے کم ہوں (۱۲) دیسی ریاستوں کی مرضی کے بغیر ان کے متعلق کوئی آئین نہ بنایا جائے ۔ وہاں مندرجہ ذیل دو شقیں بھی شامل تھیں :

۱ - تمام طبقوں کو اپنی عبادات ، عقاید ، اجتماعات ، تقریبات ، انجمن سازی اور تعلیم و تبلیغ کے تحفظ کا حق حاصل ہو۔

۱۰۳ - فاؤنڈیشن آف پاکستان ، جلد اول ، ص ۳۹۴

۲ - آئین میں مسلمانوں کی ثقافت ، زبان ، مذھب ، تعلیم ، قوانین اور فلاحی اداروں کے تحفظ کی ضمانت دی جائے ۔۱۰۴

مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے یہ دو آخری شقیں ، بہت اہم تھیں کہ انھیں پر دو تہذیبوں اور دو قومیتوں کے دعوے کا دار مدار تھا اور ان کے تحفظ کی ضمانت اردو کو قومی زبان تسلیم کئے بغیر ممکن نہ تھی ۔ چنانچہ جب آگے چل کر ان دفعات کی توضیح و تصریح کی منزل آئی تو مسلمانوں نے واضح الفاظ میں یہ مطالبہ کر دیا کہ اردو کو اپنی مروجہ شکل و صورت کے ساتھ خواہ اس کا نام ھندوستانی ھی کیوں نہ ھو برصغیر کی مشترکہ اور قومی زبان تسلیم کیا جائے ۔

یہ ان مطالبات کا مختصر ذکر تھا جو مسلمانوں کی سیاسی جماعت مسلم لیگ کی طرف سے اردو کے سلسلے میں ۱۹۰۶ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیان کئے گئے ۔ لیکن مسلم لیگ ھی پر موقوف نہیں ، مسلمانوں کے دوسرے اداروں اور جماعتوں کی طرف سے بھی اردو کے حق میں خصوصاً مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن ترقی اردو کی طرف سے بھی اس سلسلے میں جو کام ھوا وہ تاریخی اھمیت کا حامل ھے ۔

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی اردو خدمات کا مختصر سا ذکر ، زیر نظر باب کے شروع میں آچکا ھے ۔ کانفرنس کا بنیادی تعلق اگرچہ مسلمانوں کی تعلیم سے تھا لیکن اس نے اپنے تعلیمی منصوبوں اور مطالبوں کو ھمیشہ اردو سے وابستہ رکھا ۔ جگہ جگہ اردو اسکول کھلوائے ، نصاب میں اردو کو لازمی اور اختیاری مضمون کی حیثیت سے داخل کرانے اور مختلف سطحوں پر اسے ذریعۂ تدریس بنانے کی کوششیں کیں ، چونکہ اس کے حلقۂ اثر میں پورا برصغیر شامل تھا اور اس کے سالانہ جلسے ، مختلف صوبوں میں ھوا کرتے تھے نیز اس کے جلسوں کی ساری کارروائی اردو میں ھوتی تھی اور تقاریر و مقالات بھی اردو ھی میں پڑھے جاتے تھے ، اس لئے اردو کی آواز کو ملک کے ایک سرے سے

۱۰۴ - پاکستان موومنٹ ھسٹاریکل ڈاکومنٹس ، جی الانہ ، ص ۵۹

دوسرے سرے تک پہنچانے میں اس نے اہم اور نمایاں کردار ادا کیا۔ اس کے اجلاسوں میں اردو کی حمایت اور اس کی توسیع و ترقی کے سلسلے میں متعدد قرار دادیں منظور ہوئیں اور شرکا کی تقریروں میں ہندی اردو کے مسئلے پر اظہار خیال کیا گیا۔ ساتھ ہی مسلم اداروں اور جماعتوں کے ان سارے اقدامات کو سراہا گیا اور حمایت و امداد کی طرف سارے مسلمانوں کی توجہ مبذول کرائی گئی جن کا تعلق اردو یا عربی و فارسی سے تھا۔ چنانچہ ۱۸۹۲ء کے ساتویں سالانہ اجلاس منعقدہ دھلی۔۱۰۵ میں ایک قرار داد اس امر سے متعلق منظور کی گئی کہ:

> ''انجمن حمایت اسلام لاھور نے مبتدیوں کے لئے جو درسی رسالے تالیف کئے تھے کانفرنس نے ان کو پسند کیا اور ان کی اشاعت کی سفارش کی۔''

۱۸۹۵ء کے دسویں سالانہ اجلاس میں یہ قرار داد منظور کی گئی کہ:

> ''ندوۃالعلما نے جو عربی دارالعلوم بنانے کی تجویز کی ہے اس کانفرنس کے نزدیک اس قسم کے دارالعلوم سے عربی علوم کی ترقی کی امید ہے۔ لہذا یہ کانفرنس بھی ایسے دارالعلوم کی ضرورت کو تسلیم کرتی ہے اور اس معاملے میں ندوۃالعلما کے ساتھ متفق الرائے ہے۔''۱۰۶

تیرھواں اجلاس ۱۸۹۹ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوا۔ اس میں مندرجہ ذیل قرار دادیں پاس ہوئیں:

۱۔ پرائیویٹ اور سرکاری مدارس میں مسلم بورڈنگ ھاؤس قائم کئے جائیں۔

۱۰۵۔ ''مرقع کانفرنس،، (مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی قرار دادوں اور تجویزوں کا مجموعہ)، مرتبہ انوار احمد مارھروی، مطبع مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، ۱۹۳۰ء، ص ۴۶ تا ص ۵۶

۱۰۶۔ مرقع کانفرنس، ص ۵۶ تا ۵۹

۲ - ممالک شمالی مغربی کی عدالتوں اور دفتروں میں اردو کو فارسی رسم الخط میں جاری رہنا چاہئے -

۳ - بی - اے کی ڈگری کے لئے فارسی کا بطور اختیاری مضمون کے قائم رہنا ضروری ہے -

۴ - مسلمانوں کو میڈیکل مدارس میں داخلے کی ترغیب دی جائے - ۱۰۷

۱۹۰۲ء کے اجلاس منعقدہ دھلی میں اتفاق رائے سے یہ طے پایا کہ "کانفرنس کے دائرۂ عمل کو سندھ تک وسیع کردیا جائے تا کہ سندھ کے مسلمانوں کے ساتھ اشتراک عمل ہو سکے اور وہاں کی تعلیمی ترقی و اصلاح کی کوشش کی جائے ، دوسرے یہ کہ قومی یونیورسٹی کے لئے صوبہ وار کمیٹیاں قائم کی جائیں -" ۱۰۸

اٹھارواں اجلاس ۱۹۰۴ء میں لکھنؤ میں ہوا - اس میں یہ قرار داد منظور کی گئی کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں فارسی زبان کی تعلیم و تدریس بدستور جاری رہنی چاہئے - ۱۰۹

۱۹۰۷ء میں مولانا الطاف حسین حالی کی صدارت میں بمقام کراچی ، کانفرنس کا اکیسواں اجلاس ہوا - اس میں طے پایا کہ سندھ کے سرکاری مدارس میں فارسی زبان کی تعلیم کے لئے مسلمان مدرس اور سندھ کے محکمۂ تعلیم میں مسلمان افسر مقرر کئے جائیں - ۱۱۰ اسی طرح کی تجویزیں ۱۹۱۰ء میں ۱۱۱ ناگپور کے اجلاس میں ممالک متوسط کے لئے اور ۱۹۱۳ء کے اجلاس منعقدہ آگرہ میں ۱۱۲ ریاست کے کالجوں اور اسکولوں کے متعلق پاس کی گئیں ، آگرے

۱۰۷ - مرقع کانفرنس ، ص ۱۷ تا ص ۶۷

۱۰۸ - مرقع کانفرنس ، ص ۸۷ تا ص ۹۱

۱۰۹ - مرقع کانفرنس ، ص ۹۹ تا ص ۱۰۷

۱۱۰ - مرقع کانفرنس ، ص ۱۱۹ تا ص ۱۲۸

۱۱۱ - مرقع کانفرنس ، ص ۱۴۳ تا ص ۱۵۱

۱۱۲ - مرقع کانفرنس ، ص ۱۶۳ تا ص ۱۶۸

کے اجلاس میں یہ قرارداد بھی منظور کی گئی کہ صوبہ پنجاب میں ایجوکیشنل کانفرنس کی صوبائی شاخ قائم کی جائے - کانفرنس کا اکتیسواں اجلاس ۱۹۱۷ء میں کلکتے میں ہوا - اس جلسے میں ذیل کی دو قراردادیں منظور کی گئیں :

۱ - پنجاب یونیورسٹی میں مشرقی علوم کے امتحانات کے لئے جو سہولتیں ہیں ، کلکتہ یونیورسٹی بھی وہی سہولتیں مہیا کرے -

۲ - صوبہ بمبئی اور بنگال میں ان طلبہ کے لئے جن کی مادری زبان اردو نہیں ہے ، اردو کو سیکنڈ لینگویج کی فہرست میں شامل کرے -

جلسے کے صدر نواب سر حیدر نواز جنگ نے اردو کی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کہا :

''جب ہم ہندوستان کے مختلف صوبوں کی تعلیمی رپورٹوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں یہ معلوم کر کے حیرت ہوتی ہے کہ خواہ ان مقامات کی اردو زبان کے لحاظ سے کچھ ہی حیثیت ہو لیکن مسلمان یکساں طور پر اس بات کے خواہش مند ہیں بلکہ ان کا اصرار ہے کہ ان کے بچوں کے لئے کسی نہ کسی شکل میں اردو تعلیم کا انتظام کیا جائے اور ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کیونکہ اس مقدس سر زمین کی دوسری اقوام کی طرح مسلمانوں کو بھی اپنا مذہب جان سے زیادہ عزیز ہے اور اسلامی مذہب و اخلاق کا سرمایہ جس قدر اردو میں ہے ہندوستان کی کسی دوسری زبان میں نہیں ہے - اور چونکہ مسلمانوں کے بچے ہر جگہ ابتدا میں قرآن شریف پڑھتے ہیں اور اس کی اور اردو کی تحریر اور اسلامی مذہب و اخلاق کی اکثر اور مستند کتابیں اردو میں ہیں اس لئے مذہبی اور اردو زبان کی تعلیم باہم اس طرح وابستہ ہو گئی ہیں کہ ان کا جدا کرنا ممکن نہیں اور اس لئے اردو کے مطالبہ کا پورا کرنا قوم اور گورنمنٹ دونوں کا فرض ہے لیکن میرا مطلب اس انتظام سے یہ نہیں ہے کہ ہر جگہ اردو ذریعۂ تعلیم قرار دی جائے اس کا فیصلہ مقامی حالات پر منحصر ہے -

میں نے بعض صاحبوں کو یہ اعتراض کرتے سنا ہے کہ اگر مسلمان طلبہ کے لئے اردو کی تعلیم لازمی قرار دی گئی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ علاوہ مقامی زبان کے جس کا سیکھنا مقامی ضروریات و تعلقات کے لحاظ سے ضروری ہے، مسلمان طالب علموں پر ایک اور زبان سیکھنے کا بار بڑھ جائے گا۔ بیشک یہ صحیح ہے اور یہ بار مسلمانوں کو اٹھانا پڑے گا اور اس کے اٹھانے کے لئے وہ خوشی سے آمادہ ہیں کیونکہ وہ اردو کو قومی زبان سمجھتے ہیں اور تہذیب، ذوق، اسلامی تمدن اور اتحاد و خیال و یک جہتی کے لئے اس کا سیکھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ دنیا میں جو قومیں قلیل تعداد میں ہوتی ہیں انہیں کچھ خسارہ اٹھانا پڑتا ہے اور تھوڑی بہت قربانی کرنی پڑتی ہے اگر ہمیں اپنی ہستی قائم رکھنا ہے تو ہمیں بھی اس خسارہ اور قربانی کے لئے تیار رہنا چاہئے اور اگر مقامی لحاظ سے جزئی نقصانات بھی ہوں تو انہیں برداشت کرنا چاہئے ورنہ مسلمانوں کی قلیل جماعتیں جو مختلف صوبوں اور مقاموں میں منتشر پائی جاتی ہیں وہ اسلامی تمدن و تہذیب اور اسلامی اخلاق و مذہب سے محروم ہو جائیں گی اور ان کی حالت اس قدر ذلیل اور پسماندہ ہو جائے گی کہ ان میں اور نیچ قوموں میں کچھ فرق نہ رہے گا یا وہ گمنام و بے نشان ہو کر دنیا سے مٹ جائیں گے۔"۱۱۳

سنہ ۱۹۲۴ء میں کانفرنس کا سینتیسواں سالانہ اجلاس بمبئی میں ابراہیم رحمت اللہ کی صدارت میں منعقد ہوا اور طے پایا کہ صوبہ بمبئی کے گورنمنٹ کالجوں میں اردو پروفیسروں کا تقرر کیا جائے۔۱۱۴ سنہ ۱۹۲۵ء کے اجلاس منعقدہ علی گڑھ میں صدر جلسہ صاحبزادہ سر عبدالقیوم رئیس پشاور نے کہا:

۱۱۳- مرقع کانفرنس، ص ۱۸۵ تا ۱۹۲

۱۱۴- مرقع کانفرنس، ص ۲۲۵ تا ۲۲۹

''اردو ہی وہ زبان ہے جس میں ہندوستان کی قومی زبان بن جانے کے آثار صدیوں سے نشو و نما پا رہے ہیں اور یہ اس قابل نظر آتی ہے کہ اس کو ذریعۂ تعلیم بنایا جائے۔''۱۱۵

سنہ ۱۹۲۶ء میں کانفرنس کا سالانہ اجلاس دہلی میں، مدراس ہائی کورٹ کے جج سر عبد الرحیم کی صدارت میں ہوا، اس میں انہوں نے اردو کی اہمیت پر تقریر کرتے ہوئے کہا:

''مجھ کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ تعلیم بڑے پیمانے پر بلا امداد ایک وسیع لٹریچر کے نہیں ہو سکتی جو کہ عام آبادی کی دسترس میں ہو۔ اس سے ہم فوراً ایک مشترک زبان کے مسئلے پر پہنچ جاتے ہیں جو ساری آبادی کی ایک ہو اور اگر یہ ابھی ناممکن ہو تو کم از کم ہندوستان کی آبادی کے اس حصے کی مشترک ہو جس کو ہم مسلمان کہتے ہیں۔ سال گذشتہ میں نے علی گڑھ کی اسپیچ میں بتایا تھا کہ عربی رسم الخط اختیار کیا جائے جس کے ذریعے سے ایک مشترک زبان ہونا ممکن ہے۔ جس میں ایک مرکب لغت ہو جو سنسکرت، عربی اور فارسی سے ماخوذ ہو ایسی زبان فی الحقیقت اردو ہے۔ ہمارا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ فی الحال ہم اپنی ساری قوت کو اردو کی ترقی میں صرف کریں کیونکہ اس کے ذریعہ سے اسلامی روحانی قوتوں اور نیز اسلامی تاریخ اور شائستگی کی اعلیٰ روایتوں کو بغرض تعلیم استعمال کرنا ہمارے لئے ممکن ہے۔''۱۱۶

اس اجلاس میں دو خاص ریزولیوشن پاس ہوئے، ایک یہ کہ جن صوبوں میں مسلمان اردو نہیں بولتے وہاں کے نصاب میں بھی اردو رسم الخط جاری

۱۱۵۔ خطبات عالیہ، حصہ سوم، مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۲۳۴

۱۱۶۔ خطبات عالیہ، حصہ سوم، مسلم یونیورسٹی پریس، علیگڑھ، ۱۹۲۸ء، ص ۲۵۳

کیا جائے، دوسرے یہ کہ مشرقی علوم کی فیکلٹیاں یونیورسٹیوں میں کھولی جائیں ۔۱۱۷

چالیسویں اجلاس منعقدہ مدراس سنہ ۱۹۲۷ء میں زیر صدارت سر عبدالقادر یہ ریزولیوشن پاس ہوا کہ :

''اردو زبان کو تجرباً ذریعہ تعلیم بنانا مستحسن طریقۂ عمل ہے ۔''۱۱۸

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اکتالیسواں سالانہ اجلاس بمقام اجمیر، زیر صدارت سر شاہ محمد سلیمان، جج الہ آباد ہائی کورٹ، ۱۹۲۸ء میں منعقد ہوا ، اس میں مندرجہ ذیل ریزولیوشن پاس ہوئے:

۱ - اردو کی چھپائی میں لیتھو کے بجائے ٹائپ کا انتظام ہونا چاہئے ۔

۲ - اردو زبان کے تحفظ کے لئے ایک عظیم الشان مرکزی کتب خانہ قائم کیا جائے ۔ ۱۱۹

۱۹۳۴ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ میرٹھ ، زیر صدارت سر عبد القادر مندرجہ ذیل تجویزیں منظور کی گئیں :

۱ - یہ کانفرنس تجویز کرتی ہے کہ صوبہ متحدہ ورنیکیولر مڈل مدارس میں فارسی ، عربی اور سنسکرت کو بطور اختیاری مضمون رائج کر کے ان کی تعلیم کا انتظام کیا جائے اور طلبہ کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے لینے کا اختیار دیا جائے ۔

۲ - یہ کانفرنس آگرہ ، الہ آباد ، لکھنؤ اور پنجاب کی یونیورسٹیوں کی اس کارروائی کو کہ اب تک ان میں کوئی مسلمان وائس چانسلر مقرر نہیں ہوا ، نہایت افسوس کے ساتھ دیکھتی ہے اور ان

۱۱۷ - مرقع کانفرنس ، ص ۳۴۴ تا ص ۳۴۵

۱۱۸ - مرقع کانفرنس ، ص ۲۴۵ تا ص ۲۵۷

۱۱۹ - مرقع کانفرنس ، ص ۲۵۸ تا ص ۲۶۹

کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ اس معاملے میں فراخ دلی سے
کام لیں۔ ۱۲۰

اڑتالیسواں سالانہ اجلاس بمقام علی گڑھ منعقد ہوا جس کی صدارت مدراس کے رئیس نواب عبد الحلیم نے کی۔ اس میں صاحب صدر نے اردو کے بارے میں کہا :

"اگرچہ ہندوستان کے سب صوبوں کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن وہ ہندوستان کے ہر صوبے میں سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اس لئے تھوڑی سی کوشش سے وہ ہندوستان کی عام زبان ہو سکتی ہے۔ جن صوبوں کے بھائیوں کی مادری زبان اردو ہے انہیں دوسرے صوبوں مثلاً مدراس یا بنگال کے بھائیوں کی اردو پر ہنسنا نہیں چاہئے بلکہ ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے کہ باوجود کہ ان کی مادری زبان اردو نہیں ہے لیکن وہ دوسرے صوبوں کے بھائیوں کی خاطر، اس کے سیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مجھے اپنے عزیز تعلیم یافتہ نوجوانوں سے شکایت ہے کہ وہ اردو کی اشاعت و ترقی کے لئے کافی کوشش نہیں کرتے اور ان میں بہت کم ایسے ہیں جو اردو کی خدمت میں مصروف ہوں۔ البتہ پنجاب کے نوجوان نسبتاً اردو کی زیادہ خدمت کر رہے ہیں جس سے مجھے مسرت ہوتی ہے۔"۱۲۱

کلکتہ کے پچاسویں اجلاس میں زیر صدارت کمال یار جنگ یہ قرار داد منظور ہوئی کہ یہ اجلاس حکومت ہند اور حکومت سرحد سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ صوبہ سرحد میں علیحدہ یونیورسٹی قائم کرے۔۱۲۲ کانفرنس کا باونواں اجلاس ظہیر یار جنگ بہادر کی صدارت میں بمقام علی گڑھ ہوا اور یہ تجویز منظور کی گئی کہ "دہلی یونیورسٹی میں جملہ مضامین اردو زبان

۱۲۰ - مرقع کانفرنس، ص ۳۰۳ تا ص ۳۰۵

۱۲۱ - خطبات عالیہ اور علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص ۳۱۳

میں پڑھائے جائیں اور اردو زبان کی تعلیم کا معقول انتظام کیا جائے۔"۱۲۳

اردو کے سلسلے میں، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس اور مسلم لیگ کی مذکورہ بالا کوششوں میں "انجمن ترقی اردو" بھی برابر کی شریک رہی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی اردو خدمات، ان دونوں سے بہت آگے بڑھ گئیں۔ ایک طرف انجمن نے یہ کیا کہ برصغیر میں اردو ھندی کے سلسلے میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے مسلم لیگ، مسلم کانفرنس اور دوسرے اردو دوست افراد اور اردو کے ھمدرد اداروں کو باخبر رکھا، دوسری طرف اس نے اس خیال سے کہ اگر کسی وقت اردو کو سرکاری اور قومی زبان بنانے کا موقع آئے تو وہ اس کے لئے ہر طرح موزوں اور اہل ثابت ہو۔ اردو کے علمی و ادبی ذخیرے کو گراں مایہ اور اردو نثر کوسنجیدہ مضامین کا متحمل بنانے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس وقت اور جان پیدا ہوگئی جبکہ ۱۹۱۲ء میں مولوی عبد الحق، انجمن کے سیکریٹری مقرر ہوئے۔ اس وقت سے لے کر ۱۹۳۵ء تک اورنگ آباد میں رہ کر، مولوی صاحب نے انجمن ترقی اردو کی معرفت اردو کے لئے جو کچھ کیا وہ زبان کی تاریخ میں بہت ھی قیمتی حصہ ھے۔

جیسا کہ سید غلام ربانی نے تفصیل سے لکھا ھے، مولوی عبد الحق کے انجمن سے منسلک ہو جانے کے بعد اس کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہوگئی، ارکان اعانت کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ دو تین سال کے اندر کچھ کتابیں بھی شائع ہوگئیں، ملک کے مشہور اخبارات میں انجمن کی حمایت میں پرزور مضامین نکلنے شروع ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں انجمن ترقی اردو کا ایک عام جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں ملک بھر کے علما، فضلا، اکابر قوم، شعرا، ادبا اور مشائخ و رؤسا شریک ہوئے۔ ۱۹۱۷ء تک شیدایان اردو کی ارکان دوامی کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ہوگیا۔ ۱۹۱۸ء میں انجمن کے سفیر کی حیثیت سے مختلف صوبوں اور علاقوں میں بعض حضرات کو دورے پر

۱۲۲ - علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص ۳۲۱

۱۲۳ - علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں، ص ۳۲۵

بھیجا گیا اور جگہ جگہ انجمن کی شاخیں اور اردو کتب خانے قائم کئے گئے ان کوششوں کی بدولت ۱۹۱۹ء کے بعد انجمن کی مطبوعہ کتابوں کی مانگ بڑھ گئی ، چنانچہ مطبوعات میں اضافہ کیا گیا اور بعض کتابیں اپنی مقبولیت کی بنا پر کئی کئی بار چھاپی گئیں۔ ۱۹۲۳ء سے انجمن نے کتابوں کی ایجنسی کا کام بھی شروع کر دیا ، اسی سال انجمن کا اپنا پریس قائم ہوا ۔ "رسالہ اردو" ۱۹۲۱ء سے جاری تھا ، ۱۹۲۸ء میں " سائنس " کے نام سے ایک اور رسالے کا اجرا کیا گیا ۔۱۲۵

۱۹۱۸ء کے آخر میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس سورت میں ہوا ، اس میں انجمن ترقی اردو کے اجلاس کی صدارت مولوی وحید الدین سلیم نے کی ، انہوں نے اپنے خطبے میں انجمن کی رفتار ترقی کا جائزہ لیا اور نہایت پر جوش انداز میں لوگوں کی توجہ اردو کی طرف مبذول کرائی ، ایک اقتباس دیکھئے ۔

"اس شعبے یا اس انجمن کا مقصد کیا ہے ؟ اس کا مقصد یہ ہے کہ اردو زبان کو ترقی دے ۔ اس میں دنیا کے بہترین افکار اور بلند ترین معلومات کا سرمایہ مہیا کرے ۔ اس کی حفاظت و اشاعت میں سرگرمی اور جوش سے کام لے ۔ آپ کی یہ انجمن ۱۹۰۳ء میں قائم ہوئی تھی ۔ بہار و خزاں کے پندرہ موسم اس پر گزر چکے ہیں ۔ شمس العلما مولانا شبلی نعمانی ، مرحوم مولانا حبیب الرحمن صاحب شیروانی اور عزیز مرزا مرحوم اس کے معتمد رہ چکے ہیں اور اب مولوی عبدالحق بی ۔ اے کے ہاتھ میں اس کی عنان ادارت ہے ۔ اوائل ایام میں اس کی ترقی کی رفتار دھیمی رہی مگر اب وہ سرعت کے ساتھ آگے بڑھنا چاہتی ہے . . . پہلے انجمن کے پاس کوئی سرمایہ نہ تھا اب کسی قدر سرمایہ بھی مہیا ہو گیا ہے ۔ انجمن نے اپنی مستقل حیثیت بھی قائم کر لی ہے ۔

۱۲۴ - نقد عبدالحق ، ڈاکٹر سید معین الرحمن ، نذر سنز ، لاہور ، ۱۹۶۸ء ، ص ۲۰

۱۲۵ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ۵۰

متعدد کتابیں بھی انجمن کی طرف سے شائع کی گئی ھیں ۔ ملک میں اس کے مقاصد کی اشاعت کا کام بھی انجام پا رھا ھے ۔ مگر ابھی ھم منزل مقصود سے ھزاروں کوس کے فاصلے پر ھیں ۔ کیوں ؟ اس لئے کہ ھم میں زندہ قوم کے آثار نہیں پائے جاتے ۔

''حضرات! انجمن ترقی اردو کی ضرورت پہلے بھی تھی اور اب بھی ھے ۔ مگر اب زمانے کے حوادث پکار پکار کر کہہ رھے ھیں کہ غفلت کا زمانہ ختم ھو چکا اگر اب بھی بیدار نہ ھو گے تو مشکلات و شدائد کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں گے ۔ اپنی زبان کی حفاظت کرنا اس کو زندہ رکھنا ، ترقی دینا ، اس میں بلند پایہ معلومات و خیالات کا سرمایہ جمع کرنا ھر اس قوم کا فرض ھے جو اس دنیا میں زندہ رھنا چاھتی ھے ۔ جو چاھتی ھے کہ حوادث کی کشمکش سے اس کی ھستی ملیامیٹ نہ ھو جائے ۔ زبان کیا ھے ؟ تبادلۂ خیالات کا ذریعہ ھے ۔ اتحاد و اتفاق کا وسیلہ ھے ۔ جہالت کے مرض کا موثر علاج ھے ۔ تعلیم و تربیت کی رہ نما ھے ۔ اس کی حفاظت و حمایت کرنا اور اس کی توسیع و اشاعت میں کوشش کرنا تمام افراد ملت کو لازم ھے ۔

''یورپ کا ایک ادیب لکھتا ھے کہ زبان ایک طلائی زنجیر ھے جو قوم کے افراد کو باھم ملاتی ھے، جو بکھرے ھوئے دلوں کو ایک نقطہ پر جمع کرتی ھے ، جو منتشر خیالات و افکار کو ایک مرکز پر لاتی ھے ، جو ٹوٹے ھوئے ارادوں اور حوصلوں کو جوڑ کر ان میں زندگی اور تازگی کی روح پھونکتی ھے ۔ ایک زبان بولنے ، لکھنے اور پڑھنے والی قومیں ایک ھی دماغ سے سوچتی ، ایک ھی دل سے افادہ کرتی ، ایک ھی ھاتھ سے کام کرتی اور ایک ھی پاؤں سے ترقی کے میدان میں جست لگاتی ھیں ۔

''حضرات! تو کیا اب آپ پر لازم نہیں ھے کہ اپنی زبان سے محبت کریں ۔ اس کو اپنی تعلیم و تہذیب اور اتحاد خیالات کا ذریعہ

جان کر اس کے ساتھ پوری قدر شناسی کا برتاؤ کریں ؟ مگر وہ زبان کونسی ہے ؟ کیا وہ گجراتی ہے جو علاقہ بمبئی سے باہر ہندوستان میں کسی جگہ بولی اور سمجھی نہیں جاتی ؟ کیا وہ بنگالی یا پنجابی یا اور کوئی ایسی ہی زبان ہے جو ایک صوبے یا علاقے سے باہر کام نہیں دیتی ؟ حاشا و کلا وہ زبان جس سے آپ اور ہم کام لے سکتے ہیں صرف اردو ہے ۔ بس یہی ایک زبان ہے جو تمام ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ تمام ہندوستانیوں کی مشترک زبان ہے ۔ یہ اسی زبان کو شرف حاصل ہے کہ ہندوستان کے جس صوبے میں آپ کوئی ملکی یا قومی کانفرنس منعقد کریں اور اس کو تبادلۂ خیالات کا ذریعہ گردانیں تو تمام ارکان جو ہندوستان کے دور دراز گوشوں سے ایک جگہ آ کر جمع ہوئے ہیں ، نہایت آسانی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے خیالات ایک دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں ۔ یہ زبان ہمارے لئے خدا کی ایک نعمت ہے . . . . مسلمانوں کو مکاتب و مدارس بہ کثرت جاری کرنے چاہئیں ۔ ممکن ہے ان میں مضامین تعلیم ، حسب ضرورت مختلف ہوں مگر ان میں اردو زبان کی تعلیم لازمی ہونی چاہئے ۔ ہماری قوم کا ہر بچہ خواہ وہ ملک کے کسی گوشے میں پیدا ہوا ہو ، اپنی قومی زبان سے محروم نہ رہے ۔ اگر وہ اردو زبان بولتا ، سمجھتا ، لکھتا اور پڑھتا ہے تو ہر وقت یہ بات اس کے ذہن میں مرکوز رہے گی کہ میں کوئی تنہا ہستی نہیں ہوں میں کسی چھوٹی سی جماعت کا ممبر نہیں ہوں ۔ میرے خیالات صرف ذاتی خیالات ہی نہیں ہیں بلکہ پوری قوم کے دل سے اٹھے ہیں اور ان کی ایک لہر میرے دل میں بھی ہے ۔ میں اس زنجیر کی ایک کڑی ہوں جس نے ہندوستان کے کروڑوں دلوں کو باہم ملا رکھا ہے . . . . ۔" ۱۲۶

۱۲۶ - پنجاه ساله تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ۲۷ تا ص ۲۹

اردو کی ترقی اور مقبولیت کے سلسلے میں انجمن کی طرف سے اس طرح کی کوششیں مولوی عبدالحق کے معتمد ہو جانے کے بعد شب و روز کا معمول بن گئیں ، ہر چند کہ ۱۹۱۲ء اور ۱۹۳۶ء کی درمیانی مدت میں مولوی عبدالحق اورنگ آباد میں ملازمت بھی کرتے رہے اور انجمن کی ذمہ داریاں بھی سنبھالے رہے پھر بھی انھوں نے انجمن کے جثے میں ایک تازہ روح پھونک دی ، ان کی کوششوں سے انجمن کی از سر نو تشکیل کی گئی " اس کے مالی وسائل کو بڑھایا گیا اس کے اور کام کرنے والوں میں ایسی مستعدی پیدا کر دی گئی کہ اس نے بہت جلد برصغیر کے ایک نہایت اہم اور حد درجہ فعال ادارے کی حقیقت اختیار کر لی ۔ "

سید ہاشمی فرید آبادی نے صحیح لکھا ہے :

" انجمن ترقی اردو کا ، مولوی عبدالحق صاحب کے تفویض کیا جانا نہ صرف انجمن بلکہ زبان اردو کی تاریخ کا نہایت نتیجہ خیز واقعہ ہے۔ اس نے ہماری ادبیات کی رفتار پر جو اثر ڈالا ، وہ کسی صاحب خبر سے مخفی نہ ہوگا ، لیکن جدید نظام تعلیم اور ملی سیاسیات میں اس کا دخل اگرچہ ایسا براہ راست اور صریح نہ ہو ، حقیقت میں کافی قوی اور تہہ تک اتر گیا تھا ۔ " ۱۲۷

انجمن ترقی اردو سے پہلے اردو میں زیادہ تر قصے کہانیوں کی کتابیں مقبول تھیں ، علمی و ادبی اور فنی موضوعات پر کتابیں اول تو لکھی ہی کم جاتی تھیں اور لکھی بھی جاتی تھیں تو ان کے چھاپنے اور پڑھنے والے نہ ملتے تھے ۔ انجمن ترقی اردو نے اس طرف خاص توجہ کی اور خود کو اس بات کا مکلف بنا لیا کہ وہ صرف اعلیٰ درجے کی تحقیق و تنقید پر مبنی کتابیں اور جدید مغربی علوم و فنون پر مشتمل کتابوں کے تراجم ہی شائع کرے گی۔ چنانچہ انجمن نے ابتدائی چند برسوں کے اندر جو کتابیں شائع کیں ان میں :

۱ - فلسفۂ تعلیم ۔ ۳ - القول الاظہر ۔
۲ - القمر ۔ ۴ - رہ نمایان ہند ۔

۱۲۷ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ۲۷

۵ - نپولین اعظم -　　　۷ - تاریخ تمدن -

۶ - امرائے ہنود -

جیسی اہم علمی و فنی کتابیں شامل تھیں -۱۲۸ کتابوں کی اشاعت و انتخاب کے سلسلے میں انجمن نے اپنے اس ابتدائی معیار کو ہمیشہ باقی رکھا۔ ٹھوس علمی و ادبی اور سنجیدہ کتابیں ہی ادارے سے شائع کی گئیں - مولوی عبدالحق کے معتمد ہو جانے کے بعد کام کی رفتار پہلے کے مقابلے میں اور تیز ہو گئی اور اس نوع کی سینکڑوں کتابیں منظر عام پر آ گئیں - مولوی عبدالحق خود ایک ممتاز عالم زبان ، بلند پایہ ادیب ، محقق ، نقاد ، مترجم اور مبصر تھے ، وہ زبان اور ملت کے باہمی رشتوں اور قوموں کے عروج و زوال اور ان کے اثرات کو بھی خوب سمجھتے تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ اردو کے سچے بہی خواہ اور شیدائی تھے - چنانچہ انہوں نے خود بھی تحقیقی و تنقیدی کتابیں لکھیں اور دوسروں سے بھی لکھوائیں ، کسی ایک موضوع پر نہیں، ہر موضوع پر انہوں نے خود بھی قلم اٹھایا اور دوسروں کو بھی دعوت دی -

لغات سے متعلق انگریزی اردو ڈکشنری ، فرہنگ اصطلاحات علمیہ ، اصول وضع اصطلاحات ، اردو زبان میں علمی اصلاحات کی تاریخ ، فرہنگ اصطلاحات پیشہ وراں اور نوادر الالفاظ وغیرہ ، تاریخ زماں اور تحقیق سے متعلق قدیم اردو کی درجنوں مثنویاں ، نثری قصے اور اردو شعرا کے تذکرے۔ صرف و نحو اور عروض کے سلسلے میں ” دریائے لطافت ، اور قواعد اردو “ ادبی تنقید کے موضوع پر بوطیقا کا اردو ترجمہ، فن شاعری ، تنقید شعر العجم جیسی بلند پایہ کتابیں انجمن کے ذریعے منظر عام پر آئیں اور اردو کے مزاج کو زیادہ سے زیادہ سنجیدہ اور علمی بنانے میں معاون ثابت ہوئیں - ۱۲۹

۱۲۸ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۲۳

۱۲۹ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۲۷

اردو زبان کی ترقی اور اشاعت کے لئے انجمن نے رسائل بھی نکالے۔ ان میں سہ ماہی ''اردو'' اور ''ہماری زبان'' (قومی زبان) خاص اہمیت و شہرت کے مالک ہیں اور آج بھی جاری ہیں۔ برصغیر کی ہندو مسلم سیاست کے میدان میں اردو ہندی کی جنگ در اصل انہیں پرچوں کے ذریعے لڑی گئی۔ ایک طرف ان پرچوں نے اردو زبان و ادب کے معیار کو بلند کیا دوسری طرف برصغیر کے گوشے گوشے میں اردو کی آواز کو پہنچا دیا۔ رسالہ اردو میں '' افکار و واقعات '' اور '' ادبی معلومات '' کے عنوان سے انجمن کی کار گزاری اور اردو ہندی نزاع سے متعلق دوسرے اہم واقعات برابر چھپتے رہتے تھے، اس سے بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ اردو کے سارے بہی خواہوں میں اشتراک عمل قائم رہتا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو جاتا تھا کہ اردو کی مخالفت یا مدافعت میں کسی خاص علاقے میں کیا کام ہو رہا ہے اور انہیں کیا کرنا چاہئے۔

مولوی عبدالحق کی ذاتی کوششوں سے یہ بھی ہوا کہ مسلم لیگ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاسوں کی طرح انجمن ترقی اردو کے اجلاس بھی اردو کانفرنس کے نام سے جا بجا ہونے لگے۔ ہر صوبے، ہر ضلع، ہر ریاست اور بڑے قصبے میں انجمن کی شاخیں قائم کی گئیں۔ جہاں جہاں اردو کا رواج کم تھا اور ہندی کے غلبہ پا جانے کا خطرہ تھا وہاں وہاں خاص طور پر انجمن کی طرف سے اردو کی حمایت و اشاعت کے لئے جلسے کئے گئے اور مختلف علاقوں کے کام کرنے والوں کے درمیان اتحاد و اشتراک کی فضا پیدا کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ ان کوششوں کی بدولت چند برسوں میں برصغیر کے امیر، غریب اور متوسط گھرانوں کے سارے مسلمانوں میں باھمی ہمدردی اور قومی یکجہتی کا ایسا جذبہ رونما ہوا کہ کسی اور ذریعہ سے اب تک دیکھنے میں نہ آیا تھا۔ پوری مسلمان قوم اردو کے مسئلے پر ہم خیال و ہم رائے ہو گئی اور ہندوؤں نے پورے برصغیر میں اردو کی جگہ ہندی کو قومی زبان بنانے کا جو خواب دیکھا تھا وہ شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ گاندھی جی نے ہندی کو کبھی ''ہندوستانی''، کبھی ''ہندی ہندوستانی'' کہہ کر بہت فریب دینا چاہا لیکن انجمن ترقی اردو اور مولوی عبدالحق کی کوششوں نے اس فریب کو

کامیاب نہ ہونے دیا۔ ۱۹۳۶ء میں بمقام ناگپور، بھارتیہ ساہتیہ پریشد کا جو اجلاس ہوا تھا اس میں مولوی عبدالحق نے پوری طرح بھانپ لیا تھا کہ ہندو اور کانگریس کے نیتا ہر حال میں ہندی کو قومی زبان بنانا چاہتے ہیں، چنانچہ انھوں نے اسی وقت سے اس خطرے کے متعلق وضاحت سے لکھنا شروع کیا اور اردو کے بہی خواہوں کو پورے حالات سے باخبر رکھنے کے لئے بہ عجلت یعنی ۱۹۳۶ء ہی میں بمقام علیگڑھ خاص خاص لوگوں کا ایک جلسہ کرنے کا ارادہ کیا اس جلسے میں مختلف صوبوں اور علاقے کے لوگوں کو شرکت کی دعوت دی گئی۔ دعوت نامے میں مولوی صاحب نے لکھا:

"جس تجویز کا میں نے اپنے مضمون "بھارتیہ ساہتیہ پریشد کی اصل حقیقت" میں وعدہ کیا تھا، وہ میں جناب کی خدمت میں بھیجتا ہوں۔ مجھے آپ جیسے باخبر اور صاحب بصیرت شخص کی خدمت میں اس امر کے جتانے کی ضرورت نہیں کہ ہماری زبان کے لئے یہ وقت بہت نازک ہے اور اگر اس وقت ہم نے اس کے تحفظ اور ترقی کے لئے کچھ نہ کیا تو ہم اپنے ملک اور قوم کے حق میں بڑا ظلم کریں گے۔ وقت کی نزاکت اور ملک کے حالات کو دیکھ کر بہت غور و فکر کے بعد یہ تجویز مرتب کی گئی ہے اور مصمم ارادہ کر لیا گیا ہے کہ خواہ ہمارے راستے میں کیسی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں ہم اس پر عمل کرکے رہیں گے۔ اس غرض سے منتخب اصحاب کی ایک کانفرنس کا انعقاد علیگڑھ یونیورسٹی میں اکتوبر کی ۲۴ اور ۲۵ کو کیا جائے گا۔ اس کانفرنس میں جس میں ہر صوبے کے نمائندوں کو مدعو کیا گیا ہے یہ تجویز غور و بحث کے لئے پیش کی جائے گی۔ لہذا مودبانہ التماس ہے کہ جناب اس کانفرنس میں شریک ہو کر اپنے خیالات سے مستفید فرمائیں۔ یہ کانفرنس کوئی عام مجمع نہ ہوگا بلکہ صرف ایسے منتخب اصحاب کو زحمت دی گئی ہے جو زبان کے معاملے میں خاص بصیرت اور تجربہ رکھتے ہیں اور اپنے اپنے صوبے کے نمائندہ ہو سکتے ہیں تاکہ اس تجویز

کے ہر پہلو پر اطمینان کے ساتھ غور اور بحث ہو سکے کانفرنس کی منظوری کے بعد عام طور پر اس کا اعلان کیا جائے گا اور جو امور کانفرنس میں طے ہوں گے ، ان پر جہاں تک جلد ممکن ہوگا ، عمل درآمد شروع کر دیا جائے گا۔

چونکہ یہ نہایت اہم اور ضروری مسئلہ ہے اور اس کا قطعی فیصلہ کرنا ہے اس لئے آپ کی شرکت کی خاص طور پر استدعا کی جاتی ہے۔ ایسے اجتماع بار بار نہیں ہو سکتے ۔ اس موقع کو غنیمت سمجھ کر جہاں تک ہمارے امکان میں ہے اسے کامیاب بنانے کی کوشش کرنی چاہئے ۔" ۱۳۰

۲۴ اور ۲۵ اکتوبر کو جلسہ ہوا اس میں مختلف صوبوں کے نمائندے شریک ہوئے۔ ڈاکٹر ضیاالدین استقبالیہ کمیٹی کے صدر اور پروفیسر رشید احمد صدیقی سکریٹری تھے ، پہلے دن اجلاس کی صدارت راجہ امیر احمد خان محمود آباد نے کی اور دوسرے دن کے اجلاس کے صدر نواب مہدی یار جنگ تھے۔ شرکا میں پنڈت امر ناتھ ساحر ، علامہ کیفی ، منشی مہیش پرشاد اور رام بابو سکسینہ جیسے ممتاز غیر مسلم اردو ادیب بھی شامل تھے ، مولوی عبدالحق نے جلسے کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا اردو کی اشاعت و حفاظت کی طرف خصوصی توجہ کرنے کی ضرورت ہے ورنہ سیاسی وجوہ کی بنا پر بہت جلد اس کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ چنانچہ طے پایا کہ انجمن کو زیادہ سے زیادہ فعال ادارہ بنایا جائے۔ اردو کے حقوق کی حفاظت زیادہ قوت کے ساتھ کی جائے اور علمی و ادبی مطبوعات کی رفتار کو تیز تر کر دیا جائے۔ ساتھ ھی مشاورتی کمیٹی تشکیل دی گئی جس کے ارکان میں ڈاکٹر علامہ اقبال ، عبدالستار صدیقی ، مولانا ظفر علی خان ، پنڈت کیفی ، سرتیج بہادر سپرو ، نواب صدر یار جنگ شیروانی ، علامہ سید سلیمان ندوی حافظ محمود شیروانی ، پنڈت کشن پرشاد کول ، مولانا حسرت موہانی ، مولوی

۱۳۰۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ٦٦

عبدالحق (مدراس) ، رضا علی وحشت ، قاضی عبدالودود ، مولانا عبدالماجد دریا بادی اور ڈاکٹر تارا چند کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ اس جلسے میں یہ بھی طے کیا گیا کہ انجمن کا صدر دفتر اورنگ آباد سے دہلی منتقل کر دیا جائے ۔۱۳۱ چنانچہ ۱۹۳۸ء میں انجمن کا صدر دفتر ، دکن کے بجائے برصغیر کے مرکز دہلی میں آ گیا اور اب ان لسانی جھگڑوں سے نپٹنا انجمن کے لئے قدرے آسان ہو گیا جو کانگریس اور گاندھی جی کی ہٹ دھرمیوں کے سبب ہندی اردو کے سلسلے میں پیدا ہو گئے تھے ۔

اس زمانے میں ، سیاسی جماعتوں اور علمی اداروں سے قطع نظر انفرادی سطحوں پر بھی اردو کے لئے خاصا کام ہوا ۔ خلافت کمیٹی کی سرگرمیاں خصوصاً اردو کے حق میں مفید ثابت ہوئیں ۔ اول اس لئے کہ اس کے جلسوں میں تقریر و تحریر ، بحث و مباحثہ اور روئداد نویسی کا سارا کام اردو میں ہوتا تھا ، دوسرے یوں کہ برصغیر کے ہر علاقے کے مسلمان مذہبی جوش و خروش کے ساتھ اس سے وابستہ تھے اور خلافت تحریک کے بہانے انہیں اردو سے بھی روشناس ہونے کا موقع مل رہا تھا ۔

ہندی اردو تنازع اور ہندو مسلم سیاست کی ترجمانی بھی بالعموم اردو ہی کے اخبار و رسائل کرتے تھے ، اردوئے معلیٰ (علیگڑھ) ، الہلال (کلکتہ) ، البلاغ (دہلی) ، ہمدم (لکھنو) ، زمیندار (لاہور) ، سیاست (لاہور) ، انقلاب (لاہور) ، مدینہ (بجنور) ، الجمیعت (دہلی)، وحدت (دہلی) ، الامان (دہلی) ، خلافت (بمبئی) ، الوحید (کراچی) ، العصر (دہلی) ، عصر جدید (کلکتہ) ، ملاپ (امرتسر) ، پرتاب (دہلی) اور تیج (لاہور) وغیرہ اسی زمانے کی یادگار ہیں ۔ ان کا تعلق اگرچہ مختلف الخیال اداروں اور جماعتوں سے تھا لیکن زبان سب کی اردو تھی ۔ علمی و ادبی رسالوں میں دلگداز، مخزن ، تمدن ، ادیب ، نقاد ، معارف ، اردو ، نگار ، زمانہ ، الناظر اور بعض دوسرے پرچوں نے اردو زبان و ادب کی تاریخ میں گراں قدر اضافہ کیا ۔ ان اخبارات و رسائل کے

۱۳۱ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ٦٦

مدیروں اور مقالہ نگاروں میں ہندو بھی تھے مسلمان بھی ، سینکڑوں مضامین اردو ہندی نزاع کے سلسلے میں لکھے گئے لیکن چند کے سوا بیشتر میں کوئی خاص بات نہیں ، عام طور پر ایک ہی موقف اور ایک ہی قسم کے خیالات و دلائل کو دھرایا گیا ہے اور زیادہ تر رسم الخط کے موضوع پر مضامین لکھے گئے ہیں ۔

اخبارات و رسائل کی طرح بعض علمی و تعلیمی اداروں کے قیام نے بھی اردو اور اس کی تحریک کو موثر بنانے میں مدد کی ہے ، ندوۃ العلما ، لکھنؤ ۔ مسلم یونیورسٹی ، علیگڑھ ۔ جامعہ عثمانیہ ، حیدر آباد ۔ جامعہ ملیہ ، دھلی اور ادارہ ادبیات اردو ، حیدرآباد وغیرہ اسی زمانے میں قائم ہوئے اور ان سب نے اردو کی ترویج و ترقی میں غیر معمولی کردار ادا کیا ۔

ناگری، رومن اور اردو رسم الخط کا قضیہ

پچھلے تیس سال یعنی ١٩٠٦ء اور ١٩٣٦ء کے درمیان اردو ہندی تنازع کے سلسلے میں جو مسائل و موضوعات زیر بحث رہے ، ان میں " رسم الخط " اور ہندوستانی کو مرکزی اہمیت حاصل رہی " ہندوستانی " کی بحث کا آغاز اگرچہ ١٩٢٥ء ہی سے ہو چکا تھا۔ ١ جبکہ کانگریس نے اس کو برصغیر کی قومی زبان تسلیم کیا تھا لیکن چونکہ اس بحث میں شدت ١٩٣٥ء کے بعد بلکہ قیام پاکستان سے چند برس پہلے پیدا ہوئی اس لئے اس کا ذکر آئندہ باب میں آئے گا ، البتہ " رسم الخط " کے مسئلے کا اس جگہ قدرے تفصیل سے جائزہ لینا ہے کہ اس عرصے میں یہی گھوم پھر کر اہل علم اور سیاست دانوں کا موضوع سخن رہا ہے۔ بقول مولوی عبدالحق :

" رسم خط کا مسئلہ آج تک بہت زیر بحث ہے اور خاصا بھڑوں کا چھتا بن گیا ہے ۔ اس میں مشکل یہ آن پڑی ہے کہ جیسا ہمارے ہاں عام دستور ہے رسم الخط کو قومی تہذیب اور مذہب کا جزو سمجھ لیا گیا ہے ۔ اس لئے موجودہ حالات میں یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ لوگ ٹھنڈے دل سے اس پر غور کریں گے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اس پر بحث کرنا ترک کر دیں ۔ غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اس مسئلے کو جذبات اور مذہب سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ اقتصادی مسئلہ ہے۔ جس رسم خط میں

١ - لینگوئج کنفلکٹ اینڈ نیشنل ڈولپمنٹ ، ص ١١١

صرف کم ہوگا، وقت کم لگے گا جگہ کم گھرے گی اور جس کے پڑھنے میں آسانی ہوگی اور جو دیکھنے میں خوش نما ہوگا وہی مقبول ہو کے رہے گا۔"۲

لیکن رسم الخط کے سلسلے کی جو بحث اس درمیان شد و مد سے جاری ہوئی وہ نئی نہ تھی۔ اس کی بنیاد بھی در اصل اسی وقت پڑ گئی تھی جب کہ فورٹ ولیم کالج، کلکتہ میں للو لال جی سے "پریم ساگر" لکھوا کر ناگری میں شائع کی گئی تھی۔ یوں کہنا چاہئے کہ فارسی اور ناگری رسم الخط کا جھگڑا اتنا ہی پرانا ہے جتنا ہندی اور اردو کا ــــ بلکہ تاریخی حالات پر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اردو ہندی قضیے کا آغاز بھی حقیقتاً "رسم الخط" کے سوال سے پیدا ہوا۔ بابو شیو پرشاد، بابو راجندر لال متر، بابو نوبین چند اور ان کے ہم خیال شروع میں صرف یہ چاہتے تھے کہ اردو کا رسم الخط فارسی کے بجائے ناگری کر دیا جائے۔ اس میں ان کی دانائی اور دور اندیشی کو دخل تھا وہ جانتے تھے کہ رسم الخط اور زبان میں چولی دامن کا ساتھ ہے اور جیسے ہی اردو کا رسم الخط بدلا گیا ہندی خود بخود ابھر کر سامنے آ جائے گی اور اردو کا اپنا وجود ختم ہو جائے گا۔ لیکن مخالفین کی یہ چال کامیاب نہ ہوئی۔ اردو کے بہی خواہوں نے جلد ہی ان کے در پردہ عزائم کو بھانپ لیا اور اردو کی حفاظت کے ساتھ فارسی رسم الخط کی حفاظت کو بھی ضروری خیال کیا۔ نتیجہ ظاہر تھا زبان اور رسم الخط کے مسئلے، ایک دوسرے سے نتھی ہو گئے اور آخر تک رہے۔ ہندی زبان سے قبل ناگری رسم الخط کا مطالبہ جیسا ابھی ذکر کیا گیا، خاص سبب سے تھا۔ ہندی الگ سے کوئی زبان نہ تھی۔ اس کا نحوی ڈھانچہ اور قواعد کے اصول وہی ہیں جو اردو کے، صرف سنسکرت کے الفاظ بکثرت استعمال کرنے سے ہندی بن جاتی تھی۔ ہندوؤں کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا چنانچہ انھوں نے پہلے اردو کو ناگری میں لکھنے کا مطالبہ کیا۔ پھر اس میں سے عربی و فارسی کے الفاظ نکال کر سنسکرت الفاظ شامل کر دئے اور اسے ہندی کا نام دے دیا۔ حتیٰ کہ

۲۔ خطبات عبدالحق، ص ۳۱۰

۱۸۹۸ء میں اردو کے خلاف جو طویل عرضداشت ہندوؤں کی طرف سے لیفٹیننٹ گورنر میکڈانلڈ کو دی گئی اس میں بھی صرف ”ناگری“ کو رائج کرنے کی گذارش کی گئی تھی۔ مولوی وحید الدین سلیم نے ”معارف“ بابت ستمبر ۱۹۰۰ء میں بہ عنوان ”حامیان ہندی اور ان کا مغالطہ“ لکھا ہے کہ:

”صوبہ جات متحدہ کے عام باشندوں کو جن کی زبان اردو یا ہندوستانی ہے اور جن میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے باشندے شامل ہیں سخت تعجب اس بات پر ہے کہ ہز آنر نواب لیفٹیننٹ گورنر اضلاع شمال و مغرب و اودھ نے ۲ مارچ ۱۸۹۸ء کو حامیان ناگری کے میموریل کے جواب میں جو اسپیچ کی تھی اس میں انھوں نے تسلیم کیا ہے کہ حامیان ناگری اس زبان کو تبدیل کرنا نہیں چاہتے جو عدالتوں میں رائج ہے بلکہ وہ اس خط کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں وہ لکھی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ۱۸ اپریل کے ریزولیوشن کو نافذ کرنے کے وقت خود نواب ممدوح نے بھی اس امر کا اقرار کیا ہے کہ یہ ریزولیوشن ہندی حروف کے عدالتوں میں جاری کرنے سے متعلق ہے۔ ہندی زبان سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ پھر آخر کیا وجہ اس بات کی پیش آئی کہ ۲۱ جون ۱۹۰۰ء کے ریزولیوشن میں ہندی زبان اور ناگری حروف دونوں کو عدالتوں میں جاری کرنے کا حکم صادر کیا گیا ہے۔ حالانکہ اس حکم کا ایک جز میموریل پیش کرنے والوں کی خواہش سے بھی زیادہ ہے۔[۳]“

اس بیان سے ایک اندازہ تو یہ ہوا کہ میکڈانلڈ صاحب کس درجہ اردو کے دشمن اور ہندی کے طرفدار تھے دوسرے یہ کہ ہندوؤں نے رسم الخط کی تبدیلی کا مطالبہ دانستہ اور خاص منصوبے کے تحت کیا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ کسی زبان کے لئے جو رسم الخط صدیوں تک استعمال میں آتا رہتا ہے اس میں اور اس زبان

۳۔ مضامین سلیم، جلد اول، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۱۶۴

میں طرح طرح کے بڑے گہرے اور دور رس تعلقات قائم ہو جاتے ہیں اور وہ زبان کے رگ و ریشہ میں اس طرح بندھ جاتا ہے کہ رسم الخط کو بدل دینے سے زبان کی صورت کے ساتھ اس کی روح کا بدل جانا بھی لازمی امر ہے۔ یہی حال اس قوم کا ہے جو اپنی زبان کے لئے ایک رسم الخط رکھتی ہے۔ اگر اس رسم الخط کو مطلقاً بدل دیا جائے تو وہ قوم اپنے ماضی، روایات، ادب، ثقافت، علوم، فنون سب سے بیگانہ ہو جائے گی گویا صدیوں کی ترقی کے بعد وہ پھر اپنے بچپن کی جانب لوٹے گی اور اس طرح اسے ایک ایسے عظیم خسارے سے واسطہ ہوگا جس کی کسی طرح تلافی نہیں کی جا سکتی۔'' ۴

چنانچہ ہندوؤں نے خاص اسی غرض سے کہ '' ناگری '' کے استعمال سے نہ صرف اردو بلکہ مسلمانوں کے سارے ثقافتی و تہذیبی سرمائے کا رفتہ رفتہ خاتمہ ہو جائے گا، ہندی زبان سے پہلے ناگری رسم الخط کو جاری کرنے پر زور دیا۔ ہندی کے بعض حامیوں نے بھی ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد یہ دعوی کرنا شروع کر دیا تھا کہ ناگری رسم الخط، فارسی رسم الخط سے بہتر ہے اور اس کا رواج مروجہ فارسی خط سے زیادہ مفید ثابت ہوگا ہندی کے سرگرم حامی راجندر لال متر نے ۱۸۶۴ء میں کہا تھا کہ:

'' ہندوستانی زبان سچ پوچھو تو دو رسم الخط میں لکھی جاتی ہے، ناگری اور فارسی۔''

۔۔ فرق یہ بتایا ہے کہ فارسی رسم الخط مسلمانوں کی ہندوستانی (اردو) اور ناگری رسم الخط ہندوؤں کی ہندوستانی (اردو) کے لئے استعمال ہوتا ہے۔

گارسین دتاسی نے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''اردو کو ناگری رسم الخط میں لکھنے سے عربی و فارسی الفاظ کو

۴۔ خیابان (خاص نمبر)، مطبوعہ شعبۂ اردو، پشاور یونیورسٹی، دسمبر ۱۹۶۴ء، ص ۷۰

پڑھنا اس سے بھی زیادہ مشکل ہو جائے گا جتنا کہ سنسکرت الفاظ کو فارسی رسم الخط میں ۔ ''۵

اردو کے رسم خط کی تبدیلی کے سلسلے میں ناگری ہی نہیں رومن یا لاطینی رسم الخط کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے ، گارسین دتاسی کے مذکورہ بالا خطبے سے یہ بھی پتہ چلتا ہے جس سال راجندر لال متر نے ناگری کو رائج کرنے کے سلسلے میں مضمون لکھا اسی سال ایک مستشرق ماہر لسانیات نے ایشیاٹک سوسائٹی ، کلکتہ کے رسالے میں اردو کو رومن میں لکھنے کا مشورہ دیا ، دلیل یہ دی کہ :

'' اردو کا کوئی اپنا مخصوص رسم خط نہیں ہے ۔ فارسی رسم خط ہندی نژاد نہیں ہے اور دیوناگری رسم خط میں جو ہندوؤں میں بالعموم مروج ہے یہ صلاحیت نہیں کہ وہ اس زبان کے فارسی عناصر کا بخوبی احاطہ کر سکے ۔''

گارسین دتاسی نے اس کے جواب میں لکھا کہ :

'' اردو کو لاطینی خط میں لکھنا مفید نہ ہوگا اس واسطے کہ لاطینی حروف کے ساتھ مزید ایسے حروف کی ضرورت ہوگی جن پر خصوصی علامتیں لگی ہوئی ہوں ۔ یہ ایک نیا نظام تہجی ہوگا ۔ اور ان کا سیکھنا ہندی کے حروف تہجی سے بھی زیادہ دشوار ہوگا ۔'' ۶

گارسین دتاسی نے اور بھی کئی خطبوں میں زور دے کر کہا ہے کہ :

'' زبان اور رسم الخط ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہوتے ہیں اس لئے اردو کے رسم الخط کو ناگری یا رومن میں بدلنا اس کے حق میں تباہ کن ثابت ہوگا ۔''

۵ ۔ خطبات گارسین دتاسی ، حصہ دوم ، ص ۲۲

۶ ۔ خطبات گارسین دتاسی ، حصہ دوم ، ص ۲۳

اپنی مشہور ”تاریخ ادب ہندوستانی“ کے مقدمے میں بھی اس نے اس موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

”گذشتہ کئی برسوں سے ہندوستان میں وہی رجحان پیدا ہوگیا ہے جو یورپ میں قومیت کے نام پر پیدا ہوا تھا۔ ہندوؤں نے اردو پر حملے شروع کر دئیے ہیں۔ ان کا دعوی ہے کہ ملک کی عام زبان اردو نہیں ہندی ہے، لیکن اس حقیقت کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اردو ایک دلکش ادبی سرمایہ رکھتی ہے۔ اس کے برعکس ہندی کا ادبی حیثیت سے عدم وجود برابر ہے۔ یہ مسئلہ ادبی نوعیت کا ہے جیسے فرانس میں تنگ نظر قوم پرستوں نے صوبائی بولیوں کو از سر نو زندہ کرنے کی کوشش میں اٹھایا تھا اسی طرح ہندو فارسی رسم الخط کے مخالف ہیں اور دیو ناگری کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ایسا کرنا آنکھ سے اندھے ہونے کے مترادف ہے بہر حال مسلمانوں نے بڑی حوصلہ مندی سے ان کے حملوں کا مقابلہ کیا اور ایسی قوی دلیلیں پیش کیں کہ میرے نقطۂ نظر سے وہ کامیاب رہے۔ یہ اختلاف در اصل نسل و مذہب کے اختلاف سے پیدا ہوا ہے، کون جانے کہ انگریزی حکومت رومن حروف تہجی کو رواج دے کر اس اختلافی مسئلے کو ختم کر دے گی یا باقی رکھے گی لیکن اگر ایسا ہوا تو یہ علمی و ادبی حیثیت سے ایک افسوسناک واقعہ ہوگا۔“[۷]

غرضیکہ اردو کے لئے فارسی خط کے بجائے ناگری یا رومن رسم الخط کی تجویزیں بہت پرانی ہیں، ان تجویزوں پر بحث کا سلسلہ سیاسی، علمی اور صحافتی ہر سطح پر ایک مدت سے جاری ہے۔ انیسویں صدی تک یہ بحث عموماً انفرادی حیثیت کی تھی یا زیادہ سے زیادہ علمی و ادبی انجمنوں کی

۷۔ مقدمہ تاریخ ادب ہندوستانی (اردو ترجمہ قلمی)، مخزونہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، کراچی یونیورسٹی، ص ۴

نمائندگی تک محدود تھی ، لیکن بیسویں صدی میں یہ ھندو مسلم سیاست کا ایک جزو بن گئی اور علمی و ادبی شخصیتوں کے ساتھ اس بحث میں سیاسی مفکرین اور قومی رھنما سبھی شریک ھو گئے، دھواں دھار تقریریں ھوئیں ، مقالات لکھے گئے ، اخبارات میں اداریے اور کالم چھپے ۔ علمی و ادبی اور تعلیمی و سماجی انجمنوں نے قراردادیں منظور کیں ۔ سیاسی جماعتوں کے درمیان مشترک قومی زبان اور مشترک رسم الخط کی تلاش میں مذاکرات ھوئے لیکن یہ ساری چیزیں عملاً بے نتیجہ ثابت ھوئیں اور ھونا بھی یہی چاھئے تھا، اس لئے کہ ایک زبان کے مستقل رسم الخط کو خارج کرکے اس پر کسی دوسری زبان کے رسم الخط کو منطبق کرنے یا مروجہ رسم الخط کو پنچایت یا حکم و احکام کے ذریعے شعوری طور پر آسان بنانے کا عمل ایک غیر فطری عمل تھا ۔ زبان چھوٹی ھو یا بڑی رسم الخط اس کا بنیادی جزو ھوتا ھے، نہ تو رسم الخط کو زبان سے جدا کیا جا سکتا ھے اور نہ کوئی زبان بغیر اپنے مخصوص رسم الخط کے بہت دنوں تک زندہ رہ سکتی ھے ۔ ان کا باھم تعلق جسم و جان کی طرح ھے ۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری لکھتے ھیں کہ :

”یوں تو روح کے لئے ھر جسم برابر ھے ، کوئی بھی ھو ، جسم اگر صالح ، توانا اور کامل ھے تو روح کو ترقی کرنے اور اندرونی توانائی حاصل کرنے کی بڑی آسانیاں ھیں ۔ زبان کو بھی رسم الخط چاھئے وہ رسم الخط کی محتاج ھے اور رسم الخط کی صلاحیت اور کاملیت کا اثر زبان پر بھی پڑتا ھے۔ ایک اور مثال درخت و زمین کی ھے۔ درخت کو زبان سمجھئے اور زمین کو رسم الخط ۔ درخت ایک خاص قطعہ زمین سے متعلق ھوتا ھے جس میں اس کی جڑیں پیوست ھوتی ھیں۔ درخت کی نشوونما میں ایک قطعۂ زمین کا بڑا دخل ھوتا ھے، رسم الخط کو زبان کی نشوونما میں تو کوئی دخل نہیں لیکن وہ زبان کے مزاج اس کی گوناگوں تبدیلیوں اور ارتقائی منزلوں کا حامل ھوتا ھے۔ رسم الخط زبان کا آئینہ ھے جس میں اس کے خط و

خال نظر آتے ہیں - اس کی زندگی کا مقیاس ہے ، ایک کتاب ہے جس میں زبان کی پوری تاریخ لکھی ہوتی ہے -

درخت جو زمین میں جڑ پکڑ چکا ہے آسانی کے ساتھ اکھاڑا نہیں جا سکتا اور اگر کسی تختۂ زمین سے اکھاڑ کر دوسری جگہ اس کو جما دیا جائے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ درخت خشک ہو جاتا ہے اور اگر دوسری جگہ جم بھی جاتا ہے تو اچھے پھل نہیں دیتا - یہ اثر اس زمین سے الگ کرنے کا ہوتا ہے جہاں وہ عرصہ سے لگا ہوا تھا - یہ تو ایک مثال ہے -

کسی زبان کے قدیم رسم الخط کو ترک کرنا اور اس کی جگہ کوئی دوسرا خط اختیار کرنا ایک غیر فطری عمل ہے اس سے زبان کا مزاج بدل جاتا ہے - اس کی تاریخ مٹ جاتی ہے - لفظ بے جان ہو جاتے ہیں اور زبان میں وہ اثر اور جادو نہیں رہتا جو جگ بیتنے پر اس نے حاصل کیا تھا - ،، ۸

بایں ہمہ اس غیر فطری عمل کو بعض حضرات برصغیر کی تقسیم کے بعد بھی ہندوستان و پاکستان میں آزمانے کی کوششیں کرتے رہے اگرچہ کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی - پروفیسر سید احتشام حسین نے بہ عنوان زبان اور رسم خط کا تعلق اس بات کا اظہار کیا کہ :

,, یہ بات طے شدہ ہے کہ زبان پہلے پیدا ہوئی اور اس کا رسم خط بعد میں - میں اس سے یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ زبان اور رسم خط میں کوئی باطنی تعلق نہیں ہے بلکہ رسمی ہے - پھر جو یہ خیال بار بار دھرایا جاتا ہے کہ اگر کسی زبان کا رسم خط بدلا گیا تو وہ زبان بھی ختم ہو جائے گی ، اس کا مطلب کیا ہے ؟

اب اگر یہ بات طے ہو جائے کہ زبان اور رسم خط الگ الگ چیزیں ہیں اور کوئی زبان کسی رسم خط میں لکھی جا سکتی ہے تو پھر

۸ - نگار (لکھنؤ) بابت اگست ۱۹۵۱ء ، ص ۳۱

اردو کے لئے دیو ناگری ، لاطینی اور فارسی رسم خط میں سے کسی ایک کے منتخب کرنے کا سوال دوسری نوعیت اختیار کرے گا۔ فطرت ، مزاج اور نفسیات کے نام پر بہت سے علمی مغالطے تیار کئے گئے ہیں۔ انھیں میں سے ایک یہ بھی ہے اگر رسم خط بدل دیا جائے گا تو زبان بدل جائے گی یا خراب ہو جائے گی۔" ۹

پروفیسر سید احتشام حسین نے رسم الخط کی تبدیلی کے سلسلے میں جو دلائل دئے تھے اول تو وہ بہت کمزور تھے دوسرے یہ کہ وہ خود بھی رسم الخط اور زبان کے گہرے رشتے سے خوب واقف تھے اور انھوں نے انجان بن کر اس موضوع کو محض بحث مباحثے کے لئے چھیڑا تھا اس لئے کہ جیسے ہی ان کے مضمون کے جواب میں علامہ نیاز فتح پوری اور دوسرے ادیبوں نے قلم اٹھایا وہ اپنے موقف سے دست بردار ہو گئے۔

اس کے بعد ڈاکٹر عندلیب شادانی نے بہت پرانے مسئلے کو ایک نئے شوشے کے طور پر پھر چھوڑا اور اردو املا کو آسان بنانے کی غرض سے بعض آوازوں کو اردو کے حروف تہجی سے خارج کرنے کی تجویز پیش کی۔ ۱۰ اس کی رد میں پہلے بھی بہت کچھ لکھا جا چکا تھا پھر بھی کئی مضامین لکھے گئے۔ ہر طرف سے مخالفت ہوئی ، مولانا حامد حسن قادری نے لکھا :

" میرے نزدیک اردو کو آسان کرنے کی یہ تجویز نہایت خرابی کا باعث ہے۔ جب تک ہند و پاک میں مسلمان ہیں، اسلامی کلچر سے بے نیاز نہیں رہ سکتے اور کلچر کے اجزائے ترکیب و استحکام و ترقی میں عربی ، فارسی ، اردو تینوں زبانیں شامل ہیں اس لئے یہ نہیں ہو سکتا کہ صدہا لفظ جو تینوں زبانوں میں مستعمل ہیں ، عربی و فارسی میں صحیح لکھے جائیں اور اردو میں ث ، ذ ، ض ، ظ وغیرہ

۹ - نگار (لکھنؤ) بابت جون ۱۹۵۱ء، ص ۳۵ تا ص ۳۸

۱۰ - خاور (ڈھاکہ) بابت مئی ۱۹۵۲ء، ص ۳۹ تا ص ۴۲

بدل کر لکھے جائیں۔''۱۱

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے لکھا :

'' زبان وہ چیز نہیں کہ حاکم ، حکم جاری کر دے اور دوسرے ہی دن نئی زمین ، نیا آسمان بن جائے - یہ ان چیزوں میں ہے کہ۔

نہ بزورے نہ بزاری نہ بہ زر می آید '' ۱۲

پاکستان کے سابق صدر محمد ایوب خان کے اقتدار میں آنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں رسم الخط کا مسئلہ پھر شد و مد کے ساتھ اٹھایا گیا ، وہی سوال پرانی تجویز جس کا مقصد فارسی رسم خط کو رومن خط سے بدلنا تھا اور جس کی مخالفت گارسین دتاسی نے ۱۸۶۵ء کے خطبے میں کی تھی ، سامنے لائی گئی۔ اخبارات و رسائل کے ذریعے اس کے متعلق دوسروں کی آرا طلب کی گئیں ، کراچی کے اخبار جنگ نے اس پر رائے شماری کا سلسلہ شروع کیا ، نتیجہ وہی نکلا جو نکلنا چاہئے تھا یعنی چند ایک کے سوا عام و خاص سب نے رومن رسم الخط کی تجویز کو رد کر دیا۔

ان مباحث سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اردو کا رسم الخط دو چار سال نہیں پورے سو سال معرض بحث میں رہا ہے اور آج بھی اس کے خلاف بعض گوشوں سے آوازیں سننے میں آ جاتی ہیں - اس آواز کے خلاف سینکڑوں مدلل و مضبوط مضامین اردو کے مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں - مولوی عبدالحق کے خطبات اور گارسین دتاسی کے مقالات و خطبات میں تو مخالفین کی آرا کے ساتھ رسم الخط کا مسئلہ جگہ جگہ زیر بحث آیا ہے - انجمن ترقی اردو کے ترجمان '' ہماری زبان '' میں اس موضوع سے متعلق کم و بیش وہ ساری بحثیں محفوظ ہیں ، جو کانگریس اور مسلم لیگ کے موقف کے طور پر موضوع سخن رہیں - جیسا کہ پچھلی سطور میں ذکر کیا ہے ، زبان و ادب

۱۱ - خاور (ڈھاکہ) ، بابت جولائی ، ۱۹۵۲ء ، ص ۳۰

۱۲ - خاور (ڈھاکہ) ، بابت جولائی ، ۱۹۵۲ء ، ص ۳۰

کے بعض عالموں نے بھی بطور خاص توجہ کی اور اردو رسم الخط کی مدافعت میں نہایت کار آمد مضامین لکھے۔ پروفیسر مسعود حسین رضوی، ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی، پروفیسر معین الدین دردائی، سید عبدالقدوس ہاشمی، ڈاکٹر ابو اللیث صدیقی اور بعض دوسروں نے صرف یہی نہیں کہ ناگری، رومن اور اردو رسم الخط کی بحث میں ساری نئی پرانی دلیلوں کو سمیٹ لیا بلکہ بعض نئے دلائل کا اضافہ بھی کیا لیکن پچھلے سو سال کی لمبی اور تکرار بے جا سے پر بحث کو اس کے جملہ حوالوں اور تفصیلات کے ساتھ اس جگہ دھرانا نہ تو ممکن ھے نہ مفید، البتہ رسم الخط کے موضوع کا ایک مختصر سا جائزہ اس جگہ پیش کیا جا رہا ھے جسے اس موضوع سے متعلق سارے مباحث کا خلاصہ بھی کہہ سکتے ھیں۔ رسم الخط سے مراد وہ نقوش و علامات ھیں جنھیں حروف کا نام دیا جاتا ھے اور جن کی مدد سے کسی زبان کی تحریری صورت متعین ھوتی ھے۔ یوں بھی کہہ سکتے ھیں کہ زبان کی تحریری صورت کا نام رسم الخط ھے، زبان خود کیا ھے؟ اس جگہ مختصراً اتنا کہنا کافی ھے کہ زبان نام ھے مجموعۂ الفاظ کا۔ الفاظ مرکب ھیں اصوات سے اور اصوات نام ھے ان تصاویر، خطوط اور نشانات کا جو ارتقا کی منزلیں طے کرکے آج، حروف کے نام سے ھمارے سامنے ھیں۔ یہی حروف جو تلفظ کے ادا اور معنی کے اظہار کے لئے استعمال ھوتے ھیں اپنی مربوط صورت میں کسی زبان کا رسم الخط کہلاتے ھیں۔

زبان کی طرح رسم الخط کے وجود میں آنے کے بھی اسباب ھیں، زبان کی بالکل ابتدائی منزلوں میں جب کوئی آواز کسی کے منہ سے نکلی ھوگی تو آواز دینے والے نے مخاطب پر اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اصل چیز دکھائی ھوگی یا پھر جس چیز کی طرف توجہ دلانی مقصود رھی ھوگی اس کی نشاندھی کے لئے کوئی تصویر، نقش یا علامت بنا دی ھوگی۔ ٹھوس چیزوں کے سلسلے میں نقوش و علامات یا تصاویر سے بڑی مدد ملی ھوگی۔ لیکن جذبات و کوائف کو سمجھنے سمجھانے میں خاصی دشواری پیش آئی ھوگی اس لئے کہ جذبات و کوائف کا تعلق عالم خارجی سے نہیں عالم محسوسات سے ھے، پھر بھی آج

جبکہ ہر قسم کے اظہار کے لئے رسم الخط ہی سے کام لیا جا رہا ہے یہ کہنا مشکل نہیں رہ جاتا کہ انسان نے بہت جلد جذبات و محسوسات کے اظہار کے لئے بھی علامتیں وضع کر لی تھیں - یہی علامتیں ہزاروں سال کی مسافت طے کر کے حروف کے نام سے موسوم ہوئیں اور آج انہیں کا دوسرا نام رسم الخط ہے - زبان اور رسم الخط دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں کسی نے صحیح کہا ہے کہ رسم الخط کو کسی زبان کا محض لباس سمجھنا غلطی ہے - لباس کو اتار کر پھینکا جا سکتا ہے - بدلا جا سکتا ہے ، رسم الخط زبان کا لباس نہیں بلکہ اس کی جلد کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے اسے زبان سے الگ کرنے کا نتیجہ زبان کی تباہی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا - یہ خیال گمراہ کن ہے کہ کسی زبان کو دوسری زبان کے رسم الخط میں پوری صحت کے ساتھ لکھا جا سکتا ہے اور ایک زبان کے مطالب کسی دوسری زبان کے رسم الخط میں من و عن ظاہر کئے جا سکتے ہیں - اگر یہ ممکن ہوتا تو ہر زبان کے لئے ایک جداگانہ رسم الخط کی ضرورت نہ ہوتی ، ساری زبانیں ایک ہی قسم کے حروف یا رسم الخط سے اپنا کام چلا لیتیں لیکن ایسا ممکن نہیں ہے - مثال کے طور پر مندرجہ ذیل الفاظ دیکھئے :

(1) Head (2) Hid (3) Hell (4) Hill

اگر انہیں اردو میں لکھا جائے تو " ہڈ " اور " ہل " کے سوا کسی اور طرح لکھنا ممکن نہ ہوگا ، ظاہر ہے کہ یہ مجبوری ادائے تلفظ میں حارج ہوگی ، مزید وضاحت کے لئے حسب ذیل الفاظ دیکھئے :

(1) Eye, I
(2) Hear 'Heir
(3) Berth, Birth
(4) Hole 'Whole
(5) Die, Dye
(6) Foul, Fowl
(7) Lose, Loose
(8) Lawyer, Liar
(9) For, Far
(10) See, Sea
(11) Sun, Son

انھیں اردو میں علی الترتیب : آئی، هیر ، برتھ، هول، ڈائی، فاول، لوز، لائر، فار، سی اور سن لکھا جائے گا اور یہ سمجھنا مشکل ہوگا کہ انگریزی کا کونسا لفظ اس جگہ مراد ہے۔ انگریزی میں ہم تلفظ الفاظ ایک دو نہیں ہزاروں هیں ۔ اس لئے وہ اردو رسم الخط میں معنوی الجھن پیدا کریں گے ۔ ایک مثال اور دیکھئے :

Man, Main, Mean

میں سے انگریزی میں ہر ایک اپنا جدا تلفظ اور معنی رکھتا ہے لیکن اردو رسم الخط میں یہ سب " مین " کی صورت میں لکھے جائیں گے اور ان کے تلفظ و معنی تک پہنچنا دشوار ہوگا ، بعض انگریزی الفاظ تو ایسے هیں کہ انھیں کسی طرح اردو میں لکھا ھی نہیں جا سکتا مثلاً :

Pure, Cure, Sure

اردو میں " پیور "، " کیور "، " شیور " کی شکل میں لکھیے جائیں گے اور اپنا تلفظ یکسر کھو بیٹھیں گے۔ انگریزی کے Badge ، Catch اور Batch کی صورت اردو میں ترتیب وار " کیچ ، بیج اور بیچ " هو جائے گی اور یہ اردو کے با معنی لفظ بن جائیں گے ۔

انگریزی میں حروف علت (Vowel) یعنی A,E,I,O اور U کی آوازیں، اکثر الفاظ میں ایک سی ہو جاتی هیں مثلاً : Ought ‘Sir ‘Early ‘All اور Ugly وغیرہ ظاهر ہے کہ انھیں اردو رسم الخط میں الف یا ع سے لکھا جائے گا اور تلفظ و معنی دونوں کے سمجھنے میں دقت ہوگی ، اس جگہ یہ بات بھی ذهن میں رکھنی چاہئے کہ انگریزی میں حروف تہجی یا آوازیں صرف چھبیس هیں ، اس کے برعکس اردو میں حروف یا آوازوں کی تعداد تقریباً دگنی ہے۔ بایں همه اردو رسم الخط میں انگریزی کا لکھنا ممکن نہیں ہے ، عربی اور فارسی رسم الخط میں انگریزی لکھنے کی کوشش کی جائے تو اور زیادہ دشواریاں پیش آئیں گی۔ وجہ یہ ہے کہ انگریزی کی D اور T کی آوازیں پیدا کرنا عربی اور فارسی حروف کے ذریعے ممکن ھی نہیں ۔ اس قسم کی دشواریاں اردو

کو انگریزی حروف میں لکھنے سے پیدا ہوں گی۔ اردو میں حروف تہجی یعنی آوازوں کی تعداد کثیر ہے۔ ظاہر ہے کہ انگریزی کے چھبیس حروف ان کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ اردو کی بہت سی آوازیں ایسی ہیں جو انگریزی یا رومن رسم الخط میں موجود نہیں ہیں مثلاً د، ڑ، ت، ط، ع، غ، خ وغیرہ کی آوازوں کو لے لیجئے اور دل، پہاڑ، تمام، طالب، وسیع، غریب، خدا کو انگریزی میں لکھئے تو بالترتیب ان کی صورتیں یہ ہوں گی

Khuda, Gharib, Wasi, Talib, Tamam, Pahar, Dil

یعنی دل کو ڈل، پہاڑ کو پہار، تمام کو ٹمام، طالب کو ٹالب، وسیع کو وسی، غریب کو گریب اور خدا کو کھدا لکھا جائے گا۔ اس سے تلفظ و معنی، دونوں بری طرح مجروح ہوں گے۔ د، غ اور خ کی آوازیں تو رومن میں کسی طرح پیدا ہی نہیں کی جا سکتیں۔ اگر That کی مثال دے کر یہ کہا جائے کہ د کی آواز Th سے غ کی آواز Gh سے اور خ کی آواز Kh سے پیدا کر لی جائیں گی تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ دھ، گھ، کھ وغیرہ کی آوازیں کہاں سے آئیں گی؟ چنانچہ اگر مندرجہ ذیل الفاظ انگریزی میں لکھے جائیں:

غل، گھل، تھم، خر، کھر وغیرہ

تو ان کی صورتیں یہ بنیں گی اور اوپر کے لفظوں میں سے صرف ایک ہی سمجھا جائے گا۔

Khar, Tham, Ghaul

ایسی ہی مشکلات، ا اور ع، ح اور ہ، ث، ص، س اور دوسرے مشابہ الصوت حروف کی آوازوں میں پیش آئیں گی اور ان کے ذریعے تلفظ و معنی کا اخذ کرنا نا ممکن ہوگا۔

ان مثالوں سے ظاہر ہے کہ ہر زبان کا رسم الخط اس کے اپنے مزاج اور ساخت کے مطابق ہوتا ہے اور وہ اسی میں صحیح طور پر پڑھی اور لکھی جا سکتی ہے، کسی دوسری زبان میں رسم الخط منتقل کرنے سے اس کی صورت اس قدر مسخ ہو جائے گی کہ پہچاننا مشکل ہو جائے گا اسی لئے رسم الخط کو زبان کا لباس نہیں جلد کہا جاتا ہے۔ جلد اتار دینے سے زبان اصل صورت میں باقی نہیں رہ سکتی۔ رہ گیا یہ سوال کہ اردو کا رسم الخط کس قسم کا

ہے اور اس میں کیا خامیاں اور خوبیاں ہیں؟ سو اس سلسلے میں یہ بتانا ضروری ہے کہ کسی زبان کے رسم الخط کی اچھائی یا برائی کو دو طریقوں سے پرکھا جا سکتا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کس حد تک مفید و آسان ہے اور دوسرے یہ کہ دیکھنے میں کتنا خوبصورت ہے۔ اوپر بتایا جا چکا ہے کہ ہر زبان کے نظام تہجی میں اتنے ہی حروف یا نشانات ہوتے ہیں جتنی اس کے بولنے میں آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ان حروف کی غرض و غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ ساری آوازوں کو آسانی اور خوبصورتی کے ساتھ پڑھنے والوں کے سامنے لے آئیں، اس لحاظ سے اردو کا رسم الخط بہت جامع اور کامیاب رسم الخط ہے کہ وہ اس زبان کی ساری مروج آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے۔

اردو رسم الخط میں حروف تہجی کی تعداد پچاس ہے انگریزی میں یہ صرف چھبیس ہیں، ہندی یعنی ناگری رسم الخط میں ان کی تعداد بیالیس ہے عربی میں انتیس اور فارسی میں تینتیس ہے۔ یہ حروف چونکہ ان زبانوں میں استعمال ہونے والی آوازوں کی تعداد کا تعین کرتے ہیں اس لئے آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ اردو زبان میں آوازوں کی تعداد سب سے زیادہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اردو بین العلاقائی و بین المملکتی مزاج کی زبان ہے۔ اس نے اپنے نظام تہجی میں عربی، فارسی اور ہندی یعنی آریائی اور سامی دونوں خاندان کی زبانوں سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس میں انگریزی سے لے کر علاقائی زبانوں تک کی ساری زبانیں اس طرح سما گئی ہیں کہ وہ دنیا کی مختلف زبانوں کی آوازوں کا مجموعہ بن گئی ہے۔ ہر اردو جاننے والا عربی، فارسی، ہندی اور انگریزی کو ان کے حقیقی تلفظ کے ساتھ عموماً بول سکتا ہے اس لئے کہ ان میں ایک آواز بھی ایسی نہیں جو اردو میں موجود نہ ہو یا جس کو ادا کرنے پر اردو خواں طبقہ قادر نہ ہو۔ گویا جس طرح اردو اپنے ذخیرۂ الفاظ اور صرف و نحو کے اصول کے لحاظ سے ایک مخلوط زبان ہے اسی طرح اس کا رسم الخط بھی مخلوط ہے۔ وہ دائیں سے بائیں کو لکھی جاتی ہے اور ظاہر میں عربی و فارسی رسم الخط سے بہت قریب ہے لیکن اردو کے رسم الخط کو عربی یا فارسی کا رسم الخط خیال کرنا درست نہ ہوگا۔ اردو کے حروف تہجی میں ہندی اور

انگریزی کی ایسی آوازیں بھی شامل ھیں جو عربی و فارسی میں نہیں ھیں۔ ان آوازوں کی تعداد ایک دو نہیں خاصی ھے مثلاً :

ڈ ، ٹ ، ڑ ، بھ ، تھ ، ٹھ ، کھ ، جھ ، دھ

وغیرہ کی آوازیں نہ عربی میں ھیں نہ فارسی میں، ظاھر ھے کہ عربی و فارسی داں حضرات کو ان آوازوں کے نکالنے اور ھندی یا انگریزی کو صحیح تلفظ کے ساتھ لکھنے پڑھنے میں سخت مشکل ھوگی لیکن اردو خواں افراد کو کسی زبان کے سیکھنے یا اسے لکھنے پڑھنے میں بہت آسانی رھے گی۔ نتیجتاً کہنا پڑتا ھے کہ اردو کا اپنا رسم الخط ھے اور اس کی وسعت ساری زبانوں کو اپنے اندر سمیٹے ھوئے ھے۔

سر ولیم جونز نے کہا تھا کہ :

”مکمل زبان وہ ھے جس میں ھر وہ خیال جو انسانی دماغ میں آ سکتا ھے ، نہایت صفائی اور زور کے ساتھ ایک مخصوص لفظ کے ذریعہ ظاھر کیا جا سکے۔ خیالات اگر سادہ ھوں تو الفاظ بھی سادہ اور اگر خیالات مشکل ھوں تو وہ بھی مشکل۔ اس طرح مکمل رسم الخط وہ ھے جس میں اس زبان کی ھر آواز کے لئے ایک مخصوص نشان ھو۔“ ۱۳

رسم الخط کی اس تعریف پر اردو کا رسم الخط پورا اترتا ھے۔ اردو رسم الخط کی جامعیت و ھمہ گیری سے قطع نظر، اس کا بڑا وصف یہ بھی ھے کہ ناگری اور انگریزی رسم الخط کے مقابلے میں جگہ بہت کم لیتا ھے، اس کا مطلب یہ ھوا کہ وقت اور کاغذ دونوں کی بچت ھوتی ھے۔ تیسری بات یہ ھے کہ دیکھنے میں بھی دیدہ زیب ھے۔ انگریزی اور ھندی زبانوں کے حروف کے ساتھ اردو حروف پر ایک نظر ڈالیے تو اندازہ ھوگا کہ سادگی کے باوجود اردو کے حروف نگاہ کے لئے ایک خاص قسم کی کشش رکھتے ھیں۔ چوتھی خوبی یہ

۱۳ - زبان اور اردو زبان ، ص ۵۲

ہے کہ اردو میں اعراب کی ضرورت نہیں پڑتی۔ رومن میں A,E,I,O,U کے حروف زبر، زیر اور پیش کی آواز کے لئے جگہ جگہ استعمال ہوتے ہیں، یہی حال ناگری یا ھندی رسم الخط کا ہے۔

अ ، आ ، इ ، ई ، उ ، ऊ ، ए ، ऐ ، ओ ، औ

اور ان کی ماترائیں اعراب کی حرکتیں پیدا کرتی ہیں۔ چنانچہ جگہ جگہ ان حروف علت اور ان کی علامتوں سے کام لینا پڑتا ہے۔ اردو میں آسانی یہ ہے کہ اعراب کے لئے الگ سے حروف نہیں ہیں بلکہ اعراب کا کام زبر، زیر، پیش کے مختصر نشانات سے لے لیا جاتا ہے، اس کی ضرورت بھی کچھ دنوں کے لئے رہتی ہے بعد کو جب مشق بہم پہنچا لی جاتی ہے تو ان نشانات کی بھی ضرورت نہیں رہتی۔ جملے کی ساخت اور مفہوم کے لحاظ سے ہر لفظ کے اعراب خود بخود ذہن میں ابھر آتے ہیں۔ یہ اردو کا ایسا وصف ہے جو دوسری زبانوں میں بہت کم نظر آتا ہے۔

پانچویں امتیازی بات یہ ہے کہ اردو رسم الخط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا ہے اور اس کے حروف اور ان کی آوازیں عربی و فارسی سے بہت قریب ہیں، یہ قربت اردو والوں کو عربی اور فارسی سیکھنے میں مدد دیتی ہے۔ عربی و فارسی والے بھی بہ آسانی اردو میں مہارت حاصل کر لیتے ہیں۔ عربی و فارسی سے ہمارا جو ثقافتی و تہذیبی اور اسلامی و دینی رشتہ ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اردو کا رسم الخط ان رشتوں کو استوار کرنے میں معاونت کرتا ہے۔ اس طرح کی اور کئی باتیں اردو رسم الخط کی خصوصیات میں شمار کی جا سکتی ہیں لیکن ان اوصاف کے باوجود اردو رسم الخط پر اعتراضات کئے گئے ہیں۔ خاص اعتراضات یہ تھے:

(۱) اردو رسم الخط میں حروف تہجی کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔ اس لئے ان کا سیکھنا اور سکھانا بہت مشکل ہے۔ اس کے برعکس دوسری زبانوں کے حروف تعداد میں بھی کم ہیں اور لکھنے میں بھی سادہ ہیں۔

(۲) اردو کے حروف کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں، کبھی پورے

لکھے جاتے ھیں کبھی آدھے اور کبھی کبھی صرف ان کا چہرہ بنا دیا جاتا ھے ۔ یہ تبدیلی ، اردو لکھنا پڑھنا سکھانے میں حارج ھوتی ھے ، اور اردو پر قابو پانے کے لئے دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ وقت ضائع ھوتا ھے ۔

(۳) اردو میں ہم صوت ، یعنی ایک ھی قسم کی آواز رکھنے والے حروف متعدد ھیں مثلاً ا اور ع ۔ ت اور ط ۔ ث ، س ، ص ۔ ذ ، ز ، ژ ، ظ ، ض ۔ ح اور ہ وغیرہ یہ آوازیں ، املا میں خاص طور پر الجھن پیدا کرتی ھیں ۔ یہ سمجھنا مشکل ھوتا ھے کہ کونسا لفظ ”ث“ سے لکھا جائے، کونسا ”س“ سے اور کونسا ”ص“ سے ۔

(۴) اردو میں اعراب کی دشواریاں ھیں ، یہاں ناگری اور رومن کی طرح زیر ، زبر اور پیش کے لئے حروف نہیں ھیں ۔ صرف قیاس سے زیر ، زبر اور پیش لگا کر کام چلایا جاتا ھے ۔ یہ چیز تلفظ اور املا کے تعین میں مشکلات پیدا کرتی ھے ۔

(۵) اردو رسم الخط میں بہت سے حروف لکھے جاتے ھیں لیکن پڑھے نہیں جاتے مثلاً خواب و خواھش کو ”خاب“ اور ”خاھش“ بولا جاتا ھے اور ”و“ کی آواز کہیں ظاھر نہیں ھوتی ۔ لکھنے میں یا املا میں اس کا لانا ضروری ھے یہی حال ”عبدالرشید“ اور ”فی الحقیقت“ وغیرہ کے الفاظ کا ھے ۔

یہ سارے اعتراضات فارسی اور عربی رسم الخط پر بھی وارد ھو سکتے ھیں ۔ اس لئے کہ اردو رسم الخط ان دونوں سے بہت قریب ھے ، صرف بعض آوازیں اور ان کے نشانات یعنی حروف تو اردو میں زیادہ ھیں ، لیکن جہاں تک جوڑ ، شوشہ ، مرکز ، کشش اور دائروں کا سوال ھے ، وہ بالکل ایک جیسے ھیں ، تینوں زبانیں دائیں سے بائیں کو بالکل ایک ھی ڈھب سے لکھی جاتی ھیں ۔ تینوں میں خط نسخ اور نستعلیق سے کام لیا جاتا ھے اور سب میں ٹائپ و

طباعت کے مسائل ایک جیسے ھیں لیکن آج تک کسی نے فارسی یا عربی رسم الخط کو ناقص بنانے کی ھمت نہیں کی۔ خود ایرانی اور عربی علمائے زبان نے اس قسم کا خیال ظاھر نہیں کیا کہ ان کے رسم الخط کے سبب فارسی اور عربی کی ترقی رکی ھوئی ھے۔ بلکہ عملاً یہ دیکھنے میں آ رھا ھے۔ کہ عربی و فارسی کی کتابیں خوبصورت ٹائپ اور نستعلیق میں اعلیٰ درجے کی طباعت کے ساتھ منظر عام پر آ رھی ھیں اور مقبول ھو رھی ھیں، کسی نے رسم الخط کو کتابوں کی اشاعت کی راہ میں حائل قرار نہیں دیا، پھر آخر اردو رسم الخط ھی کو اعتراضات کا نشانہ کیوں بنایا گیا؟ صرف اس لئے کہ ھندوؤں کو ھندی کے نام سے اپنی قومی زبان کو فروغ دینا اور اردو کو ختم کرکے مسلمانوں کے ثقافتی آثار کو برصغیر سے ختم کرنا تھا۔ پھر بھی آئیے سارے اعتراضات کا ایک ایک کرکے جائزہ لیں اور دیکھیں کہ معترضین اپنے موقف میں کس حد تک حق بجانب تھے۔

(۱) پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ھے کہ اردو میں حروف تہجی کی تعداد زیادہ ھے اور ان کا سیکھنا سکھانا آسان نہیں ھے۔ اس سے انکار نہیں کہ حروف کی تعداد دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ ھے لیکن یہ چیز اردو کی سرشت اور مزاج کے عین مطابق ھے۔ بتایا جا چکا ھے کہ اردو ایک مخلوط زبان ھے اس کا خمیر مختلف زبانوں اور بولیوں کی مدد سے تیار ھوا ھے۔ اس نے علاقائی زبانوں کے علاوہ عربی، فارسی اور ھندی کا بہت گہرا اثر قبول کیا ھے۔ یہ اثر الفاظ پر بھی ھے اور اصوات یعنی حروف پر بھی۔ اس نے فارسی کے خاص حروف پ، گ، ژ کو عربی کے خاص حروف ث، خ، ذ، ص، ض، ط، ظ، ع وغیرہ کو اور سنسکرت و ھندی کے خاص حروف ڈ، ڑ، تھ، ٹھ، پھ اور جھ وغیرہ کو بھی اپنے اندر جذب کر لیا ھے اور اسی جذب و اخذ کی بدولت اسے بین الاقوامی مزاج ملا ھے۔ اس مزاج کی نمایاں خصوصیت یہ ھے کہ وہ عربی، فارسی اور ھندی وغیرہ کی ساری آوازوں کی متحمل ھے۔ اگر آوازوں کی یہ کثرت اردو رسم الخط میں نہ ھوتی تو اس کا مزاج وہ نہ ھوتا جو آج ھے۔ ایسی صورت میں آواز یا حروف کی کثرت کو اس کا عیب نہیں ہنر کہنا چاھئے۔

اسی هنر کی بدولت تو اسے قبول عام نصیب ہے ، اگر اس میں یہ هنر نہ ہوتا تو وہ اب تک زندہ نہ رہتی کب کی مر گئی ہوتی اس لئے کہ اسے عربی و فارسی یا هندی و انگریزی کی طرح کبھی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں رہی ، بایں ہمہ اس نے ترقی کی دوڑ میں بہت سی زبانوں کو پیچھے چھوڑ دیا - یہ گویا عملاً اس بات کا ثبوت ہے کہ رسم الخط نے کبھی اس کی راہ میں روڑا نہیں اٹکایا بلکہ اس کی بدولت دوسری زبان کے لوگ اس کی طرف متوجہ ہوئے ہیں -

اب وہ گئی سادگی اور سہل الحصول ہونے کی بات تو سب جانتے ہیں کہ بچوں کو لکھنا سکھانے کے سلسلے میں جو بڑی دقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ حروف کے نشانات کے مطابق ان کی انگلیاں آسانی سے نہیں چلتیں ، ایک ایک حرف کو بار بار ان سے لکھوایا جاتا ہے تب کہیں جا کر وہ اس کے بنانے پر قابو حاصل کر پاتے ہیں - ماہرین تعلیم نے اسی دقت کے پیش نظر یہ مشورہ دیا ہے کہ بچوں سے ابتدا میں ، چاک سے سیدھی سادی لکیریں کھنچوائی جائیں اور ہاتھ رواں ہو جانے کے بعد ان کی توجہ حروف تہجی کی طرف مبذول کرائی جائے۔ اس بنیادی اصول کو ذہن میں رکھ کر هندی و انگریزی اور اردو کے چند حروف پر ایک ساتھ نظر ڈالئے :

اردو	هندی	انگریزی
ا	अ	A
ب	ब	B
ڈ	ड	D
ف	फ	F

ان حروف کو بچوں سے لکھوائیے اور خود لکھ کر دیکھئے ، مجھے یقین ہے کہ اردو حروف ، هندی و انگریزی کے مقابلے میں آسان ثابت ہوں گے اور کم وقت اور کم جگہ میں بنائے جا سکیں گے - یہاں ایک اور پہلو کی وضاحت ضروری ہے ، اردو میں حروف تہجی کی تعداد زیادہ سہی لیکن تعداد

کی زیادتی کے باوجود ان کا بنانا اور ان پر قابو پا لینا آسان ہے ۔ نیچے لکھے ہوئے حروف تہجی کو ذرا غور سے دیکھئے :

(۱) ا (۲) ب ، پ ، ت ، ٹ ، ث

(۳) ج ، چ ، ح ، خ (۴) د ، ڈ ، ذ

(۵) ر ، ڑ ، ز ، ژ (۶) س ، ش

(۷) ص ، ض (۸) ط ، ظ

(۹) ع ، غ (۱۰) ف ، ق

(۱۱) ک ، گ (۱۲) ل

(۱۳) م (۱۴) ن

(۱۵) ہ (۱۶) ی

ان میں صرف سولہ شکلیں بنیادی ہیں اگر بچہ ان سولہ حروف پر قابو پا جائے تو وہ ان کی مدد سے سارے دوسرے حروف خود بخود بنا لے گا ۔ اس لئے کہ باقی حروف صرف نقطوں یا مرکز کے اضافے سے بن جاتے ہیں ۔ جو بچہ ”ب“ لکھ سکتا ہے وہ اس سلسلے کے سارے حروف بنا لے گا اور پہلے ہی دن یہ محسوس کر لے گا کہ وہ استاد کی مدد کے بغیر اپنی طرف سے بہت کچھ کر لیتا ہے ۔ حروف کے سارے مندرجہ بالا سلسلے اسی نوعیت کے ہیں ۔ ان کا پہلا حرف بنوا دیا جائے تو باقی حروف بچے خود بنا لیں گے ۔ ایسی صورت میں محض تعداد کی بنا پر یہ کہنا کہ اردو کے حروف تہجی کا سکھانا مشکل ہے ، صحیح نہیں ہے ۔ اردو کے حروف بناوٹ کے لحاظ سے حد درجہ سادہ اور اشکال کے اعتبار سے ناگری اور انگریزی سے بھی تعداد میں کم ہیں اور ایک اچھا استاد چند دن میں سارے حروف بچوں کے ذہن نشین کرا سکتا ہے ۔

(۲) اردو رسم الخط پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ حروف کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں اس لئے ان کے پہچاننے اور لکھنے میں دشواری ہوتی ہے ، یہ

اعتراض بھی غور و فکر کا نتیجہ نہیں بلکہ رسم الخط کی ظاہری صورت کو دیکھ کر وارد کر دیا گیا ہے ، اردو میں حروف یقیناً اپنی شکلیں بدلتے ہیں مثلاً مندرجہ ذیل لفظوں کو دیکھئے :

باسط	طبیب	رباب
لباس	سامان	تسلیم
قلم	عقل	اخلاق

ان میں ''ب'' ''س'' اور ''ق'' کی شکلوں پر غور کیجئے، لفظ کے آخر میں پورا حرف آیا ہے یعنی اصل شکل میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی - لفظ کے آغاز اور وسط میں شکل بدلی ہے ، لیکن یہ تبدیلی دونوں میں ایک سی ہے ، گویا حروف نے صرف ایک شکل بدلی ہے - پھر یہ تبدیلی ایسی بھی نہیں کہ حرف پہچاننے یا اس کے بنانے میں دقت ہو - بات یہ ہے کہ اردو کے حروف ، افراد کی حیثیت رکھتے ہیں - افراد اپنے چہرے سے پہچانے جاتے ہیں جسم سے نہیں اگر چند آدمی اپنے اپنے چہرے ڈھانپ کر سامنے آ جائیں تو ان کا پہچاننا مشکل ہوگا - عدالتوں میں ملزمان کی شناخت کے لئے پریڈ ہوتی ہے ، اصل ملزمان چند دوسرے افراد کے ساتھ سامنے لائے جاتے ہیں ، گواہان سے نشاندھی کرنے کو کہا جاتا ہے ، چونکہ یہ ملزمان اپنے چہروں میں خاصی تبدیلیاں کرکے پریڈ میں شامل ہوتے ہیں اس لئے گواہ ، اکثر انھیں شناخت کرنے میں ناکام رہتے ہیں ، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف چہرے کی تبدیلی ایسی چیز ہے جو شناخت میں حارج ہو سکتی ہے لیکن اردو کے حروف کسی ایک جگہ بھی اپنا چہرہ مسخ نہیں کرتے ہمیشہ اصل چہرے کے ساتھ سامنے آتے ہیں خواہ انھیں لفظ کے شروع میں جگہ دی جائے یا وسط میں یا آخر میں --- اوپر دئیے ہوئے الفاظ بطور مثال پیش کئے جا سکتے ہیں - دوسرے الفاظ کے ذریعے بھی اس دعوے کی تصدیق کی جا سکتی ہے -

یہ خیال بھی غلط ہے کہ سارے حروف شکلیں بدلتے ہیں اردو کے حروف تہجی میں ا ، د ، ڈ ، ذ ، ر ، ز ، ڑ ، ژ ، ط ، ظ ، و ایسے ہیں جو ہر صورت

میں پورے لکھے جاتے ھیں ، مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالئے :

(۱) اسیر — تالاب — نانا

(۲) دوڑو — کدورت — اولاد

(۳) ڈول — کبڈی — ٹھنڈ

(۴) ذکر — تذکرہ — کاغذ

(۵) رشید — کرنال — افکار

(۶) پیڑ — گڑبڑ — پہاڑ

(۷) زھرہ — مزار — مرکز

(۸) ژالہ — مژدہ — رپور تاژ

(۹) طلب — مطلب — ربط

(۱۰) ظاھر — مظہر — لفظ

(۱۱) وحید — توحید — قابو

ھر گروہ کے لفظوں کے آغاز، وسط اور آخر میں جو حروف آئے ھیں وہ اپنی پوری شکل کے ساتھ آئے ھیں اور ذرا سی توجہ سے ان حروف کی شناخت کی جا سکتی ھے ، رہ گئے باقی حروف ، ان کے متعلق بتایا جا چکا ھے کہ اصل چیز ، حرف کا چہرہ ھے ، یہ چہرہ اردو میں ھمیشہ ظاھر کیا جاتا ھے ، اس لئے حرف کی شناخت میں دقت کا سوال ھی پیدا نہیں ھوتا ، بعض حروف مثلاً ب ، ن ، ک ، اور ع جب کسی دوسرے حرف سے مل کر آتے ھیں تو ان میں معمولی سا تغیر ضرور ھوتا ھے مثلاً

بس — بط

نس — نص

کل — کا

بغداد — مغرب

اوپر ” ب “ اور ” ن “ کو ” ل “ کی شکل میں ” س “ اور ” ص “ وغیرہ سے ملایا گیا ھے لیکن نقطوں کے ذریعے انھیں پہچان سکتے ھیں اس لئے کہ اردو میں ” ن “ کے سوا کوئی حرف ایسا نہیں جس کے اوپر ایک نقطہ آتا ھو۔ یہی حال ” ب “ کا ھے کسی دوسرے حرف کے نیچے ایک نقطہ نہیں آتا۔ ” ب “ اور ” ن “ کی شکلوں کی یہ تبدیلی بھی صرف چند حروف کے ساتھ ھوتی ھے باقی جگہوں پر وہ اصل چہروں ھی کے ساتھ آتے ھیں۔ ک اور گ صرف ” ل “ اور ” ا “ سے مل کر قدرے بدل جاتے ھیں ” مرکز “ کے ذریعے انھیں آسانی سے پہچانا جا سکتا ھے۔ رہ گئے ع اور غ نستعلیق میں یقیناً ان میں تغیر واقع ھوتا ھے۔ نسخ میں یہ بھی پورے چہرے کے ساتھ لکھے جاتے ھیں۔ لیکن اس قسم کی معمولی تبدیلیاں ایسی نہیں جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ اردو رسم الخط کا سیکھنا، سکھانا بہت مشکل ھے۔ اس سے کہیں زیادہ مشکلیں انگریزی حروف سیکھنے میں پیش آتی ھیں۔

انگریزی میں سب سے پہلے بچے کو ” اے “ سے لے کر ” زیڈ “ تک بڑے حروف (Capital Letters) سکھائے جاتے ھیں حالانکہ ان کا مصرف انگریزی میں صرف اتنا ھے کہ وہ کسی اسم خاص (Proper Noun) اور جملے (Sentence) کے آغاز میں استعمال ھوتے ھیں۔ دو چار مقامات پر اور ان کا استعمال ھوتا ھے لیکن یہ مقامات بھی اسم خاص اور جملے ھی کے تحت آ جاتے ھیں۔ بڑے حروف (Capital Letters) کے بعد، ان حروف سے بالکل مختلف شکل کے حروف یعنی a,b,c,d,e وغیرہ بنوائے جاتے ھیں ان کا پہلے قسم کے حروف سے ذرا بھی تعلق نہیں ھوتا، چنانچہ جتنا وقت پہلے حروف کے سکھانے میں صرف ھوگا اتنا ھی ان کے سکھانے میں لگے گا، لیکن بات یہیں ختم نہیں ھوتی، یہ حروف تو صرف لکھنے کے لئے سکھائے گئے ھیں۔ پڑھنے کے حروف ٹائپ میں، مندرجہ بالا دونوں قسم کے حروف سے الگ ھوں گے، گویا جب تک کوئی شخص انگریزی کے چھبیس حروف کو تین طرح سے لکھنا پڑھنا نہ جانتا ھو، وہ انگریزی حروف تہجی جاننے کا دعویٰ ھی نہیں کر سکتا۔

ذیل کے انگریزی حروف دیکھئے :

A	*a*	a
B	*b*	b
D	*d*	d
E	*e*	e
F	*f*	f
G	*g*	g
H	*h*	h
I	*i*	i

اس سے ظاہر ہے کہ اکثر حروف کم از کم تین طرح اور بعض چار طرح سے لکھے جاتے ہیں ، چنانچہ جب تک کوئی آدمی انگریزی کے چھبیس حروف کو اٹھتر شکلوں میں پہچاننا اور لکھنا نہ جانتا ہو وہ انگریزی لکھنے پڑھنے کے لائق نہیں ہو سکتا اب ذرا ناگری (ہندی) رسم الخط کو لے لیجئے ، یہ سہل ترین رسم الخط سمجھا جاتا ہے لیکن جو لوگ ہندی سے تھوڑی بہت بھی واقفیت رکھتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس میں بعض حروف اپنی کئی کئی شکلیں بدلتے ہیں ۔ مندرجہ ذیل الفاظ دیکھئے :

(پرکاش) प्रकाश (سرکار) सरकार (آدرش) आदर्श (کرشنڑ) क्रिश्णा

ان لفظوں میں ہندی کا حرف (ر) چار خاص شکلوں میں استعمال ہوا ہے اور ہر شکل ایک دوسرے سے مختلف ہے ، اسی طرح ہندی میں ا کی آواز अ اور अ دو شکلوں سے ظاہر کی جاتی ہے اور دونوں میں جس کو چاہیں استعمال کر سکتے ہیں یعنی आदर्श (آدرش) کو आदर्श کی شکل میں بھی لکھنا درست ہوگا۔

نون غنہ کی آواز بھی ہندی میں کئی شکلوں سے پیدا کی جاتی ہے ، ان لفظوں کو دیکھئے :

चाँद (چاند) ، गंगा (گنگا) क्रिश्णा (کرشنڑ)

ہر لفظ میں نون غنہ کی آواز الگ الگ شکلوں سے پیدا کی گئی ہے علاوہ ازیں جس طرح اردو میں بعض حروف صرف اپنا چہرہ ظاہر کرتے ہیں ۔ اسی طرح

ہندی میں بھی حرف کا صرف ابتدائی حصہ بنایا جاتا ہے جیسا کہ حسب ذیل الفاظ سے ظاہر ہے :

कच्चा (کچّا) लड्डू (لڈّو) कल्लन (کلّن) सज्जन (سجّن)

یعنی اردو میں جہاں تشدید کا استعمال ہوتا ہے ، ہندی میں وہاں آدھا حرف لکھا جاتا ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ہندی میں آدھا حرف اکثر لکھا جاتا ہے اور مشکل یہ ہے کہ اس کا کوئی اصول مقرر نہیں ہے جیسے :

कष्ट (کشٹ) गन्द (گند) व्याकुल (ویاکل) आत्मा (آتما) शब्द (شبد) وغیرہ

اس لئے حروف کی شکلوں میں بعض تبدیلیوں کا سہارا لے کر اردو رسم الخط کو ناقص بتانا کسی طرح مناسب نہیں ہے ، اس قسم کی دشواریاں ناگری اور دوسری زبانوں میں اردو سے بھی زیادہ ہیں ۔

(۳) تیسرا اعتراض اردو رسم الخط پر یہ وارد کیا جاتا ہے کہ اس میں ہم صوت (ایک ہی قسم کی آواز والے) حروف ، املا میں الجھن پیدا کرتے ہیں اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کس لفظ کو ث سے لکھا جائے اور کس لفظ کو س یا ص سے ۔ بظاہر یہ اعتراض بہت وزنی ہے ۔ اردو میں چند حروف ایسے ہیں جو ایک ہی قسم کی آواز رکھتے ہیں اور لکھتے وقت ان میں امتیاز کرنا کچھ عرصے تک نو آموز کے لئے یقیناً مشکل ہوتا ہے ، یہ حروف مندرجہ ذیل ہیں :

(۱) ا ، ع   (۲) ت ، ط

(۳) ث ، س ، ص   (۴) ذ ، ز ، ژ ، ظ ، ض

(۵) ح ، ہ

ان میں سے ہر گروہ کی نمائندگی کے لئے ایک ایک حرف تو رکھنا ہی پڑے گا صرف نو حروف یا ان کی آوازیں ایسی رہ جاتی ہیں جن کے متعلق کہہ سکتے ہیں کہ یہ اردو رسم الخط میں دقت پیدا کرتی ہیں ، لیکن یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اردو ایک مخلوط اور بین الاقوامی مزاج کی زبان ہے ۔ اس میں

جگہ جگہ کے اور بھانت بھانت کے الفاظ شامل ہیں ، اس کا اصل رشتہ آریائی زبانوں سے ہے لیکن سامی خاندان خاص طور پر عربی کے بھی بکثرت الفاظ اس میں پائے جاتے ہیں ۔ مختلف زبانوں سے الفاظ داخل ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں مترادف الفاظ کا ذخیرہ بہت وسیع ہو گیا ہے ، دوسری زبانوں میں کسی ایک چیز کے لئے ایک یا دو سے زیادہ الفاظ نہ ملیں گے لیکن اردو میں ایک ہی چیز کے لئے متعدد الفاظ موجود ہیں مثلاً ” چاند “ کا لفظ لے لیجئے اس کے لئے :

چاند ، چندا ، چندرما ، قمر ، ماہ ، ماھتاب ، ھلال ، بدر وغیرہ

سبھی استعمال ہوتے ہیں اسی طرح تارا کے لئے :

تارا ، ستارہ ، سیارہ ، اختر ، انجم ، نجوم وغیرہ

کے الفاظ مستعمل ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جب الفاظ دوسری زبانوں سے آئیں گے تو وہ اپنی آوازیں بھی ساتھ لائیں گے چنانچہ اردو میں جو بعض آوازوں کے کئی کئی حروف ملتے ہیں وہ اس کی فطرت اور مزاج کے عین مطابق ہیں ، اگر ایسا نہ ہوتا تو اردو اپنے ذخیرہ الفاظ کو اصل آوازوں کے ساتھ ادا کرنے سے قاصر رہتی ۔ کامل اور بہترین رسم الخط وہ کہلاتا ہے جو ان ساری آوازوں کی نمائندگی کرتا ہے جو اس زبان کے بولنے میں نکالنی پڑتی ہیں ، اردو رسم الخط کی خصوصیت یہی ہے کہ وہ اردو میں بولی جانے والی تمام آوازوں کو ادا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے ، اس بات کو ایک مثال سے سمجھنا آسان ہوگا ، انگریزی میں چ ، د اور ش کی آوازیں مستعمل ہیں ، سینکڑوں ، ہزاروں الفاظ ہیں جن میں یہ آوازیں آتی ہیں ، مثلاً

(۱) Future, Picture, Match, Chapter وغیرہ

(۲) Those, This, That وغیرہ

(۳) Admission, She, Motion وغیرہ

لیکن چ ، د اور ش کی آوازوں کے لئے کوئی حرف مقرر نہیں ہے ، حالانکہ یہ آوازیں طرح طرح سے پیدا کی جاتی ہیں ، ظاہر ہے کہ یہ کسی رسم الخط

کا کھلا ہوا نقص ہے ، اردو رسم الخط اس نقص سے پاک ہے ، ساری مستعمل آوازوں کے لئے مستقل حروف رکھتا ہے ۔ اس خوبی کے نتیجے میں یہ ضرور ہوا کہ بعض آوازوں کے لئے کئی کئی حروف داخل ہو گئے ہیں، لیکن اردو میں ہم صوت حروف زیادہ نہیں صرف تیرہ ہیں ان تیرہ کو ہم نے اوپر پانچ گروہوں میں تقسیم کیا ہے ، ہر گروہ سے ایک ایک حرف تو رکھنا ہی پڑے گا ۔ چنانچہ صرف نو حروف ایسے رہ جاتے ہیں جن کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ املا میں مغالطہ پیدا کرتے ہیں لیکن اس قسم کا مغالطہ پیدا کرنے والے حروف دوسری زبانوں میں اردو سے بھی زیادہ ہیں ، انگریزی زبان میں تو آوازوں کا کوئی نظام ہی نہیں ہے ۔ نشانات کچھ ہیں ، آوازیں کچھ نکلتی ہیں ، نتیجہ یہ ہے کہ اس زبان کے املا (Spelling) اور تلفظ (Pronunciation) پر قابو پانا سخت مشکل ہے ، جب تک ہر لفظ کے معنی کے ساتھ اس کا املا بھی اچھی طرح ذہن میں محفوظ نہ ہو، لکھنا مشکل ہوگا یہی وجہ ہے کہ شروع ہی سے لفظ کے معنی کے ساتھ ساتھ اسپیلنگ بھی رٹائی جاتی ہے جس شخص کو جتنے لفظوں کی اسپیلنگ یاد ہوگی ، عام طور پر وہ اتنے ہی الفاظ لکھنے پر قادر ہوگا ۔ تجربہ بتاتا ہے کہ انگریزی کے جو الفاظ ہمارے استعمال میں آتے رہتے ہیں صرف ان ہی کی اسپیلنگ ہمیں یاد رہتی ہے اور انھیں کو ہم آسانی سے لکھ سکتے ہیں ۔ باقی الفاظ کے املا میں ہمیں بار بار ڈکشنری کی ضرورت ہوتی ہے ۔ انگریزی ڈکشنری میں ہر لفظ کے ساتھ ان کا تلفظ (Pronunciation) اسی لئے لکھا جاتا ہے کہ لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں ، ان کے متعلق یہ معلوم کر لینا کہ وہ کس قسم کی آواز پیدا کریں گے بہت مشکل ہوتا ہے ، چند مثالیں دیکھئے :

۱ ۔ انگریزی میں ''س'' کی آواز کے لئے بظاہر ایس کا حرف استعمال ہونا چاہئے اور اکثر ہوتا ہے جیسا کہ Sense, See, Sun وغیرہ میں لیکن Receipt اور Centre میں ''S'' کی آواز ''C'' سے پیدا کر لی گئی ہے ۔

۲ ۔ ''ش'' کی آواز بظاہر Sh سے پیدا کی جاتی ہے جیسا کہ She اور Shoe سے ظاہر ہے لیکن ''ش'' کی آواز اس کے علاوہ بھی متعدد طریقوں سے

پیدا کی جاتی ہے - مندرجہ ذیل الفاظ دیکھئے :

(ا)	Admission	(اڈمیشن)
(ب)	Tuition	(ٹیوشن)
(ج)	Patient	(پیشنٹ)
(د)	Ocean	(اوشن)
(ہ)	Sure	(شیور)
(و)	Machine	(مشین)
(ز)	Pressure	(پریشر)
(ح)	Fashion	(فیشن)
(ط)	Schedule	(شڈول)

جس شخص کو یہ بتایا گیا ہو کہ ”ش“ کی آواز ”Sh“ سے پیدا ہوتی ہے، وہ کس قیاس پر سمجھ لے گا کہ مندرجہ بالا لفظوں میں ”ش“ کی آواز کن کن حروف سے پیدا ہوگی چنانچہ جب تک اسپیلنگ رٹی ہوئی نہ ہو ان الفاظ کا لکھنا محال ہے اگر اس طرح کے ایک دو لفظ ہوتے تو کوئی بات نہ تھی ، ہزارہا الفاظ ہیں جن میں یہ دشواری پیدا ہوگی۔

(۳) ”ک“ کی آواز کے لئے K اور Q حروف موجود ہیں اس کے باوجود Cat اور Tact میں ک کی آواز ”C“ سے ظاہر کی گئی ہے -

(۴) ”ز“ کی نمائندگی کے لئے Z موجود تھا لیکن Has میں ز کی آواز ”S“ کی مدد سے پیدا کی گئی ہے -

(۵) ”ف“ کی آواز صرف ”F“ نہیں بلکہ Ph اور Ough سے بھی ظاہر کی جاتی ہے جیسے Prophet اور Rough میں -

(۶) ”ج“ کی آواز کی نمائندگی G اور J دونوں حرف کرتے ہیں جیسے Judge اور General میں -

(۷) ”چ“ کی آواز کے لئے کوئی حرف موجود نہیں ہے، پھر بھی کبھی Ch سے اور کبھی Ture سے اسے ظاہر کیا جاتا ہے مثلاً Match اور Picture وغیرہ میں۔

اس طرح کی اور نہ جانے کتنی باتیں ہیں جو انگریزی رسم الخط کے بارے میں کہی جا سکتی ہیں سب جانتے ہیں کہ انگریزی میں حروف سے آواز کا کچھ زیادہ تعلق نہیں ہوتا اسی لئے کسی خاص لفظ میں جو حروف استعمال ہوتے ہیں انہیں حافظے میں رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ حروف اور آوازوں کی ایسی بد نظمی شاید ہی کسی اور زبان میں پائی جاتی ہو، سینکڑوں الفاظ ہیں جن میں حروف لکھے جاتے ہیں لیکن آواز نہیں دیتے جیسے Match میں T اور Knife میں K۔ یہ چیزیں عام طور پر ایسی الجھن پیدا کرتی ہیں کہ ہر لفظ کے اسپیلنگ پر قابو پائے بغیر انگریزی کے دو جملے بھی بچہ نہیں لکھ سکتا۔ بایں ہمہ کسی طرف سے کبھی یہ آواز نہیں بلند کی گئی کہ روسن یا انگریزی کا رسم الخط بہت مشکل ہے اور اس مشکل کے سبب اس کی ترقی رکی ہوئی ہے۔

اوپر ہم‌صوت حروف کی دقتوں کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ دقتیں کم و بیش دنیا کی ہر زبان میں موجود ہیں بطور مثال ہندی کو لے لیجئے، اس میں بھی بعض آواز کے لئے کئی کئی نشانات سے کام لیا جاتا ہے:

(۱) ش کی آواز کے لئے ष اور श

(۲) نون غنہ کے لئے ञ، ण، ङ، ं

(۳) ت کی آواز کے لئے त اور त्त

اسی طرح ”ر“ کی آواز کے لئے متعدد نشانات ہیں ان کی مثالیں پچھلی سطور میں دی جا چکی ہیں، ان حقائق کی روشنی میں چند ہم صوت حروف کی بنیاد پر اردو رسم الخط کو ناکارہ بتانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

(۴) اردو رسم الخط کی چوتھی کمزوری یہ بتائی جاتی ہے کہ اس میں اعراب کا تعیّن کرنا مشکل ہے کسی لفظ کا تلفظ کرتے وقت یہ اندازہ نہیں

هوتا کہ کس جگہ زبر پڑھا جائے اور کس جگہ زیر یا پیش متصور کیا جائے اس لئے کہ اردو میں اعراب کے نشانات زبر، زیر اور پیش بہت کم استعمال ہوتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک خاص منزل تک اس سلسلے میں دقت ہوتی ہے۔ لیکن تھوڑی سی مشق کے بعد اس پر قابو پایا جا سکتا ہے اس لئے کہ تلفظ کا تعلق لکھنے سے اتنا نہیں جتنا کہ بولنے سے ہے اگر صحیح تلفظ کے ساتھ کوئی شخص اردو بول لیتا ہے تو اسی قیاس پر وہ اردو لکھے گا اور صحیح لکھے گا۔ پڑھنے کی بھی یہی صورت ہے، جن الفاظ کے تلفظ سے لوگوں کے کان آشنا ہیں، ان الفاظ کو پڑھنے یا لکھنے میں وہ کوئی خاص الجھن محسوس نہ کریں گے۔

اردو رسم الخط کا خاص وصف یہ ہے کہ اس میں حروف علت صرف تین ا، و، ی ہیں۔ یہ بھی اعراب کا کام کرتے ہیں لیکن ان سے زیادہ تر زیر، زبر یا پیش کے معمولی نشانات بطور اعراب استعمال ہوتے ہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہے کہ اردو تحریر جگہ بہت کم گھیرتی ہے، اردو کے برعکس ہندی میں جگہ جگہ ماترائیں، اوپر کی لکیریں اور پائیاں لگانے کے لئے بار بار ہاتھ اٹھانا پڑتا ہے اور حروف جگہ بھی خاصی گھیرتے ہیں۔ جگہ زیادہ لینے کا مطلب یہ ہوا کہ وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔ انگریزی میں کہنے کو تو A,E,I,O,U کو حروف علت کہا جاتا ہے اور اعراب کی علامت کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے لیکن عملاً انگریزی تحریر میں ان کی صورت کچھ ایسی ہوتی ہے کہ کوئی قیاس کام نہیں کرتا اور صحیح تلفظ تک پہنچنا مشکل ہوتا ہے، چند الفاظ بطور مثال دیکھئے:

(ا) Shoot, Good

(ب) Read, Red

(ج) Put, Shut, Unity, Ugly

(د) Sir, Pin

(ہ) Escape, Early

Ice, Eye (و)

Yes, By (ز)

ان الفاظ میں I,U,E,O اور Y کی آوازوں پر غور کیجئے، نہ کوئی اصول ہے نہ تنظیم، ایک ہی حرف کی ایک ہی آواز کہیں زبر کا کام دے رہی ہے کہیں زیر کا اور کہیں پیش کا ایک ہی حرف کہیں کھینچ کر پڑھا جاتا ہے کہیں یونہی اور کہیں سرے سے خاموش ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں یہ خیال کرنا کہ انگریزی الفاظ کا تلفظ متعین کرنا آسان ہے صحیح نہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ حروف کی آوازیں جس بے ربطی اور بے معنویت کے ساتھ انگریزی یعنی رومن رسم الخط میں استعمال ہوتی ہیں، مشکل سے کسی دوسرے رسم الخط میں نظر آئیں گی، اردو رسم الخط، رومن سے ہزار گنا بہتر ہے۔ اس میں اعراب کی ایسی دشواریاں نہیں ہیں کہ لکھنا پڑھنا مشکل ہو۔

(۵) پانچواں اعتراض یہ ہے کہ اردو میں بعض حروف آواز نہیں دیتے پھر بھی لکھے جاتے ہیں۔ جیسے ”خواہش“ کی ”و“ اور عبدالرشید میں ”ال“ معترضین کو جاننا چاہئے کہ اردو میں اس قسم کے الفاظ کی تعداد کثیر نہیں ہے تھوڑے سے الفاظ ہیں جو اس زمرے میں آتے ہیں، حروف تو صرف دو یا تین ہیں۔ جہاں تک ”ال“ کے آواز دینے اور نہ دینے کا تعلق ہے اس کے متعلق اگر حروف شمسی اور حروف قمری کی تقسیم چند مثالوں کے ذریعے طلبہ کو سمجھا دی جائے تو پھر یہ دقت خود بخود دور ہو جائے گی۔ بات یہ ہے ”ال“ کا استعمال صرف عربی ترکیب میں ہوتا ہے اور عربی ہی کے اصولوں کے مطابق وہ بولے اور پڑھے جاتے ہیں، لیکن انگریزی میں تو آواز نہ دینے والے (Silent) حروف بے شمار لفظوں میں آتے ہیں اور ایک نہیں کئی کئی آتے ہیں جیسے (Committee) اور (High) میں — با ایں همه اس میں دشواری محسوس نہیں کی جاتی، پھر محض چند الفاظ کی بنا پر اردو رسم الخط کو مورد الزام کیوں گردانا جائے؟

ان تفصیلات سے اندازہ کیا جا سکتا ھے ایک زبان کا رسم الخط دوسری زبان پر منطبق نہیں ہو سکتا ، اور نہ پختہ و مقبول ہو جانے کے بعد کسی زبان کا رسم الخط غیر ضروری اصلاحات و ترمیمات کو قبول کر سکتا ھے اور اگر اس میں کسی سبب سے تبدیلیاں لائی گئیں تو پھر وہ زبان اپنے وجود کو من و عن قائم نہ رکھ سکے گی اور اس کا سرمایہ تباہ ہو جائے گا۔ پھر بھی بعض لوگوں کی طرف سے اردو رسم خط میں اصلاح و تبدیلی کی تجویزیں پیش کی گئی تھیں۔ آئیے دیکھیں یہ تجویزیں کیا تھیں اور انھیں قبول کرنے سے اردو کو کیا نفع یا نقصان پہنچ سکتا تھا۔

اردو رسم الخط کے سلسلے میں ایک اصلاحی تجویز یہ پیش کی گئی تھی کہ اس میں لکھنے کے عمل کو صوتی بنیادوں پر قائم کیا جائے یعنی کسی لفظ کے بولنے میں جو آوازیں نکلتی ھیں صرف انھیں کا لحاظ رکھ کر اس لفظ کو لکھا جائے اور غیر ضروری آوازوں کو تحریری عمل سے خارج کر دیا جائے مثلاً

(۱) ھما اور شمع میں ا اور ع کی آوازیں

(۲) تالاب اور طالب میں ت اور ط کی آوازیں

(۳) سالم ، ثابت اور صادق میں ث ، س اور ص کی آوازیں

(۴) حاصل اور ھاتھی میں ح اور ہ کی آوازیں

(۵) ذاکر ، زائر ، ظاھر ، ضامن میں ذ ، ز ، ظ ، اور ض کی آوازیں

ایک سی ھیں عربی والوں کے نزدیک ان آوازوں میں فرق ہو تو ہو ، اردو والے ان آوازوں میں کوئی فرق نہیں کرتے ، ایک ھی طرح بولتے ھیں ، اس لئے ان آوازوں کی ترجمانی کے لئے ہر گروہ سے صرف ایک ایک حرف کو لے لینا چاھئے یعنی

(۱) ا ، ع — (۲) ت ، ط

(۳) س ، ث ، ص — (۴) ز ، ژ ، ذ ، ظ ، ض

(۵) ہ ، ح

میں سے صرف ا، ت، س، ز اور ہ کو لے لیا جائے باقی نو حروف یعنی ع، ط، ث، ص، ژ، ذ، ظ، ض اور ح کو اردو رسم الخط سے خارج کر دیا جائے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ اردو املا کی وہ دقتیں ختم ہو جائیں گی جو آوازوں کی کثرت کے سبب محسوس ہوتی ہیں اور اردو کی ترقی کی رفتار تیز تر ہو جائے گی۔

اوپر جن حروف کو حروف تہجی سے خارج کر دینے کی تجویز پیش کی گئی ہے وہ تعداد میں صرف نو ہیں، گویا ان نو آوازوں میں التباس کے سبب اردو املا میں دشواری ہوتی ہے، حالانکہ پچھلی سطور میں بتایا جا چکا ہے کہ آوازوں کا سب سے خراب نظام انگریزی میں ہے اور جب تک ہر لفظ کے ہجے (Spelling) پوری طرح رٹی ہوئی نہ ہو کوئی شخص انگریزی لکھ ہی نہیں سکتا۔ اس کے باوجود انگریزی برابر ترقی کرتی جا رہی ہے اور کسی ایک فرد نے کبھی یہ آواز نہیں اٹھائی کہ انگریزی کے رسم الخط کو بدل دینا چاہئے۔ لیکن بعض نے اردو کے مندرجہ بالا نو حروف اور ان کی آوازوں سے بڑی الجھن محسوس کی اور ان آوازوں کو اردو رسم الخط سے خارج کر دینے کی کوشش کی گئی۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ اردو ایک مخلوط زبان ہے اور اس نے کم و بیش دنیا کی ہر زبان سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اس پر فارسی اور عربی کا بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ یہ اثر اس کے رسم الخط پر بھی صاف نظر آتا ہے۔ علاوہ ازیں کوئی قومی زبان صرف اس غرض سے نہیں پڑھائی جاتی کہ اس قوم کے بچے اس میں معمولی شدھ بدھ پیدا کرکے دال روٹی کما کھا سکیں۔ یقیناً یہ بھی ایک مقصد ہے لیکن قومی زبان کی تدریس کا اس سے اعلیٰ مقصد ہوتا ہے اور وہ یہ کہ جو بچے آج اردو پڑھ رہے ہیں انہیں میں سے کوئی آگے چل کر اعلیٰ درجے کا ڈاکٹر، انجینئر، ماہر قانون، ریاضی دان، سائنسدان، عالم ادب، عالم زبان، ماہر لسانیات، محقق اور نقاد بن سکے۔ ان میں سے کئی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے لئے اسے اردو کا غائر مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کے حروف اس کے نظام صوتیات اور اس کے دخیل الفاظ سب کا حقیقی جائزہ لینا پڑے گا۔ اس کام کے لئے اردو کا موجودہ

رسم الخط ہی مفید مطلب ہوگا، یہ مانا کہ اردو میں ع، ط، ث، ص، ذ، ظ، ض، ح کی آوازیں (جنہیں خارج کر دینے کا مشورہ دیا جاتا ہے) شروع میں بعض الفاظ کے املا میں، طلبہ کے لئے الجھن کا سبب بن سکتی ہیں۔ لیکن اگر بچوں کو ابتدائی اور ثانوی منزل ہی میں یہ بات بتا دی جائے کہ یہ حروف خاص عربی کے ہیں اور اردو میں استعمال ہونے والے الفاظ میں سے جس کسی میں ان میں سے کوئی حرف نظر آئے تو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ لفظ عربی سے اردو میں آیا ہے۔ اس سے آگے چل کر زباندانی اور اردو کے لسانی مطالعے میں انہیں خاصی مدد ملے گی اور اردو الفاظ کی شناخت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے معنی تک پہنچنے میں بھی چنداں دقت نہ ہوگی۔ عربی کے ہر لفظ میں تین حرف بنیادی ہوتے ہیں ان حرفوں کو اس لفظ کا مادہ کہتے ہیں، جس مادے سے کوئی لفظ بنتا ہے اس کا اس مادے سے تعلق بہر حال باقی رہتا ہے مثلاً مندرجہ ذیل الفاظ پر نظر ڈالئے:

(۱) علم، تعلیم، معلم، تعلم، معلمہ، معلوم، عالم، علیم، متعلم، علام، علامہ، علوم

(۲) عقل، عقیل، معقول، تعقل، عقیلہ، عاقل، عاقلہ، عقلیت

ان میں "ع" کی شمولیت سے بچے سمجھ جائیں گے کہ یہ الفاظ اصلاً عربی کے ہیں۔ پہلے گروہ کے الفاظ میں "ع، ل، م" اور دوسرے گروہ کے الفاظ میں ع، ق، ل بنیادی حروف ہیں۔ چنانچہ اگر کسی طالب علم کو "علم" اور "عقل" کے معنی بتا دئے جائیں یا اسے ان دو لفظوں کے معنی پہلے سے معلوم ہوں تو پھر وہ باقی الفاظ کے معنی تک خود بخود پہنچ جائے گا، گویا ایک لفظ کے ذریعے وہ اس لفظ سے بنے ہوئے درجنوں الفاظ کی تفہیم پر قابو پا لے گا۔ اس سے زباندانی میں بچوں کو جو مدد ملے گی وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے ان کے ذخیرہ الفاظ میں تیزی سے اضافہ ہوگا ان میں خود اعتمادی پیدا ہوگی، وقت کم لگے گا، اور معلم یا لغت سے مدد لئے بغیر بھی

طلبه اس قسم کے لفظوں کے معنی تک پہنچ جائیں گے ۔ جو لوگ یہ مشورہ دیتے ہیں کہ ''ع'' کو خارج کرکے ''ع'' والے الفاظ بھی ''ا'' سے لکھے جائیں وہ اس تبدیلی سے پیدا ہونے والی مشکلات کو نظر انداز کر دیتے ہیں اگر ''علم'' اور ''عقل'' کو ا سے لکھیں تو ''الم'' اور ''اقل'' ہو جائیں گے ، الم اور اقل کے لفظ خود عربی کے ہیں اور اردو میں مستعمل ہیں مثلاً ''رنج و الم'' اور ''ذواضعاف اقل'' میں اسی طرح علیم اور عقلیت کو ''ا'' سے لکھا جائے تو ان کی صورت ''الیم'' اور ''اقلیت'' کی ہو جائے گی۔ مشکل یہ ہے کہ یہ الفاظ بھی اردو میں مستعمل ہیں ۔ اندازہ کیجئے کہ اس سے کتنی دشواریوں کا سامنا کرنا ہوگا ''ا'' اور ''ع'' کے استعمال سے تو آدمی ان کے معنی میں فرق کر لیتا ہے لیکن جب یہ فرق مٹ جائے گا تو جگہ جگہ معنی کی تفہیم میں الجھن پیدا ہوگی اگر دو چار الفاظ کا مسئلہ ہوتا تو کہہ دیا جاتا کہ کچھ دنوں بعد لوگ ، معنی کے تعلق سے ان پر قابو پا لیں گے لیکن] اردو میں [ہم] صوت یا مشابہ الصوت الفاظ کثرت سے ہیں اور املا کا فرق ختم ہو جانے سے ان کے معنی متاثر ہوں گے یعنی جب اسل و عمل ، تعمل و تامل ، امارت و عمارت ، توسل و توصل، سدا و صدا ، سفر و صفر ، ماثوم و معصوم ، ثواب و صواب ، نذیر و نظیر ، ظرف و ژرف ، ظن و زن ، کسرت و کثرت ، عام اور آم ، لعل اور لال ، سریر اور صریر ، نال اور نعل، جعل اور جال ، باد اور بعد ، باز اور بعض، عرض اور ارض ، حال اور ھال ، جالی اور جعلی ، صورت اور سورت ، ماسور اور معمور ، تانا اور طعنہ، ذکی اور زکی وغیرہ کے املوں میں یکسانیت پیدا ہو جائے گی تو صرف یہی نہیں کہ ان کے ماخذ کا پتہ لگانا مشکل ہوگا بلکہ ان کے معنی تک پہنچنے میں بھی دقت ہوگی۔

بالفرض اس تجویز کو قبول بھی کر لیا جائے تو اردو جس بلند منزل پر پہنچ گئی ہے اس میں یہ تبدیلی خوشگوار ثابت نہ ہوگی ، اس وقت کروڑوں آدمی ہیں جو صرف املا دیکھ کر لفظوں کی قرات روانی اور تیزی سے کر لیتے ہیں یعنی ان کی نظریں الفاظ کو خاص خاص املوں میں دیکھنے کی عادی ہو

چکی ہیں لیکن جب :

حضرت کو ہزرت

صاحب کو ساھب

حفیظ کو ہفیز

طرح کو ترہ

عرض کو ارز

وغیرہ کی صورت میں دیکھیں گے تو انہیں ایک طرح کی الجھن ہوگی اور پوری روانی کے ساتھ عبارت کو نہ پڑھ سکیں گے ، جو لوگ خارج شدہ حروف کی شکلوں سے یکسر نا واقف ہوں گے ، وہ شاید اس کی مشق بہم پہنچالیں لیکن عربی اور قرآن سے جو رشتہ استوار ہے وہ ختم ہو جائے گا۔

علاوہ ازیں جس وقت اردو حروف تہجی سے مندرجہ بالا نو آوازیں خارج کر دی جائیں گی اور لفظ کے تلفظ یا آواز دینے والے حروف و حرکت ہی کی بنیاد پر اس کا املا لکھا جائے گا۔ تو اردو کے ہزاروں الفاظ کی ظاہری صورت مسخ ہو کر کچھ سے کچھ ہو جائے گی :

(۱) فی الحال کو فلحال ، فی الواقع کو فلواقع اور فی الوقت کو فلوقت لکھا جائے گا۔

(۲) عبدالرشید ، خواهش و الصلواة کو ابد رشید ، خاھش اور سلات لکھا جائے گا۔

(۳) سمیع ، سجیع اور وقیع وغیرہ ، سمی ، سجی ، وقی ہو جائیں گے۔

(۴) رکعت ، وقعت ، بدعت وغیرہ کا لکھنا مشکل ہو جائے گا اور اگر لکھا گیا تو وہ رکات ، وقات اور بدات ہو جائیں گے ، اس لئے کہ ع کی جگہ الف استعمال ہوگا۔

(۵) قاعدہ ، مشاعرہ اور معمر وغیرہ کو قاادہ ، مشاارہ اور مامر لکھا جائے گا۔

(۶) فوراً ، ابتداً ، رسماً وغیرہ کا اسلا فورن ، ابتداان ، اور رسمن ہو جائے گا۔

(۷) عربی کے مروجہ الفاظ شریف ، مجیدً وغیرہ کو شریفن ، مجیدن لکھا جائے گا۔

(۸) عیسیٰ ، توسیع ، اسماعیل وغیرہ ، ایسا ، توسی اور اسمایل میں بدل جائیں گے۔

غرضیکہ لاکھوں الفاظ کا اسلا بدل جائے گا اور اردو زبان و ادب کا چار سو سالہ ذخیرہ خاک میں مل جائے گا، نہ کوئی اس کا پڑھنے والا ہوگا، نہ لکھنے والا۔ سارے کتب خانوں اور علمی و ادبی ذخیروں کو دریا برد کرکے ایک نئی زبان کے لئے کام شروع کرنا ہوگا۔ ہم بتا چکے ہیں زبان اور رسم الخط کی ترقی و تبدیلی عام طور پر ، زندگی کے تقاضوں کے مطابق خود بخود ہوتی رہتی ہے کسی شخص یا گروہ کی شعوری کوشش اس پر بہت کم اثر انداز ہوتی ہے ، بفرض محال ایسی کوشش کی بھی جائے تو ـــ

ایک عمر چاہئے کہ گوارا ہو نیش عشق
رکھی ہے آج لذت زخم جگر کہاں

آج کا ایٹمی دور بھلا اس کی اجازت کہاں دے گا ؟ زبان و رسم الخط کی تبدیلی کے ساتھ ہی ہمارا ثقافتی و تہذیبی سرمایہ خود اپنے ہاتھوں خاک میں مل جائے گا۔ تجربہ کرنا ہو تو کسی علمی ادبی کتاب کا ایک پیراگراف لے لیجئے اور اسے نئے اسلا کے مطابق لکھ کر دوبارہ پڑھنے کی کوشش کیجئے۔ وہ پیراگراف آپ کی نظروں کے لئے اتنا اجنبی ہوگا کہ پڑھنا مشکل ہو جائے گا ـــ ایسی صورت میں اردو رسم الخط کو ، اس کی معمولی دقتوں کی وجہ سے بدلنا اور اردو کی لاکھوں علمی و ادبی کتابوں کو نئی نسل کے لئے مہمل بنانا کہاں کی دانشمندی ہوگی؟

اردو رسم الخط کی اصلاح کے سلسلے میں دوسری تجویز یہ پیش کی جاتی ہے کہ موجودہ رسم الخط کو رومن رسم الخط سے بدل دیا جائے۔ مطلب یہ

ہے کہ اردو زبان وہی رہے جو ہم لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں لیکن اسے ا ، ب ۔ پ ۔ ت وغیرہ کے بجائے A,B,C,D وغیرہ کے حروف میں لکھا جائے ۔

رومن رسم الخط کی تائید میں جو باتیں اردو کے حق میں کہی جاتی ہیں وہ یہ ہیں کہ اگر رومن کو اپنا لیا گیا تو اردو املا آسان ہو جائے گا ۔ بین الاقوامی اتحاد میں اس سے مدد ملے گی ۔ علمی و ادبی ذخیرے میں اضافہ ہوگا اور اردو تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کرکے دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہونے لگے گی ۔ یہ باتیں جتنی آسانی سے کہہ دی گئی ہیں ۔ اتنی آسانی سے ھاتھ آنے والی نہیں ہیں ۔ ہم پچھلی سطور میں وضاحت سے بتا چکے ہیں کہ زبان اور رسم الخط میں جسم و جان کا تعلق ہوتا ہے وہ ساتھ ساتھ جی سکتے ہیں اس لئے انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنا ان کے ساتھ کھلی دشمنی ہوگی ۔ ہم یہ بھی واضح کر چکے ہیں کہ اردو میں حروف کی تعداد پچاس سے زیادہ اور رومن میں صرف چھبیس ہے ظاہر ہے کہ چھبیس آوازیں کسی طرح بھی پچاس آوازوں کی نمائندگی نہیں کر سکتیں ، مثلاً چ اور ش کی آواز کے لئے رومن میں کوئی حرف نہیں ہے ۔ حالانکہ یہ آوازیں Admission اور Picture وغیرہ قسم کے ہزاروں الفاظ میں پائی جاتی ہیں ، لیکن یہ طے کرنا مشکل ہے کہ کن کن حروف سے یہ آوازیں پیدا ہوں گی ۔

Christian, Match, Mixture

میں ، چ کی آواز الگ الگ طریقوں سے پیدا کی گئی ہے ۔ ش کی آواز آٹھ دس طریقوں سے پیدا کی جاتی ہے یہی حال دوسری آوازوں کا ہے ۔ اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس رسم الخط میں اردو کا لکھنا کتنا مشکل ہوگا؟ سب جانتے ہیں کہ رومن میں حروف کی آوازوں اور الفاظ کے تلفظ کا کوئی مستقل نظام نہیں ہے ۔ ہر لفظ کی اسپیلنگ ازبر کرنی پڑتی ہے ۔ ایسی صورت میں اردو کو رومن میں لکھ کر اس کے اصل تلفظ اور لہجے کو برقرار رکھنا مشکل ہوگا ۔ سینکڑوں الفاظ کا تلفظ مسخ ہوگا ۔ علاوہ ازیں اردو میں عربی اور ھندی کی بہت سی آوازیں شامل ہیں ، ان آوازوں کو علامتوں کے ذریعے ہم پہچان لیتے ہیں کہ کونسا لفظ کس زبان سے آیا ہے مثلاً ڑ ، بھ ، پھ ، کھ وغیرہ کو لے لیجئے

جن لفظوں میں یہ آوازیں اور ان کے نمائندہ حروف آئیں گے وہ علی الترتیب ہندی اور فارسی کے ہوں گے۔ رومن میں ان کی آوازیں کہاں سے لائی جائیں گی؟ اور بالفرض اگر انہیں ظاہر بھی کیا جائے تو وہ علامتیں کہاں ہوں گی جن کے ذریعہ ان کے لسانی رشتے کی شناخت کر لی جاتی ہے غرض کہ اردو کو رومن رسم الخط میں اول تو لکھا ہی نہیں جا سکتا اور اگر ایسا کیا جائے تو اس سے فائدہ کے بجائے سخت نقصان پہنچے گا۔

اسی لئے اردو کے پارکھوں اور زبان کے عالموں نے اس مسئلے پر ٹھنڈے دل سے غور کیا ہے اور بار بار سوچا ہے، تائید و تردید کی دلیلوں کو نظر میں رکھا ہے۔ سود و زیان کے تناسب کا اندازہ کیا ہے اور آخر کار پر زور طریقے سے رومن رسم الخط کی مخالفت کی ہے ان کی رائے کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(۱) رومن رسم الخط میں اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ اس میں اردو زبان کی ساری آوازیں ادا کی جا سکیں۔

(۲) رومن میں تلفظ اور ہجے کی مشکلات اتنی زیادہ ہیں کہ اس کے ذریعے اردو لکھنا پڑھنا آسان ہونے کے بجائے اور مشکل ہو جائے گا۔

(۳) رومن رسم الخط، اردو کے مقابلے میں زیادہ جگہ گھیرتا ہے۔ چنانچہ اس سے کتاب کا حجم خواہ مخواہ بڑھے گا اور لاگت زیادہ آئے گی۔

(۴) اردو رسم الخط کا فارسی اور عربی سے گہرا رشتہ ہے، رومن کو اپنانے سے یہ رشتہ ختم ہو جائے گا اور ہمارے ثقافتی و تہذیبی مشترک سرمایہ کو نقصان پہنچے گا، عربی زبان سے ہم دور ہو جائیں گے اور اس کے سیکھنے میں ہمیں بڑی دقت ہوگی۔

(۵) ہمارے اسلاف نے تحریری شکل میں جو کارنامے یادگار چھوڑے ہیں۔ ان سے ہمارا رشتہ منقطع ہو جائے گا اور ہم اپنی جڑوں کو کاٹ کر من حیث القوم زندہ نہ رہ سکیں گے۔

یہ ہیں وہ اسباب جن کے تحت آل پاکستان اردو تدریس کانفرنس منعقدہ کراچی ۲٦ تا ۳۰ دسمبر ۱۹٦۱ء میں متفقہ طور پر رومن رسم الخط کی تجویز رد کی گئی تھی اور اسے اردو زبان کے وجود کے لئے خطرہ بتایا گیا تھا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ رومن رسم الخط اپنے ناقص صوتیات کے سبب اردو الفاظ کے تلفظ کی ضمانت نہیں دے سکتا۔ ہر لفظ اس طرح مسخ ہوگا کہ اس کا صحیح پڑھنا مشکل ہو جائے گا۔ اردو کیا خود انگریزی الفاظ کا تلفظ رومن رسم الخط کی پیچیدگی کے سبب، صحت کے ساتھ ادا نہیں ہو سکتا، نتیجہ یہ ہے کہ ہر مستند لغت میں ہر لفظ کے ساتھ اس کا صحیح تلفظ قوسین کے اندر لکھ دیا جاتا ہے برنارڈ شا نے رومن رسم الخط کی اس خرابی کے سبب اس میں اصلاح کی تجویز پیش کی تھی، انھوں نے سات سو الفاظ تیار کرکے ماہرین انگریزی کو دئے تھے اور کہا تھا کہ اسی نہج پر انگریزی رسم الخط کی از سرنو تشکیل کی جائے اور جن آوازوں کے لئے رومن میں حروف موجود نہیں ہیں ان کے لئے حروف ایجاد کئے جائیں چنانچہ ماہرین زبان کی ایک جماعت نے برنارڈ شا کی تجویز پر سنجیدگی سے غور کرکے اسے قبول بھی کر لیا تھا لیکن جیسا کہ اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کسی زبان کا رسم الخط خواہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو اسے بدلنا یا اس میں تبدیلیاں لانا جس سے ماضی کے علمی و ادبی سرمایہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو، بہت مشکل کام ہے۔ چنانچہ رومن رسم الخط اپنی ہزار خرابیوں کے باوجود اپنی پرانی ڈگر ہی پر قائم ہے۔

ان مباحث کی روشنی میں جو لوگ رومن رسم الخط کو اردو کے لئے تجویز کر رہے ہیں وہ بالغ نظری کا ثبوت نہیں دے رہے ہیں۔ ان کی نظر میں اس تبدیلی کے وہ مضر نتائج نہیں ہیں، جن کا اوپر مفصل ذکر کیا گیا ہے اور اگر ان نتائج سے با خبر ہوتے ہوئے بھی وہ رومن رسم الخط کی تائید کر رہے ہیں تو یہی کہنا پڑے گا کہ وہ اردو کے دوست نہیں ہیں۔

ہندی اردو تنازع کے آخری دس سال

(سنہ ۱۹۳۷ء تا سنہ ۱۹۴۷ء)

سنہ ۱۹۳۶ء سے سنہ ۱۹۴۷ء کا زمانہ جس طرح مسلم لیگ کی تاریخ، دو قومی نظریہ کی آخری تشکیل، مستقبل میں ہندوستان کی اپنی حیثیت اور آزادی کے لئے مسلمانوں کی جد و جہد کے سلسلے میں خصوصیت سے ممتاز ہے، اسی طرح دس سال کا یہ عرصہ قومی زبان کے حوالے سے اردو ہندی تنازع کے سلسلے میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس دور میں کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اس مسئلے کی بحث میں مسلم لیگ اور کانگریس کے علاوہ بعض دوسری سیاسی و مذہبی جماعتیں بھی شامل ہوگئیں۔ بعض ایسے عالموں اور بزرگ شخصیتوں نے بھی زبان کے مسئلے پر اظہار خیال کو ضروری جانا جو اب تک اس سے بے نیازانہ گذر رہے تھے۔ جب قومی زبان کی بحث خاص دائروں سے نکل کر عوامی حلقوں تک پہنچ گئی اور دو قومی نظریے کے بارے میں علمائے کرام کی اختلافی بحثوں نے ہندی، اردو کے مسئلے کو پیچیدہ تر بنا دیا تو بعض مسلمانوں نے استفسار و استفتا کے لئے علمائے دین سے رجوع کرنا شروع کیا چنانچہ مولانا اشرف تھانوی نے مسلمانوں کے مغالطے کو دور کرنے کے لئے اردو زبان کی حمایت میں مندرجہ ذیل فتویٰ جاری کیا:

"خدا نخواستہ اگر اردو زبان ضائع ہوگئی تو مسلمانوں کا تمام اسلامی ذخیرہ ضائع ہو جائے گا۔ چونکہ تمام دینی کتابیں جو کہ فارسی اور عربی میں تھیں اب ان کا ترجمہ اردو میں ہوگیا ہے، لہذا اگر یہ زبان ضائع ہوگئی تو مسلمان، بالخصوص عوام کے لئے حصول علم دین کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے گا، تو کیا کوئی مسلمان اس بات کو گوارا کر سکتا ہے کہ یہ ذخیرہ ضائع ہو جائے؟ پس نتیجہ نکلا کہ اس وقت اردو زبان کی حفاظت، دین کی حفاظت ہے۔ اس لئے

یہ حفاظت حسب استطاعت واجب ہوگی اور باوجود قدرت کے اس میں غفلت اور سستی کرنا معصیت اور موجب مواخذہ ہوگا۔''۱

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اردو کے سلسلے میں کانگریس حکومت اور ہندوؤں کی زیادتیوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا :

''ایک قوم کی زبان اور اس کا رسم الخط، اس کی تہذیب اور قومیت کے بقا و فنا میں فیصلہ کن اہمیت رکھتا ہے، کسی قوم کو اگر دوسری قوم میں تبدیل کر دینا چاہیں تو اس کے زبان اور رسم الخط کو بدل دیجئے، رفتہ رفتہ خود بخود دوسرے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی۔ اس کی آنے والی نسلوں کا تعلق اپنے اسلاف سے منقطع ہو جائے گا اور وہ بالکل نئی ذہنیت، نئے افکار اور نئی صورت قومی لے کر اٹھیں گی۔ جن جن لوگوں نے قومیتوں کے بنانے بگاڑنے کا کھیل کھیلا ہے، ان سب نے یہ ہتھیار ضرور استعمال کیا ہے......

اسی پالیسی کا تختۂ مشق ہندوستان میں ہم کو بنایا جا رہا ہے، پنڈت جواہر لال نہرو کے بقول ہندوستان میں نیشنلسٹ جماعت کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ یہاں ایک متحدہ قوم پیدا ہو۔ اس غرض کے لئے زبان کی وحدت ناگزیر ہے... دکھانے کے لئے، تو یہ ہے کہ قومی زبان ''ہندوستانی'' ہے جس کا اطلاق اردو ہندی دونوں پر ہوتا ہے، لیکن فی الحقیقت کیا کیا جا رہا ہے؟ فارسی عربی کے وہ عام فہم الفاظ بھی جو ہندوستانی کے مشترک سرمایہ میں مدتوں سے داخل ہو چکے ہیں، جن کو ہر ہندو اور مسلمان بولتا اور سمجھتا ہے، قصداً ترک کئے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ ٹھیٹھ سنسکرت اصل کے یا بالکل نامانوس ہندی زبان کے الفاظ پھیلائے جا رہے ہیں۔''۲

۱۔ اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی، پروفیسر احمد سعید، خالد ندیم پبلی کیشنز، راولپنڈی، ۱۹۷۲ء، ص ۴۵

۲۔ ''تحریک آزادی اور مسلمان''، ص ۳۳۶ تا ۳۳۸

ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نے اردو کے بارے میں کہا :

''میں اس مسئلہ زبان کو کسی فرقہ وارانہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہتا میں تو یہ کہتا ہوں کہ جو تنازع اس وقت زبان کے مسئلے کے متعلق ہندوستان میں پیدا ہو گیا ہے اس کی اہمیت ، تنازعات سے بہت زیادہ ہے کیونکہ اگر یہ زبان جس کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں ہندو اور مسلمان دونوں نے حصہ لیا ہے ، تباہ ہو گئی تو وہ تہذیب اور طرز زندگی بھی جس کا یہ ظاہری لباس ہے تباہ ہو جائے گی ۔''[٣]

یہی وہ زمانہ ہے جس میں جمیعت العلمائے ہند کے بعض بزرگوں نے مسلمانوں کی رائے عامہ کو نظر انداز کر کے کانگریس کی حمایت میں اور اس کے اشارے پر ہندو اور مسلمانوں کو توطن کے رشتے سے ایک قوم گردانا اور متحدہ قومیت کا نعرہ بلند کیا ۔ دارالعلوم دیو بند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد مدنی نے اپنی ایک تقریر میں کہا :

''اس زمانے میں قومیتیں اوطان سے بنتی ہیں، مذہب سے نہیں بنتیں ۔''

ایک عالم دین کے اس بیان سے ملت اسلامیہ کو بڑا دکھ پہنچا ۔ علامہ اقبال نے اپنے ایک فارسی قطعہ میں ، مولانا حسین احمد مدنی کے متعلق فرمایا :

عجم ہنوز نداند رموز دین ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برسان خویش را کہ دین ہم اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

٣ - کیفیت و روئیداد کل ہند اردو کانفرنس ، دھلی ، انجمن ترقی اردو ، دھلی ، ١٩٣٩ء ، ص ١٦

اس پر مولانا حسین احمد نے تلملا کر ''متحدہ قومیت اور اسلام'' کے عنوان سے ایک رسالہ شائع کیا جس میں متحدہ قومیت کی حمایت کو قرآن اور سنت کے حوالے سے جائز اور ضروری ثابت کرنے کی کوشش کی ، اس میں انھوں نے علامہ اقبال پر چھینٹیں ڈالتے ہوئے یہ بھی فرمایا :

''یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم ، قومیت کی بنیاد جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرف ، انسانی اور اخوت بشری پر رکھی ہے ، مجھے معلوم نہیں کہ کون سی نص قطعی یا ظنی سے ثابت ہے ۔''[۳]

بعد کو تقریباً ہر مکتبۂ فکر کے عالموں نے مولانا کے اس خیال کی تردید کی اور ان کے نقطۂ نظر کو گمراہ کن بتایا ۔ علامہ شبیر احمد عثمانی نے قومیت کے مسئلے پر ایک سوال کے جواب میں تحریر فرمایا :

''قومیت کا متحدہ نظریہ جو کانگریس کے دستور اساسی کا بنیادی پتھر ہے میرے نزدیک شرعی نقطۂ نظر سے کبھی قابل تسلیم نہیں ہو سکتا ۔ میں کوئی سیاسی آدمی نہیں ہوں تاہم اپنی قوم کے سود و بہبود کو سوچنا ، اس کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے میرے لئے بھی ناگزیر ہے، جو کچھ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارے لئے سب سے پہلے ایک خالص اسلامی وحدت و مرکزیت پر زور دینے کی ضرورت ہے اس کے بدون کسی نام نہاد قومیت متحدہ کے تیز دھارے میں گھاس کے تنکوں کی طرح اپنے کو ڈال دینا خودکشی کے مترادف ہے ۔ مسلمان ، دوسری قوموں سے صلح کر سکتے ہیں ، عہد و پیمان کر سکتے ہیں، بہت سے امور میں تعاون اور اشتراک عمل کر سکتے ہیں لیکن وہ اپنی مستقل ہستی کو دوسروں میں مدغم نہیں کر سکتے ۔''

۳ ۔ تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء ، ص ۳۵۸

میں اپنے لئے فرقہ پرست کا خطاب پسند کرتا ہوں مگر اپنی قوم کا غدار یا قوم فروش کہلانا کبھی قبول نہیں کر سکتا۔ شاعر حکیم اکبر الہ آبادی نے خوب کہا ہے :

کامیابی ، خارج از ملت سے ناکاسی بھلی
لطف دشمن ہی سے شہرت ہو تو گمنامی بھلی
بے وفا سمجھیں تمہیں اہل حرم اس سے بچو
دیر والے کج ادا کہہ دیں یہ بد نامی بھلی
پختہ ہوکر اپنی شاخ و بن سے ہوتا ہے جدا
اے ثمر چشم محبت میں تیری خامی بھلی°

یہی وہ دور ہے جس میں مسلم لیگ نے یہ محسوس کیا کہ اس کے موقف کی وضاحت اور پروپیگنڈے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اردو کا کوئی اپنا اخبار ہو۔ یقیناً بعض اخبارات مسلم لیگ کی ترجمانی کر رہے تھے لیکن کوئی ایسا اخبار نہ تھا جسے اس کا ترجمان اور نمائندہ کہا جا سکے۔ نتیجہ یہ تھا کہ مسلم لیگ کی روئدادیں اس کے رہنماؤں کی تقریریں اور بیانات ، ادھر ادھر منتشر ، وقت نا وقت چھپتے تھے اور عوام تک دیر سے پہنچتے تھے ، اس کمی کو دور کرنے کے لئے ضروری تھا کہ نشر و اشاعت کے نئے وسائل کے ذریعے مسلم لیگ کے پروپیگنڈے میں تیزی اور وسعت پیدا کی جائے چنانچہ اس کے لئے مسلم لیگ نے ”منشور“ نام کا ایک اردو اخبار نکالا۔ مولانا حسن ریاض لکھتے ہیں کہ :

”۱۹۳۸ء میں میں نے یہ خدمت اپنے ذمے لی تھی کہ مسلم لیگ کی پالیسی اور پروگرام ، مسلمانوں کو سمجھاؤں اور مسلم لیگ پر مخالفین جو اعتراضات کریں ان کا جواب دوں۔ اسی غرض سے ”منشور“ جاری کیا گیا۔ میں نے اس کا اہتمام کیا کہ مسلمانوں کے تصورات اور مقاصد کو معین صورت دے کر ”منشور“ میں

° - تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علما ، ص ۳۶۳

صاف صاف بیان کروں ۔ تا کہ کانگریس کے ان خیالات سے جو اس وقت ماحول پر چھائے ہوئے تھے ، مسلمانوں کے ذہن پاک ہوں ۔،،۶

اسی زمانے یعنی اپریل ۱۹۳۹ء سے انجمن ترقی اردو نے اپنے کام کی وسعت اور اس کی اشاعت و تبلیغ کے پیش نظر ,, ہماری زبان ،، کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالنا شروع کیا ، مولوی عبدالحق لکھتے ہیں کہ :

,, اس زمانے میں ایسے اخبار کی شدید ضرورت تھی ۔ ہمارا علمی سہ ماہی رسالہ اس ضرورت کو پورا نہیں کر سکتا تھا ۔ ہمیں ضرورت تھی کہ ہم لوگوں کو اپنی زبان کی حقیقت ، اس کی ہمہ گیری اور اس کی اہمیت سے آگاہ کریں ۔ روزمرہ کے بے جا حملوں سے بچائیں اور اس کی بقا کی فکر کریں ۔ ہمیں اس بات کی بھی ضرورت تھی کہ ارکان انجمن نیز عام طور پر لوگوں کو انجمن کے حالات اور اس کی کار گزاریوں سے آگاہ کرتے رہیں ۔ اس کی بھی ضرورت تھی کہ شاخوں کو ایک دوسرے کے حالات اور مشکلات سے واقفیت رہے اور ایک تجربے سے دوسرے فائدہ اٹھائیں ۔ جو علمی کام انجمن میں ہو رہے ہیں یا دوسرے ادارے یا اشخاص انجام دے رہے ہیں ان کی اطلاع دور و نزدیک پہنچائی جائے ۔ انجمن کی مطبوعات کا عام اعلان کیا جائے ۔ غرض اپنی کہنے اور دوسروں کی سننے کے لئے ہمیں کالیداس کے میگھ دوت کی طرح ایک قاصد کی ضرورت تھی ۔ جو اس خدمت کو انجام دے ۔،، ۷

اسی زمانے میں مہاتما گاندھی نے زبان کے سلسلے میں ایک اور شوشہ چھوڑا ۔ کانگریس نے فیصلہ کیا تھا کہ ہندوستان کی قومی زبان ,, ہندوستانی ،، ہوگی ، گاندھی جی نے ,, بھارتیہ ساہتیہ پریشد ،، کے جلسے میں اسے ,, ہندی

۶ ۔ پاکستان ناگزیر تھا ، ص ۲۴۱

۷ ۔ کیفیت روئیداد کل ہند اردو کانفرنس ۱۹۳۹ء ، انجمن ترقی اردو ، دھلی ، ۱۹۳۹ء ، ص ۳۶

ہندوستانی " کر دیا ۔ " ہندی ہندوستانی " کی وضاحت چاہی گئی تو ہندی اور ہندوستانی کو مترادف بتایا ۔ جب اس وضاحت کے خلاف ہر طرف سے آواز بلند ہوئی تو ہندی یا " ہندی ہندوستانی " کو چھوڑ پھر " ہندوستانی " کی طرف رجوع ہوئے اور اردو والوں کو ایک نئے ڈھب سے فریب دینے کی کوشش کی ۔ چنانچہ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نے ایک معاہدے پر دستخط بھی کئے اور " ہندوستانی " کا معیار متعین کرنے کے لئے آل انڈیا ریڈیو ، دھلی سے ہندوستانی کے موضوع پر ، بعض اکابر مثلاً ڈاکٹر تارا چند ، مولوی عبدالحق ، بابو راجندر پرشاد ، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں ، پنڈت برجموھن دتاتریا کیفی اور آصف علی سے تقریریں کرائی گئیں جو بعد کو کتابی صورت میں بھی شائع ہوئیں ۔۸ لیکن چونکہ گاندھی جی کی کوئی تجویز ، نیک نیتی پر مبنی نہ تھی اس لئے زبان کا مسئلہ سلجھنے کے بجائے روز بروز الجھتا گیا ۔ ہندوؤں نے کھلم کھلا کہنا شروع کیا کہ آزادی کے بعد ہندوستان کی قومی زبان ناگری رسم الخط میں ہندی ہوگی اور مسلم لیگ نے تکلفات کو چھوڑ کر ، واضح طور پر اپنی قراردادوں میں اردو کی پوری حفاظت کرنے اور قومی زبان بنانے کا اعلان کیا ۔ غرضیکہ ۱۹۳۶ء اور ۱۹۴۷ء کے درمیانی دس برسوں میں ہندی اردو کی لڑائی کئی محاذوں پر لڑی گئی اور اس شد و مد کے ساتھ کہ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کی تاریخ میں یادگار رہے گی ، اس باب میں اسی تاریخی جنگ کا جائزہ لینا مقصود ہے لیکن مناسب یہ ہوگا کہ پہلے اس زمانے کے بعض سیاسی واقعات کا مختصر ذکر کر دیا جائے تاکہ اردو ہندی کے تنازع کی غایت اور نتائج کو سمجھنے میں سہولت ہو جائے ۔

پچھلے باب میں ذکر آ چکا ہے کہ ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت فروری مارچ ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلیوں کے لئے انتخابات منعقد ہوئے ۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے جداگانہ انتخاب کی بنیاد پر باہمی مفاہمت کے ساتھ انتخاب میں حصہ لیا ۔ مسلم لیگ چونکہ پچھلے کئی برسوں سے باہمی

۸ ۔ ہندوستانی کیا ہے ، مکتبہ جامعہ ، دھلی ، ۱۹۳۹ء

اختلافات کا شکار تھی ، اور اس کے پاس نہ تو پروپیگنڈے کے لئے ذرائع تھے اور نہ مالی وسائل ، اس لئے کوئی خاص کامیابی نہ ہوئی ۔ البتہ کانگریس کے امیدوار کئی صوبوں میں اکثریت کے ساتھ منتخب ہو گئے ۔ یوپی ، سی پی ، بہار ، مدراس ، اڑیسہ اور بمبئی میں انھیں ایسی اکثریت حاصل تھی کہ وہ کسی دوسری جماعت کی مدد کے بغیر اپنی وزارتیں بنا سکتے تھے ۔۹ دوسرے صوبوں مثلاً پنجاب ، سندھ اور بنگال میں اگرچہ کانگریس کے نمائندوں کی تعداد زیادہ نہ تھی ، لیکن چونکہ بیشتر جماعتوں کے نمائندے انھیں کے زیر اثر تھے اس لئے ان میں کوئی مخلوط حکومت کانگریس کی حمایت کے بغیر آسانی سے نہ بن سکتی تھی ۔ اس لحاظ سے برصغیر کے سارے صوبوں پر کانگریس راج کے لئے فضا ہموار تھی ، چنانچہ جب حکومت نے کانگریس کو بمبئی ، مدراس ، سی پی ، اور بہار وغیرہ میں اپنی صوبائی وزارتیں تشکیل دینے کی دعوت دی تو وہ تھوڑے سے قیل و قال کے بعد رضامند ہو گئی اور جولائی ۱۹۳۷ء میں ہندوؤں کی نمائندہ جماعت کانگریس نے چھ صوبوں میں خالص ہندوانہ وزارتیں قائم کر دیں ۔۱۰

وزارتوں کی تشکیل سے قبل عام طور پر قیاس کیا جاتا تھا کہ بعض صوبوں خصوصاً یوپی میں جو وزارت قائم کی جائے گی اس میں مسلم لیگ کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے گی ، یہ قیاس بے سبب نہ تھا کانگریس اور مسلم لیگ نے انتخاب میں حریفانہ انداز سے نہیں بلکہ دوستانہ ماحول میں حصہ لیا تھا ۔ دونوں کا انتخابی منشور تقریباً ایک سا تھا بجز اس کے کہ مسلم لیگ نے اپنے منشور میں اردو اور اس کے رسم الخط کو بھی تحفظ دینے کا اعلان کیا تھا ۔ علاوہ ازیں یہ بھی خیال تھا کہ پچھلے برسوں میں ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو نفرت پیدا ہو رہی تھی کانگریس ، مسلم لیگ کے ساتھ مخلوط وزارت بنا کر اس نفرت کو کم کرنے کی کوشش کرے گی ۔ لیکن کانگریس نے اکثریتی قوت کے نشے میں مسلم لیگ کو درخور اعتنا نہ جانا ،

۹ ۔ ٹو نیشن تھیوری ، ص ۶۶۸

۱۰ ۔ ہماری قومی جدوجہد (۱۹۳۸ء) ، البیان ، لاہور ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۶۲

یوپی مسلم لیگ کو مولانا ابوالکلام آزاد کی معرفت، وزارت میں شامل ہونے کی دعوت بھی دی گئی تو اس شرط کے ساتھ کہ مسلم لیگ اپنے وجود کو ختم کرکے، کانگریس میں ضم ہو جائے اور کانگریس کو برصغیر کی واحد سیاسی نمائندہ جماعت تسلیم کر لے۔۱۱ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ خصوصاً یوپی مسلم لیگ اور وہاں کے مسلمانوں کے لئے یہ دعوت ''نوید مسرت'' نہیں خود کشی کی ترغیب تھی۔ حالانکہ یوپی اسمبلی میں مسلمان ممبر ایک دو نہیں چھیاسٹھ کی تعداد میں تھے اور مسلمانوں کی ملی تحریکوں پر ان کا اتنا گہرا اثر تھا کہ اگر انہیں کانگریس وزارت میں شامل کرنے کی کوشش کی جاتی تو اس کا نہایت دور رس اثر پورے ہندوستان کی سیاست پر پڑ سکتا تھا لیکن کانگریس نے اپنی نخوت میں آ کر مسلمانوں کو نظر انداز کر دیا، بقول عاشق حسین بٹالوی:

''متعدد وجوہ سے یوپی کو ہندوستان کے تمام صوبوں میں قلب کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ اول اس لئے کہ یہ علاقہ تین سو سال تک مغلیہ حکومت کے جاہ و جلال کا مرکز رہ چکا ہے اور اس کے آثار یہاں کے چپے چپے پر موجود ہیں۔ دوئم اس لئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے ہندوستان کی صحیح تہذیب اور ادب نے اس خطے میں فروغ پایا تھا۔ سوم اس لئے کہ یوپی کے مسلمان اقلیت میں ہونے کے باوجود تہذیب و تمدن، علم و ادب اور قومی و ملی روایات میں ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی رہنمائی کر رہے تھے۔ چہارم اس لئے کہ یہ صوبہ نہرو خاندان کا وطن ہونے کی وجہ سے کانگریس کی سرگرمیوں کا سب سے بڑا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ ان وجوہ سے تمام ہندوستان کی نظریں یوپی کی طرف لگی ہوئی تھیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے درمیان جو معاملہ وہاں طے پائے گا اس کا عکس پورے برعظیم پر پڑے گا۔''۱۲

۱۱۔ شاہراہ پاکستان، انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی، ۱۹۶۷ء، ص ۶۳۸

۱۲۔ ''اقبال کے آخری دو سال''، اقبال اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۹ء، ص ۵۰۶

کم و بیش ایسا ہی ہوا، سمپورنا نند نے اپنی سوانح عمری میں اعتراف کیا ہے کہ کانگریس نے ۱۹۳۷ء کی وزارتوں میں مسلم لیگ کو نظر انداز کرکے مسلمانوں کو اتنا دل برداشتہ کیا اور ہندی مسلم اتحاد کو ایسی ضرب کاری لگائی کہ مسلم لیگ اس کے بعد کانگریس سے کسی آئینی مسئلے پر مفاہمت کے لئے رضامند نہ ہوئی اور اس طرح جو باہمی اختلاف پیدا ہو گیا تھا وہ قیام پاکستان پر منتج ہوا۔۱۳ بعض دوسرے غیر مسلم مبصروں اور نیشنلسٹ مسلمان مصنفین نے بھی اس امر کا اظہار کیا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ سے رشتہ اتحاد ختم کرکے کانگریس نے نشۂ حکومت کا وقتی لطف تو اٹھا لیا لیکن اس کا خمار، بعد کو اسی کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔ مشہور مورخ ڈاکٹر بینی پرشاد نے لکھا ہے کہ:

"جب ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے ہندو اکثریت کے بل پر خالص کانگرسی وزارتیں مرتب کیں اور اس کے ساتھ مسلم رابطۂ عوام کی تحریک بھی جاری کر دی، تو مسلمانوں کو صاف نظر آنے لگا تھا کہ آئندہ فیڈریشن میں بھی وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جائیں گے۔ ان اسباب نے مل کر مسلمان قوم میں ایک سخت ہیجان و اضطراب پیدا کر دیا تھا یہ گویا مسلم لیگ کی آزمائش کی گھڑی تھی۔ لیگ نے کانگریس کے اس چیلنج کو جو اس کے نزدیک تکبر و غرور اور نشۂ اقتدار کا نتیجہ تھا بخوشی قبول کر لیا ــــ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو ایک پرچم کے نیچے جمع کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیا اور کانگریس کو سراسر ایک ہندوانہ جماعت قرار دیا۔" ۱۴

حتیٰ کہ خود مولانا ابوالکلام آزاد، جنھوں نے کانگریس کے سفیر کی حیثیت سے مسلم لیگ کو کانگریس میں ضم کرنے کا مشورہ دیا تھا اپنے اور

۱۳- میموریز اینڈ رفلکشنز، سمپورنا نند، لندن، ۱۹۶۲ء، ص ۹۶

۱۴- انڈیاز ہندو مسلم کوئسچن، ص ۷۵

کانگریس کے طرز عمل پر اس طور پر اظہار افسوس کیا کہ :

" یوپی میں حد درجہ افسوسناک واقعہ ہوا اگر یوپی مسلم لیگ کی پیش کش قبول کر لی جاتی تو مسلم لیگ پارٹی تمام عملی مقاصد کے لئے کانگریس میں ضم ہو جاتی جواہر لال کے اس عمل نے یوپی میں مسلم لیگ کو نئی زندگی دے دی۔ ہندوستانی سیاست کے سارے طالب علم با خبر ہیں کہ وہ یوپی تھا جہاں سے مسلم لیگ کی تنظیم شروع ہوئی۔ مسٹر جناح نے اس سے پورا فائدہ اٹھایا اور کانگریس کو تنقید کا نشانہ بنا کر پاکستان کے قیام کا راستہ ہموار کر دیا۔ " ۱۵

ڈاکٹر سید عابد حسین نے کانگریس کی اس کوتاہی کی تاویل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ :

" کانگریس پارٹی کے نئے ممبروں میں جو اس کی پالیسی پر حاوی تھے اکثریت ان لوگوں کی تھی جن کو طاقت کی کشش نے کانگریس میں کھینچ لیا تھا اور جن کو اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کے ساتھ فیاضانہ سلوک کرنے کے بارے میں مہاتما گاندھی سے اتفاق نہیں تھا چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ کانگریس کا رویہ واقعی بہت کچھ بدل گیا تھا اگرچہ یہ تبدیلی غیر محسوس طور پر ہوئی تھی اس کی سب سے نمایاں علامت یہ تھی کہ کانگریسی حکومتوں نے کانگریس کی اس پالیسی پر جس کا وہ باضابطہ اعلان کر چکی تھی کہ ہندوستانی زبان (ہندی اور اردو کی قدر مشترک) کو دیو ناگری اور فارسی دونوں خطوں کے ساتھ قومی زبان بنایا جائے گا کسی صوبے میں عمل نہیں کیا اور عام طور پر اردو کو دبانے کی کوشش کی۔ اس سے مسلمانوں کے نہ صرف اونچے اور متوسط طبقے بلکہ

۱۵ - انڈیا ونز فریڈم ، ص ۲۱

نچلے طبقے میں بھی سخت بے چینی پھیل گئی۔"[16]

رچرڈ سائمنڈ نے لکھا ہے کہ:

"اگرچہ پارلیمانی اصولوں کے مطابق کانگریس اس کی پابند نہ تھی کہ وہ واضح اکثریت میں ہوتے ہوئے دوسری جماعتوں کے نمائندوں کے ساتھ مل کر حکومت بناتی، اس لئے اس نے اگرچہ اپنی کابینہ میں مسلمان وزیر رکھے لیکن مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت مسلم لیگ سے نہ تو مشورہ کیا اور نہ اسے اعتماد میں لیا لیکن یہ موقف مسلمانوں کے نقطۂ نظر سے اس لئے درست نہ تھا کہ انتخاب سے قبل کانگریس نے اس کے برعکس موقف کا اظہار کیا تھا اور پنجاب میں جہاں سر سکندر حیات خان کو اسمبلی میں کھلی اکثریت حاصل تھی وہاں ہندو سیاسی جماعتوں کو اعتماد میں لے کر وزارت قائم کرنے میں ہندو مسلم اتحاد کی مثال قائم کر دی گئی تھی۔"[17]

پرسیول گرنتھس کی رائے میں وزارتوں میں مسلمانوں کو نظر انداز کرنا،

"کانگریس کی بہت بڑی غلطی تھی، لیگ اور کانگریس کے معاشرتی اور سیاسی پروگرام میں کوئی فرق نہ تھا اس لئے اگر کانگریس لیگ سے مل کر مشترک وزارتیں بنا لیتی تو ایسی وزارتیں آسانی سے کام کر سکتی تھیں۔ بجا طور پر مسلمان یہ سمجھنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ انھیں اقتدار سے صرف اس لئے محروم کیا گیا ہے کہ کانگریس سراسر ہندوانہ جماعت ہے۔"[18]

ریجنلڈ کوپ لینڈ نے بڑی تفصیل سے کانگریس وزارت کی تشکیل پر روشنی

۱۶- قومی تہذیب کا مسئلہ، انجمن ترقی اردو، علیگڑھ، ۱۹۵۵ء، ص ۳۱۵

۱۷- دی میکنگ آف پاکستان، ص ۵۵

۱۸- دی برٹش امپیکٹ آن انڈیا، لندن، ۱۹۵۲ء، بحوالہ حصول پاکستان، ص ۲۰۵

ڈالی ہے اور تجزیہ کرکے بتایا ہے کہ :

"اس کے بعد مسلم لیگ ، کانگریس اور اس کے اس دعوے سے کہ وہ ہندوستان اور مسلمان دونوں کی نمائندہ ہے ، ہمیشہ کے لئے مایوس ہو گئی اور اس نے اپنی منزل آپ تلاش کرنے کے عمل کو تیز سے تیز کر دیا ۔" ۱۹

اس طرح کا اظہار خیال ۱۹۳۷ء کی کانگریس وزارتوں کے بارے میں ، اور بہت سے مورخین نے کیا ہے لیکن ان کو دھرانے سے اس جگہ کوئی فائدہ نہیں، ظاہر صرف یہ کرنا تھا کہ وہ کانگریس جو بظاہر ہندو مسلم اتحاد کی داعی اور برصغیر کے سارے باشندوں کی نمائندہ ہونے کی دعویدار تھی ۔ حکومت بنانے کا موقع آتے ہی ، عملاً خالص ہندو جماعت ثابت ہوئی اور مسلمانوں کے حقوق و مطالبات کو پس پشت ڈال کر رام راج قائم کرنے کا خواب دیکھنے لگی ، اس لئے کہ کانگریس نے صرف مسلمانوں کی نہیں بلکہ ہر غیر ہندو کو حکومت اور اس کے مقتدر منصبوں سے قصداً دور رکھا ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے خود اس سلسلے میں نہایت افسوس کے ساتھ یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ :

"کانگریس کے پارٹی لیڈر اور ممتاز ترین کانگریس رهنما مسٹر نریمان کو صوبہ بمبئی میں متعصب ہندو کانگریسیوں نے وزیر اعلیٰ بنانا پسند نہ کیا کہ وہ پارسی تھے ۔" ۲۰

اقتدار میں آ جانے کے بعد تو کانگریس حکومت کی حکمت عملی اور بعض بڑے تہذیبی و سیاسی مسائل میں من مانی کرنے سے صاف ظاہر ہو گیا کہ کانگریس اپنی ذهنیت کے اعتبار سے کٹر ہندو جماعت ہے اور وہ مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو جلد سے جلد ختم کرکے ہندو قومیت میں جبراً ضم کر دینا چاہتی ہے ۔ چنانچہ ہوا بھی یہی کانگریس حکومت نے ہر جگہ مسلمانوں

۱۹ - تفصیل کے لئے دیکھئے ، انڈین پالیٹکس ، مدراس ، ۱۹۴۴ء ، ص ۱۵۴ تا ص ۱۷۸

۲۰ - انڈیا ونز فریڈم ، ص ۱۵

پر نہ صرف وزارتی عہدوں، اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے بلکہ ان کے مذہب، ان کے عقائد، ان کی مذہبی تقریبات، ان کی زبان اور ثقافت، سب پر ایسی ضربیں لگائیں کہ من حیث القوم وہ بڑے پیچ و تاب میں پڑ گئے۔

کانگریس حکومت اگرچہ سیکولر ہونے کی مدعی تھی لیکن اس نے پہلا کام یہ کیا کہ بینکم چندر کے ناول "آنند مٹھ" کے ایک گانے "بندے ماترم" کو اپنا قومی ترانہ قرار دے دیا۔ اس ناول کے بارے میں پچھلے کسی باب میں بتایا جا چکا ہے کہ اس کا مقصد مسلمانوں کے خلاف نفرت و جنگ جوئی کا جذبہ پیدا کرنا تھا، یہ انیسویں صدی میں لکھا گیا تھا اور مسلمان اسی وقت سے اس کے خلاف احتجاج کرتے چلے آ رہے تھے۔ "بندے ماترم" اسی ناول کی ایک "دعا" ہے، جس میں "کالی دیوی" کے سامنے ہاتھ جوڑ کر مسلمانوں کو مفتوح و مغلوب کرنے کی دعا مانگی گئی ہے۔ محمد داور حسین نے "بندے ماترم اور اس کا تاریخی پس منظر" کے عنوان سے جو کتاب مرتب کی ہے اس میں بندے ماترم کا اردو ترجمہ بھی دے دیا گیا ہے۔ اور نواب صدیق علی خان نے "بے تیغ سپاہی" میں اس ترجمے کے بعض اجزا نقل کئے ہیں۔[۲۱]

ہونا یہ چاہئے تھا کہ مسلمانوں کے جذبات کا لحاظ رکھ کر اس گانے سے گریز کیا جاتا، لیکن ایسا کرنے کے بجائے اس کو "قومی ترانہ" قرار دے کر ہندو، مسلمان دونوں کو اس کے سننے اور پڑھنے پر مجبور کیا گیا۔ سارے اسکولوں اور کالجوں میں صبح کو یہ ترانہ بچوں اور نوجوانوں سے پڑھوایا جاتا اور مسلمان بچے بچیوں سے ان کے مذہبی عقاید کے خلاف اس کا احترام کروایا جاتا۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ مسلمانوں کے مذہبی عقاید سے براہ راست متصادم تھا اس لئے کانگریس حکومت کی طرف سے ان کا شاکی ہونا ایک فطری عمل تھا۔ کانگریس نے بندے ماترم کو قومی ترانہ بنانے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کی مرضی

۲۱۔ بے تیغ سپاہی، الائنز بک کارپوریشن، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۳۱

و منشا کے خلاف ایک حیرت انگیز قدم یہ اٹھایا کہ کانگریس کے ترنگے جھنڈے کو قومی پرچم قرار دے دیا نتیجتاً ہر ایک کے لئے اس کو سلامی دینا ضروری ہو گیا۔ سب کو معلوم تھا کہ "ترنگا جھنڈا" قومی جھنڈا نہیں بلکہ ایک سیاسی جماعت کا جھنڈا تھا۔ ملک کی دوسری سیاسی جماعتیں بشمول مسلم لیگ بھی اس طرح کے اپنے انفرادی پرچم رکھتی تھیں اور اس لئے عام خیال یہ تھا کہ جب ہندوستان کو خود مختاری ملے گی اور کوئی جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ساری جماعتوں اور پرچموں کے اشتراک سے کوئی پرچم تیار کیا جائے گا۔ لیکن کانگریس نے اس کا لحاظ کئے بغیر اپنا جماعتی پرچم، سارے ملک اور ساری قومیتوں پر مسلط کر دیا۔ عبدالوحید خان نے ڈاکٹر بینی پرشاد اور پروفیسر کوپ لینڈ کے تبصروں کے حوالے سے ۲۲، صحیح لکھا ہے کہ:

"بندے ماترم" اور "ترنگے جھنڈے" کو کانگریس نے قومی ترانہ اور قومی پرچم بنا کر ہندو قوم پرستی اور مسلمان دشمنی کا ایسا عملی ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ مسلمانوں کا کانگریس سے قریب تر آنے کا اب کوئی سوال ہی باقی نہ رہا۔"

کانگریس کا ایک اور شاہکار، اس کا وہ تعلیمی منصوبہ ہے جسے تعلیمی دنیا میں "بنیادی قومی تعلیم (Basic National Education) کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ یہ در اصل گاندھی جی کے ذہن کی تخلیق تھا اور انھیں کے دئے ہوئے خاکے کے مطابق، ڈاکٹر ذاکر حسین خاں (سابق صدر ہندوستان) نے غلام السیدین اور سات دوسرے ہندو ممبروں کے ساتھ اس کی ایک مفصل رپورٹ مرتب کی تھی، یہی رپورٹ جس کا چوتھا ایڈیشن اس وقت میرے سامنے ہے، ۲۳ ذاکر حسین کمیٹی رپورٹ کہلائی اور بیسک نیشنل ایجوکیشن کے

۲۲- انڈیا ونز فریڈم، دی ادر سائڈ، از عبدالوحید خان، پاکستان ایجوکیشن پبلشرز، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۹۳-۹۴

۲۳- بیسک نیشنل ایجوکیشن، ہندوستانی تعلیمی سنگھ، واردھا (سی پی)، جولائی ۱۹۳۸ء، طبع چہارم

نام سے شائع ہوئی۔ چونکہ یہ اسکیم ابتداً واردھا ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تحت مہاتما گاندھی کی زیر صدارت منظور ہوئی تھی اس لئے عام طور پر اسے واردھا اسکیم کے نام سے پکارا گیا۔ ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر ذاکر حسین نے اپنی رپورٹ، مہاتما گاندھی کی خدمت میں ایک خط کے ساتھ پیش کی اور مارچ ۱۹۳۸ء میں اسے کتابی صورت میں شائع کرکے، نافذ کر دیا گیا۔ دوسرے ایڈیشن مطبوعہ اگست ۱۹۳۸ء میں مہاتما گاندھی کا مختصر پیش لفظ بھی شامل کر دیا گیا۔ اس رپورٹ کا اردو ترجمہ رسالہ جامعہ دھلی، بابت جنوری ۱۹۳۸ء میں پہلے ھی شائع ھو چکا تھا۔

یہ اسکیم دو بنیادی نظریات کے تحت مرتب کی گئی تھی ایک عدم تشدد، دوسرے وطن پرستی۔ یہ دونوں باتیں اسلامی تعلیمات اور مسلمانوں کے نظریات کی ضد تھیں۔ برائی کے سد باب اور حق کی سر بلندی کے لئے مسلمانوں پر جہاد فرض تھا، جبکہ عدم تشدد یا اہنسا کی رو سے ہر قسم کا تشدد بلکہ دفاع بھی ممنوع تھا۔ چنانچہ اسکیم میں گوشت خوری ترک کرکے سبزی خوری پر زور دیا گیا تھا۔ درسی کتابیں اس نقطۂ نظر سے لکھی گئی تھیں کہ ھندو تہذیب کی عظمت اجاگر ھو اور قدیم ھندو مشاھیر کا احترام دل میں جاں گزیں ھو جائے۔ مسلمان بچوں کو یہ پڑھایا جاتا تھا کہ سارے مذاھب سچے ھیں اور موجودہ مذاھب کے من جملہ بانیوں میں ایک رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم ھیں، ظاھر ہے کہ اس تعلیم سے اسلام کی صداقت اور رحمت دو عالم کی حیثیت سے آنحضرت کے بلند مقام کے بارے میں مسلمان بچوں کا یقین متزلزل ھو جانے کا خطرہ تھا۔[۲۴] علاوہ ازیں واردھا اسکیم میں موسیقی کو تعلیم کا لازمی جزو قرار دیا گیا تھا۔ لڑکے لڑکیوں کے لئے مخلوط مدارس کی تجویز پیش کی گئی تھی، دینی تعلیمات کو نصاب سے خارج کرکے سیکولر یعنی لا دینی تعلیم کو قومی ترقی کے لئے ضروری سمجھا گیا تھا۔ یہ ساری باتیں مسلمانوں کے عقائد و نظریات کے خلاف تھیں اور ان کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہ تھا کہ

۲۴۔ تحریک پاکستان، ص ۲۰۴

مسلمانوں کی ملی انفرادیت کو رفتہ رفتہ ختم کرکے انہیں ہندو قومیت میں ضم کر لیا جائے۔

"ودیا مندر اسکیم" جس کے بانی سی پی میں کانگریس حکومت کے وزیر تعلیم، روی شنکر شکلا تھے در اصل "واردھا اسکیم" ہی کا ایک حصہ یا ضمیمہ تھی۔ اس کا واحد مقصد مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے ذہن سے دینی و ملی تصورات کو نکال کرکے ان پر ہندو قومیت کا رنگ جمانا تھا۔ خود سی پی کے وزیر تعلیم نے جن کے حکم سے ودیا مندر اسکیم بروئے کار آئی، اس کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

> ۱۔ "ودیا مندر" کے نام میں ایک سے زیادہ کششیں ہیں۔ اس نام سے دیہات کے رہنے والے ننانوے فیصد لوگوں (ہندوؤں) میں روحانی ولولہ پیدا ہوگا۔
>
> ۲۔ "ودیا مندر اسکیم" چونکہ واردھا اسکیم کا بچہ ہے اس لئے ہندی اور مرہٹی ذریعۂ تعلیم ہوگی۔
>
> ۳۔ ودیا مندر کے نصاب میں صرف وہ کتابیں پڑھائی جائیں گی جن میں ہندو دیوتاؤں، ہندو سورماؤں اور ہندو کلچر کا ذکر ہے۔"[۲۵]

سی پی اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اسے ہندو مسلم اتحاد کے لئے مہلک بتایا لیکن کسی کی ایک نہ سنی گئی۔ من مانے طور پر پوری اسکیم صوبے میں نافذ کر دی گئی۔ یہ مسلمانوں کے عقاید اور جذبات کے خلاف کانگریس حکومت کی ایسی جارحیت تھی کہ صرف مسلم لیگ ہی نہیں بلکہ ہر طبقۂ خیال کے مسلمانوں اور غیر جانبدار غیر مسلم مبصروں نے اس کے خلاف آواز بلند کی۔ کوپ لینڈ نے لکھا ہے کہ:

> "کانگریس نے اپنے دور حکومت میں تعلیم کے لئے جو اسکیم تیار کی وہ خاصی طنز آمیز تھی۔ نصابی کتابوں میں اسلام کی قیمت پر ہندو ازم

۲۵۔ بے تیغ سپاہی، ص ۱۵۲

کا پرچار کیا گیا۔ اور مسلمان بچوں میں ہندوؤں کے عقائد کے جراثیم شامل کرنے کی بھرپور کوشش کی گئی، در اصل کانگریس یہ چاہتی تھی کہ وہ جو کام ایک سیاسی تنظیم کی حیثیت میں کھلے بندوں نہ کر سکی یعنی کہ مسلمانوں کو ہندو قومیت میں ضم نہ کر سکی وہ کام اسے واردھا اسکیم کے تحت کرنا چاہئے۔ اس لئے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت اور بیزاری پہلے سے کہیں زیادہ ہو گئی۔" ۲۶

حتیٰ کہ کانگریس کی ضمیمہ جماعت "جمعیت العلمائے ہند" نے بھی اس تعلیمی اسکیم کی مخالفت کی، ۵ مارچ ۱۹۳۹ء کو دھلی میں جمعیت کے اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے مولانا احمد سعید نے دھمکی دی کہ:

"کانگریس نے اس اسکیم کو مکمل طور پر مسلمانوں پر نافذ کیا تو جمعیت سول نافرمانی سے بھی گریز نہیں کرے گی۔" ۲۷

مولانا سید ابوالاعلی مودودی نے واردھا اسکیم اور ودیا مندر پر مبسوط تبصرہ قلم بند کیا اور اس میں انھوں نے واردھا اسکیم کے بارے میں لکھا:

"اسکیم کا نام ھی بنیادی قومی تعلیم کی اسکیم ھے۔ اس کے معنی یہ ھیں کہ اس نظام تعلیم کی بنیاد ھی قومیتوں کی نفی پر رکھی گئی ھے۔ اس میں کسی جداگانہ قومیت کا رنگ نہیں آ سکتا۔ یہ بنایا ھی اسی لئے گیا ھے کہ ھماری آئندہ نسل کے ذھن سے اس تخیل کو نکال دے کہ "ہندوستانی" کے سوا ان کی اور قومیت بھی ھے۔"

"اسکیم بنانے والوں کے پیش نظر مختلف مذاھب کے پیروؤں کو ملا کر ایک سماج یعنی ایک ھیئت اجتماعی یا ایک سوسائٹی بنانا ھے،

۲۶۔ بحوالہ تحریک آزادی، ص ۳۵۱

۲۷۔ ٹوورڈس پاکستان، از وحید الزماں، لاھور، ۱۹۶۴ء، بحوالہ حصول پاکستان، ص ۲۱۲

اس لئے وہ ہر مذہب کی ایسی تعلیمات کو بچوں کے ذہن سے خارج رکھنا ضروری سمجھتے ہیں جو ان میں مذہبی انفرادیت پیدا کرتی ہو۔ تمام مذاہب کے متعلق یہ نظریہ ان کے ذہن میں بٹھانا چاہتے ہیں کہ ان میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ وطن پرستی ان میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ مذہبیت کی بنیاد پر الگ الگ رہنے کے بجائے وطنیت کی بنیاد پر ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں۔ ہندوستان کے پچھلے زمانے کی عزت ان کے دل میں پیدا کرنا چاہتے ہیں تاکہ ان سب میں قومی افتخار کے جذبات ایک ہی سر چشمے یعنی ہندوستان کے زمانۂ ماضی سے پیدا ہوں اور بیرون ہند کی تاریخ سے ان کے جذبات کا تعلق منقطع ہو جائے۔" ۲۸

علامہ سید سلیمان ندوی نے ودیا مندر اسکیم پر تنقید کرتے ہوئے لکھا:

"سیاست کے انقلاب اور قومیت کے نئے خیال نے نیا روپ بھرا اور یہ کوشش ہے کہ ہندوستان کے رہنے والوں اور خاص طور سے ہندو مسلمانوں کو اس طرح ایک کر دیا جائے کہ اقلیتوں پر اکثریت کا رنگ روغن چڑھ جائے اور وہ اپنی اصل و نسل اور دین و ملت کو بھول کر اکثریت میں مدغم ہو جائیں چنانچہ کہنے والے کہتے ہیں کہ واردھا اسکیم، ودیا مندر اسکیم سمپورنا نند جی اور ٹنڈن جی کی ہندی اور گاؤں سدھار کی موجودہ صورت حال، اصلی مقصد تک پہنچنے کے زینے ہیں اور یہی وہ چیزیں ہیں جو ان کی بد گمانی کو مضبوط کرتی ہیں اور یہی وہ نشان ہیں جن سے ان کے نزدیک موجودہ کارواں سیاست کی سمت راہ کا پتہ چلتا ہے۔" ۲۹

۲۸ - تحریک آزادی ہند اور مسلمان، اسلامی پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۴ء، ص ۱۸۴ اور ص ۲۱۳

۲۹ - ماہنامہ الفرقان، جمادی الاول ۱۳۸۵ھ، جلد ۶، ص ۱۱، بحوالہ برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقاء، ص ۱۷۸

یہی نہیں ، کانگریس نے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی اور کئی ایسے اقدامات کئے جو مسلمانوں کے جذبات کو سراسر مجروح کرنے والے اور ان کے مفادات کو نقصان پہنچانے والے تھے بقول ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی بندے ماترم ، قومی پرچم اور ودیا مندر اسکیم کے علاوہ بھی ہندی کو دیو ناگری رسم الخط میں قومی زبان بنانے کی کوشش ، اردو پڑھنے والوں کی حوصلہ شکنی ، اردو سے یکسر بے نیازی ، مقامی خود مختار اداروں میں جداگانہ انتخاب کے بجائے مخلوط انتخاب کے رواج ، مسلمانوں کے مذہبی فرائض و دینی تقریبات میں مداخلت اور جائز حقوق دینے سے انکار ، ایسی باتیں تھیں جو مسلمانوں کی تشویش اور ناراضگی کا باعث ہوئیں ۔۳۰

حکومت کے مظالم سے قطع نظر ہندو مہاسبھا جیسی مسلمان دشمن جماعت جس کا ذکر پچھلے باب میں آ چکا ہے ، کانگریس راج میں ہر قسم کی قانونی پابندی سے آزاد ہو گئی ۔ وی ڈی ساورکر ، ۱۹۳۷ء سے ۱۹۳۹ء تک یعنی کانگریس کے پورے دور حکومت میں ہندو مہاسبھا کے صدر رہے ۔ ان کا نقطۂ نظر مسلمانوں کے متعلق یہ تھا ، کہ وہ ملچھ ہیں ، غیر ملکی ہیں ۔ ہندوستان کی آزادی کے دشمن ہیں ، ہندوستان کی قومیت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مسلمانوں کو ہندوستان کی آزاد حکومت میں کوئی حصہ نہیں ملنا چاہئے ، اگر انہیں ہندوستان میں رہنا ہی ہے تو انہیں ہندو تہذیب میں پوری طرح ڈھل جانا چاہئے اور ہندو کے رحم و کرم پر زندگی گذارنا چاہئے ۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار انھوں نے ایک جگہ اور ایک بار نہیں ، جگہ جگہ بار بار کیا ۔ ۱۹۳۷ء میں ، ۱۹۳۸ء اور ۱۹۳۹ء میں ہندو مہاسبھا کے سالانہ اجلاس علی الترتیب ، احمد آباد ، ناگپور اور کلکتے میں منعقد ہوئے ۔ تینوں جگہ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ۔ احمد آباد کے اجلاس میں انھوں نے کہا :

> ”ہندوستان کی سر زمین پر صرف ہندوؤں کا حق ہے ۔ مسلمان، بدیسی اور غدار ہیں ۔“

۳۰ ۔ دی اسٹرگل فار پاکستان ، ص ۱۲۳

ناگپور کی تقریر میں انہوں نے مسلمانوں کو ہندوستان سے نکال دینے اور ان کو بیرونی مسلمانوں کی مدد سے محروم رکھنے کی ایک جارحانہ اسکیم کا اعلان کیا۔ کلکتے کے خطبے میں انہوں نے کہا کہ:

''ہندوستان میں خالص ہندو راج قائم کیا جائے اور سنسکرت آمیز ہندی کو ناگری رسم الخط میں ملک کی قومی زبان بنا دیا جائے۔'' ۳۱

کانگریسی حکومت کی در پردہ شہ اور تجاہل عارفانہ کے نتیجے میں یہ ہوا کہ مہاسبھا کے احکام اور پروگرام کے مطابق ہندوؤں نے مسلمانوں کو حقارت و نفرت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔ ان کے مذہبی فرائض کی ادائگی میں مداخلت کی۔ اذان اور نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے باجے بجا کر جذبات کو مجروح کیا اور اگر کسی طرف سے روک ٹوک ہوئی تو لوٹ مار اورقتل و غارت کا بازار گرم کر دیا گیا۔ مختصر یہ کہ کانگریس نے اپنی حکومت میں مسلمانوں کی جان ضیق میں کر دی۔ یہ تو کہئیے کہ ستمبر ۱۹۳۹ء میں دوسری جنگ عظیم چھڑ گئی اور حالات ایسے ہو گئے کہ کانگریس حکومتوں کو اس کے بعد ۳۱ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو مستعفی ہو جانا پڑا۔ ۳۲

کانگریس حکومت نے شدائد و مظالم کا یہ سارا طوفان چند مہینوں کے اندر بپا کر دیا۔ مجبوراً آل انڈیا مسلم لیگ نے سارے واقعات کا جائزہ لینے اور زیادتیوں کی نوعیت کا سراغ لگانے کے لئے اکتوبر ۱۹۳۷ء کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں ایک تحقیقی کمیٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ کمیٹی پیر پور کمیٹی کے نام سے مشہور ہوئی کیونکہ اس کے چیرمین، پیر پور کے راجہ سید محمد مہدی تھے۔ کمیٹی نے اپنی مفصل رپورٹ کی تیاری میں تقریباً ایک سال کا وقت لیا۔ نومبر ۱۹۳۸ء میں یہ رپورٹ سینتالیس صفحوں پر ایک کتابچے کی صورت میں شائع ہوئی، یہ تین حصوں پر مشتمل تھی پہلے حصے میں عمومی جائزہ تھا۔ دوسرے حصے میں ہندو مسلم نزاع کی

۳۱ - ٹو نیشن تھیوری، ص ۶۹۳ تا ص ۷۰۲

۳۲ - پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۱۸

نوعیت اور اس کے اسباب اور تیسرے حصے میں مسلمانوں پر حکومت کے مظالم کی تفصیلات درج ہیں - پہلے حصے یعنی عمومی جائزے کا خلاصہ اس طور پر درج ہے :

”ہندوستان میں فرقہ وارانہ مسئلے نے ایسی صورت اختیار کر لی ہے کہ جس کا کوئی تصفیہ نظر نہیں آتا - بعض حلقوں کے نزدیک اس قسم کا اعلان کر دینا کافی ہے کہ اقلیتوں کو مطمئن رہنا چاہئے کہ ان کے زبان ، کلچر اور مذہب بالکل محفوظ ہیں، گویا اقلیتوں کو اس اعلان کے بعد اور کسی قسم کے تحفظ کی ضرورت نہیں - یہ انداز فکر بالکل غلط ہے - کانگریس نے اگرچہ اپنے اندر چند مسلمانوں ، سکھوں اور مسیحیوں کو بھی شامل کر رکھا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ماننا پڑے گا کہ کانگریس سراسر ہندوؤں کی جماعت ہے -“ ۳۳

کانگریس کے مظالم کے سلسلے میں پیرپور کمیٹی کی رپورٹ منظر عام پر آئی تو کانگریس کے ممتاز رہنما پنڈت جواہر لال نہرو اور بعض دوسروں نے اس میں مندرج واقعات کی صحت سے انکار کیا - اس پر بنگال کے مولوی فضل الحق اور پنڈت نہرو کے درمیان بحث چھڑ گئی - آخرکار مولوی فضل الحق نے ۱۰ دسمبر ۱۹۳۹ء کے اخبار اسٹیٹس مین میں ایک مفصل مضمون لکھا - اس میں انھوں نے ان مسلم کشی واقعات و فسادات کا مدلل جائزہ لیا ، جو کانگریس کے دور حکومت میں بہار ، سی پی اور یوپی میں رونما ہوئے تھے - پورا مضمون تقریباً پچاس صفحوں پر مشتمل ہے اور اس کا اردو ترجمہ ، ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی نے اپنی کتاب ، ”ہماری قومی جد و جہد“ (جنوری ۱۹۳۹ء سے دسمبر ۱۹۳۹ء) میں درج کر دیا ہے - اس مضمون کی چند ابتدائی سطریں دیکھئے :

”دو سال سے کچھ اوپر مدت گذر چکی ہے میرے پاس ایسی دستاویزیں موجود ہیں جن میں ان مظالم کی خون چکاں روئداد درج ہے ، جن

۳۳ - ہماری قومی جد و جہد ، ۱۹۳۸ء ، ص ۲۳۴

کا ہندوستان کے کانگریسی صوبوں میں مسلمانوں کو نشانہ بنایا گیا۔ کانگریس نظم و نسق کے تحت جتنے فسادات ہوئے اور ان فسادات میں مسلمانوں کا جس قدر مالی اور جانی نقصان ہوا، اس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں پہلے کبھی نہیں ملتی۔

کانگریسی وزارتوں نے حکومت سنبھالتے ہی بعض عجیب و غریب حرکتیں کیں۔ مثلاً یہ کہ سرکاری افسروں کے نام احکام جاری کئے گئے کہ اہم انتظامی امور میں کانگریس کمیٹی کے ممبروں سے مشورہ کیا جائے۔ سرکاری اور نیم سرکاری عمارتوں پر کانگریس کا ترنگا پرچم لہرایا جائے۔ سرکاری و نیم سرکاری مجمعوں میں بندے ماترم گایا جائے۔ ہندی زبان اور ہندوؤں کے کلچر کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ ہندوؤں کو محسوس ہوا کہ وہ رام راج آ گیا جس کا انھیں مدت سے انتظار تھا۔ وہ بے بس مسلم اقلیت کو ایسی حقارت سے دیکھنے لگے جیسے ہومر کے زمانے میں ایک دیو سائیکلوپس کمزور اور منحنی انسانوں کو دیکھا کرتا تھا۔ سائیکلوپس کی طرح وہ بھی صرف ایک آنکھ سے دیکھتے تھے۔ ان کی دوسری آنکھ جو انہیں حق انصاف اور مساوات کی آگہی عطا کر سکتی تھی اور یہ باور کرا سکتی تھی کہ ہندوستان میں رہنے والے مسلمان تعداد میں کم ہیں تاہم اپنے حقوق تو رکھتے ہیں۔ یہ تھی وہ فضا جس میں ہندوؤں نے مسلم اقلیتوں پر اپنی مرضی مسلط کرنے کا آغاز کیا۔

اور ان کی مرضی کیا تھی؟ گئو ماتا کا تحفظ لازمی ہے۔ مسلمانوں کو گائے کا گوشت کھانے کی ہرگز اجازت نہ دینا چاہئے۔ مسلمانوں کے مذہب کو ضرور ذلیل کرنا چاہئے۔ اذان کی ممانعت کر دینی چاہئے۔ عین نماز کے وقت مسجدوں کے سامنے باجے گاجے اور ڈھول ڈھمکے کا جلوس نکالنا ضروری ہے۔ ہندی زبان اور ہندوؤں کا کلچر، مسلمانوں پر مسلط کرنا چاہئے۔ قبرستانوں، مسجدوں، امام باڑوں

کی بے حرمتی کرنی چاہئے۔ پھر اس میں تعجب ہی کیا ہے کہ اس ماحول میں المناک حادثوں کا ایک تانتا بندھ گیا۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ دیہاتی علاقے خوف و ہراس اور دہشت کی کمین گاہ بن گئے۔ کہیں کہیں یہ بھی ہوا کہ مظلوم بالاخر مقابلے پر ڈٹ گئے اور تمام فسادات یک طرفہ نہ رہے، لیکن یہ بالکل ایسی بات ہوگی جیسے کوئی جرمن مورخ پولینڈ کے باشندوں پر الزام لگائے کہ انھوں نے جرمن کی حملہ آور فوجوں کا کیوں مقابلہ کیا تھا؟ "۳۴

بعد ازاں ۱۹۴۱ء میں حکیم اسرار احمد کریوی کی مرتبہ کتاب "سی پی میں کانگریس راج" شائع ہوئی۔ پونے چار سو صفحات کی اس کتاب میں مرتب نے سی پی میں کانگریس کے ظلم و ستم کی مفصل داستان، دستاویزی شہادتوں کے ساتھ بیان کی ہے۔

ان رپورٹوں کا یہ اثر ہوا کہ برصغیر کے مسلمانوں میں غم و غصہ کی شدید لہر سی دوڑ گئی اور ان کے دل میں یہ خیال، کہ ہندوستان میں ایک نہیں دو قومیں ہیں اور اب وہ مل کر نہیں رہ سکتیں، ہمیشہ کے لئے مستحکم ہو گیا۔ اس دو قومی نظریے کے سلسلے میں سرسید احمد خاں، عبد الحلیم شرر اور جسٹس امیر علی وغیرہ کے خیالات کا تذکرہ اس سے پہلے کہیں آ چکا ہے۔ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد میں علامہ اقبال نے اپنے صدارتی خطبے میں اس نظریے کی وضاحت کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ:

"میری خواہش ہے کہ پنجاب، صوبہ سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے، خواہ یہ سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے، خواہ اس کے باہر۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ اور نہیں تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں

۳۴۔ ہماری قومی جد و جہد، ۱۹۳۹ء، ص ۳۳۳ تا ص ۳۳۵

کو بالآخر ایک منظم اسلامی ریاست قائم کرنی پڑے گی۔"۳۵

۱۹۳۳ء میں چودھری رحمت علی نے ہندوستان کے اندر ایک مسلم ریاست کے لئے "پاکستان" کا نام بھی تخلیق کر لیا تھا اور پاکستان اسپیشل سوومنٹ کے بانی کی حیثیت سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ:

"پانچ مسلم اکثریتی وحدتوں پنجاب، شمال مغربی صوبہ سرحد، کشمیر، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک علیحدہ وفاق قائم کیا جائے۔"۳۶

چنانچہ برصغیر کے مسلمانوں نے جب ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت منتخب ہونے والی کانگریسی وزارتوں کا رویہ دیکھ لیا اور بے شمار مسلمان کش واقعات ان کے تجربے میں آ گئے، تو متحدہ ہندوستان اور متحدہ قومیت پر جو ان کا تھوڑا بہت ایمان باقی تھا وہ بھی ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ ان میں خود کو منظم کرنے اور جلد سے جلد اس صورت حال سے نجات پانے کے لئے عجیب بے چینی پیدا ہو گئی۔ ان کے ذہنوں کو سرسید احمد خان، علامہ اقبال اور چودھری رحمت علی کے خیالات اس شدت سے پریشان کرنے لگے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے فیصلہ سے پہلے سندھ کی صوبائی مسلم لیگ کے اجلاس منعقدہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۸ء زیر صدارت قائد اعظم محمد علی جناح حسب ذیل قرارداد منظور کر دی گئی:

"سندھ صوبائی مسلم لیگ کانفرنس وسیع و فراخ براعظم ہند کے قیام امن کے مفاد میں اور بے روک ٹوک ثقافتی تعمیر و ترقی، معاشی اور سماجی بہبود اور دونوں قوموں کی جو ہندو اور مسلمانوں کے نام سے موسوم کی جاتی ہیں، سیاسی حق خود ارادی کے مفادات کے پیش نظر یہ چیز قطعی طور پر ضروری سمجھتی ہے کہ ہندوستان، دو وفاقوں میں تقسیم کر دیا جائے، یعنی مسلم ریاستوں کا وفاق

۳۵۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص ۱۰۹

۳۶۔ پاکستان منزل بہ منزل، ص ۱۷۲

اور غیر مسلم ریاستوں کا وفاق۔ چنانچہ یہ کانفرنس کل ہند مسلم لیگ سے سفارش کرتی ہے کہ دستور کی ایک ایسی اسکیم وضع کرے جس کے تحت مسلم اکثریتی صوبے، مسلم دیسی ریاستوں اور وہ علاقے جہاں مسلمانوں کی اکثریت میں آبادی ہے۔ ایک اپنے ذاتی وفاق کی شکل میں مکمل آزادی حاصل کر سکیں اور وہ بھی اس طرح کہ ہندوستانی سرحدوں کے اس پار واقع دوسری کسی بھی مسلم ریاست کو اس بات کی اجازت ہو کہ وہ اس وفاق میں شامل ہو سکے اور غیر مسلم اقلیتوں کے لئے ہر قسم کے تحفظات کے ساتھ، جس قسم کے تحفظات ہند کے غیر مسلم وفاق میں مسلم اقلیتوں کے لئے کئے جا سکتے ہوں۔" ۳۷

غرض کہ مسلمانوں پر ایک عالم اضطراب طاری تھا۔ سب کی نظریں قائد اعظم پر لگی ہوئی تھیں، وہ اس خواہش و آرزو مندی کے ساتھ ان کو تک رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کے مستقل تحفظ کے لئے کوئی قدم اٹھائیں۔ قائد اعظم نے بھی ملت کی نبض کو ٹٹول لیا۔ بقول مولانا حسن ریاض، قائد اعظم کے مزاج کا خاصہ تھا کہ وہ عوامی تقاضوں کو نظر میں رکھ کر آگے قدم بڑھاتے تھے۔ ۳۸ چنانچہ مسلم لیگ کی تنظیم نو کا کام نئے جوش و خروش، نئے انداز، اور نئے تقاضوں کے ساتھ شروع کیا گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے دو سال میں تین سالانہ اجلاس ہوئے۔ پہلا اجلاس ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء کو لکھنؤ میں۔ دوسرا ۱۷ اپریل ۱۹۳۸ء کو کلکتے میں اور تیسرا ۲۶ دسمبر ۱۹۳۸ء کہ پٹنہ میں۔ ۳۹ ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت کانگریس وزارتوں سے جو تلخ تجربات ہوئے تھے ان کی بنا پر مسلم لیگ نے طے کر لیا کہ وہ آل انڈیا فیڈریشن کو آئندہ کسی طرح بھی قبول نہیں کرے گی۔ طبعاً سوال پیدا ہوا کہ کونسی متبادل اسکیم سامنے رکھی جائے۔ اس کے لئے ایک

۳۷۔ پاکستان منزل بہ منزل، ص ۱۹۴

۳۸۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۵۰

۳۹۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص ۲۶۴، ص ۲۸۲، ص ۳۰۰

آئینی کمیٹی اس غرض سے تشکیل دی گئی کہ وہ اس مسئلے پر لوگوں کی تجاویز پر غور کرے اور کوئی حل تلاش کرے۔ کمیٹی کے سامنے پانچ تجویزیں پیش ہوئیں :

۱ - عثمانیہ یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر سید عبداللطیف کی اسکیم۔

۲ - میاں کفایت علی کی مرتبہ اسکیم جو مصنف کے نام کے بجائے "ایک پنجابی" کے نام سے شائع کی گئی۔

۳ - چودھری رحمت علی کی اسکیم جس میں پہلی بار پاکستان کا لفظ استعمال ہوا تھا۔

۴ - علیگڑھ کی اسکیم جسے ڈاکٹر افضال حسین قادری اور ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے مرتب کیا تھا۔

۵ - سر سکندر حیات خان کی اسکیم جو عام طور پر زونل اسکیم کے نام سے مشہور ہے۔ ۴۰

۱۹۳۹ء کا پورا سال ان تجویزوں پر غور کرنے اور اس فکر و اضطراب میں گزر گیا کہ برصغیر کے مسلمانوں کے حقوق کو محفوظ کرنے اور انہیں ہندوؤں کی چیرہ دستیوں سے بچانے کے لئے کس قسم کا دستور مرتب کرنا چاہئے؟ آخر کار مارچ ۱۹۴۰ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں قائداعظم کی صدارت میں ہوا۔ اس میں ۲۳ مارچ کو حسب ذیل تاریخی تجویز منظور ہوئی اور "قرار داد پاکستان" کے نام سے مشہور ہوئی :

"قرار پایا کہ غور و خوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی رائے یہ ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو۔ یعنی یہ کہ :

حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت رد و بدل

۴۰ - ہماری قومی جد و جہد (۱۹۳۹ء)، ص ۱۴۳ تا ص ۱۵۷

کرکے، متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنا دئے جائیں کہ وہ علاقے، جن میں مسلمان بہ اعتبار تعداد اکثریت میں ہیں، جیسے ہندوستان کے شمالی و مغربی اور مشرقی منطقوں میں اس طرح ایک ہو جائیں کہ وہ ایسی خود مختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر با اختیار اور خود مختار ہوں۔

یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیت کے لئے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کے تحفظ کے لئے ان کے مشورے سے بقدر ضرورت موثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کئے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، حسب ضرورت موثر اور واجب التعمیل ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق و مفاد کی حفاظت کے لئے ان کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔

یہ اجلاس ورکنگ کمیٹی کو یہ مزید اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق دستور کی ایک ایسی اسکیم مرتب کرے جس میں اس کا انتظام ہو کہ بالآخر یہ جداگانہ علاقے ایسے تمام اختیارات لے سکیں جیسے دفاع، امور خارجہ، رسل و رسائل، کسٹمس اور دوسرے امور جو ضروری ہوں۔"[۱۳]

اس اجلاس میں قائد اعظم نے دو قومی نظریے کے بارے میں یہ بات بھی واضح کر دی کہ:

"ہندوستان کا مسئلہ فرقہ وارانہ نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے اور اس مسئلے کو بین الاقوامی مان کر حل کرنا چاہئے اگر برطانوی حکومت یہ چاہتی ہے کہ ہندوستانیوں کو امن اور سکون حاصل

۱۳۔ پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۰۰

هو تو اس کی صرف ایک صورت ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کرکے جداگانہ قومی وطن منظور کئے جائیں ۔ ہندو اور مسلمان کبھی ایک قوم نہیں بنے ۔ نہ دونوں کے درمیان شادیاں ہوتی ہیں ، نہ ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ایسی تہذیبوں کے ماننے والے ہیں ، جن کی بنیاد متصادم افکار و تصورات پر ہے ۔ ان کے کارنامے مختلف ہیں ، اکثر اوقات ایک کا ہیرو ، دوسرے کا دشمن ہوتا ہے ۔ ایک کی فتح ، دوسرے کی شکست ہے ۔ ایسی قوموں کو ایسے نظام میں باندھنا جس میں ایک اقلیت ہو ، دوسری اکثریت ، بے چینی کا سبب ہوگا اور بالآخر وہ نظام تباہ ہو جائے گا ۔ ''۴۲

۱۹۴۰ء کی '' قرارداد پاکستان '' نے مسلم لیگ اور مسلم لیگ کی معرفت مسلمانان برصغیر کا رخ کلی طور پر ، اس انقلابی نصب العین کی طرف پھیر دیا جس میں سرسید احمد خاں اور علامہ اقبال کے خوابوں کی تعبیر مضمر تھی ۔ نئی امنگوں اور تازہ ولولوں کے ساتھ کام شروع کیا گیا لیکن اس کی مخالفت و مزاحمت بھی اتنی شدت سے کی گئی کہ اس سے پہلے مسلم لیگ کے کسی موقف کی نہ ہوئی تھی ۔ تقسیم ملک اور قیام پاکستان کا نام سن کر کانگریس اور دوسرے ہندو حلقوں کے تن بدن میں آگ لگ گئی ۔ گاندھی جی ، مولانا ابوالکلام آزاد ، پنڈت جواہر لال نہرو اور دوسرے کانگریسی لیڈر مخالفت کے لئے میدان میں آ گئے ۔ ساتھ ہی ساتھ جمعیت العلمائے ہند کے بعض عالموں کو انھوں نے اس طرح اپنا ہمنوا بنا لیا کہ دو قومی نظریے کی زیادہ مخالفت انھیں کی طرف سے ہوئی ۔ قوم ، قومیت اور قومیت کے عناصر پر دھواں دھار مخالفانہ تقریریں کی گئیں ، مضامین لکھے گئے ۔ شرعی نقطۂ نظر سے ان کی تشریحات کی گئیں اور عام مسلمانوں کو مسلم لیگ اور دو قومی نظریے سے بدظن کرنے کے لئے یہ باور کرانے کی سعی کی گئی کہ '' دو قومی نظریہ اسلامی تعلیمات اور دینی نقطۂ نظر کے منافی ہے ''۔ مولانا شبیر احمد عثمانی ،

۴۲ ۔ فاؤنڈیشن آف پاکستان ، جلد دوم ، ص ۳۳۸

مولانا اشرف علی تھانوی ، علامہ سید سلیمان ندوی ، مولانا عبدالحامد بدایونی ، مولانا ظفر احمد انصاری اور بعض دوسرے علما اور دانشوروں کی طرف سے اس کی تردیدیں شائع ہوئیں۔ ہندو مہاسبھا جیسی مسلمان دشمن جماعتوں نے مسلم لیگ اور اس کے حامیوں پر غداری کا الزام لگایا اور مسلمانوں کو پاکستان کے خیال سے باز رکھنے کے لئے ہراساں کیا اور طرح طرح کی جارحیت اور تشدد کا نشانہ بنایا ، لیکن قائد اعظم کی بردباری اور مسلمانوں کی عام سیاسی بیداری کے سبب مسلم لیگ سارے حربوں کو جھیل گئی۔ حریفوں کی کوئی چال کامیاب نہ ہوئی اور اپنی منزل کی سمت مسلم لیگ کا قدم روز بروز آگے بڑھتا گیا۔

دوسری جنگ عظیم کے درمیان حکومت نے سیاسی جماعتوں پر اگرچہ سختیاں کیں اور پابندیاں لگائیں ، لیکن تحریک آزادی پر کوئی فرق نہ پڑا۔ مسلم لیگ اور کانگریس دونوں کی طرف سے آزادی کا مطالبہ شدت اختیار کر گیا ، لیکن اب ان کے مطالبات کی سمتیں ایک دوسرے سے اتنی مختلف تھیں کہ آئین آزادی کی کسی تجویز پر دونوں کا متفق ہونا مشکل تھا۔ کانگریس اور اس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی کا کہنا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کا خیال ناقابل فہم اور ناممکن العمل ہے۔ میرے جیتے جی ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا ہوا تو میری لاش پر سے گزرنا ہوگا۔ میں تقسیم کو گناہ سمجھتا ہوں اور اس جرم میں شریک نہیں ہو سکتا۔۴۳ قائد اعظم اور مسلم لیگ حتمی اور آخری فیصلے کے طور پر اعلان کر چکی تھی کہ تقسیم ہندوستان کے سوا کسی طرح کا کوئی اور آئینی فیصلہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہ ہوگا ، پھر بھی آزادی اور ہندو مسلم مفاہمت کی کوششیں ساتھ ساتھ جاری رہیں۔ ۱۹۴۲ء میں اسٹیفورڈ کرپس ، آزادئ ہند کے لئے بعض تجویزیں لے کر آئے ، مسلم لیگ اور کانگریس دونوں نے اسے بعض وجوہ سے مسترد کر دیا۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں چکرورتی راج گوپال اچاریہ نے گاندھی جی کے مشورے سے ایک فارمولا بنایا۔ تحریک پاکستان کی تاریخ میں یہ ''سی آر فارمولا'' کہلاتا

۴۳۔ پاکستان منزل بہ منزل ، ص ۲۷۹

ہے ہر چند کہ یہ فارمولا مسلم لیگ کے لئے پوری طرح قابل قبول نہ تھا لیکن چونکہ اس میں تقسیم ہند کو اصولاً مان لیا گیا تھا اس لئے کانگریس نے اسے مسترد کر دیا۔ ۱۹۴۴ء میں مہاتما گاندھی اور قائد اعظم کے درمیان گفت و شنید ہوئی لیکن بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ اس ساری کشمکش اور سارے عرصے یعنی ۱۹۴۰ء سے لے کر ۱۹۴۵ء کے انتخابات سے قبل تک، ہندو اور مسلمانوں کے درمیان بحث کا خاص موضوع دو قومی نظریہ رہا۔ قوم کسے کہتے ہیں؟ قومیت کیا ہے؟ اور اس کی تشکیل و تعمیر میں کون کون سے عناصر کام کرتے ہیں؟ ان سوالوں کے جوابات کی تلاش میں جگہ جگہ مناظرے اور مباحثے ہوئے اور مضامین و مقالات لکھے گئے۔ قوم اور قومیت کے الفاظ کی لسانی و اصطلاحی تشریحات کا ایسا سلسلہ چھڑ گیا کہ قیام پاکستان سے پہلے نہ ختم ہوا۔ ظاہر ہے کہ ایسے میں زبان، قومی زبان اور ہندی اردو کا مسئلہ بھی بطور خاص زیر بحث آیا۔ اس لئے کہ زبان کو نظر انداز کرکے قوم، قومیت اور قومی نظریے کی تشکیل کی کوئی تعریف یا ہیئت متعین ہی نہ ہو سکتی تھی۔

یوں تو اردو ہندی کا جھگڑا ایک مدت سے چلا آ رہا تھا لیکن بقول شخصے اب اس میں نئی زندگی کے آثار پیدا ہو گئے۔ کوئی جلسہ ہو، کوئی سبھا ہو، کوئی انجمن ہو، کوئی میٹنگ ہو، اس کی پرچھائیں سے نہ بھاگ سکتی تھی۔ ۴۴ بحث میں الجھاؤ اور شدت در اصل اس وقت پیدا ہوئی جب گاندھی جی نے انڈین نیشنل کانگریس کی قرار داد سے تجاوز کرکے بھارتیہ ساہتیہ پریشد ناگپور کے جلسے میں لفظ " ہندوستانی " پر " ہندی " کا اضافہ کیا اور ہندوستان کی مجوزہ قومی زبان کو " ہندی ہندوستانی " کا نام دیا۔ وضاحت طلب کرنے پر کہا " ہندی ہندوستانی " سے مراد " ہندی " ہے، اور اس کا رسم الخط ناگری ہے۔ جیسا کہ اس سے پہلے کسی جگہ ذکر آچکا ہے۔ اردو کے بارے میں انہوں نے یہ بھی کہا کہ اردو، مسلمانوں کی

۴۴۔ ہماری زبان (دہلی)، بابت ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء، ص ۵

مذہبی زبان ہے ، قرآنی حروف میں لکھی جاتی ہے اور مسلمان ہی اس کو زندہ رکھنے کی ذمہ داری لے سکتے ہیں -

کانگریس کی قرار داد میں ''ہندوستانی'' کی تعریف یہ بتائی گئی تھی کہ :

''یہ وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں عام طور پر بولی اور سمجھی جاتی ہے اور ناگری و فارسی رسم الخط دونوں میں لکھی جاتی ہے -''

لیکن مہاتما گاندھی نے '' ہندوستانی '' کی اس تعریف کو نظر انداز کرکے ہمیشہ ایک ایسی زبان کی ایجاد و ترقی کے لئے کوشش کی جو واضح طور پر سنسکرت آمیز ہندی تھی، اس کا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے ساھتیہ پریشد کے جلسے میں ہندوستانی کے نام سے جو خطبہ دیا وہ ایسی ٹھیٹھ ہندی میں تھا کہ مسلمان تو مسلمان خود عام ہندو بھی اسے پوری طرح نہ سمجھ سکتے تھے - مولانا نیاز فتح پوری نے '' گاندھی جی کی بانی '' کے نام سے اس وقت اپنے رسالے میں گاندھی جی کا یہ خطبہ پورے کا پورا شائع کر دیا تھا۔ اس کی صرف ابتدائی سطریں بطور نمونہ دیکھئے :

'' اس سبھا کا پتیتو مجھے دینے کا کارن ، جب میں ڈھونڈتا ہوں تو دو ہی پرتیت ہوتے ہیں، ایک میرا ساھتیہ کار نہ ہونا اور اس لئے کم سے کم دویش کا کارن ہونا - تتھا دوسرا میرا ہندوستان کی سب بھاشاؤں کا پریم - جو کچھ میں آشا کرتا ہوں کہ ہم کچھ نہ کچھ سیوا کریں گے ، اور بھوشیہ میں اپنا سیوا کشیتر بڑھائیں گے - یدی ہم شری نگر سے کنیا کماری تک ، کراچی سے لے کر ڈبرو گڑھ تک ، جو پردیش ہے اسے ایک مانتے ہیں اور اس کے لوگوں کو ایک پرجا سمجھتے ہیں تو اس پردیش کے پرتیک بھاگ کے ساھتیہ کار، بھاشا شاستری ، اتیادی آپس میں کیوں نہ ملیں اور بھن بھن بھاشاؤں دوارا ہندوستان کی سپتھا یوگیہ سیوا کیوں نہ کریں -'' ۴۵

۴۵ - نگار (لکھنؤ) ، اگست ۱۹۳۶ء، ص ۵۰

علامہ نیاز فتح پوری نے اپنے مبصرانہ نوٹ میں اس خطبے کے بارے میں کہا تھا کہ :

”اگر قارئین نگار اس کو سمجھ نہ سکیں تو اس کی ذمہ داری گاندھی جی کے سر نہیں۔ کیونکہ ان کا مقصود تو یہی تھا کہ کوئی مسلمان اسے پڑھ بھی نہ سکے۔ سمجھنے کا کیا ذکر ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے مشترکہ زبان سمجھنے پر اصرار کیا جاتا ہے اور یہ وہ لٹریچر ہے جسے ”سخن گسترانہ“ طور پر غالب کے جواب میں بجائے نظم کے نثر میں پیش کیا جا رہا ہے۔ مرزا نوشہ ہوتے تو پوچھتے ”یہ انداز گفتگو کیا ہے؟ ہم اس کے اعتراف میں سوائے اس کے اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ بیشک عربی، فارسی کے الفاظ قابل ترک ہیں اور یہ ”دیوبانی“ لائق احترام۔“ ۴۶

مہاتما گاندھی کے اس طرز عمل کا اثر، کانگریس اور اس کے سارے کارخانے پر یہ پڑا کہ ہر شخص، ”ہندوستانی“ کی جگہ ”ہندی“ کا لفظ استعمال کرنے لگا اور قومی زبان کا معیار وہ قرار پایا جو گاندھی جی نے اپنے خطبے میں پیش کیا تھا۔ چنانچہ اس کے بعد کانگریس اور ہندی کے حامیوں کی طرف سے قومی زبان کے سلسلے میں جو نعرہ لگایا گیا وہ ”ہندوستانی“ کا نہیں ”ہندی“ کا تھا اور اس مہم میں صرف ہندو مہاسبھا یا متعصب ہندو جماعتوں کے ارکان نہیں بلکہ کانگریس کے سارے نامور لیڈر شامل تھے۔

پنڈت نہرو نے ستمبر ۱۹۳۶ء میں مدراس میں ہندی پرچار سبھا کی نئی عمارت کا افتتاح کرتے ہوئے کہا:

”دکن میں ہندی پرچار کا سوال بہت اہم ہے۔ ہندی کے ذریعے سے قومی تحریکوں کو بڑی تقویت پہنچ سکتی ہے۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ پرانی زبانوں کی بنیادیں مضبوط کی جائیں اور انہیں کے ذریعے تعلیم عام کی جائے، لیکن پورے ملک کا احاطہ کرنے اور مختلف

۴۶۔ نگار (لکھنؤ)، اگست ۱۹۳۶ء، ص ۵۰.

علاقوں میں باھمی تعلق پیدا کرنے کے لئے ھندی کو رواج دینا چاھئے ۔ ھندوستان کے دو تہائی حصے میں ھندی بولی اور سمجھی جاتی ھے ۔ صرف ایک تہائی حصے میں اسے پھیلانا ھے اس لئے اگر آپ ھندی کو اختیاری مضمون کی حیثیت سے سیکھ لیں تو یہ مسئلہ حل ھو جاتا ھے ۔ پبلک جلسوں کی کارروائی ھندی میں ھی ھوتی ھے ۔ کانگریس کے اجلاسوں میں دکن والے پیچھے رہ جاتے ھیں کیونکہ وہ ھندی نہیں سمجھتے، یوں بھی آپ کا ھندی سیکھنا لازمی ھو جاتا ھے ۔ ''۴۷

۲۰ فروری ۱۹۳۸ء کو راشٹر بھاشا کے ایک اجلاس کے موقع پر جو کہ انڈین نیشنل کانگریس کے پنڈال میں ھوا تھا، کانگریس کے صدر سبھاش چندر بوس نے اپنے ایک پیغام میں کہا کہ :

'' ھندوستان کی مشترک زبان صرف ھندی ھو سکتی ھے ۔ جنھوں نے اب تک ھندی نہیں سیکھی انہیں سیکھنا چاھئے کیونکہ یہ ھندوستانی قوم بنانے میں مدد دے گی ۔''

جمنا لال بزاز نے اپنے خطبہ صدارت میں ایک مشترک زبان یعنی ھندی کی ضرورت پر زور دیا اور کہا :

'' ھندی کی اشاعت، سوراج حاصل کرنے کے لئے لازمی ھے ۔''

اس اجلاس میں ایک ریزولیوشن بھی بالاتفاق منظور ھوا کہ :

'' ایسے تمام ادارے جن کا تعلق ھندوستان کے مختلف صوبوں سے ھے اپنے کاروبار اور مراسلت میں ھندی زبان استعمال کریں ۔'' ۴۸

مسٹر بی جی کھیرے، وزیراعظم بمبئی، نے ۱۰ اپریل ۱۹۳۸ء میں '' ھندی سکشا پرچارک سبھا '' کے سالانہ جلسے میں تقریر کرتے ھوئے

۴۷ - اردو، جنوری ۱۹۳۷ء، ص ۱۲۸-۱۲۹

۴۸ - اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۴۷۱

کہا کہ:

"کسی کو اس بارے میں مطلق اختلاف نہیں کہ ہندوستان کی ایک مشترک زبان ہونی چاہئے اور سب نے اس بات کو تسلیم کر لیا ہے کہ وہ مشترک زبان ہندی ہے۔"۴۹

اکتوبر ۱۹۳۶ء میں بابو راجندر پرشاد، صدر، آل انڈیا ہندی پرچار سمتی نے ناگپور میں ہندی زبان کی اشاعت سے متعلق ایک بڑے جلسے میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"اٹھارہ سال پہلے ہندی ساہتیہ سمیلن نے اندور کے اجلاس میں مہاتما گاندھی کی زیر صدارت یہ قرار داد منظور کی تھی کہ غیر ہندی داں صوبوں میں ہندی زبان کی اشاعت کا کام شروع کیا جائے، چنانچہ احاطہ مدراس میں یہ کام شروع کیا گیا اور جنوبی ہند کے کچھ پر جوش صاحبوں نے ہندی سیکھ لی۔ کچھ دنوں بعد یہ کام مقامی اصحاب ہی کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا، چنانچہ ایک مجلس دکشنا بھارت پرچار سبھا کے نام سے مدراس میں قائم کی گئی۔ اس کی غیر معمولی کامیابیوں کو دیکھ کر ساہتیہ سمیلن کے اجلاس ناگپور (اپریل ۱۹۳۶ء) میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ ہندی کی اشاعت کے کام کو دوسرے غیر ہندی داں علاقوں میں پھیلایا جائے۔ یہ علاقے مہاراشٹر، گجرات، سندھ، بنگال اور آسام کے علاوہ سنتھال پرگنہ اور چھوٹا ناگپور اور بہار وغیرہ ہیں۔ یہاں کے لوگ مختلف زبانیں بولتے ہیں مگر یہاں ہندی کا رائج کرنا ضروری ہے۔ اس غرض کے لئے سمیلن نے ایک خاص کمیٹی بنائی ہے جس کا دفتر واردھا میں ہے اور اس مقصد کے لئے ان صوبوں میں مجلسیں قائم کر رہی ہیں۔

یہ محسوس کیا گیا ہے کہ قومیت کے ان رشتوں کو مضبوط کرنے

۴۹۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۴۷۰

اور باهم جوڑنے کے لئے ، جو اس ملک میں مختلف طریقوں سے بنائے جا رہے ھیں ایک ایسی مشترک زبان کا ھونا لازمی ہے ۔ ایک غیر زبان سے یہ ممکن نہیں کہ وہ کسی قوم کے عزیز خیالات و جذبات کو صحیح طور سے ادا کر سکے اور ھماری تہذیب و تمدن کا یہ تقاضا ہے کہ ھماری ایک ایسی زبان ھو جو نہ صرف کسی فرقے یا صوبہ کے لئے کارآمد ھو بلکہ بہ حیثیت مجموعی سارے ملک کے کام آئے ۔ اس غرض کے لئے ھندی زبان سب سے زیادہ موزوں ہے ۔“ ۵۰

مئی ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا ھندی ساھتیہ سمیلن کا اجلاس ، بابو پرشوتم داس ٹنڈن کی صدارت میں ھوا ۔ اس میں ھندی کی حمایت میں متعدد قرار دادیں منظور کی گئیں لیکن ھندی کے سوا ایک جگہ بھی ”ھندوستانی“ کا لفظ استعمال نہیں ھوا ۔ قرار دادیں دیکھئے :

۱ ۔ نیشنل کانگریس صوبوں میں صدر مجلس وضع قوانین کے ارکان سے درخواست کی جائے کہ وہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ میں اس قسم کی تبدیلی کی تحریک کریں کہ جس سے ان کونسلوں کی کارروائی ھندی زبان میں ھوا کرے ، نیز یہ طے پایا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے درخواست کی جائے کہ اپنی تمام کارروائی ھندی میں کیا کرے ۔

۲ ۔ ریلوے حکام سے تحریک کی جائے کہ ریلوے ٹائم ٹیبل ، نقشے ، قواعد اور ٹکٹ سب ھندی میں ھوں ۔

۳ ۔ کوچین ، ٹراونکور اور میسور کے حکام سے جنھوں نے اس سے قبل اپنی اپنی ریاستوں میں ھندی کے پروپیگنڈے میں بہت بڑی مدد دی ہے ، یہ درخواست کی جائے وہ ریاست کے مدارس میں ھندی کی تعلیم کو لازمی قرار دیں ۔

۵۰ ۔ اردو ، جنوری ۱۹۳۷ء ، ص ۲۰۲ تا ۲۰۵

۴ - یونیورسٹی اور انٹرمیڈیٹ بورڈ سے درخواست کی جائے کہ ہندی شارٹ ہینڈ اور ٹائپ رائٹنگ کو اپنے نصاب تعلیم میں داخل کریں -

۵ - کانگریس پارٹی کے لیڈر اور سرحد کے وزیراعظم ڈاکٹر خان صاحب سے درخواست کی جائے کہ وہ حکومت سرحد کے اس سرکلر کو منسوخ کرانے کی کوشش کریں جو ہندی اور گورسکھی کے خلاف نافذ کیا گیا تھا -

۶ - نظام حیدرآباد سے درخواست کی جائے کہ ہندی کو ریاست کی سرکاری زبان تسلیم کیا جائے - ۵۱

ہندی کے مبلغ اور اردو کے دشمن ، کاکا کالیکر صاحب دسمبر ۱۹۳۶ء میں لاہور گئے اور ہمایوں کے مدیر میاں بشیر احمد کے مکان پر مولانا ظفر علی خان سے اردو کے مسئلے پر بڑی دلچسپ گفتگو ہوئی ، اس کے آخر کے چند جملے دیکھئے :

مولانا ظفر علی خان : چوتھی چیز جو قومیت کے لئے ضروری ہے وہ زبان ہے -

کاکا کالیکر : اسی لئے تو ہم چاہتے ہیں کہ ہندوستان کی قومی زبان ایک ہو جائے -

مولانا : تو آپ کے نزدیک وہ کونسی زبان ہے ؟

کاکا جی : یہی جو ہم آپ بولتے ہیں -

مولانا : میرا مطلب یہ ہے کہ اس کا نام کیا ہے ؟

کاکا جی : ہندی

مولانا : اور اس کا نام اردو کیوں نہیں ؟

۵۱ - اردو ، اپریل ۱۹۳۷ء ، ص ۴۳۹

کاکا جی: یہ ایک فرقے کی زبان کا نام بن چکا ہے اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان ہے - ۵۲

کاکا کالیکر ہی نے ہندی ساہتیہ سمیلن میں ہندی کی اشاعت و تبلیغ کے لئے ''ہندی پرچار جاتری'' کے نام سے ایک کمیٹی قائم کی، اس کا مقصد ایشیا کے بعض ممالک میں ہندی کے مبلغین کو بھیجنا اور وہاں کے لوگوں کو ہندی کی ترغیب دلانا تھا - اس کمیٹی میں کاکا کالیکر، سیٹھ جمنا لال بزاز، بابو پرشوتم داس ٹنڈن اور بابو راجند پرشاد وغیرہ شامل تھے - کاکا کالیکر کے بیان کے مطابق:

''سمیلن نے جو ہندی پرچار سمتی قائم کی ہے اس نے فیصلہ کیا ہے کہ ایک جاتری منڈل، برما، ملایا، جاوا اور سیام وغیرہ کو بھیجا جائے - جن ممالک کے سفر کا تہیہ کیا گیا ہے انھیں ہندوستان سے قدیمی تعلق ہے - پرانے زمانے میں انھوں نے سنسکرت سیکھ کر اور بودھوں کے عہد میں پالی کے ذریعے انھوں نے ہندوستان سے اپنا رشتہ قائم کیا - اب ہمیں انھیں سمجھانا ہے کہ وہ ہندی زبان کے وسیلے سے جسے تمام ہندوستان نے متفقہ طور پر قومی زبان تسلیم کر لیا ہے، اپنے پڑوسی ہندوستان کو پہچانیں -'' ۵۳

خود مہاتما گاندھی نے ہندی اور ہندوستانی کے موضوع پر اس زمانے میں متعدد مضامین لکھے اور بیانات شائع کرائے - ان کی نیت چونکہ قومی زبان کے سلسلے میں صاف نہ تھی، اس لئے ان کے مضامین و بیانات سے سلجھنے کے بجائے بات الجھتی ہی چلی گئی - مسلم لیگ اور کانگریس کے رہنماؤں میں وہ تنہا آدمی تھے جو زبان کے مسئلے کو اپنی تقریر و تحریر کا موضوع بنائے ہوئے تھے - ایک بات کہتے اور جب اس کی مخالفت شروع ہوتی تو اس سے انکار کرکے کوئی دوسرا شوشہ چھوڑ دیتے - خود ڈاکٹر تارا چند اور بعض

۵۲ - اردو، جنوری ۱۹۳۷ء، ص ۱۸۹

۵۳ - اردو، جولائی ۱۹۳۷ء، ص ۶۵۱

دوسرے مصنفین نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ زبان کے مسئلے میں ناقابل حل پیچیدگی اس وقت سے پیدا ہوئی جب گاندھی جی نے ہندوستانی کو " ہندی اتھوا ہندوستانی " سے بدل دیا اور پھر اس کی بے جا تاویلات میں خود بھی الجھے رہے، دوسروں کو بھی الجھاتے رہے۔ پچھلے باب میں زبان کے مسئلے پر گاندھی جی کے مقالات کے مجموعہ " لنگوئج پرابلم " کا ذکر آچکا ہے۔ اس کا مطالعہ بتاتا ہے کہ قومی زبان کے بارے میں ان کا ذہن صاف نہ تھا۔ وہ دل سے تو یہ چاہتے تھے کہ قومی زبان ہندی ہو اور بات ہندوستانی کی کرتے تھے۔ ڈاکٹر ناموس نے گاندھی جی کی کتاب سے زبان کے متعلق ان کے نظریات کا جو خلاصہ، انھیں کے الفاظ کے لفظی ترجمے کی مدد سے تیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ:

"جب سے میں نے پبلک لائف میں قدم رکھا ہے (صفحہ ۲۷) میرا یہی عقیدہ رہا ہے اور میں نے اسی کا ہمیشہ اعلان کیا ہے کہ میری پختہ رائے میں انگریزی نہ تو کل ہند زبان بن سکتی ہے اور نہ ہونی چاہئے۔ کل ہند زبان صرف ہندی (یعنی ہندوستانی) ہی ہو سکتی ہے وہ ہی زبان جس کو شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمان لاکھوں انسان بولتے ہیں۔ یہ تو ابتدائی انتخابات کی بات ہے چونکہ اس وقت یہی زبان کل ہند زبان بننے کی اہلیت رکھتی ہے یہی اردو زبان ہے جو دھلی، لکھنو میں مروج ہے فی الحال ہم اس کو دیو ناگری اور فارسی دونوں طرح کے رسم الخط میں لکھا کریں گے۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ ایک زبان کے لئے دو رسم الخط کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اپنے کہے کو خود ہی بالکل باطل کرنا ہے۔ میں جانتا ہوں (صفحہ ۲۸) کہ میں تناقص کی بات پیش کر رہا ہوں۔ جب میں ایک ہی زبان کے لئے دیو ناگری اور اردو رسم الخطوں کو روا کر رہا ہوں، مگر میرا یہ تناقص بالکل احمقانہ نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندو مسلمانوں میں بے اتفاقی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمانوں کے لئے عقلمندی اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کا

احترام کریں اور جس حد تک ممکن ہو سکے بردباری اور رواداری سے کام لیں اس لئے دیو ناگری یا اردو کسی رسم الخط کے انتخاب کا اختیار ہے مگر ہندو جاتی کے دھرماتما جو اس وقت چراغ پا ہو ہو رہے ہیں یا ان کو معلوم نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا کتنا بھی انسان روا داری سے کام لے لیکن (صفحہ ۱۰) جب قوم میں وسعت پیدا ہوگی تو لازمی ہے کہ ہندو جو صرف سنسکرت جانتے ہیں وہ سنسکرت کے الفاظ کا خاص طریقے سے استعمال کریں گے اگرچہ دونوں ایک ہی زبان لکھیں اور مخصوص رغبت یا نفرت نہ بھی رکھتے ہوں تو بھی یہی ہوگا، ظاہر ہے کہ ہندو دیو ناگری رسم الخط سیکھیں گے اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کریں گے بھارت دیش میں ان کی تعداد بھی مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے (مسلمان ہیں ۲۰ فیصدی) ’’ آخر کار (صفحہ ۵۹) اس میں سے جو جو رسم الخط لوگ زیادہ پسند کریں گے وہی زیادہ وقعت حاصل کر لے گا،، اس کا نتیجہ ظاہر ہے زبان کی جو شکل بھی (صفحہ ۴۰) عوام میں ہردلعزیز ہوگی اور جس کو وہ بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان وہی کل ہند زبان بنے گی۔ ’’جب ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں زیادہ ہے تو میجارٹی کے حکم کے مطابق یہ ہندوؤں کی زبان ہوگی جو کل ہند زبان بنے گی اور وہ سنسکرت سے معمور ہندی ہوگی، اس کا رسم الخط دیو ناگری ہوگا۔ یہ زبان ہندوستان کے تمام رہنے والوں کو سیکھنی پڑے گی۔ اس سیاسی پروگرام کے پیش نظر میں (یعنی گاندھی جی) نے ابھی سے کام شروع کر دیا ہے اور دیو ناگری رسم الخط کو فروغ دینے کی تدابیر اختیار کی ہیں۔ بلا شبہ (صفحہ ۱۶) ایک دیو ناگری تحریک موجود ہے اور میں بہ دل و جان اس کا حلیف بن گیا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ دیو ناگری کو ان سب زبانوں کا جو مختلف صوبوں میں بولی جاتی ہیں مشترکہ رسم الخط بنا دیا جائے۔ خاص طور پر ان صوبوں

میں جہاں ایسی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سنسکرت الفاظ کی تعداد زیادہ ہے،، اب سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر کار (صفحہ ۶) جب ہمارے دل ایک ہو جائیں گے۔ اور ہم سب اپنے اپنے صوبوں پر نہیں بلکہ اس بات پر فخر کریں گے کہ ہندوستان ہمارا ملک ہے، جب ہم یہ سمجھ لیں گے کہ تمام مذاہب ایک ہی منبع سے نکلے ہیں اور ان کی پیروی اسی خیال سے کریں گے جس طرح سے کہ ہم ایک درخت کے مختلف پھولوں سے محظوظ ہوتے ہیں تو ہم ایک مشترک زبان تک پہنچ جائیں گے جس کا رسم الخط تمام ہندوستان میں ایک ہوگا۔ ہاں مگر صوبہ جاتی زبانوں کو صوبائی استعمال کے لئے قائم رکھیں گے۔ '' اس وقت تو مسلمان کے دل میں مذہبی جوش اور قوت کا گھمنڈ ہے۔ جب وہ ہندو میجارٹی کے راج میں کچھ عرصہ تک پس کر مہین ہو جائے گا۔ اس وقت اس کے خیالات ہندو تہذیب میں رنگے جائیں گے تو وہ خود بخود ہمارا ہم خیال ہو جائے گا۔ اس وقت رومن رسم الخط بھی میدان میں دعویدار ہے مگر '' رومن رسم الخط،، ہندوستان کا مشترکہ رسم الخط نہ تو بن سکتا ہے (صفحہ ۳۶) اور نہ ہونا چاہئے۔ مقابلہ تو صرف فارسی اور دیو ناگری خطوں کے درمیان ہے۔ اس بات کو بھی ہم بحث میں نہیں لاتے کہ اس میں کتنی کتنی ذاتی خوبیاں موجود ہیں لیکن دیو ناگری تمام ہندوستان کا مشترکہ رسم الخط اس لئے ہونا چاہئے کہ صوبہ جاتی رسم الخطوں میں سے بیشتر کا ماخذ دیو ناگری ہے۔ اس کے علاوہ سیکھنے میں نسبتاً بہت ہی آسان ہے۔،، ۵۴

گاندھی جی کے خیالات کی اس تلخیص سے واضح طور پر جو بات سامنے آتی ہے وہ یہ کہ ناگری رسم الخط، سارے مروجہ رسم الخطوں سے بہتر ہے

۵۴۔ آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان، ڈاکٹر ناموس، یونائٹیڈ پبلیشرز، لاهور، ۱۹۴۷ء، ص ۸۲ تا ص ۸۳

اور ہندی زبان چونکہ ہندوستان کی اکثریت کی زبان ہے، اس لئے قومی مصلحتوں کے تحت تھوڑے دنوں کے لئے قومی زبان کا نام خواہ کچھ بھی رکھ لیا جائے، ہر حال میں اس کا نتیجہ ہندی کے حق میں نکلے گا۔ اس لئے گاندھی جی کے نزدیک "ہندوستانی" کے لفظ کو قبول کر لینا ہندی کے لئے مضر نہ تھا۔ لیکن جب ہندو ان سے "ہندوستانی" کی تشریح پوچھتے تو وہ جیسا کہ ساہتیہ پریشد کے جلسے میں پہلے بھی برملا کہہ چکے تھے صاف کہہ دیتے کہ ہندوستانی کی آخری شکل ہندی ہوگی۔

گاندھی جی کے اس رویے کے سلسلے میں ڈاکٹر مجیب کے اس طویل خط کا حوالہ دیا جا چکا ہے جس میں انہوں نے ہندی اور ہندوستانی کی وضاحت چاہی تھی اور ان کی ہندی پرستی کو ملکی و قومی مفاد کے خلاف بتایا تھا، اسی طرح کا ایک مدلل اور طویل خط بعد کو پنڈت سندر لال نے بھی انہیں لکھا یہ خط گاندھی جی کے اس مضمون کے رد میں لکھا گیا تھا جو یکم اگست ۱۹۳۶ء کے ہریجن میں بہ عنوان "غلط فہمیوں کی گتھی" (A Cobweb of Misunderstandings) کے نام سے چھپا تھا۔۵۵ اس خط میں پنڈت سندر لال نے گاندھی جی کے مضمون کے ہر پہلو اور ہر نکتے پر بحث کی ہے اور ہندی، ہندوستانی اور اردو کے بارے میں ان کے بعض خیالات کی تردید کرتے ہوئے مسائل پر از سر نو غور کرنے کی گذارش کی ہے۔ پورے خط کو اس جگہ نقل کرنے کی گنجائش نہیں نکل سکتی۔ مختصر ترین لفظوں میں اس کی تلخیص البتہ دیکھتے چلئے:

"یہ بات درست نہیں ہے کہ اردو نام خاص طور سے اور خاص مطلب سے رکھا گیا ہے۔ سچ یہ ہے کہ یہ نام دوسرے لفظوں کی طرح خود بخود مروج ہو گیا ہے۔ ہندی اور اردو، اگر دونوں ایک ہی زبان ہیں اور صرف رسم الخط کا فرق ہے تو ان کا نیا مشترک نام جیسا کہ پہلے طے کیا گیا تھا "ہندوستانی" ہی ہونا

۵۵۔ اور لینگوئج پرابلم، ص ۲۱ تا ص ۲۳

چاھئے ، اس میں تبدیلی کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی ۔ آپ کے یہ الفاظ پڑھ کر کہ '' اردو والے بھاشا کا ویا کرن (زبان کی قواعد) بھی بدل دیتے ھیں'' مجھے اور بھی دکھ اور حیرانی ھوئی ۔ ھندوستانی زبان کی مختلف شکلوں پر جتنی اچھی کھوج گذشتہ تیس سال میں مولانا عبدالحق نے کی ھے شاید کسی دوسرے نے نہیں کی ۔ اگر آپ اردو ھندی دونوں کے ودوان (عالم) منشی پریم چند سے دریافت کر لیتے تو معلوم ھو جاتا کہ اصلیت اس سے ٹھیک برعکس ھے ۔ شاید آپ کے دھیان میں یہ بات نہیں ھے کہ اس وقت کی کتابی ھندی ، ھندوستان کے کسی بھی ضلع یا نگر یا گاؤں کی بول چال کی زبان نہیں ھے ، اور اگر اردو اور ھندی کو دو الگ الگ زبانیں شمار کریں تو یہ بات بالکل سچ ھے کہ ھندی کہیں کی بھی بول چال کی زبان نہیں ھے ۔ آپ نے لکھا ھے کہ '' مولوی عبدالحق نے ' ھندی ھندوستانی ' کے بجائے صرف ھندوستانی یا ھندی اردو کے استعمال کا لحاظ رکھا تھا لیکن بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے جنم کو نہیں بھلایا جا سکتا تھا ۔ ھندی لفظ کا رکھنا ضروری تھا ۔'' اگر بھارتیہ ساھتیہ پریشد ، ھندی ساھتیہ سمیلن کا ایک بچہ ھے تو پھر یہی غنیمت ھے کہ آپ کے اثر سے انھوں نے محض ' ھندی ' کی جگہ ' ھندی ھندوستانی ' رکھنا منظور کر لیا ۔'' آپ نے کہا تھا : '' اردو زبان مسلمانوں کی مذھبی زبان ھے ، قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ھے اور مسلمان بادشاھوں نے اسے بنایا اور پھیلایا، مسلمان چاھیں تو اسے رکھیں اور پھیلائیں ۔'' اردو نہ تو مسلمانوں کی اور نہ کسی اور کی مذھبی زبان ھے اور نہ کبھی تھی ۔ وہ محض اس ملک کے لاکھوں رھنے والوں کی قدرتی اور مادری زبان ھے اس کی ترقی میں ھندوؤں نے اتنا ھی حصہ لیا ھے جتنا مسلمانوں نے اور آج تک بہت سے ھندوؤں کو اس پر ویسا ھی فخر ھے جیسے مسلمان کو ھو سکتا ھے ۔ ھندی میں رامائن بھی ھے جسے کم سے

سے کم شمالی ہند کے لاکھوں ہندو، مذہبی کتاب مانتے ہیں، اردو میں تو مسلمانوں کی کوئی اس طرح کی کتاب نہیں ہے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ بہت سے کٹر مسلمان مولویوں کو قرآن کے اردو میں ترجمہ ہونے پر سخت اعتراض تھا اور کچھ کو آج تک ہے۔ یہ بھی ٹھیک نہیں ہے کہ اردو قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے اگر ہم اردو کو قرآن کے حرفوں میں لکھنے کی کوشش بھی کریں تو حرفوں کی شکلیں بدل جائیں گی، پڑوسی کو فروسی، چاند کو جاند، گائے کو کائے یا غائے، کھانا کو کانا لکھنا پڑے گا۔ آپ کی باقی باتیں بھی حقیقت کے خلاف ہیں، اردو کے پریمیوں میں خوش قسمتی یا بد قسمتی سے تھوڑے بہت ہندو بھی ہیں، جنھیں اس بات پر قدرتی دکھ ہوتا ہے کہ اردو ہندی کے مسئلے کو بھی فرقہ وارانہ شکل دی جائے۔ آپ اس غلط میلان کو ہو سکے تو روکیں۔ "۵۶

لیکن گاندھی جی پر اس خط کا یا اس قسم کے دوسرے بہت سے مضامین و خطوط کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ انھوں نے ہندی کی تبلیغ کو اپنا مستقل مشن بنا لیا اور برابر کچھ نہ کچھ اس مسئلے پر کہتے رہے۔ گاندھی جی اور ان کے اشارے پر اوروں نے زبان کے مسئلے پر جس قسم کا جارحانہ رویہ اختیار کیا تھا اور جس بے باکی سے ہندی کو قومی زبان بنانے کا اعلان کیا جانے لگا تھا، اس میں ۱۹۳۵ء کے قانون کے تحت ہونے والے انتخابات کو بڑا دخل تھا۔ اس میں کانگریس کو نمایاں کامیابی ہوئی تھی اور ہندو سیاسی رہنماؤں میں ایک خیال یہ پختہ ہو گیا تھا کہ وہ مسلمانوں کی سیاسی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کو یکسر نظر انداز کر کے بھی اپنی حکومت بنا سکتے ہیں، چنانچہ انتخاب میں کامیابی اور آئندہ سوراج قائم کرنے کے امکانات نے ان کے حوصلے اتنے بڑھا دئے کہ انھوں نے "ہندوستانی" کو بالاعلان "ہندی" کر لیا اور جب ۱۹۳۷ء میں فی الواقع مختلف صوبوں میں کانگریس کی وزارتیں

۵۶ - اردو، جنوری ۱۹۳۷ء، ص ۱۹۰ تا ص ۲۰۱

قائم ہو گئیں تو ہندی کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں جو کچھ تقریر و تحریر میں کہا جا رہا تھا اسے عملی شکل دینے کی کوشش شروع کر دی گئی ۔ مدراس ، بہار ، اڑیسہ ، یوپی ، بمبئی اور سی پی جہاں کانگریس کی وزارتیں قائم ہوئیں ، ہندی کو " ہندوستانی " کے بہانے آگے بڑھانے کی کوشش کی گئی ۔

اڑیسہ کے کانگریسی وزیر تعلیم بودھ رام دوبے نے قلمدان وزارت سنبھالتے ہی صوبے میں ہندی کے پرچار کی صورتوں پر غور کیا اور سارے مدارس میں ہندی پڑھانے کے احکام جاری کر دئیے ۔ کٹک کے بعض مدارس میں فوری طور پر ان پر عمل بھی شروع کر دیا گیا ۔۵۷

بہار میں بھی کانگریس حکومت نے یہی کرنا چاہا لیکن مسلمانوں کی مزاحمت کے سبب خاطر خواہ کامیابی نہ ہو سکی ، جب " ہندوستانی " کی واضح شکل متعین کرنے کے سوال پر زیادہ اختلاف بڑھا تو پٹنہ کی مقامی شاخ کی تحریک پر انجمن ترقی اردو نے ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء کو ایک خاص جلسہ منعقد کیا ۔ اس میں مختلف شہروں کے اساتذہ ، مصنفین ، ماہرین تعلیم اور ناشرین شریک ہوئے ۔ ہندی کے حامی اور کانگریس کے بعض رہنماؤں نے بھی اس میں شرکت کی اور علامہ سلیمان ندوی کی صدارت میں ایک قرارداد اتفاق آرا سے یہ منظور کی گئی کہ :

" ہندوستانی زبان کے قواعد اور اصطلاحات لغات کے لئے بہار حکومت کی طرف سے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جس میں انجمن ترقی اردو اور ہندی کی نمائندہ جماعت کے قائم مقام مساوی تعداد میں شریک ہوں ۔ اس کمیٹی کی کوشش یہ ہونی چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو ، اتفاق سے کام لیا جائے لیکن اختلاف کی صورت میں اردو کتابوں کے متعلق انجمن ترقی اردو اور ہندوستانی کی ہندی کتابوں کے متعلق، ہندی انجمن کے قائم مقاموں کی رائے کو فیصلہ کن سمجھا

۵۷ - اردو ، اپریل ۱۹۳۸ء ، ص ۳۷۴

جائے - "۵۸

اسی دن سہ پہر کو بابو راجندر پرشاد اور صوبائی کانگریس کے سکریٹری نے جلسے میں شرکت کی اور طے کیا گیا کہ ایک متفقہ اعلان ، انجمن ترقی اردو کے سکریٹری اور بابو راجندر پرشاد کے دستخطوں سے شائع کیا جائے ، چنانچہ دونوں کے دستخط سے حسب ذیل بیان مرتب اور شائع کیا گیا :

" بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء میں ہمیں ہندوستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا - ہمیں فکر تھی کہ " اردو ، ہندی ، ہندوستانی " کے تماشے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں انھیں دور کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان میں بڑی حد تک ہم متفق الرائے ہیں - چنانچہ ہم کو اس پر اتفاق ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہئے اور یہ اردو رسم الخط اور دیو ناگری دونوں میں تحریر اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لئے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہئے - ہندوستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار یہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہئے - مزید برآں ہماری رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بہ حیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دئے جانے چاہئیں - ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندوستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے - اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے ، ایک مختصر نمائندہ

۵۸ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ۷۷ ، ۷۸

کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہئے جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں کو قریب تر لانے کی ضرورت کو مانتے ہیں اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قائل ہیں تاکہ اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جائے۔"

دستخط..............
مولوی عبدالحق

....
بابو راجندر پرشاد" ۵۹

اس معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے صوبہ بہار کے وزیر تعلیم اور مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر سید محمود نے بابو راجندر پرشاد کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی۔ اس کمیٹی کے سپرد مندرجہ ذیل کام ہوئے:-

۱۔ نصابی کتابوں کی تیاری، تنقیح اور منظوری۔
۲۔ "ہندوستانی" زبان کی لغت کی ترتیب۔
۳۔ ہندی اور اردو کے مصنفین کے لئے اصطلاحات کی تیاری۔
۴۔ جدید طرز پر قواعد کی ترتیب۔
۵۔ مترجمین کے استعمال کے لئے انگریزی ہندوستانی لغت کی ترتیب۔

کمیٹی کے ارکان میں مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر غلام السیدین، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر ایس سنہا، ڈاکٹر آر بی سکسینہ، پروفیسر بدری ناتھ ورما، ڈاکٹر تارا چند، پروفیسر نریندر دیو، راجہ رادھیا رام پرشاد اور علامہ سید سلیمان ندوی شامل تھے۔۶۰

مارچ ۱۹۳۸ء میں پٹنہ میں اس کمیٹی کے اجلاس ہوئے، ڈاکٹر سید محمود وزیر تعلیم نے کمیٹی کا افتتاح کیا۔ اس کے بعد کمیٹی کے ارکان نے اپنا کام

۵۹۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۷۸
۶۰۔ اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۴۵۴

شروع کیا ، کئی گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد دوسری باتوں کے ساتھ یہ بھی طے پایا کہ :

۱ - ''ہندوستانی'' وہ زبان ہے جو شمالی ہند میں معمولی بول چال اور آپس کے ملاپ کے وقت استعمال کی جاتی ہے اور جو ہندی ، اردو کی مشترک بنیاد ہے -

۲ - ثانوی درجے تک مختلف مضامین کی کتابوں کی ترتیب و تالیف میں بھی ہندوستانی زبان استعمال کی جائے اور ان کتابوں میں اصطلاحی الفاظ مشترک ہونے چاہئیں - ان اصطلاحوں کی بنیاد ہندوستانی الفاظ پر قائم کی جائے اور اس طرح کی اصطلاحیں نہ بن سکیں تو دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر ہندوستانی کے صرف و نحو کے مطابق بنائی جائیں اور کمیٹی کی منظوری کے بعد بہار کے مدارس کی کتابوں میں استعمال کی جائیں -

۳ - ایسی ادبی ریڈریں مرتب کی جائیں جن میں :

الف - ہندی اردو کے مشہور مصنفین کے کلام کے منتخبات شامل ہوں -

ب - سادہ ہندی اور اردو کے منتخبات دونوں کے لئے مشترک ہوں -

۴ - مولوی عبد الحق ہندوستانی زبان کا ایک لغت تیار کریں اس میں وہ تمام عربی فارسی لفظ آجانے چاہئیں جو مستند ہندو مصنفین نے استعمال کئے ہیں - اسی طرح وہ تمام ہندی اور سنسکرت الفاظ بھی شریک کئے جائیں جو مستند اردو مصنفوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں - اس لغت کے جو حصے ہوتے جائیں وہ مولوی عبدالحق ، ڈاکٹر تارا چند کو بھیجتے جائیں -

۵ - مولوی عبد الحق اور ڈاکٹر تارا چند ، ہندوستانی زبان کی قواعد تیار کریں -[61]

۶۱ - اردو ، اپریل ۱۹۳۸ء ، ص ۳۵۴ تا ص ۳۵۷

مولوی عبد الحق اور بابو راجندر پرشاد معاهده ، اگر اس پر فی الواقع عمل کیا جاتا تو اردو، هندی تنازع کو رفع کرنے میں بڑا کارگر ثابت هو سکتا تها۔ هر صوبے کے لوگوں کو توقع تهی که اس طرح کے معاهدے ان کے یہاں بهی هو جائیں گے اور ''هندوستانی'' کی ایک خاص صورت مرتب کر کے ، هندو مسلمان دونوں کو زبان کے سلسلے میں مطمئن کیا جا سکے گا۔ غالباً اسی امید پر دکهشنا هندی پرچار سبها کے ایک اجلاس منعقده دسمبر ۱۹۳۷ء کی صدارت کرتے هوئے ، یعقوب حسن وزیر مدراس نے ''هندوستانی'' کے موضوع پر تقریر کرتے هوئے خیال ظاهر کیا تها که :

''هندی کو ادبی زبان بنانے کی کوشش ابهی زیاده سے زیاده پچاس سال سے شروع هوئی هے اور چونکه اس کوشش کی ابتدا اور قومی کانگریس کی ابتدا ساتھ ساتھ هوئی اس لئے مسلمان اس تحریک کو بهی شبه کی نگاه سے دیکهتے هیں ۔ بدقسمتی سے اردو هندی کا تنازع موجوده فضا میں اور بهی نقصان رساں هو گیا هے ۔ یه دیکھ کر بے شک اطمینان هوتا هے که اس کو رفع کرنے اور دونوں زبانوں کے مبلغین کو ایک نقطے پر متحد کرنے کی کوشش شروع هوگئی هے ۔ چنانچه مولوی عبد الحق اور بابو راجندر پرشاد کے مابین حال هی میں جو سمجهوته هوا هے اس نے ایک ایسی زبان کے لئے میدان تیار کر دیا هے جس کو هندو اور مسلمان دونوں کی زبان کہا جا سکے گا۔ اس مفاهمت کی رو سے ''هندوستانی'' وه زبان کہلائے گی جو شمالی هندوستان میں مشترکه طور پر سب سے زیاده بولی جاتی هے ۔ لغت میں الفاظ کے داخل و خارج کرنے کا معیار، رواج کو قرار دیا جائے گا اور هندوستانی کو ملک کی مشترکه عام زبان بنانے میں هندو مسلمان دوش بدوش کوشش کریں گے۔ یه زبان اردو اور ناگری دونوں رسم الخط میں لکهی جائے گی اور تمام دفتری و تعلیمی کاموں میں اس کو استعمال کیا جائے گا ۔ نیز اردو اور هندی دونوں زبانوں کی نشو و نما کو پوری آزادی هوگی ۔ اس کی بهی کوشش کی جائے گی

که هندی اور اردو کے اہل زبان باہم مشورے اور تعاون سے اساسی ہندوستانی کی لغت مرتب کریں۔ یہ بھی تجویز ہے کہ ایک مختصر سی نمائندہ کمیٹی زبان کے متعلق دوسرے اہم مسائل مثلاً فنی اصطلاحات وغیرہ کا فیصلہ کرے۔''۶۲

لیکن بہار کمیٹی کی سفارشات کا کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا، ابتدا میں کچھ کام ہوا، پھر کانگریس حکومت نے دانستہ اس سے گریز اختیار کرنا شروع کیا۔ مولوی عبدالحق نے ہندی اور اردو کے ماہرین کی مدد سے ''ہندوستانی'' کی مجوزہ لغت بھی مرتب کرا دی اور اس کا مسودہ بھی کمیٹی کو پیش کر دیا، لیکن پھر نہ پتہ چلا کہ وہ کہاں گیا اور بہار کی صوبائی حکومت نے اسے کیوں درخور اعتنا نہ جانا۔ اسی زمانے میں محمد اجمل خان نے اردو کے بنیادی لفظوں کی ایک طویل فہرست تیار کی۔ جس میں عربی، فارسی، سنسکرت اور مقامی بولیوں کے وہ سارے الفاظ شامل کر لئے جو اردو میں مستعمل ہو سکتے تھے۔ مرتب کا خیال تھا کہ:

''اردو یا ہندوستانی کو سنسکرت سے نہیں مروجہ زبانوں کے قریب تر لانے کی ضرورت ہے۔''

چنانچہ انہوں نے اپنی مرتبہ فہرست کی ابتدا میں لکھا کہ:

''جو لوگ ہماری زندہ بولیوں کو سنسکرت کے قریب لانا چاہتے ہیں وہ خود ایک ایسا کام کرنا چاہتے ہیں جو اول تو فطرت انسانی کے خلاف ہے اور اگر بفرض محال ہم مان بھی لیں کہ مذہبی جذبات پر رجعت پسندی کا نام زندہ رکھا جا سکتا ہے تو کیا یہ زبان ملک کی خدمت کے لائق کہی جا سکتی ہے؟ میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ جس طرح پاننی نے سنسکرت کے لئے گرامر کے جامد اور ٹھوس قواعد بنا کر اسے مردہ کر دیا اسی طرح ہندوستانی زبان کو سنسکرت کے ذریعے سے ترقی دینے والے، ہندوستانی بولنے والوں

۶۲ - اردو، جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۱۷۰

کی سماجی اور ادبی زندگی کا جنازہ نکال دیں گے ۔ لفظوں کے پسند کرنے میں ہمیشہ رواج پر نظر ہونا چاہئے، یہ خیال ہی تنگ نظری پر مبنی ہے کہ فلاں لفظ دیسی ہے اور فلاں بدیسی۔"۶۳

لیکن یہ ساری کوششیں یوں بے نتیجہ ثابت ہوئیں کہ کانگریس نے حکومت کے زعم میں معاہدے کی کسی شق کو عملاً رو بکار نہ آنے دیا اور سرکاری دستاویز اور کاغذات میں، سنسکرت آمیز ہندی استعمال ہوتی رہی ۔ پبلک تقریروں میں اسی کو "ہندوستانی" کا نام دے کر مسلمانوں کو بہلایا جاتا رہا ۔ اس سلسلے میں اپریل ۱۹۳۸ء میں مولوی عبدالحق نے مولانا ابوالکلام آزاد سے کلکتے میں ملاقات کی اور کہا :

"کانگریس حکومت کے اکثر ارکان اور وزرا اپنی سرکاری اور غیر سرکاری تقریروں اور تحریروں میں ہندی کی اشاعت پر زور دے رہے ہیں اور یہ کانگریس کے فیصلے کے صریحاً خلاف ہے چونکہ آپ کی رائے اس معاملے میں کانگریس کے حلقوں میں زیادہ مستند سمجھی جائے گی اس لئے آپ انہیں ہدایت فرما دیں تو مناسب ہوگا ۔"

مولانا نے وعدہ کیا لیکن شاید بھول گئے اس لئے مولوی عبدالحق نے بطور یاد دہانی مولانا آزاد کو خط لکھا، مولانا نے اپنے خط میں بڑی احتیاط سے کام لیا اور بچ بچ کر لکھا کہ مدراس، بمبئی اور سی پی وغیرہ میں چونکہ لوگ ہندی اور اردو کے نازک فرق کو نہیں سمجھتے اس لئے اس طرح کے مغالطے ہو جاتے ہیں، پھر ایک خط بھی سرکلر کے طور پر جاری کیا گیا لیکن اثر کچھ نہ ہوا ۔ ۷ جون ۱۹۳۸ء کے مدینہ اخبار (بجنور) نے آزاد کے گشتی خط کے حوالے سے اس صورت حال کو ہندو مسلم اتحاد کے لئے مہلک خیال کرتے ہوئے لکھا :

"ہم خود ہمیشہ کہتے چلے آئے ہیں کہ اردو ہندی کے مسئلے کے بارے میں کانگریس نے جو فیصلہ کیا ہے وہ نہایت صاف ہے اور

۶۳ - اردو، جنوری ۱۹۴۱ء، ص ۳

اس سے بہتر اور معقول فیصلے کی بحالت موجودہ توقع نہیں کی جا سکتی ہے لیکن اسی کے ساتھ ہمارا خیال ہے کہ ہندوؤں کا متعصب اور تنگ نظر طبقہ اس مسئلے کے بارے میں جو خیال رکھتا ہے اور عملاً اسے جس طرح حل کرنا چاہتا ہے وہ یقیناً اردو کے لئے خطرناک ہے اور اس کی بنا پر مسلمانوں کے دلوں میں خود کانگریس کی طرف سے بدگمانیاں پیدا ہوتی ہیں اور انہیں یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ کہیں اردو کے آسان بنانے کی تحریک ہندی کی ترویج عام کا زینہ سمجھ کر تو نہیں اختیار کی گئی ، مثلاً حکومت یوپی ہی کی طرف سے جو سرکاری بیانات و اعلانات وغیرہ فارسی اور ہندی رسم الخطوں میں الگ الگ شائع ہو رہے ہیں ، ان کی زبان بھی ایک دوسرے سے جداگانہ ہے ، حالانکہ کانگریس کے فیصلے کے مطابق زبان ایک ہونی چاہئے تھی اور صرف رسم الخطوں کا فرق ہونا چاہئے تھا ۔ اس طرح بہت سے کانگریسی لیڈر اپنی تحریروں اور تقریروں میں اب ایسے الفاظ استعمال کرنے لگے ہیں جن کا پنڈتوں کی مدد کے بغیر مسلمانوں کے لئے اور شاید عام ہندوؤں کے لئے بھی سمجھنا دشوار ہے ۔ درآنحالیکہ ان الفاظ کے ہم معنی سبک اور سادہ الفاظ روز مرہ کی زبان میں مستعمل ہیں اور خود یہ لوگ اپنی پہلے کی تقریروں اور تحریروں میں ان کے استعمال کے عادی رہ چکے ہیں ۔ بہت سے ہندو اخبارات مثلاً تیج وغیرہ جو کانگریس کے علمبردار خیال کئے جا رہے ہیں، اردو کے عام اور مستعمل الفاظ کے ساتھ ، محسوس طور پر تعصب برت رہے ہیں، اور ان کے بجائے سنسکرت کے غیر مانوس اور ثقیل الفاظ کو روز بروز زیادہ کثرت سے استعمال کرنے لگے ہیں ایسی حالت میں کانگریس کا فیصلہ خواہ کتنا ہی معقول اور صائب ہو، مسلمانوں کو بدگمانی سے کسی حال میں بچایا نہیں جا سکتا ۔ بنا بریں ، ہم کانگریسی ، ارباب حل و عقد سے التجا کرتے ہیں کہ وہ کانگریسی حکومتوں اور لیڈروں کے ان اعمال کی پوری شدت کے

ساتھ نگرانی کریں۔"۶۴

لیکن ان التجاؤں کا، ارباب حل و عقد پر کوئی اثر نہ پڑا، کانگریس حکومتیں اور ان کے لیڈر، کس طرح ان زیادتیوں کا سد باب کرتے جبکہ وہ خود ھی ان کے مرتکب تھے اور مختلف صوبوں میں جو کچھ ھو رھا تھا وہ انھیں کے اشارے اور منشا سے ھو رھا تھا۔

زبان کے سلسلے میں مدراس کی کانگریس حکومت کی حکمت عملی وھی تھی جو دوسرے صوبوں کی تھی، جب ھندی کو جبری طور پر مدراس میں رائج کرنے کے متعلق مدراس لیجسلیٹو اسمبلی کے مسلمان ممبروں نے بہت سخت اعتراضات کئے تو جواب میں وزیر اعلیٰ راج گوپال اچاریہ نے کہا :

" اردو یا دیو ناگری رسم خط کو ھندو مذھب اور اسلام سے کوئی تعلق نہیں، ھندی کا بھی کسی مذھب سے کوئی تعلق نہیں ھے البتہ وہ ھندوستان کی زبان ھے۔ اس کے ذریعے مشترک زبان کا پیدا کرنا بھی مقصود نہیں ھے لیکن ھندوستانی بچوں کو ھندی پڑھانا ضروری ھے اس لئے کہ زیادہ تر یہی زبان ھندوستان میں بولی اور سمجھی جاتی ھے۔" ۶۵

چنانچہ ھندوستانی رائج کرنے کے بہانے مدراس میں بھی ھندی کی اشاعت شروع کی گئی۔ پہلے مدراس کے تقریباً ایک سو اسکولوں میں ھندوستانی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا، پھر حکومت نے اسے دو سو اسکولوں میں رائج کر دیا اور اس کا رسم الخط صرف ناگری رکھا۔ نام کو یہ " ھندوستانی " تھی عملاً سنسکرت الفاظ سے پر ھندی تھی۔ یہ نئی سیاسی زبان ناگری خط میں ان مسلمان طلبہ و طالبات کو بھی جبراً پڑھائی جاتی تھی جو اردو رسم الخط

۶۴ - مدینہ اخبار، بابت ۷ جون ۱۹۳۸ء، بحوالہ اردو، جولائی ۱۹۳۸ء، ص ۶۹۳

۶۵ - اردو، اپریل ۱۹۳۸ء، ص ۳۶۷

سیکھنا چاہتے تھے۔٦٦ چنانچہ مدراس کے ایک اخبار نے حکومت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا :

”موجودہ وزارت نے جب سے حکومت کی باگ اپنے ہاتھ میں لی ہے ہمیں یہ امید ہو رہی تھی کہ اصولاً کانگریسی حکومت اگر اردو کو اردو کی حیثیت سے نہیں تو ہندوستانی کی حیثیت سے فروغ دینے کی کوشش کرے گی۔ اس نے جب جبری ہندوستانی کی تعلیم کا حکم نافذ کیا اور ناگری حروف کے ساتھ درسی کتب میں اردو حروف کو بھی شامل کر لیا تو ہماری امید اور بھی قوی ہو گئی لیکن عملاً ہم پر یہ ثابت ہو رہا ہے کہ ہماری توقعات صحیح نہیں تھیں۔ ہندی کو سرفراز کرنے کا کام تو پوری مستعدی اور کشادہ دلی کے ساتھ کیا جا رہا ہے لیکن اردو کو ترقی کی طرف بالکل توجہ نہیں کی جاتی بلکہ اردو کو خالص مسلمانوں کی زبان تصور کرتے ہوئے اس کو ہر حیثیت سے محدود کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اعلانات اور بیانات یا سرکاری اشتہارات کو اردو جاننے والوں تک پہنچانا بھی حکومت کے خیال میں ضروری نہیں ہے حالانکہ ہمارے صوبہ میں کم از کم دس بارہ لاکھ مسلمان ایسے ہیں جن کی مادری زبان اردو ہے اور جو سوا اردو کے اور کوئی زبان نہیں سمجھتے۔“ ٦٧

اس جبری تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ مدراس میں ہندی کے خلاف ایک کانفرنس قائم کی گئی اس کانفرنس میں مسلمان، عیسائی، پارسی اور ہندو شریک ہوئے، فروری ۱۹۳۸ء میں اس کانفرنس کا ایک بڑا جلسہ ہوا اس میں تقریر کرتے ہوئے کے وی ریڈی نے بہ حیثیت صدر جلسہ کہا :

”ہم دراوڑیوں کے لئے ہندی ایسی ہی غیر زبان ہے جیسی انگریزی اور سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ نہ تو کسی قدامت کا دعویٰ

٦٦ - ہماری زبان (دہلی)، یکم مئی ۱۹۳۹ء، ص ۳

٦٧ - ہماری زبان (دہلی)، ۱۶ ستمبر ۱۹۳۹ء، ص ۱۱

کر سکتی ہے ۔اور نہ کسی بڑی ترقی کا ۔"

سر ایم کرشنن نائر نے کانفرنس کا افتتاح کرتے ہوئے کہا :
"یہ کوئی عقل کی بات ہے کہ انگریزی کو تو غیر زبان سمجھ کر خارج کیا جا رہا ہے اور لوگوں کی خواهش کے برخلاف ہندی کو سارے ملک کی زبان بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے جو ایک نا ممکن کام ہے ؟ " ٦٨

یہ احتجاج روز بروز بڑھتا گیا ۔ وزیر اعلیٰ راج گوپال اچاریہ جہاں جاتے ان کا کالی جھنڈیوں سے استقبال کیا جاتا ۔ روزانہ ان کے سامنے کئی شخص دھرنا دیتے اور گرفتار ہوتے ۔ ان ہڑتالیوں میں مسٹر جگدیش کئی مہینے فاقے سے رہے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ اقلیتوں کی زبان و تہذیب کی حفاظت کی جائے ۔ صوبے میں جبراً ہندی کا نفاذ نہ کیا جائے اور دراوڑی نسل کے علاقوں پر آریائی برہمنوں کے جبر و تشدد کا خاتمہ کیا جائے ۔٦٩ اس قسم کی ہڑتالوں کا اتنا اثر ضرور ہوا کہ وزیر اعلیٰ اور حکومت کے دوسرے ارکان " ہندی " کے لفظ سے گریز کر کے " ہندوستانی " کا لفظ استعمال کرنے لگے لیکن عملاً ہندی ہی کو فروغ دیتے رہے ۔

سی پی کی کانگریس حکومت ، اردو کی مخالفت اور ہندی کے پرچار میں سب سے آگے بڑھ گئی ۔ یہاں " ودیا مندر " کے نام سے ایک ایسے نظام تعلیم کو مروج کرنے کی کوشش کی جو صرف لسانی نقطۂ نظر سے نہیں بلکہ اور کئی اسباب سے مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے والا تھا ۔ ودیا مندر اسکیم کس نے مرتب کی تھی اور اس کی غرض و غایت کیا تھی؟ اس کا ذکر اسی باب میں جہاں کانگریس وزارتوں کے اقتدار سنبھالنے کا تذکرہ ہے ، تفصیل سے کیا جا چکا ہے ، اس لئے اس کا دھرانا لا حاصل ہے ، البتہ زبان کے معاملے میں سی پی کی حکومت جس قسم کی ہٹ دھرمیوں سے کام لے رہی تھی ،

٦٨ - اردو ، اپریل ١٩٣٨ء ، ص ٧٥٣

٦٩ - اردو ، جولائی ١٩٣٨ء ، ص ٦٩٧

ان کا اندازہ کرنے کے لئے صرف ایک واقعہ مختصر الفاظ میں سن لیجئے :

''سی پی کی لیجسلیٹو اسمبلی میں جب یہ بات زیر بحث آئی کہ اسمبلی میں تقریریں کس زبان میں کی جائیں اور اس کی روئداد کس میں لکھی اور مرتب کی جائے تو ہندوستانی ، کے بجائے '' ہندی '' اور ''مرہٹی'' کو ایک قرار داد کے ذریعے منظور کیا گیا۔ مسلم لیگ کے دو ممبروں سیر ہدایت علی اور خان صاحب اے ای خان نے ترمیم پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس میں '' اردو '' کو بھی شامل کیا جائے ۔ حزب اختلاف کے سارے ممبروں نے اس کی تائید کی اور ایوان پر زور دیا کہ وہ زبان کے سلسلے میں کانگریس کی اس قرار داد پر عمل کریں جس میں کہا گیا ہے کہ ہندوستان کی قومی زبان '' ہندوستانی '' ہوگی جو کہ اردو اور ناگری دونوں خطوں میں لکھی جاتی ہے لیکن اکثریتی جماعت نے توجہ نہ کی۔ وزیر مالیات مسٹر مہتا نے ترمیم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ کانگریس کو ہندوستان کی واحد قومی جماعت تسلیم نہیں کرتے اور اس کے اغراض و مقاصد سے اختلاف رکھتے ہیں انہیں اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کی وزارتوں کے منصوبوں اور تجویزوں پر نکتہ چینی کریں ۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ مٹھی بھر اقلیت کے لئے اسمبلی کی تقریروں اور روئداد کو اردو میں چھپوانا محض تضیع اوقات اور پیسے کا زیاں ہے ۔''۷

نتیجتاً سی پی کی کانگریس حکومت کے خلاف بھی ہڑتال اور احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا ۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۹ء کو ودیا مندر کی افتتاحی تقریب کے موقع پر ناگپور سکریٹریٹ کے سامنے نواب صدیق علی خان کی قیادت میں سول نافرمانی کا آغاز کر دیا گیا ۔ حکومت نے صلح و صفائی کے لئے مختلف طبقے کے لوگوں کا ایک اجلاس بلایا ، کئی گھنٹے بحث رہی لیکن مسٹر شکلا

۷ ۔ ہندوستانی اے پولیٹیکل کیچ ورڈ ، دین محمد ، امرتسر ، ۱۹۳۹ء ، ص ۵۲

نے جو کہ پہلے وزیر تعلیم تھے اور بعد کو وزیر اعلیٰ ہو گئے تھے ، بعض ایسی شرطیں عائد کیں کہ کوئی معاہدہ نہ ہو سکا ۔ فروری ۱۹۳۹ء میں نواب زادہ لیاقت علی خاں ناگپور گئے اور حکومت سے بات چیت کرنے کے بعد ایک سمجھوتہ ہو گیا لیکن چونکہ اس سمجھوتے کی تفصیلات خفیہ رکھی گئی تھیں اس لئے اردو کے حامی مطمئن نہ ہوئے ، ان کا احتجاج جاری رہا اور حکومت کو ودیا مندر اسکیم کو معطل کر دینا پڑا ۔۱۔۷

یوپی میں بھی کانگریس حکومت نے یہی روش اختیار کی ۔ ہر موقع پر اور ہر شعبے میں ہندوستانی کے پردے میں اردو زبان پر ہندی کو ترجیح دی گئی ۔ لوگوں کی شکایات پر صوبائی محکمہ اطلاعات کی طرف سے ایک کتابچہ بہ عنوان ”مسلمان اقلیت اور حکومت صوبہ جات متحدہ“ شائع کیا گیا جس میں مسلمانوں کی شکایات کے بارے میں حکومت کا نقطۂ نظر واضح کیا گیا ، آخری پیراگراف میں لکھا :

> ”زبان کے مسئلے پر موجودہ حکومت کے متعلق بہت غلط فہمیاں پھیلائی گئیں اور یہ کہا گیا کہ موجودہ حکومت ہندی کو ترجیح دے رہی ہے اور اردو کو فنا کرنے کی کوشش کر رہی ہے ۔ یہ الزام سرتاپا غلط ہے ، حکومت نے کبھی ہندی کو اردو پر فوقیت نہیں دی ۔“ ۲۔۷

یہ وضاحت چونکہ غلط بیانی پر مبنی تھی اس لئے اردو کے حامیوں کا اضطراب کم نہ ہوا ۔ اس کی تردید میں متعدد مضامین و بیانات شائع ہوئے پہلی بات تو یہی قابل اعتراض تھی کہ اردو کو اقلیت کی زبان قرار دیا گیا تھا حالانکہ خود کانگریس کی قرار داد کے تحت ”ہندوستانی“ کے نام سے اسے قومی زبان کی حیثیت حاصل تھی ۔ دوسرے یہ کہ ”ہندوستانی“ کے نام سے جو زبان ، سرکاری اور عدالتی دفتروں میں رائج کی جا رہی تھی ، اس میں اردو

۱۔۷ ۔ ہماری زبان ، ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء ، ص ۱۴

۲۔۷ ۔ ہماری زبان ، ۱۶ اپریل ۱۹۳۹ء ، ص ۲

کے مروجہ الفاظ خارج کرکے سنسکرت کے مشکل الفاظ شامل کئے جا رہے تھے مثلاً عدالتی زبان میں مدعی اور مدعا علیہ کے الفاظ عام ہیں اور ہندو مسلمان عالم، جاہل سبھی سمجھتے ہیں لیکن ان کی جگہ " بادی " اور " پرتبادی " کے الفاظ لکھے جانے لگے، یہی روش دوسرے الفاظ کے سلسلے میں اختیار کی گئی ۔ صوبائی بجٹ میں، مختلف شہروں کے اردو کتب خانوں اور دارالمطالعوں کے لئے جو رقم مخصوص کی گئی تھی اور جو امدادیں مختلف اداروں کو دی گئی تھیں ان سے بھی یہی پتہ چلتا تھا کہ یوپی کی حکومت ہر طرح اردو کو نظر انداز کر رہی ہے ۔

یوپی کے مدارس میں یہ کیا جاتا کہ جو ہندو انسپکٹر، معائنے کی غرض سے جاتے وہ عام طور پر بولی جانے والی اردو کے بجائے ایسی زبان میں سوال کرتے جس میں ہندی کے مشکل الفاظ شامل ہوتے، جو امتحانی پرچے، بنا کر دئے جاتے وہ بھی اسی قسم کی زبان میں ہوتے ۔ لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ کے پرائمری اسکولوں میں زیادہ تر ہندو ٹیچر ہوتے تھے اور وہ مسلمان بچوں کو اردو کے بجائے ہندی ہی پڑھنے کی ترغیب دیتے تھے ۔ حاضری کے وقت "حاضر جناب، حاضر صاحب" کے بجائے لڑکوں سے عام طور پر " اپستھتہ شریمان " کہلوایا جاتا تھا ۔ دیہات کے اسکولوں میں زیادہ تر بچے کسانوں اور مزدوروں کے ہوتے تھے وہ آسانی سے اردو سمجھتے اور بولتے تھے، لیکن اسکولوں میں انہیں ایسی زبان سے واسطہ پڑتا تھا جسے نہ وہ خود سمجھ سکتے تھے اور نہ ان کے والدین ہی اس سے مانوس تھے ۔۷۳

یوپی کے وزیر تعلیم، شروع میں پنڈت پیارے لال شرما تھے، وہ ایک شایستہ اور آزاد خیال آدمی تھے، یوپی حکومت نے جب ان سے مدارس میں ہندی کو جبراً رائج کرنے اور اردو کے معاملے میں ہندی کو ترجیح دینے کے لئے کہا تو انہوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ: "میں اس گنواری زبان کو رائج کرنے کا حامی نہیں ہوں"، اس پر ان کے خلاف طوفان اٹھا،

۷۳ - اردو، جنوری ۱۹۳۸ء، ص ۱۹۳ تا ۱۹۴

پنڈت شرما کو مجبوراً مستعفی ہونا پڑا اور ان کی جگہ ہندی کے مشہور پرچارک اور اردو کے جانی دشمن، سمپورنا نند جی کو وزیر تعلیم بنایا گیا جنھوں نے اردو کے خلاف یوپی حکومت کے عزائم سے بھی آگے بڑھ کر "ہندی" کو ترقی دینے کی کوشش کی اور شاید اسی بنا پر جب سمپورنا نند جی نے اپنی سوانح حیات، کتابی شکل میں مرتب کی تو اس میں انھوں نے خود کو۷۴ اور پرشوتم داس ٹنڈن کو۷۵ ہندی کا سب سے بڑا حامی قرار دیا۔ اس کتاب میں سمپورنا نند جی نے ایک پورا باب "آور نیشنل لینگوئج" (Our National Language) کے عنوان سے قائم کیا۔ اس میں انھوں نے لکھا کہ:

"ہندی کو کامیاب بنانے میں بڑی مشکلات پیش آئیں پہلے اردو سے اس کا سخت مقابلہ رہا بعد کو ہندوستانی سے۔"

اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ سمپورنا نند جی نے آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی منعقدہ ۲۹ ستمبر ۱۹۳۸ء، کی اس قرار داد کو جس میں "ہندوستانی" یا انگریزی کو مرکز اور صوبوں کی کارروائیوں کے لئے ترجمان کی حیثیت دی گئی تھی، کبھی دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ ہندی ان کا اصل مطمح نظر تھی اور وہ "ہندوستانی" کے پردے میں شروع سے آخر تک اسی کے لئے کام کر رہے تھے۔ سمپورنا نند جی کو اردو والوں سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ندی کی جگہ دریا، نگر کے بجائے شہر، دیش کے بجائے ملک، سلطانوں کی جگہ سلاطین، ضلعوں کے بجائے اضلاع اور ملکوں کی جگہ ممالک کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔۷۶ یہ اعتراض لا یعنی ہے اس لئے کہ یہ الفاظ اردو میں دونوں طرح، حسب موقع استعمال ہوتے ہیں اور اتنے عام فہم ہیں کہ ہر شخص ان سے مانوس ہے۔ خود ہندو بھی ان الفاظ کو

۷۴۔ میموریز اینڈ رفلیکشنز، سمپورنا نند، لندن، ۱۹۶۲ء، ص ۸۷

۷۵۔ میموریز اینڈ رفلیکشنز، ص ۹۰

۷۶۔ میموریز اینڈ رفلیکشنز، ص ۸۸

آئے دن استعمال کرتے ہیں ان میں وہ اجنبیت نہیں جس کی بنا پر انہیں ہندوستانی سے خارج کر دیا جاتا۔ اصل بات صرف اتنی تھی کہ سمپورنا نند جی کو ایسے سارے الفاظ سے چڑ تھی جو اصلاً عربی اور فارسی کے ہوں یا جن میں مسلمانوں کی ثقافت کی بو باس موجود ہو۔ وہ ان الفاظ کو خواہ کتنے ہی سہل اور عام فہم کیوں نہ ہوں، خارج کرکے سنسکرت الفاظ کو جگہ دینا ضروری سمجھتے تھے۔ اسی سنسکرت آمیز ہندی کو انھوں نے ٹنڈن جی کی مدد سے جوبنی ہند پر تھوپنے کی کوشش کی اور شروع میں سیاسی مصلحتوں کی بنا پر یہ کہتے رہے کہ جنوبی ہند میں ''ہندی'' تیزی سے قبول عام حاصل کر رہی ہے، لیکن جب خود ہندوؤں کی طرف سے مصنوعی ہندی کے خلاف احتجاج ہوا اور جنوبی ہند، زبان کے سلسلے میں کانگریس کے قابو میں نہ آیا تو افسوس کے ساتھ اعتراف کیا کہ جنوبی ہند میں ہماری کوششیں ناکام رہیں۔[۷۷]

کانگریسی حکومتوں کے زیر اثر محکمہ اطلاعات و نشریات کی زبان میں بھی نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ ریڈیو کی خبریں، عام فہم ہندوستانی کے بجائے، سنسکرت آمیز ہندی میں نشر کی جانے لگیں۔ صوبہ بمبئی میں تو اسمبلی کے ایک کانگریسی ممبر جمنا داس مہتا نے ''ریڈیو سنسرس ایسوسی ایشن'' کے نام سے ایک انجمن بنا ڈالی اور اس کے صدر کی حیثیت سے انھوں نے ایک قرار داد کے ذریعے یہاں تک مطالبہ کر دیا کہ ''بمبئی ریڈیو اسٹیشن سے اردو میں تقریریں نہ کی جائیں کیونکہ بمبئی میں ریڈیو استعمال کرنے والوں میں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہے جن کی زبان مرہٹی اور گجراتی ہے۔''[۷۸] ریڈیو کی زبان کانگریس کے دور حکومت میں کیا سے کیا ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ تعلیم، آزادی، اعلان، مدعی، سیاسی، ساحل لا مذہبی، وزیراعظم، جمہوریت، اقتصادی، بین الاقوامی کے الفاظ سے دانستہ گریز کر کے ان کی جگہ شکسا، سونترتا، گھونشڑ، تبادی، راجنتک، تٹ،

۷۷۔ میموریز اینڈ رفلیکشنز، ص ۸۸

۷۸۔ ہماری زبان، یکم اپریل ۱۹۳۹ء، ص ۵

دھرم ھنیتا ، پردھان منتری ، پرجا تنتر ، ارتھک ، انتریشیڑیا جیسے بالکل اجنبی سنسکرت الفاظ استعمال کئے جاتے تھے ، ایک معاصر اخبار نے ریڈیو کی زبان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ :

”ھندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک زبان یعنی اردو کو مٹانے کی جو کوششیں ملک کے طول و عرض میں جاری ھیں ان کے اثرات سے ریڈیو کا محکمہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا، چنانچہ آجکل ریڈیو اسٹیشنوں سے جو خبریں اور مضامین نشر کئے جاتے ھیں ، ان میں بکثرت الفاظ ایسے ھوتے ھیں جو سمپورنا نند اور ٹنڈن جی کے لغت کے مخصوص الفاظ ھیں اور جن کا سننا مسلمانوں کو چھوڑ کر عام اھل ذوق اور صحیح الخیال ھندوؤں کے لئے بھی ناگوار اور تکلیف دہ ھوتا ھے ۔ اردو زبان کے وہ الفاظ جو عام طور سے بولے اور سمجھے جاتے ھیں بالقصد نظر انداز کئے جا رہے ھیں اور ان کی بجائے یا تو سنسکرت کے ثقیل اور نامانوس الفاظ کو رواج دیا جا رہا ھے یا ان کا مفہوم ایسے نئے الفاظ سے ادا کیا جاتا ھے جن کو سن کر اھل ذوق اپنے کان بند کر لینے پر مجبور ھو جاتے ھیں ۔ مطالبات ، مغربی ، وقت ، طالب علم ، زمین ، آمد و رفت ، حفاظت وغیرہ الفاظ ایسے ھیں جن کا مفہوم جاھل شخص بھی اچھی طرح سمجھتا ھے لیکن اب ان کی بجائے مانگیں ، پچھمی ، سمے ، ودیارتھی ، دھرتی ، آوت جاوت ، اور رکھشا بڑی بے تکلفی سے استعمال کئے جا رہے ھیں ۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ ریڈیو کا محکمہ ، حکومت کے ماتحت ھے یا ھندی ساھتیہ سمیلن کے ، اور وہ ملک کی عام سیدھی سادی زبان میں خبریں اور مضامین نشر کرنے کے لئے قائم کیا گیا ھے یا جناتی زبان کی تبلیغ و ترویج کے لئے ۔

ھم حکومت ھند کو متوجہ کرنا چاھتے ھیں کہ وہ زبان کے اس

بے دردانہ ”قتل“ کی طرف اپنی توجہ مبذول کرے۔“۹۷

ایک اور معاصر اخبار نے دھلی ریڈیو کی زبان پر بڑے سخت الفاظ میں اس طور پر لعن طعن کی :

”دھلی ریڈیو کے فرقہ پرست اور جاھل کارکنوں نے اردو زبان کو مسخ کرکے ایک نئی زبان مینوفکچر کرنے کی جو ناپاک روش جاری کر رکھی ھے اس کے خلاف کافی احتجاج ھو چکا ھے۔ اس احتجاج کا نتیجہ یہ ھوا کہ چند روز کے لئے اس جہالت میں کمی واقع ھو گئی تھی۔ مگر اب ھم دیکھ رھے ھیں پھر وھی زبان کو مسخ کرنے اور بگاڑنے کا سلسلہ شروع ھو گیا ھے۔

دلی ریڈیو کے جہالت مآب کارکن کس طرح زبان کو بگاڑ رھے ھیں اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اسی ھفتہ سے سفیر کو ایلچی کہنا شروع کر دیا گیا ھے حالانکہ سفیر اور ایلچی کے معنوں میں زمین اور آسمان کا فرق ھے۔ سفیر حکومت کے نمائندہ کو کہتے ھیں اور ایلچی پیغامبر کو۔ ان جاھلوں کو سفیر اور ایلچی دونوں ھم معنی معلوم ھوتے ھیں صرف اس لئے کہ ”سفیر“ کے لفظ سے ان کو نفرت ھے۔

ان کی قابلیت کا مزید نمونہ ملاحظہ ھو کہ انھوں نے ”سنگ بنیاد“ کا ترجمہ ”کونے کا پتھر“ کرنا شروع کر دیا ھے حالانکہ کونے کا پتھر ایک قطعی بے معنی ایجاد ھے۔ اس کے علاوہ ”بدھوار“ اور ”منگل وار“ کا مزید اضافہ ھوا ھے۔

دھلی ریڈیو کے کارکنوں کی زبان کو مسخ کرنے کی یہ کوشش صاف طور پر بتا رھی ھے کہ دھلی ریڈیو اسٹیشن فرقہ پرستی کا اکھاڑہ بنا ھوا ھے جس کے کارکن دھلی ریڈیو اسٹیشن کو بھی ھندی

۹۷۔ مدینہ اخبار (بجنور)، بابت ۲۵ نومبر ۱۹۳۹ء، بحوالہ ھماری زبان، یکم دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۸

اور اردو کے جھگڑے میں پھنسا کر اس اسٹیشن کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں۔
ضرورت ہے کہ حکومت ہند ان فرقہ پرست کارکنوں سے اس اسٹیشن کو پاک کرے، جنھوں نے اس اسٹیشن پر فرقہ وارانہ ہنگامہ آرائی کا ایک نہایت ہی ناخوشگوار سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ ہم حیران ہیں کہ حکومت ہند اس فرقہ وارانہ بد تمیزی کو اس وقت تک کیسے برداشت کرتی رہی اگر حکومت ہند نے فوراً اس سلسلہ میں مناسب قدم نہ اٹھایا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ دہلی ریڈیو اسٹیشن اپنے اس مقصد کو کھو دے گا جس کے لئے یہ جاری کیا گیا تھا۔'' ۸۰

اس سے پہلے فروری ۱۹۳۹ء کے آخر میں آل انڈیا ریڈیو کی درخواست پر ''ہندوستانی'' کے معیار کی نشان دہی کے لئے ملک کے کئی ممتاز ادیبوں اور رہنماؤں نے تقریریں کی تھیں۔ تقریر کرنے والوں میں ڈاکٹر تارا چند، بابو راجندر پرشاد، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر ذاکر حسین، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور آصف علی خان (مشہور کانگریسی لیڈر) شامل تھے۔ اگرچہ یہ تقریریں اپنے اسلوب و زبان کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھیں اور ان سے ''ہندوستانی'' کے متعلق کسی نتیجے تک پہنچنے میں کوئی مدد نہ ملتی تھی تاہم یہ سب تقریریں ایسی سادہ زبان میں ضرور تھیں، جنہیں ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا تھا۔ یہ تقریریں کتابی شکل میں چھاپی گئیں۔ اس کے علاوہ بعض دوسروں نے بھی عام فہم ''ہندوستانی'' کے سلسلے میں مضامین لکھے، لیکن ان باتوں کا کانگریس حکومت نے عملی صورت میں کوئی اثر قبول نہ کیا۔ اس کے نمائندے ہر قسم کی تنقید و مشورہ کو بالائے طاق رکھ کر اپنی ایجاد کردہ زبان بولتے رہے اور ان کے زیر اثر ابلاغ عامہ کے وسائل میں بھی عموماً اسی سے کام لیا جاتا رہا۔ سمپورنا نند

۸۰۔ ''دین و دنیا''، بابت ۲۶ نومبر ۱۹۳۹ء، بحوالہ ہماری زبان، یکم دسمبر ۱۹۳۹ء، ص ۹

جی نے تو اپنی ایک تقریر میں ریڈیو پروگراموں کے افتتاحی جملے "آداب عرض" سے بھی بیزاری کا اظہار کیا اور کہا:

"نمسکار کا لفظ اس سے زیادہ آسان اور عام فہم ہے۔"

ان کی اس تجویز پر خاصی لے دے رہی صدق اخبار (لکھنؤ) نے لکھا:

"حکومت کا ریڈیو ڈپارٹمنٹ ہندی کی راہ میں سنگ گراں بنا ہوا ہے، اس نے اردو اور ہندی سے کنارہ کشی کرکے صرف ہندوستانی کو سرکاری زبان تسلیم کیا ہے مگر اس کی "ہندوستانی" ہندی کے مترادف ہے، ریڈیو کا اعلانچی "نمسکار" کبھی نہیں کہے گا وہ اپنی تہذیب کے مطابق ہمیشہ آداب عرض ہی کہتا ہے۔"۸۱

مدینہ (بجنور) اخبار نے لکھا:

"اس قسم کے لوگوں نے اردو اور ہندی کے سوال کو فرقہ وارانہ رنگ دینے کی کوشش کی ہے اور اس طرح ہندوستان کی دو عظیم الشان قوموں کے درمیان ایک مستقل منافرت اور اختلافات کی دیوار حائل کر دی ہے۔ اپنی وزارت کے زمانے میں بھی سمپورنا نند، قوم پرستی کے نام پر کانگریس کے پلیٹ فارم سے اس فتنے کو ہوا دیتے رہے ہیں۔" ۸۲

ریڈیو کی زبان پر سمپورنا نند جیسے متعصب ہندو لیڈروں کے سبب کانگریسی حکومت کے دور میں جو اعتراضات ہوئے ان کو رفع کرنے کے لئے آل انڈیا ریڈیو کے کنٹرولر احمد شاہ بخاری نے ہندی اور اردو کے ماہرین کو بطور مشیر ریڈیو سے منسلک کیا، ریڈیو کے بنیادی لفظوں اور دوسرے

۸۱ - صدق (لکھنؤ)، ۲۰ جنوری ۱۹۴۱ء، بحوالہ ہماری زبان، یکم فروری ۱۹۴۱ء

۸۲ - مدینہ اخبار (بجنور)، بابت ۱۷ جنوری ۱۹۴۱ء، بحوالہ ہماری زبان، یکم فروری ۱۹۴۱ء

مروجہ الفاظ و اصطلاحات کی فہرست مرتب کرانے کے انتظامات کئے۸۳ تاکہ ریڈیو کے سارے مرکزوں سے عام فہم زبان کا استعمال کیا جا سکے لیکن کوئی کوشش کانگریس کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے کارگر ثابت نہ ہوئی۔

کانگریس وزارتیں، ہندی کی حمایت اور اردو کی مزاحمت میں عملاً اتنی آگے بڑھ گئیں کہ نہ صرف مسلم لیگ یا انجمن ترقی اردو کے ہمدردوں کو بلکہ سبھی کو اس سلسلے میں شکایت پیدا ہوئی۔ خود کانگریس کے اندر اس مسئلے پر اختلاف رائے رونما ہوا اور بعض ایسے ممبر شاکی ہو گئے جو اس سے پہلے اردو والوں کی شکایت کو صرف فرقہ واریت پر مبنی خیال کرتے تھے، چنانچہ مشہور اشتراکی اور کانگریسی لیڈر، ڈاکٹر اشرف کو، جنھوں نے کانگریس کے شعبۂ اطلاعات کی طرف سے گاندھی جی کی ہندی سمیلن کی کارروائی کی تائید میں ایک رسالہ شائع کیا تھا، کانگریس سے شکایت پیدا ہوئی اور انھوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک اجلاس میں باقاعدہ مندرجہ ذیل تحریک پیش کی:

> "چونکہ سارے ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان کا مسئلہ بہت اہم ہے اور چونکہ ہندی اردو کی بحث نے ایک فرقہ وارانہ صورت اختیار کر لی ہے اس لئے یہ کمیٹی اس بات کو دہراتی ہے کہ کانگریس ہندوستانی زبان کو جو اردو اور دیو ناگری دونوں رسم الخط میں لکھی جاتی ہے ہندوستان کی قومی زبان مانتی ہے اور تمام کانگریس والوں کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ ہندوستانی زبان کو مقبول بنانے کی کوشش کریں اور ہندی اردو کی بحث سے الگ رہیں۔ یہ کمیٹی ایک "ہندوستانی بورڈ" مقرر کرتی ہے جو ہندوستانی زبان کی ترقی کے واسطے ایک جامع تجویز، کانگریس کے سالانہ اجلاس سے پہلے مرتب اور پیش کرے۔"۸۴

۸۳ - ہماری زبان، ۱۶ دسمبر ۱۹۴۰ء، ص ۴

۸۴ - اردو، ۱۹۳۷ء، ص ۴۳۲

ڈاکٹر اشرف نے تحریک پیش کرتے وقت اپنی تقریر میں کہا کہ :
” ہندوستانی سینکڑوں برس کے میل ملاپ سے پیدا ہوئی ہے۔ اب اردو کے مقابلے میں ہندی کا لفظ اختیار کرنا بلا وجہ ایک خطرناک تفرقہ پیدا کرنا ہوگا۔“

انہوں نے یہ بات زور دے کر کہی کہ :
” ہماری زبان نہ تو ہندی ہے، نہ ہندی ہندوستانی، بلکہ صرف ہندوستانی ہے ، جو لوگ اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں وہ رجعت پسند ہیں۔“

انہوں نے مزید کہا :
آپ کو میرے الفاظ ناگوار محسوس ہوئے ہوں گے لیکن میرے سامنے وہ تجربات ہیں جو مجھے مسلمانوں کے ساتھ کام کرنے میں ہوئے ہیں۔ یہ معاملہ اگرچہ تمدنی قسم کا ہے لیکن جو لوگ سیاسی میدان میں کام کر رہے ہیں وہ جانتے ہیں کہ اس کی شکل سیاسی ہو چکی ہے۔ لوگ ہندوستانی کی جگہ ہندی لفظ استعمال کرتے ہیں اور اس سے درحقیقت غلط فہمیاں پھیل رہی ہیں اور اس لئے میں آپ سے کہوں گا کہ اپنی سرگرمیوں میں اردو کا بھی خیال رکھیں۔“[۸۵]

ڈاکٹر اشرف نے یہ تحریک خالص وطنی اور سیاسی مصالح کی بنا پر پیش کی تھی لیکن کانگریس کمیٹی نے کثرت آرا سے بے تکلف اسے مسترد کر دیا ، اس تجویز سے اختلاف کیا بھی تو سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے ، حالانکہ چند مہینے پہلے وہ خود مولوی عبدالحق کی درخواست پر کانگریسی حکومتوں کے نام ایک گشتی خط ، اس ہدایت کے ساتھ بھیج چکے تھے کہ وہ ہندی کے بجائے ” ہندوستانی “ کا استعمال کیا کریں۔ لیکن یہ صرف دکھانے کی باتیں تھیں۔ پیغامات و بیانات میں کانگریسی لیڈر اور کانگریسی

۸۵۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۹۰ ، اور ”اردو“ ، بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء، ص ۱۱۲۰

حکومتیں '' ہندوستانی '' ہی کا لفظ استعمال کرتی رہیں لیکن سرکاری کاغذوں اور کارروائیوں میں ہر جگہ '' ہندی '' لکھا جاتا رہا اور عملاً '' ہندی '' ہی کو ترقی دینے کی کوشش کی جاتی رہی۔

ڈاکٹر عبدالعلیم ، اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین کے جنرل سکریٹری تھے اور پکے اشتراکی ، اس لئے عام ہندو اور مسلمانوں سے الگ قومی نقطۂ نظر رکھتے تھے، لیکن ہندوستان کی سیاست میں وہ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے ہم خیال اور اس کی حکمت عملیوں کے مداح تھے ، چنانچہ '' نیا ادب '' (لکھنؤ) میں ان کے مضامین ، سروج اردو کے بجائے گاندھی جی کی مجوزہ '' ہندوستانی '' زبان میں چھپتے تھے ، یعنی اردو کو ہندوستانی کرنے کی فکر میں وہ کثرت سے ہندی کے الفاظ استعمال کرتے تھے لیکن جب گوالیار کے ایک جلسے میں ڈاکٹر امر ناتھ نے '' انجمن ترقی پسند مصنفین '' کے بارے میں یہ حکم لگایا کہ :

'' یہ نوجوان مسلمانوں کی جماعت ہے۔ ان کی زبان میں عربی و فارسی کے الفاظ بہت ہوتے ہیں۔ انجمن کے نام سے بھی کچھ ایسا ہی شبہ ہوتا ہے۔ '' ۸۶

تو ڈاکٹر عبدالعلیم بھی ہندوستانی اور ہندی کے سلسلے میں خاموش نہ رہ سکے۔ انہوں نے نومبر ۱۹۳۹ء کے '' نیا ادب '' میں '' ہندی ساھتیہ سمیلن کی بھول '' کے عنوان سے ایک طویل اور سخت اداریہ لکھا اور اس کے ابتدائی پیراگراف میں کہا :

''سمیلن کی اٹھائیسویں بیٹھک کی کارروائی اخباروں میں کچھ ادھوری اور سرسری دیکھنے میں آئی تھی جس سے کچھ جی کڑھا اور کچھ اچنبھا سا ہوا خاص کر جب یہ بات دھیان میں آئی کہ اس کے کار کرتا راشٹر پتی راجندر پرشاد اور شری پرشوتم داس ٹنڈن جیسے سوجھ بوجھ کے لوگ ہیں تو اور زیادہ اچرج ہوا۔ کانگریس کے

۸۶ - ہماری زبان (دہلی) ، ۱۶ دسمبر ۱۹۳۹ء ، ص ۱

بڑے بڑے نیتا جس جلسے میں شریک ہوں اس میں ایسی باتیں کہی جائیں ، دل میں یہ بات اترتی نہ تھی لیکن ” سمیلن کے اٹھائیسویں ادھیویشن کے سوئکرت نشیچے “ جب اپنی آنکھوں سے دیکھیں تو آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور اچنبھا اس پر ہوا کہ ایک ایسی سبھا جو ہندوستان کے سب سے بڑے ساہتیہ کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرتی ہو ایسی تنگ دل اور تنگ نظر کیسے ہو سکتی ہے؟ اس بیٹھک میں سب سے پہلے جس چیز کو پیش کیا گیا وہ یہ تھی کہ تانبے اور چاندی کے سکوں پر ناگری لپی کو بھارت کی سرکار نے ابھی تک استھان نہیں دیا ہے ۔ دوسری بات جو غور کے قابل معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ عدالتوں میں جو زبان لکھی اور بولی جاتی ہے اس میں عربی اور فارسی کے لفظوں کی بھرمار ہوتی ہے جس کی وجہ سے عام لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے ۔ جنتا کے دکھ سکھ کا خیال ودوانوں کو ہو اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے ، لیکن کیا سمیلن کی بھاشا بھی عدالتوں کی طرح نقلی نہیں ہے اور کیا اس کا یہ دھرم نہیں ہے کہ ” سہل بھاشا کا پریوگ جاری کرے “ ۔ پورے بھروسے کے ساتھ یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ سمیلن کے پرستاروں کی بھاشا اتنی کٹھن ہے کہ عام جنتا تو الگ رہی کم پڑھے لکھے لوگ بھی اس کو سمجھ نہیں سکتے ۔ سچ ہے کہ دوسروں کی آنکھ کا تنکا اپنی آنکھ کے شہتیر سے بھی بڑا معلوم ہوتا ہے ۔ “ ۸۷

مختصر یہ کہ کانگریس حکومتوں نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ” ہندوستانی “ کو عملاً نظر انداز کیا ” ہندی “ کو قومی زبان بنانے کی غرض سے اسے تیزی سے ترقی دینے اور اردو کو ختم کرنے کی کوشش کی ۔ جب مدراس میں ہندی کے خلاف احتجاج کیا گیا تو صوبائی اسمبلی میں کانگریس کے چیف وھپ مسٹر سیتہ مورتی نے یہ کہہ کر اہل مدراس کی جھوٹی دلجوئی کرنی چاہی کہ جنوبی ہند میں ” ہندی “ بہت مقبول ہے

۸۷ - ہماری زبان (دہلی) ، ۱۶ دسمبر ۱۹۳۹ء ، ص ۸

اور یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یہاں کے لوگ ہندی کو قومی زبان بنانے کے حق میں ہیں ۔ ایک سابق وزیر گوکل چند نارنگ نے آل انڈیا ساہتیہ سمیلن کے جلسے میں کہا :

” ہندوستان کی ساری زبانوں میں صرف ” ہندی “ ایسی ہے جو قومی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے ۔ “

یوپی کے وزیر تعلیم بابو سمپورنا نند نے ناگری پرچارنی سبھا ، بنارس کی صدارتی تقریر میں کہا :

” اگر ہم جنوبی ہند کے لوگوں کو واقعی ہندی سکھانا چاہتے ہیں تو پھر ہندی میں کثرت سے سنسکرت الفاظ داخل کرنے چاہئیں ۔ “

تری پورہ کے انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں سبھاش چندر بوس کانگریس کے صدر منتخب ہوئے اس اجلاس کی کارروائیوں سے تو پوری طرح واضح ہو گیا کہ کانگریس ” ہندوستانی “ کے نام سے صرف ” ہندی “ کو رائج کرنا چاہتی ہے اور اردو سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ، اس لئے کہ جیسا کہ ۲۱ مارچ ۱۹۳۹ء کے مدینہ اخبار (بجنور) نے لکھا تھا ، کانگریس کے اس اجلاس میں سارے بیج ، سارے ٹکٹ ، بینر ، اشتہارات ، سائن بورڈ اور سرکلر وغیرہ ایسی سنسکرت آمیز اور نا مانوس زبان میں لکھے گئے تھے جس کا ہندوستانی سے دور دور کا بھی واسطہ نہ تھا ۔ ۸۸ یہ سب کچھ کانگریس ہائی کمان کی ہدایت اور اس کے مشیر اعلیٰ مہاتما گاندھی جی کے اس بیان کی تعمیل میں ہو رہا تھا جس میں انھوں نے کانگریس کی قرار داد کو پس پشت ڈال کر ” ہندوستانی “ کے بجائے ” ہندی “ کو قومی زبان کا نام دیا تھا ۔ مولوی عبدالحق بڑے دلچسپ انداز میں لکھتے ہیں کہ :

” میں ایک مدت تک اس الجھن میں رہا کہ کیا وجہ ہے کہ جب کانگریس نے اپنے ریزولیوشن اور اپنے دستور میں صاف طور سے یہ

۸۸ ۔ ہندوستانی اے پولیٹکل لینگوئسٹک کیچ ورڈ ، دین محمد ، امرتسر ، ۱۹۳۹ء ، ص ۵٦ تا ص ۵۸

اعلان کر دیا ھے کہ ھندوستان کی زبان " ھندوستانی " ھے تو پھر کانگریس حکومتوں کے وزرا اور کانگریس کے ارکان کیوں بار بار بجائے ھندوستانی کے ھندی کو ملک کی مشترک زبان قرار دیتے ھیں اور جتانے پر اور اپنی غلطی ماننے پر بھی کیوں اپنے اس خیال پر قائم ھیں اور جب موقع آتا ھے تو وہ اپنی تحریر اور تقریر میں ھندی ھی کا راگ الاپتے ھیں ۔ بہت دنوں کے غور کے بعد یہ راز کھلا اور وہ یہ کہ کانگریس سے بھی بالا ایک اعلیٰ ھستی ھے ۔ جس کے ایک اشارے ، ایک لفظ کے سامنے کانگریس کے تمام ریزولیوشن ، اس کا دستور اور اس کے ضوابط اور قواعد سب ھیچ ھیں ۔ گاندھی جی نے چونکہ ملک بھر میں ھندی کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ھے اس لئے کانگریس کا ھر وزیر اور ھر رکن وہ ھی کہتا ھے جو مہاتما گاندھی کہتے ھیں ، جو نیت امام کی وھی ان کی ۔ " ۸۹

اس تفصیل سے اندازہ کیا جا سکتا ھے کہ کانگریس کے دور حکومت میں اردو کو جان سے مار دینے کے لئے اسے کس کس طرح نرغے میں لیا گیا ، لیکن اپنی سخت جانی اور اپنے چاھنے والوں کی پاسبانی کے سبب وہ سارے خطرات سے بچ نکلی ۔ جس شدت اور تیزی سے اس پر حملے کئے گئے اسی شدت اور تیزی سے ان حملوں کی کاٹ کی گئی ۔ مولوی عبدالحق جامعہ عثمانیہ ، حیدرآباد کی پروفیسری چھوڑ کر اردو کی خاطر اورنگ آباد سے دھلی آ گئے سابقہ فیصلے کے مطابق انجمن ترقی اردو کا مرکزی دفتر بھی دھلی منتقل ھو گیا ۔ انجمن ترقی اردو مولوی عبدالحق کی معتمدی میں اردو کے لئے پہلے ھی سے بہت کچھ کر رھی تھی ۔ کانگریس راج میں اس کی سرگرمیاں اور بھی تیز ھو گئیں ۔ ذکر کیا جا چکا ھے کہ انجمن کی تنظیم نو کے سلسلے میں ۱۹۳۶ء میں بمقام علیگڑھ اس کا جلسہ ھو چکا تھا اور انجمن کے کام کی رفتار کو تیز تر اور بار آور بنانے کے لئے شعبہ جاتی کمیٹیاں قائم کی جا چکی تھیں ۔

۸۹ - اردو ، اپریل ۱۹۳۸ء ، ص ۴۷۱

انجمن کا مرکزی دفتر دھلی آ گیا تو اورنگ آباد کے مقابلے میں یہاں سے اردو کی ترویج و اشاعت کے کام کی نگرانی میں آسانی ہو گئی ۔

دھلی آ کر انجمن نے '' ھماری زبان '' کے نام سے ایک پندرہ روزہ اخبار نکالا ۔ رسالہ اردو پہلے ھی سے جاری تھا اور اردو ھندی قضیے کے متعلق پہلے ساری خبریں اسی میں التزام کے ساتھ چھپتی تھیں لیکن رسالہ اردو چونکہ سہ ماھی تھا اور تین چار مہینے کے بعد کہیں کوئی شمارہ منظر عام پر آتا تھا اس لئے اردو سے متعلق بیانات و واقعات بہت دیر سے دوسروں تک پہنچتے تھے '' اردو '' چونکہ خالص علمی و ادبی نوعیت کا پرچہ تھا اس لئے اس کے پڑھنے والوں کا حلقہ بھی محدود تھا ۔ نتیجتاً اردو کی اشاعت و مدافعت کے سلسلے میں اس کی کوششیں کچھ زیادہ کار گر ثابت نہ ھوتی تھیں ۔ ۱۹۳۷ء کے بعد کانگریس نے حکومت کے زعم میں اردو کے خلاف کچھ ایسا طوفان برپا کر رکھا تھا کہ اس سے لمحہ بہ لمحہ با خبر رھنے اور اردو کے حامیوں کو خبردار رکھنے کی سخت ضرورت تھی ۔ مولوی عبدالحق نے اسی ضرورت کے پیش نظر '' ھماری زبان '' جاری کیا ۔ اور بلا شبہ '' ھماری زبان '' نے اس ضرورت کو بدرجہ اتم پورا کیا ۔

ھماری زبان مہینے میں دو بار یعنی پہلی اور سولہ تاریخ کو پابندی سے نکلتا تھا اور اس میں اردو ھندی تنازع سے متعلق وہ ساری سرگرمیاں اور سارے واقعات اختصار کے ساتھ آ جاتے تھے جو برصغیر میں ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک سرکاری یا عوامی سطح پر رونما ھوتے تھے ۔ خاص بات یہ تھی کہ اردو اور ھندی دونوں کی مخالفت یا موافقت میں جو کچھ کہا یا لکھا جاتا تھا وہ سب کچھ اس میں چھپتا تھا ۔ اس سے فائدہ یہ ھوتا تھا کہ حالات کے صرف ایک رخ سے نہیں بلکہ دونوں رخ سے لوگ با خبر رھتے تھے اور نتائج کے اخذ کرنے میں آسانی ھو جاتی تھی مثلاً اردو ھندی کے بارے میں عام طور پر لوگ کس طرح سوچ رھے ھیں؟ '' ھندوستانی '' کے سلسلے میں ان کا کیا موقف ھے؟ مختلف صوبوں میں ھندی اردو کے لئے کیا کیا ھو رھا ھے؟ صوبائی حکومتوں کا طرز عمل کیا ھے؟ وھاں کے عوام کیا چاھتے

ہیں؟ اسمبلیاں اردو ہندی کے سلسلے میں کس قسم کی سرگرمیوں میں مصروف ہیں؟ وزرا کیا کر رہے ہیں؟ سرکاری سطح پر زبان کے مسئلے کو کس طرح حل کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے؟ عوام کے سوچنے کا انداز کیا ہے؟ کانگریس اور دوسری ہندو جماعتیں اردو کو کہاں کہاں اور کس کس طرح نقصان پہنچانے میں لگی ہیں؟ اور ہندی کی اشاعت و ترقی کے لئے کس طرح کام کیا جا رہا ہے؟ اس قسم کی ساری خبریں ہماری زبان میں پابندی سے چھپتی تھیں اور ان پر تبصرے اور تنقیدیں بھی شائع کی جاتی تھیں۔ اس سے یہ ہوا کہ مختلف صوبوں اور علاقوں کے اردو خواں طبقے میں باہم مشاورت، مواصلت، مراسلت اور اردو کے دفاع میں مشارکت و معاونت کی راہیں ہموار ہو گئیں۔ ایک صوبے کے لوگ دوسرے صوبے کے لوگوں کی مدد کو پہنچنے لگے اور اردو کے دفاع میں آسانی پیدا ہو گئی۔

دہلی پہنچ کر مولوی عبدالحق نے ”انجمن ترقی اردو“ کی بنیادیں پہلے سے زیادہ مضبوط کر دیں۔ اس کے بہی خواہوں، ہمدردوں، معاونوں اور مالی مدد گاروں میں بڑی تیزی سے اضافہ ہوا۔ رسالہ اردو بدستور جاری رہا۔ نئی کتابوں کی اشاعت کی تعداد سال بہ سال بڑھتی گئی انجمن کی مطبوعات کی مانگ بڑھ گئی اور اردو پڑھنے والوں کا حلقہ وسیع تر ہو گیا۔ انجمن کی شاخوں میں کئی گنا اضافہ ہوا اور انجمن کے سفیروں کی تعداد بھی پہلے سے زیادہ ہو گئی۔ خود مولوی عبدالحق انجمن کے سکریٹری کی حیثیت سے ملک کے گوشے گوشے میں پہنچے اور اس کا اردو کی اشاعت و مقبولیت پر بہت اچھا اثر پڑا، سید ہاشمی فرید آبادی نے صحیح لکھا ہے کہ:

> ”دہلی کا دور مولوی صاحب کے دوروں کی وجہ سے بھی انجمن کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔“۹۰

سلسلہ کچھ دن پہلے سے چل نکلا تھا مگر ریاست حیدرآباد سے باہر نکلنے کے بعد سارا برصغیر ان کی جولان گاہ بن گیا۔ غالب کے اس شعر کے

۹۰ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۱۱۶

مصداق -

مانع دشت نوردی کوئی تدبیر نہیں
ایک ہے چکر سرے پاؤں میں زنجیر نہیں

مولوی صاحب نے پشاور اور کراچی سے کلکتے اور ڈھاکے تک ہر جگہ کا سفر کیا اور بار بار کیا - دو تین سال کے اندر اندر انھوں نے کلکتہ ، الہ آباد ، علیگڑھ ، ناگ پور ، ترویتی (جنوبی ہند)، جموں ، تروندرم (جنوبی مدراس)، مدورا ، ترچنا پلی ، حیدرآباد ، لاھور ، کانپور ، پٹنہ ، دیناج پور (بنگال) جمشید پور ، رانچی ، گیا ، ٹونک ، رام پور ، اورنگ آباد ، بیجا پور ، شملہ ، کالی کٹ ، مدراس اور بہت سے غیر معروف قصبات و مقامات کا دورہ کیا ، بعض شہروں مثلاً پٹنہ ، علیگڑھ ، ناگپور ، لاھور ، الہ آباد اور مدراس وغیرہ تو انھیں کئی بار جانا پڑا - ۹۱

علاوہ ازیں جگہ جگہ اعلیٰ پیمانے پر اردو کانفرنسیں منعقد کی گئیں ، دارالمطالعے اور کتب خانے قائم ھوئے - ھندی کے حامیوں نے چونکہ صوبہ پنجاب اور سندھ کو خاص طور پر نشانہ بنا رکھا تھا اور ان کی کوشش یہ تھی کہ اردو کو پنجابی اور سندھی کی دشمن ثابت کرکے زبان کے مسئلے پر مسلمانوں میں افتراق پیدا کرا دیا جائے - اس لئے ان دونوں صوبوں کی انجمن ترقی اردو کو خاص طور پر فعال اور متحرک بنانے کی کوشش کی گئی - پنجاب میں ھمایوں کے مدیر میاں بشیر احمد نے اردو کے اشاعتی ، تبلیغی اور دفاعی کاموں میں خاص طور پر حصہ لیا - زبان کے مسائل خصوصاً ''ھندوستانی'' کے موضوع پر انھوں نے درجنوں اعلیٰ درجے کے مضامین شائع کئے - اردو ھندی کا انھوں نے سال بہ سال جائزہ لینا شروع کیا اور ھندی کے حامیوں کے بیانات و جارحانہ اقدامات پر تنقید و تبصرہ کا سلسلہ جاری رکھا ، ان کے بعض مضامین کا ذکر اس کتاب کے مختلف ابواب میں جابجا آ چکا ھے ، تفصیل کے لئے رسالہ اردو اور ھماری زبان کی فائلیں دیکھی جا سکتی ھیں - پنجاب میں

۹۱ - تفصیل کے لئے دیکھئے ''ھماری زبان''، ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۳ء

اردو کا دفاعی محاذ دوسرے صوبوں کے مقابلے میں یوں بھی بہت مضبوط تھا کہ وہ اردو کی اشاعت کا مرکز تھا ، بیشتر اردو اخبارات و رسائل وھیں سے نکلتے تھے اور بڑے بڑے اردو چھاپہ خانے بھی وھیں تھے - اردو کے ممتاز صحافیوں ، ادیبوں اور شاعروں مثلاً علامہ اقبال ، مولانا غلام رسول مہر ، مولانا عبدالمجید سالک ، مولانا ظفر علی خان وغیرہ کی ذات و صفات بھی اردو کے تحفظ میں معاون تھیں ، انجمن حمایت اسلام بھی اردو کے سلسلے میں چوکنا اور با عمل تھی - انجمن ترقی اردو نے پنجاب کے اس اردو ماحول کو اور بھی سرگرم کار و مستحکم بنا دیا -

سندھ میں البتہ خطرہ تھا کہ شاید هندی کے حامیوں کی سرگرمیاں کامیاب ہو جائیں - اس لئے کہ کراچی کے روزنامہ ” حیات “ کے حوالے سے یکم دسمبر ۱۹۳۹ء کے ” هماری زبان “ میں جو مضمون نقل هوا هے اس سے پتہ چلتا هے کہ هندوؤں کی کوششیں اس سلسلے میں بہت گہری اور وسیع تھیں - بقول هاشمی فرید آبادی ” بڑی چالاکی سے سندھی کو اردو کا مد مقابل بنانے کی تدبیر کی گئی اور کاکا کالیکر نے ۱۹۴۱ء میں ” دھوئیں کی آڑ میں “ میں سندھ پر حملہ کیا تھا -۹۲ لیکن کامیابی نہ ھوئی - بات یہ هے کہ کراچی میں انجمن ترقی اردو کی شاخ ۱۹۱۴ء سے قائم تھی اور اردو کے لئے برابر کام کر رهی تھی - ۱۹۴۰ء میں اس کی سلور جوبلی منائی گئی اور افسر امروهوی نے کتابی صورت میں اس کی روئداد شائع کی - سر عبداللہ هارون ، حاتم علوی ، خان صاحب فضل الٰہی ، پیر الٰہی بخش وغیرہ نے خاص طور پر انجمن کی امداد کی اور اس کے کام کو آگے بڑھایا - چنانچہ ان کی کوششوں اور مسلم لیگ کے بعض وزرا کی بر وقت توجہ اور اعانت کے سبب اردو کے خلاف هندی کے حامیوں کی چالیں کامیاب نہ ھوئیں -

دهلی میں انجمن کا مرکز قائم هونے کا ایک نہایت اهم پہلو یہ بھی هے کہ انجمن ترقی اردو اور مسلم لیگ میں قریبی رابطہ پیدا هو گیا - دونوں کو

۹۲ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ۱۳۸

ایک دوسرے سے زبان کے مسئلے پر مشورہ کرنے اور اتفاق رائے سے کسی فیصلے تک پہنچنے میں آسانی ہو گئی - مولوی عبدالحق کوئی سیاسی آدمی نہ تھے لیکن اردو کے ذریعے مسلمانوں کے ثقافتی آثار کو ہندو ثقافت کی زد سے بچانے کے لئے وہ جس قسم کی خدمات انجام دے رہے تھے وہ بجائے خود مسلم لیگ کی لسانی حکمت عملی کا ایک حصہ تھیں - اس لئے مسلم لیگ کے ارکان خاص اور مولوی عبدالحق کے درمیان رشتۂ اتحاد استوار ہونے میں دیر نہ لگی - خصوصیت سے قابل ذکر بات یہ ہوئی کہ قائد اعظم نے اپنی سیاسی بصیرت و فراست سے کام لے کر اردو کے تعلق سے مولوی عبدالحق کو مسلم لیگ کا ہم نوا بنا لیا - نواب صدیق علی خان نے لکھا ہے کہ :

> "مولوی عبدالحق ایک ایسے با عمل آدمی اور ایک ایسے اردو کے حامی تھے جنھوں نے اردو کو تقسیم ہند کا عظیم سبب بنا دیا - لوگ خود بخود ان کی طرف کھنچنے لگے - خاص بات یہ ہوئی کہ قائد اعظم نے مولوی عبدالحق کو ۱۹۳۷ء کے آل انڈیا اجلاس میں شرکت کرنے اور ہندی اردو کے مسئلے پر جلسے کو مخاطب کرنے کی دعوت دی تاکہ اراکین کونسل ، کوئی صائب رائے قائم کر سکیں - مولوی صاحب کو جو صرف ایک ڈگر پر چلنا جانتے تھے اپنا ہم نوا بنا لینا قائد اعظم کا ایک عظیم کارنامہ ہے - علاوہ ازیں قائد اعظم نے ان کو ہموار کرکے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو بھی بڑی تقویت پہنچائی - نیز اختلاف کے ایک ایسے دروازے کو بند کیا جس سے نکلی ہوئی آواز مسلم لیگ کے مفاد کو نقصان پہنچا سکتی تھی -" ۹۳

مسلم لیگ اور انجمن ترقی اردو کے اس اشتراک و اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں ایک طرف انجمن ترقی اردو نے مسلم لیگ کے ارکان اور اسمبلی کے

۹۳ - بے تیغ سپاہی ، ص ۱۴۷ تا ۱۴۸

دوسرے مسلمان ممبروں کے سلسلے میں اس قسم کی قراردادیں منظور کیں کہ :

۱ - ''یہ کانفرنس صوبائی اور مرکزی قانون ساز مجلسوں کے تمام اردو داں ارکان سے خاص طور پر گذارش کرتی ھے کہ وہ اپنی اپنی مجلس میں ھر موقع پر صرف اردو زبان میں تقریر فرمائیں اور اس طریق عمل کو زبان کی دشواری یا کسی قسم کی کسر شان کے خیال سے ترک نہ فرمائیں ۔ جبکہ اردو زبان کے استعمال کی کوئی قانونی مخالفت نہیں ھے ۔'' ۹۴

۲ - اس کانفرنس کے نزدیک نہ صرف لسانی بلکہ قومی خود مختاری کا تقاضا یہ ھے کہ ملک کے تمام قومی اور نیم سرکاری اور تجارتی اداروں میں جملہ مراسلات ، مباحث ، حسابات اور ھر قسم کے کاروبار میں جہاں تک ممکن ھو اردو زبان کا استعمال کیا جائے ۔'' ۹۵

وھاں مسلم لیگ کے ارکان نے بھی ذرا کھل کر اپنے موقف کو بیان کرنا شروع کیا چنانچہ مسلم لیگ کے پچیسویں اجلاس منعقدہ لکھنؤ پندرہ تا اٹھارہ اکتوبر ۱۹۳۷ء زیر صدارت قائد اعظم محمد علی جناح ، اردو کے بارے میں راجہ صاحب محمود آباد کی تجویز پر مندرجہ ذیل قرارداد اتفاق آرا سے منظور کی گئی ۔

'' اس خیال سے کہ اردو جو کہ اصلاً ایک ھندوستانی زبان ھے ۔ ھندو اور مسلمانوں کے ثقافتی ارتباط سے وجود میں آئی ھے ۔ ملک کے بیشتر حصے میں بولی جاتی ھے ۔ ھندو مسلم قومیت کے فروغ کے لئے موزوں ترین ھے اور جس کی جگہ ھندوستانی کے نام سے ھندی کو رواج دینے کی کوشش '' اردو کے اساسی ڈھانچے ھی کو بگاڑ

۹۴ - روئیداد کل ھند اردو کانفرنس ، دھلی ، ۱۹۳۹ء ، ص ۶۵

۹۵ - روئیداد کل ھند اردو کانفرنس ، دھلی ، ۱۹۳۹ء ، ص ۶۹

کر رکھ دے گی اور ہندو مسلم اتحاد پر بہت خراب اثر ڈالے گی۔ آل انڈیا مسلم لیگ ملک کے سارے اردو بولنے والوں کو توجہ دلاتی ہے کہ وہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے سارے اداروں اور دفتروں میں اپنی زبان کے مفادات و حقوق کے تحفظ کی ہر ممکن کوشش کریں، جہاں اردو علاقائی زبان کی حیثیت رکھتی ہو وہاں اس کے آزادانہ استعمال و ترقی کی راہیں ہموار کریں اور جن علاقوں میں اردو کو کوئی نمایاں مقام نہ حاصل ہو وہاں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اس کی تعلیم اور سرکاری دفتروں، عدالتوں، اسمبلیوں اور مواصلاتی شعبوں میں اس کے استعمال کو حکومت سے منوائیں۔ کوشش یہ ہونی چاہئے کہ اردو ایک ہمہ گیر زبان بن جائے۔"۹۶

۱۷-۱۸ اپریل ۱۹۳۸ء کلکتے میں آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک خصوصی اجلاس منعقد ہوا۔ اس کی صدارت کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا:

"کانگریس کی ساری قراردادیں جن میں کہا گیا ہے کہ مذہبی، ثقافتی اور لسانی امور کو آئین میں بنیادی حقوق کی حیثیت حاصل رہے گی، محض کاغذی ہیں۔

اس میں ذرہ بھر شک نہیں ہے کہ جس وقت سے کانگریس کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آئی ہے۔ کانگریس نے اس سلسلے میں بڑا ہی تشدد آمیز طرز عمل اختیار کر رکھا ہے۔ انہوں نے اسمبلیوں میں "بندے ماترم" کو رواج دینے پر زور دیا اور بڑی مشکلوں سے اسے روکا جا سکا۔ وہ ہندی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے اپنی تعلیمی پالیسی میں جگہ دے رہے ہیں جس کا اثر اگر کلی طور پر تباہ کن ثابت نہ ہوا تو بھی اردو کی ترقی پر بری طرح اثر انداز ہوگا اور اس کی ترویج میں حد درجہ خلل ڈالے گا لیکن اس سے زیادہ

۹۶ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص ۲۷۹

خطرناک چیز یہ ہے کہ جس قسم کی سنسکرت آمیز اور ہندو فلسفہ سے لبریز، ہندی پڑھائی جا رہی ہے وہ مسلمان بچے اور بچیوں کے ذہنوں پر بھی لاد دی جائے گی۔" ۹۷

اسی طرح پراونشل ایجوکیشنل کانفرنس کے پندرھویں اجلاس میں جو کہ ۹-۱۰ اپریل ۱۹۳۹ء کو علیگڑھ میں منعقد ہوا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان، ایم۔ ایل۔ اے نے اپنے خطبۂ صدارت میں ہندی اور ہندوستانی کے مسئلے کا ذکر کرتے ہوئے کہا:

"اردو اور ہندوستانی کا مسئلہ بہت صاف ہے اس پر بحث اور استدلال بہت ہو چکا۔ ہم خوب سمجھتے ہیں کہ ہم کیا چاہتے ہیں اور ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ کانگریس کی نیت کیا ہے۔ لفظی بھول بھلیوں سے اب ہمیں باہر نکل آنا چاہئے نہ ہم دھوکا دینا چاہتے ہیں اور نہ دھوکا کھانا چاہتے ہیں۔ صاف اور سیدھی بات یہ ہے کہ ہم اردو بولیں گے اور لکھیں گے۔ اپنے بچوں کو اردو میں تعلیم دیں گے اور اپنی زبان کو سوائے اردو کے اور کچھ نہیں کہیں گے۔ ہم نے اس ہندوستان کی خاطر اور ہندوؤں کی خاطر عربی چھوڑی، ترکی چھوڑی اور وہ زبان اختیار کی جو اس ملک میں بنی ہے اور سوائے اس ملک کے کہیں اور بولی اور لکھی نہیں جاتی۔ اب ہم سب سے کہا جاتا ہے کہ ہم والمیک کی زبان بولیں۔ ہم نہ بولیں گے۔ ہم ہندو مسلم اتحاد کی خاطر بہت آگے بڑھ چکے اب نہ بڑھیں گے جسے ہم سے ملنا ہو یہاں آ کر ملے۔ ہم اپنی آخری حد پر کھڑے ہیں۔" ۹۸

زبان کے باب میں انجمن ترقی اردو مسلم لیگ اور اردو کے عام حامیوں کی متحدہ کوششوں اور اپنے موقف پر سختی سے قائم رہنے کی حوصلہ مندیوں

۹۷ - فاؤنڈیشن آف پاکستان، جلد دوم، ص ۲۹۴

۹۸ - ہماری زبان، یکم مئی ۱۹۳۹ء، ص ۱۵

کا یہ اثر ہوا کہ اگرچہ ہندی کو قومی زبان بنانے کے سلسلے میں کانگریس کے عزائم وہی رہے لیکن عملی اقدامات کرنے کی ہمت بہت کچھ پست ہو گئی۔ ۱۹۳۹ء کے آخر میں جب کانگریسی وزارتوں کو مستعفی ہونا پڑا تو اقتدار کا وہ زعم بھی باقی نہ رہ سکا۔ جس کی بنا پر اردو کو ختم کرنے کے منصوبے بنائے گئے تھے۔ اب صورت حال بدلی ہوئی تھی، لیکن مہاتما گاندھی بہت بڑے سیاستدان تھے۔ زبان کے سلسلے میں زیادہ الجھاوے انہیں کے پیدا کردہ تھے۔ سمپورنا نند جی، پرشوتم داس ٹنڈن، کاکا کالیکر اور مدن موہن مالویہ جو کچھ ہندی کے لئے کر رہے تھے، وہ بالاعلان کر رہے تھے اور ہندی کو اردو پر ترجیح دیتے ہوئے صاف کہتے تھے کہ ہندی ہی کو ہندوستان کی قومی زبان بنایا جائے۔ گاندھی جی بھی یہی چاہتے تھے لیکن ایسی ہوشیاری اور چالاکی کے ساتھ کہ مسلمان، کانگریس میں مدغم ہو کر اسے ہندوستان کی واحد قومی نمائندہ جماعت خیال کرنے لگیں اور دو قومی نظریے سے دست بردار ہو کر متحدہ قومیت اور متحدہ ہندوستان کے حامی بن جائیں۔ اسی خاص غرض سے پہلے انہوں نے کانگریس سے یہ قرارداد منظور کروائی کہ ہندوستان کی آئندہ قومی زبان "ہندوستانی" ہوگی جو اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھی جائے گی پھر ہندوستانی کو "ہندی ہندوستانی" کا نام دیا اور آخر آخر "ہندی" کا پرچار کرنے لگے۔ حتیٰ کہ کانگریس وزارت کے خاتمے کے وقت تک یعنی دسمبر ۱۹۳۹ء میں کل ہندی اردو کانفرنس دھلی کے لئے انہوں نے جو خط لکھا تھا اس میں بھی ہندی کو ہندوؤں کی اور اردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا تھا۔۹۹ اور ہر طرف سے اس پر لے دے ہوئی تھی۔ گاندھی جی ایک طرف ہندی ساہتیہ سمیلن، ہندی پرچارنی سبھا اور بھارتیہ ساہتیہ پریشد وغیرہ کے جلسوں کی صدارت کرتے ان کے کارکنوں کو مشورہ دیتے اور ہندی کی مقبولیت و اشاعت کے لئے تقریریں کرتے، مضامین لکھتے اور ہندی کے حامیوں سے یہ کہتے کہ ہندوستان کی قومی زبان صرف ہندی ہوگی۔ دوسری طرف مسلمانوں کو دھوکا

۹۹ - ہماری زبان، ۱۶ جنوری ۱۹۴۶ء، ص ۶

دینے کے لئے کانگریس کی قراردادوں میں '' هندی '' کے بجائے '' هندوستانی '' درج کرواتے ۔ ان کا یہ طرز عمل آخر تک قائم رہا ۔ چنانچہ ۱۹۳۹ء میں کانگریس حکومتوں کے خاتمے کے بعد جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ پاکستان کا مطالبہ روز بروز زور پکڑتا جا رہا ہے اور اردو کے حامی کسی قیمت پر بھی '' هندی '' کو قومی زبان بنانے پر رضا مند نہ ہوں گے تو انہوں نے پھر پینترا بدلا اور بظاہر '' هندی ساهتیہ سمیلن '' اور بھارتیہ ساهتیہ پریشد کو چھوڑ کر هندی کے بجائے '' هندوستانی '' کا دوبارہ دم بھرنے لگے ۔ اب انہوں نے '' هندوستانی پرچار سبھا '' کے نام سے ایک اور انجمن کی بنا ڈالی اور از سر نو اس بات کا تکرار کے ساتھ اعلان شروع کیا کہ هندوستانی کو اردو اور ناگری دونوں رسم الخطوں میں لکھا جائے گا اور '' هندوستانی '' هی کو قومی زبان بنایا جائے گا ۔ یہ کام گاندھی جی نے ۱۹۴۲ء میں اس وقت شروع کیا تھا جبکہ کانگریس حکومت کے مظالم کے سبب هندو اور مسلمانوں کے باهمی اختلافات آخری حدوں کو پہنچ رہے تھے اور تحریک پاکستان نے ایسی قوت پکڑ لی تھی کہ اسے منزل تک پہنچنا آسان هو گیا تھا ۔ جی رام ناتھن نے وضاحت سے لکھا ہے کہ :

> When he found that his dream of a fusion between Hindi and Urdu did not promise immediate realization, he had to content himself with the thought that Hindi and Urdu would for the time being continue as two languages and that by the efforts of scholars in both languages a resultant language would emerge. He continued to exhort the people to learn both the languages and both their corresponding scripts, Nagari and Persian.
>
> The term Hindustani came to be used exclusively to denote the common language, distinct from both Hindi and Urdu. By 1942 this concept was clearly defined in the constitution of the Hindustani Parchar Sabha formed in that year:
>
> The controversy reached its finale in 1945 when Gandhiji broke his connection with the Hindi Sahitya Sammelan.

He realized that his definition of Hindi was not really accepted by the Sammelan. The Sammelan had organized a subordinate body known as Rashtrabhasha Prachar Samithi to propagate Hindi as the national language throughout the country. There was a confusion of thought as to what this body aimed at and what the Hindustani Parchar Sabha founded by Gandhiji aimed at. Gandhiji wanted to clarify that though the Hindi Sahitya Sammelan was mainly concerned with Hindi its subordinate wing, the Samithi, was concerned with Hindustani and thus to ensure that there was no conflict between the activities of the two bodies. He therefore wrote to Purshothamdas Tandon seeking a clarification. Tandon's reply brought out their difference in clear relief.

In that reply he said:

The Sammelan holds Hindi to be the national language. It regards Urdu as a particular form of Hindi prevailing among a certain section of the people.

The Sammelan works for the propagation of the more generally prevalent form of Hindi; it does not concern itself with the Urdu form.[99a]

جے۔ داس گپتا نے بھی کم و بیش اسی طرح کا اظہار خیال کیا ہے۔ ان کے الفاظ میں :

It is in this context that the intensification of the language politics in Uttar Pardesh during this and the subsequent periods can be appreciated. The leaders of the Congress ministry were now eager to introduce Hindi with the official help of their newly acquired political power. As a first step, they introduced the study of Hindi in schools. The Hindi movement, as well as the Hindi elite, now came to feel an

۹۹ (الف) - ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹیگریشن ، ص ۱۲۴ تا ص ۱۲۵

exaggerated sense of importance and power. At the same time, this new feeling contributed to an intensification of the conflict between the different factions within the Hindi movement. The leading center of this conflict was the Hindi Sahitya Sammelan. After 1935, Gandhi faced a stiff opposition from the powerful faction led by P.D. Tandon.

In 1942 Gandhi gave up the hope of utilizing the Sammelan and resigned from its leadership, though he did not give up his membership. The same year, together with Nehru and Parsad, he established the Hindustani Parchar Sabha for the dissemination of Hindustani, which would serve, he thought, as the medium of contact and intercourse between various provinces with different provincial languages, and which might come to be used throughout India for social, political, administrative, and other such purposes of the nation. The new organization did not succeed appreciably in winning the bases of support that were built by the Sammelan.[100]

ہندوستانی پرچار سبھا دو سال تک کوئی کام نہ کر سکی اس لئے کہ ۱۹۴۲ء میں یعنی جس سال ہندوستانی سبھا قائم ہوئی، کانگریس کو حکومت نے خلاف قانون جماعت قرار دے دیا۔ اس کے اکثر اکابر و رہنما قید کر دئے گئے اور تقریباً دو سال بعد انھیں نجات ملی۔ مسلم لیگ نے اپنی تنظیم کا کام ۱۹۳۶ء ھی سے شروع کر رکھا تھا۔ کانگریس حکومت کے دور میں اس میں ایسی جان پیدا ہو گئی کہ ۱۹۴۴ء تک وہ ایک طاقتور حریف کی حیثیت سے کانگریس کے سامنے آ گئی۔ اب کانگریس کے رہنماؤں نے اپنا سارا زور دو قومی نظریے کی تردید میں صرف کیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد کو کئی سال تک کانگریس کا صدر بنائے رکھا گیا اور جمعیت العلمائے ہند کو بھی دو قومی نظریے کی تردید اور متحدہ قومیت کی تبلیغ پر مامور کیا گیا۔ ادھر گاندھی نے اپنے پرانے حربے یعنی ”ہندوستانی“ کی تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں کو پھر

۱۰۰- لینگوئج کنفلکٹ اینڈ نیشنل ڈیولپمنٹ، ص ۱۱۸ تا ص ۱۱۹

کانگریس کے چنگل میں پھنسانے کی کوشش شروع کر دی ۔ ہندوستانی پرچار سبھا کا ایک بڑا جلسہ ۲۶ ، ۲۷ فروری ۱۹۴۵ء کو واردھا میں منعقد کیا گیا ۔ اس میں مختلف زبانوں کے ادیبوں اور مصنفوں کے ساتھ ساتھ اردو والوں خصوصاً انجمن ترقی اردو کے سکریٹری مولوی عبدالحق کو بھی شرکت کی دعوت دی گئی ۔ مولوی صاحب اس خیال سے کہ یہ گاندھی کی وھی پرانی چال ھے اور اس کا کوئی نتیجہ نہ نکلے گا جلسے میں شرکت کے لئے تیار نہ تھے لیکن جب ڈاکٹر تارا چند اور پنڈت سندر لال وغیرہ کے ذریعے ان پر زور ڈلوایا گیا تو اس کے آخری اجلاس میں شریک ہوئے ۔ لیکن سبھا کا ممبر بننا منظور نہیں کیا ۔۱۰۱ اس جلسے میں مولوی عبدالحق نے مختصر سی تقریر کرتے ہوئے کہا :

” بھارتیہ ساھتیہ پریشد کے اجلاس ناگپور (۱۹۳۶ء) میں میری تحریک یہی تھی کہ ہندوستانی اختیار کی جائے ۔ گاندھی جی نے اسے رد کر دیا ۔ آج دس برس بعد وھی تجویز خود پیش کر رہے ھیں ۔ اگر اس وقت منظور کر لیتے تو یہ دس سال کا نقصان نہ ھوتا ۔ “

اس کے جواب میں گاندھی جی نے اپنی آخری تقریر میں کہا :

” میں نے ۱۹۳۶ء میں مولوی صاحب کو دوست کرکے بلایا تھا وہ دشمن ھو کر گئے ۔ غلطی میری تھی میں ان کی بات کو نہیں سمجھا ، آج میں اپنی غلطی کا کفارہ ادا کر رھا ھوں ۔ “ ۱۰۲

گاندھی جی نے البتہ یہ کیا کہ ” ہندوستانی پرچار سبھا “ کے صدر بن گئے اور ہندی ساھتیہ سمیلن سے مستعفی ھو گئے ۔ سمیلن سے اختلاف اور استعفے کا سبب یہ تھا کہ ہندی ساھتیہ سمیلن نے اسی اثنا میں ” راشٹر بھاشا پرچار سمیتھی “ کے نام سے اپنی ذیلی انجمن بنا لی تھی اور اس کا خاص کام ہندی کا پروپیگنڈا تھا ۔۱۰۳ گاندھی جی کے ” ہندوستانی “ کی طرف رجعت

۱۰۱ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ۱۶۰

۱۰۲ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو ، ص ۱۶۱

۱۰۳ - ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ نیشنل انٹیگریشن ، ص ۱۲۵

کرنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو والے تو ان کی اس تحریک کو ایک سیاسی چال سمجھ ہی رہے تھے ہندی کے حامیوں نے بھی گاندھی جی کو طنز و تعریض کا نشانہ بنایا۔ سمیلن کے صدر ٹنڈن نے شکایت بھرے خطوط لکھے اور بعض نے معترضانہ مضامین شائع کئے۔ اس پر گاندھی جی نے انھیں یقین دلایا کہ وہ اب بھی ہندی کے ویسے ہی در پردہ حامی ہیں جیسے پہلے تھے۔ گاندھی جی کی سازش کا یہ راز اس وقت کھلا جب ''ہندوستان اسٹینڈرڈ'' اور ''امرت بازار پتریکا'' میں ان کا ایک خط مندرجہ ذیل فقروں کے ساتھ شائع ہوا:

''میں نے کوئی نئی راہ نہیں اختیار کی۔ بات یہ ہے کہ کبھی ایسا وقت ہوتا ہے جب کسی جماعت سے باہر رہ کر اس کی بہتر خدمات انجام دے سکتا ہوں اور کبھی اندر رہ کر۔ میں اب ہندی ساہتیہ سمیلن سے باہر رہ کر اس کی زیادہ خدمت کر سکتا ہوں۔'' ۱۰۴

مولوی عبدالحق نے اس خط کے حوالے سے لکھا ہے کہ ممکن ہے مہاتما جی مسٹر ٹنڈن کو بھی دم دلاسا دینا چاہتے ہوں، لیکن اسی سال ان کا ''ہریجن سیوک'' جو اردو رسم خط میں ان کی ہندوستانی کا نمونہ بن کر شائع ہوا، اس کی زبان بھی وہی مصنوعی اور نا مانوس ہندی میں پائی گئی۔ ہندو مسلمان سبھی اردو شناسوں نے اس نئی انشا پردازی کی مذمت کی۔ ۱۹۴۶ء کے ''ہماری زبان'' ہی میں بیسیوں مضمون اور مراسلے مخالفت میں چھاپے گئے۔ ۱۰۵

ہندی اردو نزاع سے متعلق یہ بحث مباحثے جاری تھے کہ حکومت نے اس منشا کا اظہار کیا کہ وہ ہندوستان کو جلد سے جلد آزاد کر کے اس کا اقتدار مقامی باشندوں کو سونپ دینا چاہتی ہے چنانچہ ویول پلان اور کابینہ مشن کے نام سے آئینی آزادی کی ہیئت متعین کرنے کے لئے بعض تجویزیں سامنے لائی گئیں۔ لیکن مسلم لیگ اور کانگریس کا ان تجویزوں پر اتفاق رائے

۱۰۴۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۱۶۱

۱۰۵۔ پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص ۱۶۲

نہ ہو سکا۔ آخر کار ۱۹۴۵ء کے آخر میں مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز کے لئے انتخابات منعقد ہوئے۔ جنوری ۱۹۴۶ء میں نتائج کا اعلان ہوا۔۱۰۶ مسلم لیگ کو غیر معمولی اور حیرت انگیز کامیابی حاصل ہوئی۔ سیاست کا رخ بدل گیا۔ اب پانسہ کانگریس کے ہاتھ میں نہیں مسلم لیگ کے ہاتھ میں تھا۔ جون ۱۹۴۶ء میں وائسرائے نے ایک بیان کے ذریعے اس بات پر زور دیا کہ بلا تامل و تاخیر نمائندہ ہندوستانی حکومت کا قیام ضروری ہے۔ اس کے ساتھ ہی وائسرائے نے چودہ ممتاز سیاسی رہنماؤں کو مرکزی کابینہ میں شمولیت کے لئے دعوت نامے جاری کر دئیے ان چودہ میں ایک سکھ، ایک عیسائی، ایک پارسی، ایک اچھوت اور پانچ پانچ ارکان کانگریس اور مسلم لیگ سے تھے۔ کانگریس نے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا۔ حکومت نے کانگریس کے اس اقدام سے مرعوب ہو کر پنڈت جواہر لال نہرو سے بات چیت کر کے بارہ آدمیوں پر مشتمل ایک نئی کابینہ تشکیل دی، جس نے یکم ستمبر ۱۹۴۶ء کو حلف وفاداری اٹھایا۔ مسلم لیگ نے البتہ اس نئی کابینہ کا بائیکاٹ کیا اور ۱۶ اگست ۱۹۴۶ء کو راست اقدام منانے کا اعلان کیا اسی اثنا میں کانگریس نے مسلم لیگ اور مسلمانوں کے خلاف ایسا اشتعال انگیز رویہ اختیار کیا کہ سارے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ چار و ناچار ۲۶ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو مسلم لیگ نے بھی عبوری کابینہ میں شرکت منظور کر لی۔ لیکن دستور ساز اسمبلی کے بائیکاٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان کشمکش جاری ہی تھی کہ برطانوی حکومت نے ۲۰ فروری ۱۹۴۷ء کو یہ اعلان کیا کہ چند مہینوں کے اندر اندر اقتدار بہر حال ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں منتقل کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ۳ جون ۱۹۴۷ء کو اقتدار کی منتقلی کے منصوبے کا اعلان ہو گیا۔ ریڈ کلف جیسے انصاف دشمن ثالث نے ہندوستان کی تقسیم اور سرحدوں کے تعین کا کام انجام دیا اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ”پاکستان“ ایک نئی آزاد اسلامی مملکت کی حیثیت سے وجود میں آ گیا۔ گویا اردو ہندی

۱۰۶ - پاکستان منزل بہ منزل، ص ۲۸۶

تنازع کے حوالے سے سرسید احمد خاں نے ۱۸٦۷ء میں ان الفاظ کے ساتھ :

''مجھے یقین ہے کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا محال ہے ۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا ۔''۱۰۷

جو پیشین گوئی کی تھی وہ اسی (۸۰) سال بعد پوری ہوئی ۔

۱۰۷ - حیات جاوید ، ص ۱٦۳ ، ۱٦۴

ضمیمے

ہندی اردو تنازع سے متعلق اہم دستاویزیں

(۱)

۲۰ نومبر ۱۸۳۷ء کے قانون کی وہ دفعات جن کے تحت فارسی کو سرکاری اور عدالتی دفتروں سے خارج کر دیا گیا۔

1. It is hereby enacted, that from the First day of December 1837, it shall be lawful for the Governor General of India in Council, by an Order in Council, to dispense, either generally or within such local limits as may to him seem meet, with any provision of any Regulation of the Bengal Code which enjoins the use of the Persian language in any Judicial proceeding or in any proceeding relating to the Revenue, and to prescribe the language and character to be used in such proceedings.
2. And it is hereby enacted, that from the said day it shall be lawful for the said Governor General of India in Council, by an Order in Council, to delegate all or any of the powers given to him by this Act, to any Subordinate Authority, under such restrictions as may to the said Governor General of India in Council seem meet."[1]

(۱) یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ یکم دسمبر ۱۸۳۷ء سے گورنر جنرل کشور ہند با اجلاس کونسل اس امر کے مجاز ہوں گے کہ بہ اتباع حکم مجریہ کونسل تمام ملک کے لئے عموماً جہاں وہ مناسب خیال فرمائیں ضابطہ بنگال کی اس دفعہ کو کالعدم قرار دے دیں - جس کی

۱ - دی کراچی لا جرنل (ایس - ایم لا کالج ، کراچی)، شمارہ نمبر ۱ ، جلد اول ، ۱۹۶۴ء ، ص ۴

رو سے فارسی زبان کا استعمال عدالتی کارروائی میں یا مالی معاملات کی کارروائی میں قانوناً لازمی ھے اور اس کی جگه کسی زبان یا رسم الخط کو ان تمام کارروائیوں کے لئے مقرر کر سکتے ھیں -

(۲) نیز تاریخ مذکورہ سے اس اعلان کے ذریعے یه بھی قانوناً لازمی قرار دیا ھے که گورنر جنرل به اجلاس کونسل وہ تمام اختیارات جو قانوناً ان کو تفویض کر دے گئے ھیں وہ ایسی پابندیوں کے تحت جو گورنر جنرل به اجلاس کونسل خیال کریں اپنے کسی ماتحت کو منتقل کر سکتے ھیں - ۲

۲ - انگریزوں کی لسانی پالیسی ، ص ۷۹

(۲)

کلکتے کی صدر عدالت دیوانی اور نظامت کی وہ مشترک قرارداد جو ۱۹۳۹ء میں منظور کی گئی اور جس کی رو سے فارسی کے بجائے اردو کو رواج دیا گیا:

(a) The Court resolve, with the sanction of His Honour the Deputy Governor, that the Oordoo language shall in future be the language of record in all proceedings and orders in the Sudder Dewanny and Nizamut Adawlut, at the Presidency and that the same shall be written in the Persian Character.

(b) The Proceedings and papers in all civil cases transmitted to this court, which may be written either in the Persian, Oordoo or Bengalee language, shall be unaccompanied by translations; but criminal trials referred to the Nizamut Adawlut, with exception to trials for the crime of Thuggee, all papers which may not be drawn up in the Persian or Oordoo Languages shall be accompanied by translation in the Oordoo.

(c) All papers in the Mogh, Orissa and other dialects shall be accompanied by Oordoo translation.

(d) The authorities in the Bengal districts shall correspond with each other in the vernacular language, and employ the Oordoo in their correspondence with the Courts of other Districts the same rule shall be observed mutatis mutandis in Cuttack and the other provinces subject to the jurisdiction of this court.[1]

(اردو ترجمہ)

(۱) عالی مرتبت ڈپٹی گورنر کی منظوری سے عدالت قرار دیتی ہے کہ آئندہ سے صدر دیوانی اور نظامت عدالت برائے کلکتہ . . . اپنی تمام

۱ - دی کراچی لا جرنل (ایس۔ ایم لا کالج، کراچی میگزین)، شمارہ نمبر ۱، جلد اول، ۱۹۶۳ء، ص ۵

عدالتی کارروائیوں اور اجرائے احکام میں اردو زبان استعمال کرے گی۔

(۲) تمام دیوانی مقدمات کی کارروائیاں اور دستاویزات جو اس عدالت میں پیش کئے جائیں اور جو فارسی یا اردو یا بنگلہ زبان میں لکھے ہوئے ہوں ان کے ساتھ ترجموں کی ضرورت نہیں ہوگی۔ لیکن فوجداری مقدمات میں جو نظامت عدالت کو بھیجے جائیں بجز ٹھگی، جرائم کے مقدمات کی تمام مسلیں جو فارسی میں تحریر شدہ ہوں ان کا اردو ترجمہ ساتھ پیش ہوگا۔

(۳) موگھ، اڑیا اور دیگر بھاشاوں میں جو مسلیں ہوں ان کا اردو ترجمہ بھی اصل کاغذات کے ساتھ منسلک ہوگا۔

(۴) اضلاع بنگال کے افسران آپس میں دیسی زبان کے ذریعے مراسلت کریں گے اور دیگر اضلاع کی عدالتوں سے جو مراسلت ہوگی اس میں بھی اردو ہی استعمال ہوگی۔ اسی قانون کا اتباع کٹک اور دوسرے صوبوں سے مراسلت کرنے میں بھی کیا جائے گا بشرطیکہ وہ اسی عدالت کے تحت ہوں۔۲

۲۔ انگریزوں کی لسانی پالیسی، ص ۸۰

(۴)

ہندی اردو قضیہ ، دو قومی نظریہ اور سر سید احمد خاں

جب ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعضِ سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی خط کے موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے تو سر سید نے کہا :

''یہ پہلا موقع تھا جب مجھے یقین ہو گیا تھا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لئے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے ۔ انہیں دنوں میں جب کہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ۔ ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے ، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے ۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ ، عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کیا کرتے تھے ۔ میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں ، بڑھتا نظر آتا ہے ۔ جو زندہ رہے گا وہ دیکھے گا ۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ کی یہ پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے ۔ میں نے کہا ، مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے ۔''[1]

۱ ۔ حیات جاوید ، مولانا الطاف حسین حالی ، آئینہ ادب ، لاھور ، ۱۹۶۶ء ، ص ۱۶۳ ، ۱۶۴

(۴)

لندن سے ۲۲ اپریل ۱۸۷۰ء کا مرقومہ نواب محسن الملک کے نام سر سید احمد خاں کا ایک خط

ایک اور مجھے خبر ملی ھے جس کا مجھے کمال رنج اور فکر ھے کہ بابو شیو پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ھندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ھے کہ زبان اردو و خط فارسی جو مسلمانوں کی نشانی ھے مٹا دیا جائے۔ میں نے سنا ھے کہ انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی کے ھندو ممبروں سے تحریک کی ھے کہ بجائے اخبار اردو، ھندی ھو۔ ترجمہ کتب بھی ھندی میں ھو۔ یہ ایک ایسی تدبیر ھے کہ ھندو مسلمان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ھرگز، ھندی پر متفق نہ ھوں گے اور اگر ھندو متحد ھوئے اور ھندی پر اصرار کیا تو وہ اردو پر متفق نہ ھوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ھوگا کہ ھندو علیحدہ اور مسلمان علیحدہ ھو جائیں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بلکہ میں سمجھتا ھوں کہ اکثر مسلمانوں کو زیادہ فائدہ ھوگا اور ھندو نقصان میں رھیں گے۔[1]

۱۔ سر سید احمد خان کے خطوط، مرتبہ وحید الدین سلیم، حالی پریس، پانی پت، ۱۹۰۱ء، ص ۵۹

(۵)

سر سید احمد خاں کی مجوزی اردو یونیورسٹی کی درخواست

سر سید احمد خاں نے اردو یونیورسٹی کے قیام کے لئے ، برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے جو درخواست ۱۸۶۷ء میں حکومت کو بھجوائی تھی اس کے چند اجزا :

ہم برٹش انڈین ایسوسی ایشن شمال و مغرب ، جن کی دستخط اس عرضداشت کے ذیل میں ثبت ہیں بہ دل و جان گورنمنٹ کی ان سخت کوششوں سے بخوبی واقف اور ان کی قدر و منزلت کرنے والے ہیں جو اس نے ہندوستانیوں کی عام تعلیم کے باب میں کی ہے اور ان کے عوض میں ہم سب پر گورنمنٹ کی نہایت بڑی احسان مندی واجب اور لازم ہے۔ ہم کو اچھی طرح یقین ہے کہ گورنمنٹ نے اس تعلیم کے کام کو نہایت خالص نیت اور بالکل بے غرضی سے اختیار کیا ہے۔ تعلیم سے گورنمنٹ کا اصلی مقصود بالکل لوگوں کی بہبودی اور فلاح ہے ۔ وہ اپنی رعایا کی حالت کو ترقی دینے کے باب میں ہمیشہ ساعی رہتی ہے ۔

اس یقین کے مستقل اثر سے جو ہمارے دلوں پر اچھی طرح نقش پذیر ہو گیا ہے ۔ پیش گاہ حضور میں ایسی چند تدبیریں پیش کرنے کے لئے ہماری ڈھارس بندھی ہے ، جس کا عمل درآمد ہو جانے پر ہم کو کامل بھروسہ ہے کہ اس موجودہ سرشتۂ تعلیم سے لوگوں کو حد سے زیادہ فائدہ حاصل ہوگا اور ہم کو بہت بڑی توقع ہے کہ گورنمنٹ کمال فیاضی سے ان تدبیروں پر از بس سنجیدہ اور پسندیدہ توجہ فرمائے گی ۔

بالفعل بڑے بڑے علموں سے صرف زبان انگریزی کے ذریعہ سے واقفیت حاصل ہو سکتی ہے اور یہی بات ایسی ہے جس کے سبب سے ملک میں مفید علموں کے عموماً جلد شائع ہونے میں بڑے بڑے موانع اور ہرج واقع ہوتے ہیں اور اس کے باعث سے لوگوں کی رائے اور خیالات سے بہتر تبدیلی ہونے میں توقف ہوتا ہے اور عام تعلیم مضمحل اور پژمردہ ہو گئی ہے اور چند لوگ ایسے

ذریعہ سے جس تک رسائی مشکل ہے اس علم کے ثمروں کو حاصل کر سکتے ہیں جس تک سب کی رسائی آسان اور سہل ہونی چاہئے ۔

تعلیم جو اب ترقی کرنے سے تھکی ہوئی ہے اس کی اس حالت کے اور بھی کئی باعث ہیں جن میں سے سب سے بڑا باعث یہ ہے کہ صرف انگریزی کے تحصیل کے ذریعہ سے جیسے کہ اب مروج ہے علی العموم ہر ایک طالب علم باستثنائے بعض طالب علموں کے علم کے اس قدر درجہ بااخلاق اور سیرت کے اس قدر مرتبہ کو نہیں پہنچتا یا اس کی ذات سے ظاہر نہیں ہوتا ۔ جس کی لوگ تعظیم و تکریم حرص و تقلید کریں یا جس سے ان کے والدین کو یہ معلوم ہووے کہ انھوں نے نہایت اعلیٰ درجہ کی تعلیم پائی ہے ۔ البتہ سینکڑوں میں سے ایک کا اس درجہ کی عظمت تک پہنچنا ممکن ہے جس کی بڑی خواهش کی جاتی ہے مگر ایسے طالب علم کی تعداد بہت خفیف اور تھوڑی ہے اور ہزاروں جاهلوں پر جو ان کے گرد و پیش موجود ہیں کچھ اثر ان کا نہیں ہوتا ۔ اس نقصان کے علاج کی غرض سے ہم اپنی تجویزیں پیش کرنے کے آرزو مند ہیں ۔ ہماری خواهشیں یہ ہیں کہ جو کوششیں انگریزی زبان کی اشاعت کے لئے بالفعل کی جاتی ہیں وہ جاری رہیں بلکہ ان کو وقتاً فوقتاً ترقی ہوتی رہے مگر ایک اور طریقۂ تعلیم کا جو عام تعلیم کی ترقی کے لئے زیادہ موثر تصور کیا جاتا ہے ۔ قائم اور جاری کیا جائے اور اس کے ذریعہ سے انگریزی زبان کو بجائے بہت تھوڑے آدمیوں کے بہت سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کا وسیلہ بنایا جائے ۔ جو طریقہ ہم تجویز کرتے ہیں وہ تعلیم کے طریقۂ مروجہ سے گو علیحدہ اور غیر ہو مگر اس سے مخالف نہیں ہے ۔ نتیجہ دونوں کا انجام کار ایک ہی حاصل ہوگا ۔ وہ طریقہ یہ ہے کہ بجائے اس بات کے کہ صرف انگریزی ہی زبان میں تعلیم کی جائے ۔ دیسی زبان کو بھی تعلیم کے اعلیٰ درجہ کے مضمون اور مطالب میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کا ذریعہ گردانا جائے ۔ علم کی تحصیل کے واسطے زبان کے ذریعہ کو اس لئے ازبس ترجیح دیتا ہوں کہ اول تو طالب علم کو اس میں بہت سی آسانی ہوتی ہے ۔ دوسرے اس کی یہ خاصیت ہے کہ جو علم اس زبان کے ذریعہ

سکھایا جاتا ہے اس کا اثر، عمل میں بہت قوی اور مفید ہوتا ہے۔ علاوہ اس کے اس میں ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے علم خوب شائع ہوتا ہے۔

اگر علم کی تحصیل غیر ملک کی زبان کے ذریعہ سے کی جائے تو اس میں دو چند وقت صرف ہوتا ہے۔ اول تو خود زبان ہی کے سیکھنے میں وقت خرچ ہوتا ہے اور اس کی تحصیل میں ہزاروں طالب علم اس قدر وقت ضائع کرتے ہیں کہ پھر اس زبان کے ذریعہ سے جس کو انھوں نے حاصل کیا ہے کسی مفید علم کی تحصیل کرنے کے واسطے وقت باقی نہیں رہتا ہے۔ بہت تھوڑے طالب علم ایسے ہوتے ہیں جو بخوبی علم تحصیل کر لیتے ہیں۔ دوسرے علم کی تحصیل خاص علم کے فائدوں کے لحاظ سے ضروری ہوتی ہے اور شاذ و نادر ایسے طالب علم پائے جاتے ہیں جن کو زبان اور علم دونوں کی تحصیل میں کامیابی حاصل ہو مگر جب کہ اس کے دیس کی زبان میں علم کی تعمیل کی جاتی ہے تو طالب علم کا کچھ بھی وقت ضائع نہیں ہوتا۔

دو کالج اب ایسے موجود ہیں جن کی سند ہم اپنی تجویز کے مفید ہونے کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔ ایک تو ٹامسن سول انجنیرنگ کالج رڑکی کی شاخ، دوسرا میڈیکل کالج آگرہ کی شاخ اردو۔ رڑکی کالج کے انگریزی اور اردو فریقوں میں سے ہر ایک کو ایک ہی قسم اور ایک ہی درجہ کے علم سکھائے جاتے ہیں۔ یعنی جن کتابوں کی تحصیل اردو فریق کے طالب علم کرتے ہیں وہ کتابیں بالکل ان کتابوں کا ترجمہ ہوتی ہیں جو انگریزی طالب علموں کے استعمال میں ہوتی ہیں۔ امتحان کے سوالات دونوں فریق کے یکساں ہوتے ہیں ایک بند سوالوں کا انگریزی میں اور دوسرا اردو میں دیتے ہیں جو انگریزی کا ٹھیک ترجمہ ہوتا ہے۔ امتحان کے نتیجے بھی ایک ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ کبھی اردو فریق والے کا طالب علم، انگریزی فریق والے اپنے ہم سر سے بہتر نمبر حاصل کرتا ہے اور کبھی انگریزی طالب علم اپنے ہم سر اردو کے طالب علم سے سبقت لے جاتا ہے۔ دونوں فریق کے طالب علم کو مساوی فائدے حاصل ہوتے ہیں۔ صرف ذریعہ مختلف ہوتا ہے جس سے وہ علم

کی تحصیل کرتے ھیں ۔ علاوہ اس کے میڈیکل کالج آگرہ میں یہ بات معلوم نہیں ھوتی کہ اردو کے طالب علم اپنے انگریزی کے ھم سر طالب علموں سے ان منصوبوں کے بخوبی تحصیل کرنے میں پیچھے رہ جاتے ھوں جو دونوں کو ایک ھی معین حد تک یکساں طریق پر سکھاتے ھیں ۔

پس اگر دیسی زبان کو تعلیم کا ذریعہ ٹھہرایا جائے تو اس درجہ کا علم، جس تک اب چند ایم اے کے سند یافتہ طالب علموں کو رسائی ھوتی ھے، بے انتہا لوگوں کو حاصل ھونے لگے گا ۔ اب جو سرشتہ تعلیم کا غیر ملکی زبان کے ذریعہ سے جاری ھے اس کی بدولت طالب علم جس علم کو ایک مرتبہ حاصل کرتا ھے اس کو وہ یونیورسٹی کے چھوڑنے اور زندگی کے معمولی کام کاج میں مصروف ھونے کے بعد جلد بھول جاتا ھے اور جلد اس کے ذھن سے وہ علم اتر جاتا ھے ۔ مگر جو طریقہ ھم نے تجویز کیا ھے اس کے ذریعہ سے جو علم ایک مرتبہ حاصل ھو جائے گا صرف وھی باقی اور برقرار نہیں رھے گا بلکہ علم کے تحصیل کا ذریعہ اس معمولی زبان کے ھونے سے جس میں ھر وقت اس کے خیالات ظاھر اور پیدا ھوتے ھیں وہ علم کی استعداد اور قابلیت کی مناسبت سے ھمیشہ ترقی اور شگفتگی پاتا رھے گا ۔

اس بات کا خیال کرنا بے جا ھے کہ دیسی زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم کرنا انگریزی زبان کی اشاعت کو مضر اور حارج ھوگا ۔ کیونکہ یہ کہنا بھی تو اسی طرح سے صحیح نہیں ھے کہ نہر اور سڑکوں دونوں کا ایسے مقاموں میں بنانا ، جہاں دونوں کی ضرورت ھے مضر اور ایک دوسرے کا مخالف اور مانع ھوگا حالانکہ یہ دونوں کام ایسے جداگانہ ھیں کہ اپنی ذات سے ھر ایک فیض بخش ھے اور ایک دوسرے کا حارج اور مزاحم نہیں ھے ۔

وجوھات مسطورہ بالا کی رو سے ھم مسکینی اور نہایت عاجزی سے گذارش کرتے ھیں کہ گورنمنٹ ھند سے اعلیٰ درجہ کی تعلیم عام کا ایسا سرشتہ قائم کرے جس میں بڑے بڑے علوم اور فنون کی تعلیم دیسی زبان کے ذریعہ سے ھوا کرے اور دیسی زبان میں انھیں مضمونوں کا امتحان سالانہ ھوا کرے ۔

جس میں کہ اب طالب علم کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی زبان میں امتحان دیتے ہیں اور جو سندیں اب انگریزی زبان کے طالب علموں کو علم کی مختلف شاخوں میں لیاقت حاصل کرنے کے عوض میں عطا ہوتی ہیں وہ ہی سندیں ان طالب علموں کو عطا ہوا کریں جو انہیں مضمونوں کا دیسی زبان میں امتحان دے کر کامیاب ہوں ۔ حاصل یہ ہے کہ خواہ ایک اردو فریق کلکتہ یونیورسٹی میں قائم کیا جائے یا ممالک شمالی و مغربی میں ایک یونیورسٹی دیسی زبان کی علیحدہ مقرر کی جائے ۔

یہ بات البتہ سچ ہے کہ بالفعل ایسی کتابیں دیسی زبان میں موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے طالب علم اس درجہ تک علم کی تحصیل کر سکے جو اب یونیورسٹی میں امتحان دینے کے واسطے ہوتا ہے لیکن ایسی کتابوں کا موجود ہو جانا کوئی مشکل امر نہیں ہے ۔ جو کتابیں یونیورسٹی کے امتحان کی فہرست میں مندرج ہیں ان کے ترجمے دیسی زبان میں تیار ہو سکتے ہیں اور بعض مضمونوں کی اصل کتابیں تصنیف ہو سکتی ہیں ۔

خاتمہ پر ہم اپنا یہ قوی یقین ظاہر کرتے ہیں کہ جس تجویز کی ہم تائید کرتے ہیں اگر اس کو جاری کیا جائے تو اس ملک کی حالت کو سر نو عمدہ اور بہتر کرنے اور اس کے باشندوں کی طبیعتوں میں سے غلطی اور جہالت کو دور کرنے اور سب حاکم محکوموں کو برابر فائدہ پہنچانے کا یہ تجویز ایک بڑا موثر وسیلہ اور ذریعہ ہوگی ۔ ۱

۱ - اخبار سائینٹفک سوسائٹی ، علی گڑھ ، ۱۹ اگست ۱۸٦۷ء

مرکزی اردو ڈفینس ایسوسی ایشن ، الہ آباد کی وہ اہم تجویز و قرارداد جو ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کے جلسے میں منظور کی گئی اور سر سید احمد خاں کے دستخط سے سرکلر کے طور پر مختلف شہروں اور ضلعوں کی اردو کمیٹیوں کو بھیجی گئی

صدر کمیٹی ' الہ آباد

تمام خط و کتابت متعلق اس کمیٹی کے بنام سید احمد خاں بمقام بنارس رسل ہو

اطلاع

یہ بات معلوم کرکے کہ تھوڑا عرصہ گزرا جو ایک عرضی باستدعائی جاری کئے جانے دیو ناگری کے سرکاری دفتروں اور مدرسوں میں ممالک مغربی و شمالی میں ہندوؤں کے دستخط ہونے کے لئے پھرائی گئی تھی وہ عنقریب گورنمنٹ کے حضور میں پیش ہونے والی ہے اور نیز اس خیال سے کہ صوبہ بہار کے اردو کے طرف داروں کے مستعد اور آمادہ نہ ہونے کے سبب سے دیو ناگری کے جاری ہو جانے کا حکم اس ملک میں صادر ہونے تک کوئی عرضی نہ گزر سکی اون صاحبوں نے جو اضلاع شمالی و مغرب میں اردو کا بحال رہنا چاہتے ہیں تاریخ نویں دسمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں اس غرض سے ایک جلسہ کیا کہ کس طرح پر کارروائی کی جاوے ۔ اور اس جلسہ کے صدر انجمن سید جعفر علی صاحب رئیس و تعلقہ دار الہ آباد تھے ۔

اس جلسہ میں یہ تجویز ہوئی کہ اگر گورنمنٹ سے دیو ناگری کے اجرا کا حکم صادر ہو یا اوس کے نسبت رائے طلب کی جاوے تو ایک عرضی دینی چاہئے اور یہ بھی تجویز ہوا کہ جب وقت آوے تو لوگوں کے دستخطوں کے کرانے میں کچھ عرصہ نہ لگے ایک صدر کمیٹی ، الہ آباد میں قائم کی جاوے اور اوس کمیٹی میں سید احمد خان بہادر سی ۔ ایس ۔ آئی سکریٹری اور مفصلہ ذیل ممبر مقرر ہوویں ۔ اور اس کمیٹی کی طرف سے سرکیولر منسلکہ اطلاع ھذا الہ آباد کے سوا اضلاع شمال و مغرب کے ہر ایک

ضلع میں خاص خاص هندوستانیوں کے پاس اس درخواست سے بھیجا جاوے که هر ایک ضلع میں ماتحت کمیٹیاں اس صدر کمیٹی کی ماتحت سمجھی جاویں گی مقرر کریں اور یه ماتحت کمیٹیاں صدر کمیٹی سے خط و کتابت کر کے ایسے تعلیم یافته هندوستانیوں کی فہرستیں بناویں جو عرضی مجوزه پر اپنے دستخط کرنے کے لئے آماده هوں ـ اور اله آباد کے ضلع میں یه کام صدر کمیٹی خود اپنے ذمه رکھے ـ فقط

تفصیل ممبران و افسران کمیٹی یه هے

پیٹرن یعنی مربی کمیٹی

نواب مظفر حسین خان صاحب ، رئیس و تعلقه دار، اله آباد

شریک صدر انجمن

مولوی محمد حیدر حسین صاحب ، رئیس جونپور و وکیل هائی کورٹ

صدر انجمن

سید جعفر علی صاحب ، رئیس و تعلقه دار ، اله آباد

نائب صدر انجمن

مولوی سید فرید الدین احمد صاحب ، رئیس کڑه و وکیل کورٹ

سکریٹری

سید احمد خان بہادر ، سی ـ ایس ـ آئی

جوائنٹ سکریٹری

منشی محمد ذکاء الله صاحب، پروفیسر ، ورنیکولر سائنس اینڈ لٹریچر ، میور سنٹرل کالج ، اله آباد

سرکیولر

دیو ناگری کا اجرا مفصلہ ذیل تین وجوہات کے سبب سے قابل اعتراض کے ہوگا :

اول : تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اس سے نہایت سخت ضرر پہنچے گا۔

دویم : اس کے ساتھ زبان تبدیل ہوگی جس سے غالباً مروجہ زبان میں بہت زیادہ خرابی اور نقصان پیدا ہوگا۔

سویم : عام کاروبار میں سخت دقت پیش آوے گی۔

اولاً تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ضرر پہنچنے کی نسبت بعض لوگ شاید یہ کہیں کہ یہ وجہ مقدم نہ ہونی چاہئے بلکہ سب کے آخر میں ہونی مناسب ہے لیکن اس ملک میں جہاں دو قوموں کے باہم ربط و اتحاد کو محفوظ رکھنا اور مستحکم کرنا اور طرفداری کا ذرا سا بھی اظہار نہ ہونے دینا ضرور ہے کوئی ایسی تدبیر جس سے کسی ایک قوم کا فائدہ اور دوسری قوم کا نقصان ہو بغیر اس بات کے کہ اوس تدبیر کے کئے جانے کی نہایت ضرورت ثابت کر دی جاوے خاص اس وجہ سے کہ ایک قوم کا فائدہ ہو اور ایک کا نقصان قابل الزام کے ہے۔

ناگری حرف کے جاری ہونے سے تعلیم یافتہ مسلمانوں کا یہ نقصان ہوگا کہ ہر ایک تعلیم یافتہ مسلمان عربی اور فارسی پڑھتا ہے وہ ان زبانوں کو کچھ تو اس سبب سے پڑھتا ہے کہ وہ اردو زبان کے جو اس زمانہ میں مروج ہے ماخذ ہیں اور بالتخصیص اس وجہ سے کہ اون دونوں زبانوں کا علم و ادب مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور اون کی نسل کی تاریخ سے مخلوط ہے۔ عربی اور فارسی زبان کی تحصیل ، مسلمانوں کی تعلیم کا ضروری جز سمجھا جاتا ہے اور بالفعل اون زبانوں کو ایسا نہ سمجھنا ممکن نہیں ہے۔

اعلیٰ درجہ کے مسلمانوں کا بہ نسبت ہندوؤں کے سرکاری نوکریوں کے حاصل کرنے میں بوجہ مذکورہ بالا بہت نقصان ہوا ہے۔ مسلمانوں کو تین زبانیں یعنی عربی اور فارسی اور اردو پڑھنی پڑتی ہیں اور ہندوؤں کو صرف ایک ہی زبان یعنی اردو سیکھنی ہوتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ مسلمان عربی اور فارسی کے علم کے سبب سے بہ نسبت ہندوؤں کے عموماً بہتر اردو خواں ہوتے ہیں مگر سرکاری نوکری کے حاصل کرنے میں اس سے کچھ بھی ان کو فائدہ نہیں ہے۔ سرکاری نوکری کے واسطے زبان کو پختہ طور پر جاننا نہ کبھی ضروری سمجھا گیا ہے اور نہ اب سمجھا جاتا ہے اور نہ گورنمنٹ سے اوس کی کسی قسم کی قدردانی ہوتی ہے۔ پس نتیجہ اس کا یہ ہے کہ گو ادنیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ مسلمان جو کسی قدر عربی اور فارسی پڑھتے ہیں سرکاری نوکری کے حاصل کرنے میں ہندوؤں کے برابر ہو جاتے ہیں لیکن اعلیٰ درجہ کے مسلمان نقصان میں ہی رہتے ہیں اور اس قسم کے لوگوں کو جن کی تعلیم مسلمانوں کے طرز پر ہوئی ہے کوئی نوکری ملنا نہایت مشکل ہوتا ہے چونکہ ہندوؤں کو صرف ایک زبان پڑھنی پڑتی ہے اس لئے اور علوم کی تحصیل کے واسطے جو سرکاری نوکری حاصل ہونے کے لئے ضروری ہیں اون کو زیادہ فرصت ملتی ہے اور اسی سبب سے وہ بہت جلد اور عمدہ طور پر بہ نسبت مسلمانوں کے قابلیت پیدا کر لیتے ہیں۔ انگریزی دفتروں میں نوکریاں حاصل کرنے میں مسلمانوں کا اب بھی زیادہ نقصان ہوتا ہے کیونکہ انگریزی نویس کو اکثر حالتوں میں دیسی زبان کو لکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں پڑتی پس ایک ہندو کو جو انگریزی دفتر میں نوکری کرنے کی لیاقت حاصل کرنا چاہتا ہے صرف ایک انگریزی سیکھ لینی ضرور ہے لیکن ایک مسلمان کو گو کسی پیشہ کے اختیار کرنے کا اوس کا ارادہ ہو ہمیشہ ضرور ہے کہ عربی، فارسی اور اردو پڑھے۔

اگر سرکار کی طرف سے ناگری حرف جاری ہوئے تو تعلیم یافتہ مسلمانوں پر بہ نسبت کے اور بھی بار عظیم پڑ جاوے گا۔ کیونکہ ما سوا اون ضروری علموں کے جو اب اون کو حاصل کرنے پڑتے ہیں۔ ایک نئے حرف سیکھنے

ہوں گے اور حقیقت میں تو ایک نئی زبان سیکھنی ہوگی اور یہ بات ثابت کی جاوے گی کہ زبان اور حرف دونوں تبدیل ہو جاویں گے کچھ عرصہ کے بعد ممکن ہے کہ بجائے اردو کے ہندی ہندوؤں کی بول چال کی زبان ہو جاوے۔ لیکن مسلمانوں کی بول چال کی زبان ہرگز نہ ہوگی جن کے باہمی برتاؤ کے لئے ایک ایسی زبان کا ہونا ضرور ہے جو عربی و فارسی الفاظ سے مخلوط ہو۔ علاوہ اس کے نئی زبان تب ہی بطور مناسب حاصل ہو سکتی ہے جبکہ زبان سنسکرت کے ذریعہ سے جو اوس کا ماخذ ہوگا سیکھی جاوے اور کسی قدر زبان سنسکرت سے واقفیت حاصل کرنی ضرور ہوگی۔ پس ایک مسلمان کو جو سرکاری نوکری حاصل کرنا چاہے، تین قسم کے حرف یعنی حرف عربی، فارسی اور دیو ناگری اور پانچ زبانیں یعنی عربی، فارسی، اردو، سنسکرت اور ہندی سیکھنی ہوگی اور ہندو کو ایک قسم کے حرف یعنی صرف دیو ناگری اور دو زبانیں یعنی سنسکرت اور ہندی سیکھنی ہوگی پھر بھی اسی قدر کافی نہ ہوگا۔ اغلب ہے کہ گورنمنٹ دیسی زبان کی اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا بہت جلد کوئی سلسلہ قائم کرے، جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ دیسی زبان کو زیادہ پختہ طور پر لوگ سیکھیں گے اور پختہ علم اوس کا زیادہ ضروری سمجھا جاوے گا، یعنی اگر ہندی دیسی زبان ہوئی تو بجائے کچھ تھوڑی سی سنسکرت کی واقفیت حاصل کرنے کے اچھی طرح پر سنسکرت پڑھنی ہوگی جو ایک مسلمان کے لئے قریب غیر ممکن کے ہے۔

تعلیم یافتہ مسلمانوں کا بھی جو سرکاری نوکری کے خواہاں نہیں ہیں ایسا ہی نقصان ہوگا۔ اگر وہ ہندی زبان کو نہ سیکھیں گے تو ملک کی دیسی زبان کا علم و ادب اون کے لئے ایسا ہوگا جیسے کہ کوئی کتاب بند ہے اور اوس پر مہر لگی ہوئی ہے اور دیسی زبان کے علم و ادب میں جو درجہ اب اون کو حاصل ہے وہ بیشک اون کے ہاتھ سے جاتا رہے گا کیونکہ بمقابلہ ہندوؤں کے نئی زبان میں مصنف ہونے کا دعویٰ نہ کر سکیں گے۔

امید یہ ہے کہ جس قدر اوپر بیان ہو چکا وہ اس بات کے ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمانوں کو سرکاری نوکریاں اور امیروں اور

سوداگروں وغیرہ کی نوکریاں حاصل کرنے میں اور اکثر پیشوں میں ناگری حرفوں اور ہندی زبان کے جاری ہونے سے بڑا نقصان ہوگا۔ درحقیقت جس قدر نقصان کہ مسلمانوں کو ہونا ممکن ہے وہ ہوگا کہ اوس سے بڑھ کر بجز دین سے محروم کر دینے کے نقصان کے اور کوئی نقصان نہیں ہو سکتا ۔ گورنمنٹ نے بہت کچھ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے کیا ہے اور زیادہ کرتی جاتی ہے ۔ لیکن بالفعل تعلیم یا تو سرکاری نوکری کے واسطے یا تصنیف اور تالیف کے لئے تربیت سمجھی جاتی ہے اور جو غرض کو علیحدہ کر دیں تو تدبیروں کے بڑھانے سے کچھ فائدہ نہ ہوگا بر خلاف اس کے موجودہ حالت کے بدستور بحال رکھنے میں ہندوؤں کا کچھ بھی نقصان نہیں ہے۔ جو بات اب ہے وہ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اور اب جو کوششیں شروع ہوئی ہیں اس سے پیشتر کوئی شکایت نہیں ہوئی جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ہندو تو اب بھی بہ نسبت مسلمانوں کے فائدہ کے ساتھ دنیاوی کاروبار کرتے ہیں۔ اون ہندوؤں کو بھی جو سنسکرت پڑھتے ہیں صرف ایک اصلی زبان سیکھنی ہوتی ہے اور مسلمانوں کو دو زبانیں سیکھنی پڑتی ہیں ۔ فقط

پس ناگری کے اجرا سے ہندوستان کی ہر ایک تدبیر کا مقدم اور ضروری جزو یہی یعنی کسی قوم کی طرفداری کرنی منظور نہیں ہے مگر نتیجہ یہی ہوگا کہ ایک قوم کی طرفداری ہوگی اور دوسری قوم کا نقصان ہوگا۔ دوئم اب دیکھنا چاہئے کہ ناگری کے اجرا سے زبان پر کیا اثر ہوگا زبان کی اصلی ضروری باتیں یہ ہیں اول اوس کے حروف تہجی پورے ہوں یعنی ہر ایک طرح کی آواز کے لئے جدا جدا حرف، مفرد خواہ مرکب، ہونے چاہئیں ۔ دوم وہ زبان وسیع ہونی چاہئے تاکہ مختلف قسم کے مضامین اوس میں ادا ہو سکیں ۔ سوم زبان شستہ اور صاف ہو تاکہ ہر طرح کا خیال اور مطلب اوس سے ظاہر ہو سکے ۔

اب اردو زبان فارسی زبان کے ترمیم شدہ حرف پہلی ضرورت کے واسطے کافی وافی ہیں ــ لیکن ناگری میں چودہ آوازوں کے لئے حرف نہیں ہیں اور نہ پانچ ضروری ترکیب الفاظ کی علامتیں ظاہر کرنے کے طریقے ہیں ناگری کے

طرفدار یه تجویز کرتے ھیں کہ جن آوازوں کے لئے حرف نہیں ھیں اون کے واسطے موجودہ حرفوں کے نیچے نقطہ یا کوئی اور علامت بنا لیں گے لیکن فارسی اور عربی الفاظ جو اس طرح لکھے جاویں گے اون کی بھونڈی اور بھدی شکل ھو جاوے گی - اور اس بات کا یقین نہیں ھو سکتا کہ کوئی شخص بذریعہ حروف تہجی مجوزہ کے زبان کو صحیح صحیح کبھی سیکھ سکتا ھے۔ ناگری کے طرفداروں نے جو غیر زبان سے حرف لئے ھیں اون سب کے لئے علیحدہ علیحدہ علامتیں نہیں بتائیں ھیں مثلاً اردو کے پانچ تہجی حروف ز، ذ، ژ، ض، ظ کے واسطے جو ھندی کا ایک ھی حرف ھے اسے دیکھ کر طالب علم کیونکر معلوم کر سکتا ھے کہ اس سے کونسا اردو کا حرف مراد ھے اور خصوصاً یہ بات ضرور ھے کہ مختلف حروف اوس کو یاد ھوں کیونکہ اردو میں خاص حرفوں سے لفظوں کے مادے معلوم ھوتے ھیں -

لیکن اس امر پر بحث کرنا ضرور نہیں ھے کیونکہ ناگری کے طرفدار اس بات کو تسلیم کرتے ھیں کہ فارسی کے خاص حرف ناگری میں نہیں ھیں مگر اس کو کچھ نقص اور عیب نہیں سمجھتے بلکہ ایک طرح کی خوبی قرار دیتے ھیں اس لئے کہ اون کی غرض فارسی اور عربی لفظوں کو زبان میں سے نکال ڈالنے کی ھے۔ بیشک ناقص حرفوں سے اون کی کارروائی ھوگی پس ناگری کے واسطے جو کوشش ھو رھی ھے اوس کا اصلی مقصود یہی ھے صرف حرف تبدیل کرنا مطلوب نہیں ھے بلکہ زبان بھی تبدیل ھو اور تمام عربی اور فارسی مادے کے الفاظ نکل جاویں اور اون کے بجائے سنسکرت کے الفاظ قائم ھوں اگر اون سے یہ پوچھا جاتا ھے کہ ایسا کیوں ھو تو یہ جواب دیتے ھیں کہ فارسی اور عربی الفاظ غیر زبان کے ھیں اور خراب - اگر یہ پوچھتے ھیں کہ نئے الفاظ کہاں سے آویں گے تو کہتے ھیں کہ ھندی سے - یہ بات مان لی گئی ھے کہ اردو کے ساتھ ساتھ ایک اور زبان بھی ھے جس کو ھندی کہتے ھیں اور جو سب ضلعوں میں بولی جاتی ھے اور وھی لوگوں کی اصلی زبان ھے لیکن ھر شخص جس کو اضلاع شمال و مغرب سے کچھ بھی واقفیت ھے، جانتا ھے کہ یہ بات ایسی نہیں ھے۔ تعلیم یافتہ لوگ ھر کہیں ایک

هی، یعنی اردو زبان بولتے ہیں۔ میرٹھ اور روھیل کھنڈ کے اکثر اضلاع میں ناخوانده لوگ بھی ایک قسم کی صاف اردو بولتے ہیں ۔ آگره اور الہ آباد کے مغربی حصہ کی بول چال برج بھاشا ہے ۔ بنارس اور الہ آباد کی سمت کے مشرقی حصہ میں پورب کی بولی بولی جاتی ہے اور بنڈیل کھنڈ میں ایک تیسری قسم کی بول چال رائج ہے مگر ان تینوں قسم کی بول چال میں گو وہ بالکل الگ الگ ہیں بہت سے الفاظ عام ہیں اور وهی الفاظ اردو کی بنیاد ہیں اور ہندی لفظوں کے نام سے مشہور ہیں یعنی وہ الفاظ جن کا ماخذ سنسکرت ہے۔ ہندوستان کے لوگ لفظ ہندی کے یہی معنی سمجھتے ہیں چونکہ سرکار پر فرض ہے کہ سنسکرت سے نکلی ہوئی کوئی بول چال سکھا دے اس لئے اوس نے برج بھاشا کو پسند کیا ہے اور اوس کا نام ہندی رکھا ہے اور اسی سے یہ خیال پیدا ہوا ہے کہ اس نام کی ایک زبان عام استعمال میں ہووے۔

اب کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہر حالت میں جہاں اب کوئی فارسی یا عربی لفظ استعمال ہوتا ہے اوس کے لئے کوئی ہم معنی ہندی لفظ ہی مل سکتا ہے یعنی ایسا لفظ جو سب مقاموں کی بول چال میں عام ہو بعض حالتوں میں بیشک فارسی اور عربی لفظ ایسے استعمال ہوتے ہیں جہاں ہندی لفظوں سے بھی ویسا ہی مطلب ادا ہو سکتا ہے لیکن اکثر حالتوں میں میں ایسے ہم معنی لفظ نہیں ملتے پس نئے سنسکرت مادے کے لفظ کہاں سے آویں گے جواب اس کا یہ ہے کہ یا تو کسی خاص مقام کی بول چال سے یا سیدھے سنسکرت سے لئے جاویں گے۔ قانونی یا علمی اصطلاحیں قریب کل کے سنسکرت میں سے آویں گی۔ سرکاری مترجم یا اور ایسے شخص جو اس کام کے لئے مقرر ہوں گے نئے الفاظ کو چنیں گے اور تمام قانونی اور علم ہنر اور انتظام مدن میں اور جو باتیں تہذیب اور شایستگی سے پیدا ہوں گی جن کی اصطلاحیں اب قریباً سب فارسی اور عربی زبان سے لی گئی ہیں تبدیل ہو جاویں گی۔ الغرض ہر ایک پڑھے لکھے آدمی کو ایک نئی زبان سیکھنی ہوگی۔

اب دیکھنا چاہئے کہ کتنے آدمی سیکھیں گے۔ ہم کو یقین ہے کہ بہت سے لوگ تو نہیں سیکھیں گے ۔ بہت برسوں تک گورنمنٹ کی زبان کے ساتھ

ساتھ اردو زبان رہے گی - اور شاید کہ کبھی معدوم نہ ہو -

فرض کیجئے کہ تبدیلی ہو گئی اور نئی زبان قائم ہو گئی تو کیونکر یقین ہو سکتا ہے کہ پہلی سے کس طرح پر بہتر ہوگی - بے شک اوس کے تمام الفاظ ایک ہی مادہ کے ہو جاویں گے لیکن سب سے عمدہ وہ زبان نہیں ہے جو سب سے زیادہ صاف ہے بلکہ عمدہ وہ زبان ہے جو سب سے زیادہ وسیع ہے اور اغلب یہ ہے کہ ایسی زبان جو ایک ماخذ سے نکلی ہو ایسی وسیع نہ ہو جو کئی ماخذوں سے نکلی ہو پھر کیا یقین ہے کہ وہ لوگ جو نئے لفظوں کی فہرست منتخب کرنے کے لئے مقرر ہوں گے الفاظ موجودہ کی بہ نسبت بہتر لفظ چنیں گے یا یہ کہ اون کے چنے ہوئے الفاظ اتنے ہی اچھے ہوں گے جتنے کہ موجودہ الفاظ ہیں - اس کام کے لئے ایسے لوگ درکار ہوں گے جو صرف کامل علم اور پختہ رائے نہ رکھتے ہوں بلکہ اون کو موجودہ زبان کے تمام الفاظ بھی معلوم ہوں اور ہر ایک ذات اور قوم کے مذہب اور رسم و رواج سے بھی بخوبی آگاہی رکھتے ہوں اگر ایسی لیاقت کے لوگ مل جاویں تو گورنمنٹ کی بڑی خوش نصیبی ہے اور اب ایک بات یہ ہے کہ سرکاری مترجموں سے جو الفاظ کی فہرست منتخب کریں گے کام نہیں چلے گا وہ نئی زبان کو ایسا شستہ اور طیار نہیں کر سکیں گے جو قابل استعمال کے ہو - عبارت کا بنانا دوسروں کے لئے باقی رہ جاوے گا اور جو بات کہ اردو کے لئے ہوئی ہے وہی بات از سر نو برسوں میں ہووے گی -

ناگری کے اجرا ہونے پر ایسی ہی باتیں ہوویں گی- زبان تو برائے نام درست ہوگی اور حقیقت میں تبدیل ہو جاوے گی اگر گورنمنٹ کی مرضی ہو تو بیشک یہ باتیں ہو سکتی ہیں لیکن اگر زبان کا درست کرنا منظور ہے تو زیادہ تر بے جوکھوں تدبیر یہ ہے کہ ایسے طریقہ سے درستی کی جاوے جس میں یقین کامیابی کا ہو یعنی یعنی بذریعۂ تعلیم کے زبان کی خرابی یا تو باوجود کم علمی کے علمیت کا اظہار ہونے یا جہالت کے باعث سے ہوتی ہے - یعنی خرابی یا تو دیدہ و دانستہ کی جاتی ہے یا نادانی سے جہالت کا زمانہ اور باوجود کم علمی کے علمیت کے اظہار کرنے کا زمانہ دونوں حقیقت میں ایک

هی هیں - جہالت کو اگر دفع کیا جاوے تو کم علمی بھی جاتی رہے گی۔ یہ تحقیق ہے کہ انگریزی زبان کے مصنف بہت دن نہیں ہوئے کہ بغیر ضرورت کے یونانی اور لاطینی زبان کے لفظوں کو ایسے ہی استعمال کرتے تھے جیسے کہ اب اردو زبان کے مصنف بغیر ضرورت کے عربی اور فارسی زبان کے الفاظ کو استعمال کرتے ہیں لیکن تعلیم کی ترقی کے ساتھ آسان عبارت لکھنے کا رواج ہو گیا اور زبان اب تک صاف اور شستہ ہوتی چلی جاتی ہے باوجود انگریزی گورنمنٹ کی عدم توجہی کے اور نیز باوجود اس بات کے کہ تعلیم یافتہ لوگ بہت کم ہیں اسی قسم کی تبدیلی اردو زبان میں ہی ہوتی جاتی ہے - آج کی اردو بہ نسبت بیس برس بلکہ دس برس پہلے کی اردو سے بہت مختلف ہے۔ فارسی اور عربی الفاظ کے استعمال کا رواج جو صرف علمیت کے ظاہر کرنے کے لئے تھا وہ اب اوٹھتا جاتا ہے اور جس قدر تعلیم کی ترقی ہوگی اوسی قدر اور بھی کم ہوتا جاوے گا - پس زبان تو درست ہو رہی ہے اور یہ درستی ایک یقینی بنیاد پر ہوتی جاتی ہے گو ترقی آہستہ ہوتی ہے مگر وہ اولٹی نہ پھرے گی۔ یہ بات تعلیم سے پیشتر نہیں ہوتی بلکہ تعلیم کے بعد ہوا کرتی ہے اور کچھ یہ بات چند غیر مروج اور مروج زبانوں کے جاننے والوں اور زبان کے صاف کرنے والوں کے خیال پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ ایسے لوگوں کی مرضی پر ہوتی ہے جو اوس زبان سے کام لیتے ہیں اور اوس کو استعمال میں لاتے ہیں اور جن کی صرف یہی غرض نہیں ہوتی کہ کوئی پہلے کی سوچی ہوئی بات پوری ہو جاوے بلکہ جو سب سے عمدہ لفظ ہو وہ لیں اگر ممکن ہو تو ہندی سے ورنہ کسی اور زبان میں سے - زبان کا وہ جز جس میں بہت کم ترقی ہوئی ہے وہ قانونی اصطلاحیں ہیں اور اس کا ٹھیک سبب یہی ہے کہ یہ اصطلاحیں خاص سرکاری مترجموں کی ملکیت ہیں کسی دوسرے شخص کو اون میں مداخلت نہیں - فقط

تیسرے باقی رہی وہ دقت جو عام کاروبار میں ہوگی۔ اس امر کی نسبت حسب ذیل لکھنا کافی ہوگا، اول ہندوستانی افسر جو اعلیٰ درجہ کے سرکاری ملازم ہیں اون میں سے بہت سے زبان کے تبدیل ہونے پر نئی زبان اور حرفوں

کو نہ سیکھیں گے۔ جب کہ ایک شخص کو کوئی کتاب یا اخبار دیکھنے کی فرصت نہیں ملتی تو ممکن نہیں کہ ایک نئی زبان سیکھنے کے لئے اوس کو فرصت ملے۔ پس یہ افسر بعوض اس کے کہ اپنا کام خود اپنی زبان میں کریں بہ مجبوری دوسروں سے کام لیں گے۔ دوم ماتحت اہلکار بھی بہت کم نئی زبان اور حرفوں کو بخوبی سیکھیں گے اور نتیجہ یہ ہوگا کہ بہ نسبت حال کے کام کم اور بری طرح پر ہوگا۔ سوم جبکہ ایک نئی نسل ناگری نویس اہلکاروں کی پیدا ہو جاوے گی تب بھی اس قدر کام نہ ہو سکے گا جس قدر کہ اب ہوتا ہے۔ کوئی خاص ناگری نویس محرر ایسا زود نویس ہو سکتا ہے جیسا کہ کوئی خاص اردو نویس ہوتا ہے، لیکن حرفوں کی شکل سے اور جس قدر جگہ وہ گھیرتے ہیں اوس کے سبب سے ممکن نہیں کہ ناگری عموماً ایسی جلدی لکھی جاسکے جیسے کہ اردو۔ فقط

پس ناگری حرفوں کے جاری ہونے کی نسبت یہی اعتراض ہوں گے۔ نقصان تو ظاہر ہیں مگر فائدے ایسے صاف نہیں ہیں۔ فی الحقیقت موجودہ زمانہ کے لوگوں سے آئندہ نسل کے فائدے کے لئے ایک امر کے تجربہ کرنے کو کہا جاتا ہے پیشتر اس بات کے منظور کرنے کے زمانہ موجودہ کے لوگ یہ دریافت کرنے کے مستحق ہیں کہ اس تجربہ میں کامیابی ہونے کا یقین کرنے کی کونسی معقول وجہ ہے۔ ایک بات تو تحقیق ہے کہ اس قسم کی بات ہرگز کسی ملک میں اس سے پیشتر نہیں ہوئی اور ہندوستان بمشکل ایک مناسب مقام اس کو شروع کرنے کے لئے ہو سکتا ہے ناگری کے طرفدار زبان کی درستی کا آسان اور بے جوکھوں طریقہ یعنی بذریعہ تعلیم کے کیوں نہیں پسند کرتے۔ اس کی وجہ اس بات کے دریافت کرنے سے معلوم ہو سکتی ہے کہ وہ ناگری کے طرفدار کون ہیں اکثر یا تو ایسے لوگ ہیں جو اعلانیہ مسلمانوں کی ذلت کے خواہاں ہیں یا ایسے جو سنسکرت پڑھے ہوئے ہیں۔ پہلی قسم کے لوگوں کی نسبت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ وہ لوگ اپنی ذہانت کے لئے قابل مبارک بادی کے ہیں کیونکہ اونھوں نے نہایت موثر تدبیر مسلمانوں کی ذلت اور تکلیف کی نکال لی ہے۔ جس سے بڑھ کر بجز اوس تکلیف کے جو مذہبی

امور کے ادا کرنے سے باز رکھنے کے باعث سے دی جا سکتی ہے اور کوئی تکلیف نہیں ہو سکتی۔ دوسرے قسم کے لوگوں کی نسبت یہ بات باسانی سمجھ میں آتی ہے کہ سنسکرت پڑھے ہوئے لوگ ایک ایسی دیسی زبان کیوں نہ پسند کریں گے جس میں یا تو سنسکرت کے لفظ ہوں یا سنسکرت سے نکلے ہوئے لفظ ہوں لیکن یہ بات نہایت سخت ہے کہ یہ لوگ اپنا آرام ایک جماعت کثیر کے اغراض اور خواہشوں سے مقدم سمجھیں۔ یہ یقین ہے کہ ناگری کے دونوں قسم کے طرفداروں میں سے بہت کم ایسے ہیں جن کو اردو زبان سے اس قدر واقفیت ہو کہ اوس کی خوبی کو سمجھیں صرف کتابی علم کی لیاقت سے زبان کی نسبت رائے دینے کی ہر کسی کو قابلیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ مناسب رائے دینے والے وہی لوگ ہیں جو اوس زبان میں لکھتے پڑھتے ہیں جب تک کہ کوئی شخص لکھنا شروع نہیں کرتا اوس وقت تک زبان کی صفائی وغیرہ اچھی اور آسان معلوم ہوتی ہے مگر جب لکھنا شروع کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ نہایت مشکل یا غیر ممکن ہے۔

المختصر جو رائے اس سرکیولر میں ظاہر کی گئی وہ حسب ذیل ہے یعنی اردو زبان کا درست ہونا ضرور ہے لیکن اسے اوسی طور سے درست کرنا چاہئے جیسے کہ اور زبانیں درست ہوئی ہیں یعنی اون لوگوں کی تعلیم کے ذریعہ جو اوس کا استعمال کرتے ہیں اور یہ کہ وہ دوسرا طریق جو ناگری کے طرفداروں نے تجویز کیا ہے صرف فضول ہی نہیں ہے بلکہ خطرناک ہے۔ فقط

مسلمان جن کو ناگری کے اجرا سے بہت ضرر پہنچے گا بالطبع اوس کے مخالف ہوں گے مگر کمیٹی یقین کرتی ہے کہ جو باتیں اس سرکیولر میں لکھی گئی ہیں وہی تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان دونوں کی رائے ہوگی۔

جو لوگ اردو کے بحال رکھنے کے خواہاں ہیں اون سے یہ درخواست ہے کہ ممالک مغربی و شمالی کے ہر ایک ضلع میں ماتحت کمیٹیاں مقرر کریں ہر ایک کمیٹی کا یہ کام ہوگا کہ وہ اوس ضلع کے باشندوں میں سے ایسے شخصوں کی فہرست تیار کرے جو بشرط ضرورت اوس عرضی پر اپنے دستخط

کریں گے جس میں رائے مندرجہ سرکیولر ھذا لکھی جاوے گی۔ یہ تجویز ھے صرف تعلیم یافتہ لوگوں کے نام فہرست میں مندرج ھوں کیونکہ صرف ایسے ھی لوگوں کی رائے قدر و منزلت کے قابل ھوگی، جب کمیٹی قائم ھو جاوے تو ھر ایک کمیٹی کے سکریٹری کو چاھئے کہ صدر کمیٹی کے سکریٹری کو اطلاع دیوے اور جو کچھ کارروائی ھوا کرے اوس کی وقتاً فوقتاً اطلاع دیا کرے چونکہ اس بات کے یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں ھے کہ گورنمنٹ یا زیادہ انگریزی افسر بالفعل ناگری کے اجرا کے خواھاں ھیں۔ پس جب تک کہ وہ حرفوں کے تبدیل کرنے کی تدبیریں در حقیقت شروع نہ ھویں تب تک عرضی کے طیار کرنے کی کوئی ضرورت نہ ھوگی۔ پس بالفعل صرف اسی قدر ضرورت ھے کہ آمادہ اور مستعد رھیں۔ فقط

دستخط
سید احمد خاں
سکریٹری

۱ - قلمی مسودات محمد امین زبیری، مملوکہ مشفق خواجہ، کراچی

(۷)

انسٹیٹیوٹ آف الہ آباد کے سکریٹری منشی سرودا پرشاد کا وہ تاریخی خط جو ۲۰ دسمبر ۱۸۶۸ء کو سر سید احمد خاں کے نام بھیجا گیا اور جس میں فارسی کے بجائے ناگری رسم الخط رائج کرنے کا واضح طور پر مطالبہ کیا گیا ۔

چٹھی

بنام

مولوی سید احمد خان صاحب بہادر جج

عدالت خفیفہ ، بنارس

صاحب من ۔ آپ کا عنایت نامہ مورخہ ۲۱ نومبر میرے پاس پہنچا ۔ لیکن چونکہ آپ نے یہ فرمایا تھا کہ جو تبدیلی ان اضلاع کی عدالتوں کی زبان میں تجویز کی گئی ہے اس کی نسبت آپ آخر دسمبر تک پوری رائے نہیں دے سکتے ہیں ۔ اس وجہہ سے میں نے اس وقت تک جواب کا نہ دینا مناسب سمجھا اور نہ میں اس وقت تک لکھتا بشرطیکہ جو خط کتابت میرے اور آپ کے درمیان ظہور میں آئی ہے اس کی غیر مکمل حالت میں چھپ جانے سے جو میری رائے میں ایک بے موقع بات تھی جواب کے جلد تر لکھنے کا خیال نہ ہوتا ۔

آپ کو معلوم ہوا ہوگا کہ میں نے اپنی پچھلی چٹھی میں جو زبان ہندی کی تعریف میں لکھی تھی اس کی تائید میں نے اس خیال سے کرنی نہ چاہی تھی کہ یہ تائید خود صحیح ہو یا بے جا ہو اس معاملہ سے جو معرض بحث میں ہے کچھ تعلق نہ رکھتی تھی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی نسبت جیسا کہ میں خیال کرتا تھا آپ کو اس معاملہ کا زیادہ خیال ہے اس وجہہ سے میں اب زیادہ خاموش نہیں رہ سکتا ۔

اب آپ جو یہ کہتے ھیں کہ میں نے ھندی زبان کی تعریف میں دو باتوں کو باھم ملا دیا ھے سو یہ اعتراض آپ کا میری دانست میں خاص آپ ھی کی رائے کے مطابق نہیں ھے کیونکہ آپ کا یہ قول ھے کہ ھندی یعنی ان اضلاع کی زبان مخلوط اور اردو ایک ھی ھے پس جب کہ یہ امر مسلم ٹھہرا تو پھر صرف اس بات کی بحث باقی رھی کہ کن حرفوں میں اس زبان کو لکھنا چاھئے پس خاص آپ کی تقریر کے بموجب صرف ایک امر بحث طلب ھے نہ کہ دو امر پر مباحثہ ھے۔

چونکہ اب بھی آپ شاید یہی اعتراض کریں کہ آپ کی رائے کے بموجب تو نہیں لیکن میری رائے کے بموجب دو مختلف معاملوں پر بحث کی جاتی ھے یا ھونی چاھئے اس وجہہ سے میں اب یہ ثابت کرتا ھوں کہ یہ صورت بھی ھرگز نہیں ھے۔

زبان مخلوط کے کہنے سے میری غرض اس مخلوط زبان سے نہیں ھے جس میں باوجود اکثر فارسی الفاظوں اور ان الفاظوں کے جو خاص اس ملک سے مخصوص ھیں۔ سنسکرت زبان کے الفاظ مع ان الفاظوں کے جن کی ھیئت بدل گئی ھے یا وہ اس سے بگڑ کر بن گئے ھیں، کثرت سے ھوتے ھیں۔ لیکن جب کہ یہ مخلوط زبان دیو ناگری حروف میں لکھی جاتی ھے تو زیادہ شستہ حالت میں ھوتی ھے یعنی بگڑے ھوئے اور غیر زبانوں کے الفاظ اس میں نہیں ھوتے ھیں۔ کیونکہ ان شخصوں کو اس ملک کے علم انشا میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت حاصل ھوتی ھے وہ اس کو اس طرح پر لکھتے ھیں یعنی اس میں بگڑے ھوئے اور غیر زبان کے لفظوں کا استعمال نہیں کرتے ھیں اور ھندی حرفوں میں جو زبان کہ اس طرح سے لکھی جاتی ھے اسی کو میں نے مخلوط زبان کہہ کر تعبیر کیا تھا پس یہ بات مجھ کو ثابت نہیں ھوتی کہ آپ نے یہ کیونکر دریافت کیا کہ میں نے دو باتوں کو ایک بات میں مخلوط و شامل کر دیا۔ مجھ کو یقین ھے کہ آپ یہی اعتراض اس صورت میں نہ کریں گے جبکہ کوئی بنگالی عدالتوں میں اردو زبان کی جگہ

اور ترجیح پر زبان بنگالی کے قایم کرنے کے مقدمہ میں زبان مذکور کو ایسی مخلوط بنگالی زبان کہہ کر تعبیر کرے جو بنگالی حرفوں میں لکھی جاتی ہو مگر اس باب میں اسی قدر بحث کافی وافی ہے ، زیادہ کہنا فضول ہے ۔

یہ بات ہرگز میری سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ نے ھندی زبان کو کس طرح سے اور کس لئے ایسی زبان ٹھہرایا کہ اس میں اور اردو میں اختلاف یا محض تباین ہے اس لئے کہ اب تک آپ نے اور میں نے جو کچھ اس معاملہ میں لکھا پڑھا ہے اس میں کوئی بات ایسی نرھی جس سے وہ اختلاف و تباین سمجھا جاتا ۔ باقی جو کچھ فرق و اختلاف ھندی اور اردو میں واقع ہے اس کی نسبت میں نے اپنی رائے بہت صاف صاف اور سیدھے سادھے لفظوں میں اس محل پر ظاہر کر دی تھی جہاں کہ میں نے یہ کہا تھا اور اس کا حوالہ آپ نے بھی اپنی تحریر میں کیا تھا کہ فارسی زبان کی آمیزش بہ نسبت ھندی کے اردو میں زیادہ ہے ۔ اس اختلاف کو آپ نے بھی تسلیم کیا ہے اگرچہ اس کے تسلیم کرنے سے ان اضلاع کی عدالتوں کے اھل کاروں کا جو سب کے سب فارسی یا اردو خواں ھیں نقصان متصور ہے ، اور یہ اختلاف بھی بغرض تمثیل کے اس قسم کا اختلاف ہے جو بلاد بنگالہ میں ان دو زبانوں میں پایا جاتا ہے ۔ جن میں سے ایک، سخت سادھو بھاشا اور دوسری، صاف بنگالی یا رائج الوقت مخلوط بنگالی زبان کہلاتی ہے ، دونوں میں یہ امتیاز ہے کہ پچھلی زبان میں سنسکرت کے الفاظ کم مخلوط ھیں ۔

جب سے کہ بنگالی زبان عدالتوں میں مروج ہو گئی ہے اور قانون کی کتابیں اسی زبان اور اسی کے حرفوں میں لکھی جاتی ھیں تو اس تدبیر سے عموماً بہت بڑا فائدہ ھوا ۔ چنانچہ ایک مزدور یا کاشتکار خواہ اپنی ذات میں یا اپنے کسی ھمسایہ کے ذریعہ سے اس قدر لیاقت اور علم حاصل کرتا ہے کہ جس سے وہ اپنے قانونی روزمرہ کی معاملات کی بذات خود بخوبی کاربراری کر لیتا ہے اور قانونی کتابیں جو سابق ھیں ، وکیلوں اور قانون دانوں کے کتب خانوں میں محفوظ رھتی تھیں اب معمولی شریف آدمیوں کے مکانوں ھی میں نہیں پائی جاتیں بلکہ اکثر عطاروں کی دکان تک پہنچتی ھیں اور آخر

نتیجہ تدبیر مذکور الصدر کا یہ ہوا کہ ایسی زبان قائم ہو گئی ہے جس کو قومی زبان کہہ سکتے ہیں، اور اس وقت تک جو زبان بنگالی عموماً رائج تھی اس کی نسبت سے زیادہ شایستہ اور لطیف ہے اور دشوار فہم سادھو بھاشا کی نسبت سے بہت سہل اور عام فہم ہے اور جس خرابی اور بگاڑ اور آمیزش و اختلاط اور لہجہ وغیرہ میں وہ مبتلا تھی جو غیر ملکی زبانوں کے لفظوں کے استعمال کا باعث تھا، اس سے اب بتدریج پاک اور علیحدہ ہوتی جاتی ہے اور مجھ کو یقین ہے کہ آپ اس بات پر یہ حجت نہ کریں گے کہ یہ عمدہ نتیجہ اس صورت میں نہ ہوتا کہ اگر بنگالہ کی عدالتوں میں ایسی زبان رائج ہوتی جس کے بہت سے حصہ کو لوگ سمجھ نہ سکتے، جیسی کہ ان اضلاع کی عدالتوں کی زبان ہے اور کسی ایسی غیر ملکی زبان کے حرفوں میں وہ تحریر ہوتی جیسی کہ انگریزی یا فارسی یا چینی یا یونانی زبان ہے۔

جو دلیلیں کہ آپ نے قانون کی پیچیدگی اور دشواری کی نسبت پیش کیں، وہ جائز اور تسلیم کے قابل نہیں۔ اس لئے کہ بنگالہ میں یہ واقعی حال کہ کوئی شخص کسی وکیل یا قانون داں کے پاس ایسے ایسے عام کاغذات عدالت کے سمجھنے کے واسطے جیسے کہ پروانہ یا سمن بلکہ فیصلہ تک بھی سمجھنے کو نہیں جاتا، البتہ اہل حرفہ، وکیلوں اور قانون دانوں کے پاس ایسی صورت میں جاتے ہیں جبکہ نالشوں کی عرضی یا مختلف قسم کے انتقال ناموں کے لکھوانے کی ضرورت ہوتی ہے، بلکہ ایسے موقعوں پر اس وجہ سے بھی کہ وہ کاغذات کاشتکار کی زبان خاص میں لکھے ہوتے ہیں وہ ان کے مطالب میں ایسی رسائی ظاہر کرتے ہیں اور ایسی ایسی معقول رائیں اور بڑی بڑی باتیں غور اور لحاظ کے قابل بتاتے ہیں کہ اس سے ان کے قانونی مشیر یعنی وکیل وغیرہ کو بڑی حیرت ہوتی ہے اور جبکہ اس زمانہ میں اور اسی ملک میں ایسی عمدہ کامیابی حاصل ہو چکی ہے تو ہم کو کچھ ضرور نہیں ہے کہ ہم اپنے کلاموں کے ثبوت کے واسطے اور ملکوں کے حالات پر نظر کریں۔ پس جو دلیل آپ کے قانون کی پیچیدگی اور دشواری پر مبنی ہے اور جس پر آپ نے بہت کچھ زور لگایا ہے وہ کچھ بڑی منزلت نہیں رکھتی اور کسی واقعہ واقعی سے اس

کو تائید نہیں پہنچتی۔

بقول آپ کے ممکن ہے کہ ہندی خواں قانونی دشوار اور پیچیدہ باتوں کو نہ سمجھے مگر کیا وہ رسیدوں اور سمن یا پروانوں اور اسی قسم کے کاغذوں کو بھی نہ سمجھے گا جو ہندی میں تحریر ہوویں اور جن میں ایسی دشواری پائی نہ جاوے بلکہ آپ نے اپنی تقریر کو یہاں تک وسعت دی ہے کہ آپ بیان کرتے ہیں کہ ایک دستاویز پڑھنے کے لئے بھی قانونی علم درکار ہے مگر بلا شبہ آپ اس بات سے واقف ہوں گے کہ وہ ہزاروں آدمی جو بغرض سننے اور سمجھنے قسم مذکور کے دستاویزوں اور کاغذوں کے جا بجا مارے مارے پھرتے ہیں اس کی وجہہ بغیر اس کے کچھ نہیں کہ وہ ایسی زبان اور حرفوں میں تحریر ہوتے ہیں جس سے وہ لوگ واقف نہیں ہوتے، پس یہ بات کہنی کہ حروف کی نا واقفیت ان لوگوں کے حق میں کچھ دقت اور حرج کا باعث نہیں ہوتی جس کو معاملہ خاص سے علاقہ ہوتا ہے۔ حق اور واقعی باتوں سے صریح انکار کرتا ہے۔

جو اعتراض کہ آپ نے ناگری کے حرفوں کی بابت وارد کیا ہے اس کی بنیاد صرف آپ کی زبان پر ہے۔ باقی کسی دلیل سے اس کی تائید نہیں کی گئی۔ پس اس کا جواب دینے کی حاجت نہیں ہے۔ اور اگر یہہ بات بخوبی روشن نہ ہوتی کہ آپ کی رائے میں عالی حوصلگی اور فراخی پائی جاتی ہے تو اعتراض آپ کا ایک تعصب سمجھا جاتا۔ آپ اس بات سے ضرور ہی واقف ہوں گے کہ ہندی کے حرفوں کی قوت شاید دنیا کی تمام زبانوں کی قوت سے برتر ہے اس لئے کہ اس سے تمام مختلف آوازیں اور بولیاں جو انسان کی زبان سے نکلنی ممکن ہیں بخوبی ظاہر ہوتی ہیں حالانکہ فارسی حروف میں علاوہ اس دقت کے جو شکستہ حرفوں میں پیش آتی ہے اور برسوں کی محنت سے بھی رفع نہیں ہو سکتی ان حرفوں سے بیشمار لفظوں کا اظہار جو زبان میں رائج مروج ہیں بغیر اس کے بالکل نہیں ہو سکتا کہ قوت تلفظ میں دست اندازی نہ کی جاوے۔ اس ذاتی بے قوتی کے نقص کو پورا کرنے کے واسطے ایک مصنف کو اکثر بے ڈھنگی تدبیریں اختیار کرنی پڑتی ہیں۔ میں ایسے لفظوں کی ایک بہت بڑی

فہرست پیش کر سکتا ہوں جو اس ملک میں معمول اور مستعمل ہیں اور فارسی حرفوں میں بالکل نہیں لکھے جا سکتے ہیں اور اس وجہ سے بجائے ان کے مشابہہ معنی کے اور لفظ قائم کئے جا سکتے ہیں۔

آپ کے اس قول سے مجھ کو بہت تعجب ہوا کہ عدالتوں کی زبان ایسے حرفوں میں تحریر ہونی چاہئے جو قانون داں یعنی وکیلوں کے استعمال میں ہوں گویا کہ کسی حروف کا ان کی جانب سے استعمال ہونا عدالتوں میں اس کے رواج کے لئے دوسرے حرفوں پر ترجیح کی ایک وجہہ متصور ہونی چاہئے گو دوسرے حرف اس ملک کے لوگوں کے واسطے کیسی ہی مفید اور آسائش کی بات ہوں جس کی بھلائی اور بہبودی تمام عدالتوں اور گورنمنٹوں کا منشا اور مقصود ہوتا ہے۔ لوگ یہی کہتے ہیں کہ ناگری کے حرف اجرائے کار سرکاری میں حرج و تاخیر کا باعث ہوں گے مگر یہی اعتراض بنگالی زبان پر بھی اس سے پہلے کیا گیا تھا کہ رواج اس کا بنگالہ کی سرکاری عدالتوں میں ہوا۔

مجھ کو اس بات کا افسوس ہے کہ خواہ میری خواہ آپ کی جانب سے کوئی ایسی غلطی ہوئی جس کے سبب سے آپ نے بجائے لفظ قوسی زبان کے قدرتی زبان پڑھا مگر چاہئے تھا کہ ایسی صریح نمایاں غلطی کو آپ جان لیتے اور سمجھ لیتے کہ یہ غلطی تحریر میں میرے قلم سے بے ساختہ نکل گئی اور آپ کو لفظ مذکور کو میری چٹھی میں دوبارہ ملاحظہ فرمانا چاہئے۔

مجھ کو امید ہے کہ جو مباحثانہ طرز تقریر میں نے بغرض حجت و دلیل کے اس چٹھی میں برتا ہے اس پر آپ کچھ خیال نہ کریں گے کیونکہ آپ کی منزلت و خصلت کے لحاظ سے جیسا کچھ ادب و تعظیم آپ کی چاہئے، اس سے میں غافل و بے پروا نہیں ہوں اور واضح ہو کہ میں نے یہ طرز مباحثہ اپنے ملک کی بھلائی بہبودی کی خواہش کے جوش میں آ کر اختیار کیا ہے جو ایسا معاملہ ہے کہ اس کی تائید خاص آپ کی طرف سے بہت عمدہ طرح پر ظہور میں آئی ہے۔ مجھ کو امید ہے کہ بقول اپنے اب آپ کو سابق کی نسبت اس مقدمہ میں

جس پر بحث ہے غور و توجہہ کرنے کے لئے زیادہ وقت اور فرصت ہاتھ آئی ہوگی جس طرح سے کہ آپ نے ہماری باہمی خط و کتابت کو اس مقدمہ میں پہلے اخبار سائنٹیفک سوسائٹی میں چھاپا ہے میری التماس و التجا ہے کہ اس چٹھی کو معہ اپنے جواب کے آپ اخبار مذکور میں چھپوا دیں -

آپ کا دوست　　　　　　　　　　　　　　　　اله آباد انسٹیٹیوٹ

سرودا پرشاد سندل ۱　　　　　　　　　　　　　۲۰ دسمبر ۱۸۶۸ء

۱ - اخبار سائنٹفک سوسائٹی ، علیگڑھ ، بابت ۱۹ فروری ۱۸۶۹ء ، ص ۱۱۲ تا ص ۱۱۸

(۸)

اردو ڈفینس ایسوسی ایشن ، لکھنؤ کی ابتدائی کمیٹی کے اجلاس منعقد ۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء کی روئداد۔

مقام لائل ٹاؤن ہال ۳۰ اپریل ۱۹۰۰ء

جلسہ ابتدائی کمیٹی حمایت اردو۔ وقت ۵ بجے شام

حاضرین :

جناب نواب رضا علی خان صاحب
جناب شیخ علی عباس صاحب وکیل
جناب سید محمد آغا صاحب وکیل
جناب منشی عبدالحلیم صاحب شرر
جناب ڈاکٹر کرم حسین صاحب
جناب محمود حسن صاحب
جناب منشی عبدالستار صاحب
جناب منشی عبدالتقی صاحب
جناب خان بہادر حکیم نظیر حسین صاحب
جناب سید ساجد حسین صاحب
جناب حسن رضا صاحب
جناب منشی عاشق صادق صاحب
جناب مولوی نور الحسن صاحب
جناب مولوی انوار الحسن صاحب
وکیل ہائی کورٹ
جناب ابوالفتح جلال الدین سلطان
محمد شاہ اسمعیل صفوی صاحب
جناب حامد علی خان صاحب
بیرسٹر ایٹ لا ،
سکریٹری

جناب منشی فرزند علی صاحب
وکیل ہائی کورٹ
جناب منشی احتشام علی صاحب
جناب حافظ قطب الدین صاحب
جناب مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب
وکیل ہائی کورٹ
جناب منشی سب بخش صاحب
جناب مرزا نادر حسین صاحب
عرف منے آغا
جناب سلطان رضا علی مرزا صاحب
جناب شیخ مشیر حسین صاحب
جناب نواب مہدی حسن صاحب
فتح نواز جنگ
جناب محمد نظیر حسین صاحب
جناب حکیم عبدالعزیز صاحب
جناب مرزا عباس حسین صاحب ہوش
جناب سید خورشید حسن صاحب
جناب سید ظہور احمد صاحب
وکیل ہائی کورٹ ،
جوائنٹ سکریٹری

(۱) بتحریک جناب شیخ علی عباس صاحب و بتائید جناب منشی احتشام علی صاحب یہ تجویز ہوا کہ جناب ابو الفتح جلال‌الدین سلطان محمد شاہ اسمعیل مرزا صفوی صاحب صدر انجمن جلسہ ہوں۔

(۲) باتفاق رائے یہ تجویز ہوا کہ ممبران کمیٹی مندرجہ ذیل بھی جوائنٹ سکریٹری اس کمیٹی کے مقرر ہوں:

جناب منشی احتشام علی صاحب	جناب منشی عبدالحلیم صاحب
جناب منشی عبدالستار صاحب	جناب شیخ مشیر حسین صاحب
جناب مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب	جناب ڈاکٹر کرم حسین صاحب
وکیل ہائی کورٹ	

(۳) باتفاق رائے یہ امر طے پایا کہ جہاں جہاں کمیٹیاں حمایت اردو کے واسطے قائم ہوئیں ہوں، وہاں سے خط و کتابت کرکے تمام کے حالات دریافت کئے جائیں تاکہ اون کمیٹیوں سے اتحاد پیدا کیا جائے اور بعد دریافت حالات یہ تجویز کیا جائے۔ یہ کمیٹی سنٹرل کمیٹی قرار پاوے کہ جس کے ماتحت اور کمیٹیاں رہیں یا کہ یہ کمیٹی خود کسی اور سنٹرل کمیٹی کی ماتحت ہو۔

(۴) باتفاق رائے یہ امر طے ہوا کہ صوبہ اودھ کے خاص خاص سربر آوردہ اصحاب سے اس کمیٹی کی ممبری کی درخواست کی جائے اور جو اون میں سے منظور کریں وہ ممبر کئے جائیں۔

(۵) جو تار حسب تجویز جلسۂ عام بخدمت نواب لفٹینٹ گورنر صاحب و بحضور وائسرائے ہند پہنچ گئے تھے۔ اون کے مضمون پڑھے گئے اور باتفاق رائے منظور ہوئے۔

(۶) باتفاق رائے یہ تجویز ہوا کہ اس کمیٹی کے جلسوں میں سات ممبروں کا کورم ہوگا۔

(۷) جو تار بھیجے گئے تھے اون کے مصارف کے واسطے و نیز دیگر مصارف کے واسطے یہ امر باتفاق رائے تجویز ہوا کہ چندہ کھولا جائے اور جمیع ممبران کمیٹی کی خدمت میں فہرست چندہ بھیجی جائے۔

(۸) باتفاق رائے یہ تجوز ہوا کہ جناب سید ظہور احمد صاحب جوائنٹ سکریٹری ٹریژرر مقرر ہوں۔

(۹) باتفاق رائے یہ قرارپایا کہ آئیندہ جلسہ اس کمیٹی کا ۱۰ مئی کو بوقت ۵ بجے اسی مقام پر منعقد ہو۔

(۱۰) بعد شکریہ صدر انجمن صاحب جلسہ برخاست ہوا۔۱

۱ - آرکایوز آف فریڈم مووسنٹ، مخزونہ یونیورسٹی آف کراچی، کراچی

(۹)

۱۸ اگست ۱۹۰۰ء ، سنٹرل اردو ڈفینس ایسوسی ایشن کے خصوصی اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں نواب محسن الملک سید مہدی علی خان کی تاریخی تقریر کے بعض اجزا :

حضرات! ہماری کارروائی کی نسبت جو کچھ کہا گیا ہے اور جو اعتراض مختلف پیرایوں میں ہم پر کئے گئے ہیں ۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ہم اس پالیسی سے منحرف ہو رہے ہیں جس کو نہایت سوچ سمجھ کر اور جسے مضبوطی کے ساتھ ہم نے اختیار کیا تھا اور جس پر مدت دراز سے ہم عمل کر رہے تھے ۔

یہ اعتراض بالکل غلط ہے اور غلط فہمی پر مبنی ہے ۔ درحقیقت ہم نے اس پالیسی کو جس کے بانی سر سید احمد خاں مرحوم تھے اور جس کے فوائد انھوں نے ہم پر ثابت کر دئے تھے کہ ہم پولیٹکل ایجیٹیشن کے تلاطم میں نہ پھنسیں ، انھیں چھوڑا ۔

بظاہر اس تحریک کو پولیٹکل ایجیٹیشن سے منسوب کرنے اور ان کارروائیوں سے جو خاص خاص مسائل کے متعلق اسی طرح پر کی جاتی ہیں جدا سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ اس تحریک کو بہت زیادہ وسعت ہو گئی ہے اور اس صوبہ کے تمام مسلمانوں میں اس کا چرچا ہو رہا ہے اور ہر مقام پر مسلمان اس کے متعلق کارروائی کر رہے ہیں اس لئے بہت سے لوگ اس بات کو سمجھ نہیں سکتے کہ یہ بھی بالکل اس قسم کی تحریک ہے جو قانونی یا انتظامی معاملات میں عموماً کی جاتی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بجائے ایک خاص فریق یا ایک گروہ کے ہماری ساری قوم اس میں شامل ہے اور بجائے کسی خاص مقام کے ملک کے ہر گوشہ سے اس کے متعلق افسوس اور رنج کی صدا آ رہی ہے ۔

صاحبو ! جو لوگ ہماری اس تحریک کو اس پالیسی کے خلاف سمجھتے ہیں جو مرحوم سر سید نے اختیار کی تھی ۔ وہ یا دھوکا کھاتے ہیں یا ان کی کارروائی سے نا واقف ہیں ۔ میں ان کو بتانا چاہتا ہوں اور صاف صاف کہتا

ہوں کہ ہم نے اس معاملے میں یعنی اپنی زبان کے محفوظ رکھنے کے لئے وہی طریقے اختیار کئے ہیں جو خود مرحوم سر سید نے اس معاملہ کے متعلق ۱۸۷۳ء میں اختیار کئے تھے اور ہم لوگ اس دائرہ سے جو انھوں نے کھینچا تھا ذرا بھی باہر نہیں ہوئے۔ میں آپ کے روبرو ایک چھپا ہوا پمفلٹ جو سر سید کے کاغذات سے ابھی مجھے ملا ہے پیش کرتا ہوں۔ اس کے دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس زمانے میں ممالک مغربی و شمالی کے ہمارے معزز بھائی ہندوؤں نے سرکاری دفاتر اور اسکولوں میں دیو ناگری حروف جاری کرنے کے لئے گورنمنٹ سے درخواست کرنے کا ارادہ کیا تھا اور ایک عرضی ناگری جاری کرنے کی درخواست میں اپنی قوم میں دستخط ہونے کے لئے پھرائی تھی جس وقت مرحوم سر سید کو ان کے ارادے سے اطلاع ہوئی۔ انھوں نے ۹ دسمبر ۱۸۷۳ء کو الہ آباد میں ایک بڑا جلسہ کیا اور ایک سنٹرل کمیٹی قائم کی جس کے وہ خود سکریٹری ہوئے اور اس جلسہ کی یہ غرض قرار دی کہ وہ اردو زبان کے قائم رہنے کی حفاظت اور ناگری کے جاری نہ ہونے کی تدبیر کرے۔ اس کام کے لئے ہر ضلع میں کمیٹیاں قائم کی گئیں اور سنٹرل کمیٹی، الہ آباد کی شاخیں قرار دی گئیں۔ اور خود مرحوم سر سید نے ایک نہایت پر زور و مدلل سرکلر جاری کیا، جس میں انھوں نے ان اعتراضات کو صاف صاف ظاہر کیا جو دیو ناگری جاری کرنے کے متعلق تھے اور ان نقصانات کی تشریح کی جو اس کے جاری ہونے سے مسلمانوں کو پہنچنے والے تھے۔ یہ سرکلر اسی زمانہ کا چھپا ہوا اردو اور انگریزی میں اس وقت میرے ہاتھ میں ہے اور میں اسے میز پر رکھتا ہوں اور آپ لوگوں کو اس کے دیکھنے کا موقع دیتا ہوں اور اس سے میری غرض یہ ہے کہ اس معاملہ کو کسی تعصب یا جہالت یا قومی جذبہ کی وجہ سے صرف ہم لوگوں نے اہم اور مہتمم بالشان نہیں سمجھا بلکہ مرحوم سر سید نے جن کی دانشمندی اور پالیسی پر گورنمنٹ کو بھی اطمینان تھا۔ وہ بھی اس کو نہایت اہم اور ضروری سمجھتے تھے۔ پس جب کہ سر سید مرحوم نے صرف اس خیال سے کہ ہمارے ہندو بھائی گورنمنٹ میں دیو ناگری حروف جاری کرنے کے لئے

درخواست کرنے والے ھیں - مسلمانوں کی کمیٹی قائم کرنا مناسب سمجھا - تو ایسی حالت میں کہ لوکل گورنمنٹ نے بغیر دریافت کرنے ھمارے خیالات کے ایسا ایک حکم جاری کر دیا جس سے ھماری مادری زبان کو ضرر عظیم پہنچنے کا احتمال پیدا ھوتا ھے - ھمارا اپنی زبان کی حفاظت کے لئے متفقہ تدابیر کرنا اور ان نقصانات سے جو ھماری قوم کو اس سے پہنچنے والے ھیں آگاہ کرنا کس قدر زیادہ ضروری تھا - اگر ھم ایسے وقت میں ایسا نہ کرتے تو در حقیقت اس فرض کفایہ کے ترک کرنے کے گنہگار ھوتے جو قوم کا ھم پر ھے -

یہ رزولیوشن بھی جو گورنمنٹ نے جاری کیا ھے - ایسا ھی ھے کہ مسلمانوں کو اس کی شکایت ھے اور ھم اس میں اپنا نقصان دیکھتے ھیں - اور ھم اس پر اعتراض کرنے کو آمادہ ھیں - یہ سچ ھے کہ ھم مسلمان تعلیم میں دوسری قوموں سے کم ھیں مگر اور باتوں میں جن سے گورنمنٹ وقت پر ھم سے کام لے سکتی ھے - کم نہیں ھیں -

گو ھمارے ھاتھ میں قلم نہیں - اور ھمارے قلم میں زور نہیں اور اسی وجہ سے ھم دفتروں میں کم نظر آتے ھیں مگر ھمارے ھاتھ میں تلوار پکڑنے کی قوت ابھی باقی ھے (چئیرز)

مجھے ھرگز یقین نہیں ھے کہ گورنمنٹ ھماری زبان کو مرنے دے گی - بلکہ اس کو زندہ رکھے گی اور وہ کبھی مرنے نہ پائے گی مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کوشش اس کے مارنے کی دوسری طرف سے ھو رھی ھے اگر وہ برابر جاری رھی تو آئندہ کسی وقت ھماری زبان کو صدمہ پہنچے گا - یہی خوف ھے جس کے لئے یہ کوششیں ھو رھی ھیں تاکہ ھم اپنی زبان کو زندہ رکھ سکیں اور اگر خدا نخواستہ وہ وقت آوے کہ اس کو زندہ نہ رکھ سکیں تو اس کا جنازہ تو دھوم سے نکالیں ---

عاشق کا جنازہ ھے ذرا دھوم سے نکلے

میں اس موقع پر سر سید مرحوم کے ایک ریمارک کو نقل کرنا کافی سمجھتا ہوں۔ جو انھوں نے ۱۸۷۳ء کے ایک سرکلر میں شائع کیا تھا۔ ہمارے معزز لیڈر نے لکھا کہ :

”تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ناگری حروف اور ہندی زبان جاری ہونے سے بڑا نقصان ہوگا۔ در حقیقت جس قدر نقصان کہ مسلمانوں کو ہونا ممکن ہے وہ ہوگا کہ اس سے بڑھ کر بجز دین سے محروم کر دینے کے نقصان کے اور کوئی نقصان نہیں ہو سکتا۔“ ۱

۱۔ مجموعہ لکچرز و اسپیچز، حصہ اول، از نواب محسن الملک سید مہدی علی خان، مرتبہ ملک فضل دین ککے زئی، نول کشور گیس پرنٹنگ پریس، لاہور، ۱۹۰۴ء، ص ۳۷۹ تا ص ۳۹۴

مولوی عبدالحق اور بابو راجندر پرشاد معاہدہ

اردو ، ہندی اور ہندوستانی کے قضیے کے سلسلے کا وہ تاریخی معاہدہ جو بابو راجندر پرشاد اور مولوی عبدالحق کے درمیان پٹنہ میں ہوا اور ان کے دستخطوں سے مشتہر کیا گیا۔

بہار کی اردو کمیٹی کے جلسے منعقدہ ۲۸ اگست ۱۹۳۷ء میں ہمیں ہندوستانی زبان کے مسئلے پر بحث و گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ ہمیں فکر تھی کہ "اردو، ہندوی، ہندوستانی" کے مناقشے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی ہیں، انھیں دور کیا جائے اور خوشی کی بات ہے کہ اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر بحث کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس باب میں جن مباحث پر گفتگو ہوئی تو معلوم ہوا کہ ان میں بڑی حد تک ہم متفق الرائے ہیں۔ چنانچہ ہم کو اس پہ اتفاق ہے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان ہندوستانی ہونی چاہئے اور یہ اردو رسم الخط اور دیو ناگری دونوں میں تحریر اور جملہ دفتری اور تعلیمی اغراض کے لئے سرکاری زبان تسلیم کی جانی چاہئے۔ ہندوستانی سے ہم وہ زبان مراد لیتے ہیں جو شمالی ہند کی بولی میں سب سے بڑا مشترکہ عنصر ہے اور ہماری دانست میں اس ذخیرے میں الفاظ کے شمول اور انتخاب کا معیار یہی عام استعمال یا رواج ہونا چاہئے۔ مزید برآں ہماری رائے ہے کہ ہندی اور اردو دونوں کو بہ حیثیت ادبی زبانوں کے ترقی کرنے کے پورے مواقع دئے جانے چاہئیں۔ ہم یہ بھی تجویز کرتے ہیں کہ اردو اور ہندی اہل علم کے اشتراک عمل سے ہندوستانی الفاظ کی ایک اساسی لغت تالیف کرنے کی کوشش کی جائے۔ اس لغت کی تدوین اور اس قسم کے حل طلب مسائل کے واسطے جیسے اصطلاحی الفاظ کا انتخاب ہے، ایک مختصر نمائندہ کمیٹی کا انعقاد کسی قریبی تاریخ میں ہونا چاہئے جس میں اردو اور ہندی کے ایسے ذی اثر حامی شامل ہوں جو ان دونوں زبانوں

کو قریب تر لانے کی ضرورت مانتے ہیں اور ہندوستانی زبان کو ترقی دینے کے قابل ہیں تاکہ اس طرح دونوں زبانوں کے بولنے والوں میں حسن ظن پیدا کیا جائے۔''[۱]

شرح دستخط

(مولوی) عبدالحق

(بابو) راجندر پرشاد

۱۔ اردو، بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء، اور پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو، ص۸۷

قائد اعظم اور اردو

(۱)

۳۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم نے اقلیتوں کے تحفظ کے موضوع پر ریڈیو پاکستان، لاہور سے ایک تقریر انگریزی اور اردو میں نشر فرمائی۔ اس تقریر کا اردو حصہ اس جگہ نقل کیا جا رہا ہے کہ اردو زبان اور پاکستان کی تاریخ اور قائد اعظم کی زندگی کی یہ ایک نہایت اہم یادگار ہے۔ اردو تقریر کا حصہ رومن رسم الخط میں لکھا ہوا تھا۔

" پنجاب کے مسلمانوں کے بلانے پر میں اٹھائیس تاریخ کو لاہور آیا۔ جہاں تک مجھ سے ہو سکا اور جس طرح مجھ سے ہو سکا میں نے اصل اور ٹھیک ٹھیک حالات کا پتہ لگایا اور آج کل جو کچھ ہو رہا ہے اس کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی۔

آپ کو اس وقت تک معلوم ہو گیا ہوگا کہ لاہور میں جو اسپیشل کانفرنس ہوئی تھی اس میں کیا کیا فیصلے کئے گئے اور ان پر عمل کرنے کے کونسے قدم اٹھائے گئے۔

اس کانفرنس میں انڈین ڈومینین اور پاکستان کی حکومتوں کے نمائندے — ڈومینین آف انڈیا اور پاکستان کے گورنر جنرل یعنی لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور میں . . . ہمارے صلاح کار اور ماہرین شامل تھے۔

کانفرنس نے پورے پورے اتفاق کے ساتھ یہ اعلان کیا ہے کہ دونوں حکومتوں کا یہ پاک فرض ہے کہ وہ عوام کے مال اور جان کی ہر طرح سے حفاظت کریں گی اور ہزاروں کی تعداد میں جو لوگ اپنا گھر بار چھوڑ کر

بھاگ رہے ہیں ، ان کی حفاظت ، ان کی دیکھ بھال اور بہتری کے لئے دونوں حکومتیں اپنی اپنی طاقت کے مطابق سب کچھ کریں گی۔

میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جہاں تک پاکستان کی حکومت کا تعلق ہے ہم اپنی ذمہ داری کو سر انجام دینے کے لئے سب کچھ کریں گے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ڈومینین کی حکومت بھی ایسا ہی کرے گی۔

جن جن باتوں پر ہم نے اقرار کیا ہے اگر ان کو با عزت طریقے سے اور پورے طریقے سے اور پورے ارادے اور طاقت سے پورا کیا گیا تو مجھے یقین ہے کہ اس وقت جو نازک صورت حال پیدا ہو چکی ہے اس میں جلد ہی اچھی تبدیلی پیدا ہوگی اور ہم سب پھر امن و امان سے دونوں حکومتوں میں آزاد قوم کی طرح زندگی خوشی سے بسر کریں گے۔ پاکستان زندہ باد۔" ۱

۱۔ بہ حیثیت گورنر جنرل آف پاکستان (۴۸-۱۹۴۷ء) ، قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریریں (انگریزی) ، فیروز سنز لمیٹڈ ، کراچی ، ص ۳۵-۳۴

(۲)

۲۱ مارچ ۱۹۴۸ء کو ڈھاکے میں ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے قائد اعظم نے فرمایا :

میرے مخاطب نوجوان دوستو اور طالب علمو !

میں ایک ایسے شخص کی حیثیت میں کہ جس کے پیار اور محبت کی آغوش آپ کے لئے ہمیشہ کھلی رہی ہے اور جس نے دس سال دیانت و خلوص کے ساتھ آپ کے لئے کام کیا ہے آپ کو خبردار کرنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کسی سیاسی جماعت کے ہاتھوں میں کھیلیں گے تو سب سے بڑی غلطی کریں گے۔

یاد رکھئے موجودہ تبدیلی انقلابی نوعیت کی ہے یہ ہماری اپنی حکومت ہے۔ ہمارا ملک خود مختار و آزاد ہے۔ ہمیں اپنے مسائل پر آزاد قوم کی حیثیت سے غور کرنا چاہئے۔ غیر ملکی حکومت نے ہمیں غلامی کی زنجیروں میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ ہم نے ان زنجیروں کو توڑ کر نجات حاصل کرلی ہے۔

میرے نوجوان دوستو !

پاکستان کے حقیقی معمار آپ ہیں۔ کسی کا آلۂ کار بننے یا گمراہ ہونے سے بچئے۔ اپنے اندر مکمل اتحاد اور یگانگت پیدا کیجئے۔

لیکن میں واضح الفاظ میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اردو اور صرف اردو ہوگی۔ جو شخص آپ کو اس سلسلے میں غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش کرے وہ پاکستان کا پکا دشمن ہے۔ ایک مشترک قومی زبان کے بغیر کوئی قوم نہ تو پوری طرح متحد رہ سکتی ہے اور نہ کوئی کام کر سکتی ہے۔ "[۱]

۱ - بہ حیثیت گورنر جنرل آف پاکستان (۱۹۴۷ء - ۱۹۴۸ء)، قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریریں، فیروز سنز لمیٹڈ، کراچی، ص ۸۳ تا ص ۸۶

۲۴ مارچ ۱۹۴۸ء، ڈھاکہ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد کی تقریر کا ایک پیرا گراف

"پاکستان کی مشترکہ قومی زبان جو مملکت کے مختلف صوبوں کے درمیان تبادلۂ خیال کا ذریعہ ہو صرف ایک ہو سکتی ہے اور وہ اردو ہے۔ اردو کے سوا کوئی اور زبان نہیں ہو سکتی۔ ملک کی سرکاری زبان بھی ظاہر ہے کہ اردو ہی کو ہونا چاہئے۔ یہ وہ زبان ہے جسے برصغیر کے لاکھوں مسلمانوں نے پروان چڑھایا ہے اور جسے پاکستان کے اس سرے سے لے کر اس سرے تک سمجھا جاتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ ہے کہ اردو میں دوسری صوبائی زبانوں سے کہیں زیادہ اسلامی تہذیب و ثقافت کا بہترین سرمایہ پایا جاتا ہے اور اردو ہی دوسرے اسلامی ملکوں میں بولی جانے والی زبانوں سے قریب تر ہے۔"[۱]

۱- بہ حیثیت گورنر جنرل آف پاکستان (۱۹۴۷-۱۹۴۸ء)، قائد اعظم محمد علی جناح کی تقریریں ، فیروز سنز لمیٹڈ ، کراچی ، ص ۹۰

کتابیات

اردو کتابیں

۱ - آب حیات	محمد حسین آزاد	شیخ مبارک علی ، لاہور ، ۱۹۵۴ء
۲ - اپنی کہانی	راجندر پرشاد ، مترجمہ گوپی ناتھ امن	ساہتیہ اکیڈمی ، دھلی ، ۱۹۶۱ء
۳ - آثار الصنادید	سر سید احمد خاں	مطبع نامی ، کانپور ، ۱۹۰۴ء
۴ - آداب اردو	گلچین کرنالی	اردو مشن ، ملتان ، ۱۹۶۶ء
۵ - ادب و لسانیات	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ، ۱۹۷۰ء
۶ - ادبی و قومی تذکرے	پنڈت کشن پرشاد کول	انجمن ترقی اردو ، علیگڑھ ، ۱۹۵۱ء
۷ - ادبی رابطے ، لسانی رشتے	علامہ آئی - آئی - قاضی مترجمہ الیاس عشقی	مجلس ادب ، حیدرآباد ، ۱۹۷۶ء
۸ - ارباب نثر اردو	سید محمد ایم - اے	معین الادب ، لاہور ، ۱۹۵۰ء
۹ - اردو زبان کا ارتقاء	ڈاکٹر شوکت سبزواری	مکتبہ گہوارۂ ادب ، ڈھاکہ ، ۱۹۵۶ء
۱۰ - اردو سندھی کے لسانی رشتے	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی	مرکزی اردو بورڈ ، لاہور ، ۱۹۷۰ء

۱۱ - اردو شعرا کے تذکرے اور تذکرہ نگاری	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	مجلس ترقی ادب ، لاہور، ۱۹۷۲ء
۱۲ - اردو ، ہندی ، ہندوستانی	سجاد ظہیر	کتب پبلشرز لمیٹڈ ، بمبئی ، ۱۹۴۷ء
۱۳ - آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان	ڈاکٹر ناموس محمد شجاع	یونائیٹڈ پبلشرز، لاہور، ۱۹۴۷ء
۱۴ - اشرف علی تھانوی اور تحریک آزادی	پروفیسر احمد سعید	خالد ندیم پبلیکیشنز ، راولپنڈی، ۱۹۷۲ء
۱۵ - اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ	ڈاکٹر مظہر بقا	ادارہ تحقیقات اسلامی ، اسلام آباد ، ۱۹۷۳ء
۱۶ - اعمال نامہ	سر رضا علی	ہندوستانی پبلشرز، دھلی ، ۱۹۴۳ء
۱۷ - اقبال کے آخری دو سال	عاشق حسین بٹالوی	اقبال اکیڈمی ، لاہور، ۱۹۶۹ء
۱۸ - انجمن پنجاب " تاریخ و خدمات " (قلمی)	ڈاکٹر صفیہ تمنائی	مخزونہ ڈاکٹر محمود حسین ، لائبریری جامعہ کراچی
۱۹ - انجمن ترقی اردو ، کراچی کی پچیس سالہ کارکردگی کی رپورٹ	افسر صدیقی امروہوی	فائن آرٹ لیتھو ورکس ، کراچی ، ۱۹۳۰ء
۲۰ - انگریزوں کے عہد میں ہندوستان کے تمدن کی تاریخ	عبداللہ یوسف علی	کریم سنز ، کراچی ، ۱۹۶۷ء
۲۱ - انگریزوں کی لسانی پالیسی	سید مصطفیٰ علی بریلوی	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، کراچی ، ۱۹۷۰ء

۲۲ - انتخاب گنج شریف	مرتبہ شرافت نوشاھی	دارالمورخین ، لاھور ، ۱۹۷۵ء
۲۳ - باغ و بہار	میر امن مرتبہ ڈاکٹر سید ابوالخیر کشفی	اردو اکیڈمی سندھ ، کراچی ، ۱۹۶۵ء
۲۴ - بال گنگا دھر تلک	———	لال اسٹیم پریس ، لاھور ، ۱۹۱۹ء
۲۵ - برصغیر میں مسلم قومیت کے تصور کا ارتقا	محمد الیاس فارانی	ادارہ مطبوعات پاکستان ، کراچی ، ۱۹۶۸ء
۲۶ - برصغیر پاک و ھند کی ملت اسلامیہ	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، جامعہ کراچی ، کراچی ، ۱۹۶۷ء
۲۷ - بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جہد آزادی	عبداللہ ملک	مجلس ترقی ادب ، لاھور ، ۱۹۶۷ء
۲۸ - بے تیغ سپاھی	صدیق علی خان	الائیز بک کارپوریشن ، کراچی ، ۱۹۷۱ء
۲۹ - پاکستان منزل بہ منزل	سید شریف الدین پیر زادہ	گلڈ انجمن کتاب گھر ، کراچی ، ۱۹۶۵ء
۳۰ - پاکستان ناگزیر تھا	سید حسن ریاض	شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ، جامعہ کراچی ، کراچی ، ۱۹۷۰ء
۳۱ - پنجاب میں اردو	پروفیسر حافظ محمود شیرانی	معین الادب ، لاھور ، (سن ندارد)
۳۲ - پنجاہ سالہ تاریخ انجمن ترقی اردو	سید ھاشمی فرید آبادی	انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۵۳ء

۳۳ - تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ ترجمہ مرزا محمد عسکری	نول کشور، لکھنؤ، ۱۹۲۹ء، طبع سوم
۳۴ - تاریخ ادب ہندوستانی (اردو ترجمہ قلمی)	گارسین دتاسی ترجمہ لیلیان سکتسان ندرو	مخزونہ ڈاکٹر محمود حسین لائبریری، جامعہ کراچی
۳۵ - تاریخ ادب اردو، جلد اول	ڈاکٹر جمیل جالبی	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۷۵ء
۳۶ - تاریخ اورنٹیل کالج، لاہور	ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار	پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۶۲ء
۳۷ - تاریخ نظریۂ پاکستان	پیام شاہجہاں پوری	انجمن حمایت اسلام، لاہور، ۱۹۷۰ء
۳۸ - تحریک پاکستان کا ایک باب	محمد سرور	سندھ ساگر اکیڈمی، لاہور، ۱۹۷۵ء
۳۹ - تحریک آزادی اور مسلمان	مولانا ابوالاعلیٰ مودودی	اسلامی پبلیکیشنز لمیٹڈ، لاہور، ۱۹۶۴ء
۴۰ - تحریک پاکستان	صاحبزادہ عبدالرسول	ایم - آر برادر، لاہور، ۱۹۷۲ء
۴۱ - تحریک پاکستان اورنیشنلسٹ مسلمان	چودھری حبیب احمد	البیان، چوک انارکلی، لاہور، ۱۹۶۶ء
۴۲ - تحریک آزادی	صلاح الدین ناسک	عزیز بک ڈپو، لاہور، ۱۹۷۲ء
۴۳ - تمدن ہند پر اسلامی اثرات	ڈاکٹر تارا چند مترجمہ ڈاکٹر مسعود احمد	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۴ء
۴۴ - تذکرہ اہل دہلی	سر سید احمد خاں	انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء

۴۵ - تذکرہ محسن	محمد امین زبیری	جامع برقی پریس ، دھلی ، ۱۹۳۵ء
۴۶ - تذکرہ وقارالملک	محمد امین زبیری	اسلامیہ ھائی اسکول ، اٹاوہ ، ۱۹۲۵ء
۴۷ - تلاش ھند ، حصہ اول	پنڈت جواھر لال نہرو	مکتبہ جامعہ ، دھلی ، ۱۹۴۶ء
۴۸ - تعلیم و تہذیب	پروفیسر حمید احمد خان	مجلس ترقی ادب ، لاھور ، ۱۹۷۵ء
۴۹ - تعلیمی مسائل	سید الطاف علی بریلوی	آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس ، کراچی ، ۱۹۶۵ء
۵۰ - ثقافت پاکستان	شیخ محمد اکرام	ادارہ مطبوعات پاکستان ، کراچی (سن ندار)
۵۱ - جامع القواعد	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	مرکزی اردو بورڈ ، لاھور ، ۱۹۷۱ء
۵۲ - جناح گاندھی گفت و شنید	آل انڈیا مسلم لیگ	دھلی ، ۱۹۴۴ء
۵۳ - حصول پاکستان	پروفیسر احمد سعید	ایجوکیشنل اسپوریم ، لاھور ، ۱۹۷۵ء
۵۴ - حیات جاوید	الطاف حسین حالی	آئینہ ادب ، لاھور ، ۱۹۶۶ء
۵۵ - حیات محسن	محمد امین زبیری	مسلم یونیورسٹی ، علیگڑھ ، ۱۹۳۴ء
۵۶ - خطبات عبدالحق	مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی	انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۵۲ء
۵۷ - خطبات عالیہ ، حصہ اول	مرتبہ انوار احمد زبیری	مسلم یونیورسٹی ، علیگڑھ ، ۱۹۲۷ء

۵۸ - خطبات عالیہ ، حصہ دوم و سوم	مرتبہ انوار احمد زبیری	مسلم یونیورسٹی ، علیگڑھ ، ۱۹۲۸ء
۵۹ - خطبات گارسین دتاسی ، حصہ اول و دوم	ـــــــ	انجمن ترقی اردو ، اورنگ آباد، ۱۹۳۵ء
۶۰ - خطبات گارسین دتاسی ، حصہ دوم	ـــــــ	انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۷۴ء ، طبع دوم
۶۱ - خطوط غالب	مرتبہ غلام رسول مہر	پنجاب یونیورسٹی ، لاہور، ۱۹۶۹ء
۶۲ - داستان تاریخ اردو	مولانا حامد حسن قادری	لکشمن نرائن اگروال ، آگرہ ، ۱۹۵۷ء، طبع سوم
۶۳ - داستان زبان اردو	ڈاکٹر شوکت سبزواری	انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۶۰ء
۶۴ - داستان غدر	ظہیر دہلوی	مطبع جدید ، لاہور، ۱۹۵۵ء
۶۵ - دریائے لطافت	انشا اللہ خان مترجمہ پنڈت دتاتریا کیفی	انجمن ترقی اردو، ۱۹۳۵ء
۶۶ - دعوت اسلام	تھامس آرنلڈ مترجمہ عنایت اللہ دہلوی	مسعود پبلشنگ ہاؤس ، کراچی ، ۱۹۶۴ء
۶۷ - دکن میں اردو	نصیر الدین ہاشمی	اردو مرکز ، لاہور، ۱۹۵۲ء
۶۸ - راجہ رام موہن رائے	منشی نتھو رام	مطبع خادم التعلیم پنجاب ، لاہور، ۱۸۹۳ء

٦٩ - رپورٹ کارکردگی تحریک تنظیم (جولائی ۱۹۳۰ء تا دسمبر ۱۹۳۰ء)	——	سبحان اللہ پریس ، الہ آباد ، ۱۹۳۰ء
۷۰ - زبان اور اردو زبان	ڈاکٹر فرمان فتح پوری	قمر کتاب گھر ، کراچی ، ۱۹۷۲ء
۷۱ - سرسید احمد خان کے خطوط	مرتبہ مولوی وحید الدین سلیم	حالی پریس ، پانی پت ، ۱۹۰۱ء
۷۲ - سرگذشت ادارہ ادبیات اردو	حمید الدین شاہد	حیدر آباد دکن ، ۱۹۴۰ء
۷۳ - سن اٹھارہ سو ستاون کے مجاہد شعرا	امداد صابری	مکتبہ شاہراہ ، دھلی ، ۱۹۵۹ء
۷۴ - سن ستاون	سندر لال	انجمن ترقی اردو ، دھلی ، ۱۹۵۵ء
۷۵ - سن اٹھارہ سو ستاون کا تاریخی روزنامچہ	خلیق احمد نظامی	ندوۃ المصنفین ، دھلی ، ۱۹۵۹ء
۷۶ - سید محمود کا خطبہ مع ضمیمہ	مسلم ایجوکیشنل کانفرنس	مطبع مفید عام ، آگرہ ، ۱۸۹۴ء
۷۷ - سیاست ملیہ	محمد امین زبیری	مطبع عزیزیہ ، آگرہ ، ۱۹۴۱ء
۷۸ - سی - پی میں کانگریس راج	حکیم اسرار احمد کریوی	شہر و ضلع مسلم لیگ ، ناگپور ، ۱۹۴۱ء
۷۹ - سیاسی تنظیموں کی ابتدائی روئیدادیں جلد اول قلمی	——	مخزونہ آرکایوز آف فریڈم مووسنٹ ، جامعہ کراچی ، کراچی
۸۰ - شکست کے بعد	کرشن چندر	البیان ، چوک انارکلی ، لاہور ، ۱۹۶۶ء

۸۱ - شاہراہ پاکستان	چودھری خلیق الزماں	انجمن اسلامیہ ، کراچی ، ۱۹۶۷ء
۸۲ - صحافت ، پاکستان و ہند میں	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید	مجلس ترقی ادب ، لاہور، ۱۹۶۳ء
۸۳ - صوبہ شمالی و مغربی کے اخبارات و مطبوعات	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو ، علیگڑھ، ۱۹۶۲ء
۸۴ - ظہور پاکستان	چودھری محمد علی	مکتبۂ کاروان ، لاہور، (سن ندارد)
۸۵ - علیگڑھ تحریک اور قومی نظمیں	سید الطاف علی بریلوی اور محمد ایوب قادری	اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ، کراچی ، ۱۹۷۰ء
۸۶ - کتاب الہند	ابو ریحان البیرونی مترجمہ اصغر علی	انجمن ترقی اردو، ۱۹۴۱ء
۸۷ - کلیات شبلی	مرتبہ سید سلیمان ندوی	معارف پریس ، اعظم گڑھ، ۱۹۴۰ء
۸۸ - کلیات نظم حالی	مرتبہ ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی	مجلس ترقی ادب ، لاہور، ۱۹۷۰ء
۸۹ - کمپنی کی حکومت	باری	مکتبۂ اردو ، لاہور، ۱۹۴۴ء
۹۰ - کیفیہ	برجموہن دتاتریا کیفی	معین الادب ، لاہور، ۱۹۵۰ء
۹۱ - کیفیت و روئیداد	کل ہندی اردو کانفرنس ، دھلی	انجمن ترقی اردو، دھلی ، ۱۹۳۹ء
۹۲ - قائد اعظم میری نظر میں	ایم - اے - ایچ اصفہانی	مکتبہ شاھکار، لاہور، ۱۹۷۶ء

۹۳ - قومی تہذیب کا مسئلہ	ڈاکٹر سید عابد حسین	انجمن ترقی اردو، علیگڑھ، ۱۹۵۵ء
۹۴ - گلکرسٹ اور اس کا عہد	محمد عتیق صدیقی	انجمن ترقی اردو، علیگڑھ، ۱۹۶۰ء
۹۵ - لباب الالباب	محمد عوفی مرتبہ سعید نفیسی	تہران بہمن ماہ، ۱۳۳۵
۹۶ - لیکچر در مخالفت و اظہار مضرت انڈین نیشنل کانگریس	ڈپٹی نذیر احمد	مطبع مفید عام، آگرہ، ۱۸۸۸ء
۹۷ - مارشل لا سے مارشل لا تک	سید نور احمد	دین محمدی پریس، لاہور، ۱۹۶۵ء
۹۸ - مجموعہ لیکچرز و اسپیچز، حصہ اول	نواب محسن الملک مرتبہ فضل دین ککے زئی	نول کشور پریس، لاہور، ۱۹۰۴ء
۹۹ - مرحوم دھلی کالج	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو، دھلی، ۱۹۴۵ء
۱۰۰ - مسلمانوں کا روشن مستقبل	طفیل احمد منگلوری	نظامی پریس، بدایوں، ۱۹۳۸ء
۱۰۱ - مرقع کانفرنس	مرتبہ انوار احمد مارھروی	مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ، ۱۹۳۵ء
۱۰۲ - مضامین سلیم، جلد اول	مولوی وحید الدین سلیم	انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۱ء
۱۰۳ - مقالات محمود شیرانی	مرتبہ مظہر محمود شیرانی	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۶ء
۱۰۴ - مقالات سر سید، حصہ ہشتم و نہم	مرتبہ اسمعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۶۲ء

۱۰۵ - مقالات سر سید ، حصہ پانزدهم	مرتبہ اسمعیل پانی پتی	مجلس ترقی ادب ، لاهور ، ۱۹٦۳ء
۱۰٦ - مقالات منتخبہ اورنٹیل کالج میگزین	مرتبہ پروفیسر سید وقار عظیم	اورنٹیل کالج ، لاهور ، ۱۹۷۰ء
۱۰۷ - مقالات گارسین دتاسی ، حصہ اول و دوم	——	انجمن ترقی اردو ، دهلی ، ۱۹۴۳ء
۱۰۸ - مقدمہ تاریخ زبان اردو	ڈاکٹر مسعود حسین خان	حالی پبلشنگ هاؤس ، دهلی ، (سن ندارد)
۱۰۹ - مقدمہ هندوستانی لسانیات کا خاکہ	پروفیسر احتشام حسین	دانش محل ، لکھنؤ ، ۱۹۴۸ء
۱۱۰ - مقدمہ قواعد اردو	مولوی عبدالحق	انجمن ترقی اردو ، دهلی ، ۱۹۴۵ء
۱۱۱ - موج کوثر	شیخ محمد اکرم	فیروز سنز ، لاهور ، ۱۹٦۸ء
۱۱۲ - نامہ اعمال ، حصہ اول و دوم	سر محمد یامین خان	آئینہ ادب ، لاهور ، ۱۹۷۰ء
۱۱۳ - نقد عبدالحق	ڈاکٹر سید معین الرحمن	نذر سنز ، لاهور ، ۱۹٦۸ء
۱۱۴ - نقوش سلیمانی	علامہ سید سلیمان ندوی	اردو اکیڈمی ، سندھ ، کراچی ، ۱۹٦۷ء
۱۱۵ - نیا هندوستان	رجنی پام دت	قومی دارالاشاعت ، لاهور ، (سن ندارد)
۱۱٦ - وحید الدین سلیم ، حیات اور ادبی خدمات	ڈاکٹر منظر عباس نقوی	علیگڑھ یونیورسٹی ، ۱۹٦۹ء
۱۱۷ - وضع اصطلاحات	مولوی وحید الدین سلیم	انجمن ترقی اردو ، کراچی ، ۱۹۵۴ء

۱۱۸ - وقار حیات	محمد اکرام اللہ خان ندوی	علیگڑھ یونیورسٹی ، ۱۹۲۵ء
۱۱۹ - ہماری قومی جد و جہد (۱۹۳۸ء)	عاشق حسین بٹالوی	پاکستان ٹائمز پریس ، لاہور، ۱۹۶۶ء
۱۲۰ - ہماری قومی جد و جہد (۱۹۳۹ء)	عاشق حسین بٹالوی	پاکستان ٹائمز پریس ، لاہور، ۱۹۶۸ء
۱۲۱ - ہماری قومی جد و جہد (۱۹۴۰ء تا ۱۹۴۲ء)	عاشق حسین بٹالوی	پاکستان ٹائمز پریس ، لاہور، ۱۹۷۵ء
۱۲۲ - ہمارے ہندوستانی مسلمان	ڈبلو۔ ڈبلو ہنٹر مترجمہ صادق حسین	قومی کتب خانہ ، لاہور، ۱۹۵۵ء
۱۲۳ - ہندوستانی کیا ہے؟	(آل انڈیا ریڈیو کی تقریریں)	مکتبۂ جامعہ ، دہلی ، ۱۹۳۹ء
۱۲۴ - ہندی ادب کی تاریخ	ڈاکٹر محمد حسن	انجمن ترقی اردو ، علیگڑھ ، ۱۹۵۵ء
۱۲۵ - یادوں کی دنیا	ڈاکٹر یوسف حسین خان	دارالمصنفین ، اعظم گڑھ ، ۱۹۶۷ء

رسائل

(۱)		(۲)	

اردو (سه ماهی)

(۱)		(۲)	
جنوری	۱۹۳۶ء	جنوری	۱۹۳۸ء
اپریل	۱۹۳۶ء	اپریل	۱۹۳۸ء
اگست	۱۹۳۶ء	جولائی	۱۹۳۸ء
جنوری	۱۹۳۷ء	اکتوبر	۱۹۳۸ء
اپریل	۱۹۳۷ء	جنوری	۱۹۴۱ء
جولائی	۱۹۳۷ء	جنوری	۱۹۴۸ء
اکتوبر	۱۹۳۷ء	اپریل	۱۹۵۱ء

اخبار سائنٹیفک سوسائٹی، علیگڑھ

(۱)		(۲)	
۱۹ اگست	۱۹۶۷ء	۲۳ اپریل	۱۹۶۹ء
۲۲ جنوری	۱۹۶۹ء	۲ جولائی	۱۹۶۹ء
۱۹ فروری	۱۹۶۹ء	۳ دسمبر	۱۹۶۹ء
۵ مارچ	۱۹۶۹ء		

اردو معلیٰ (دلی کالج میگزین، لسانیات نمبر)، دهلی

۱۹۶۲ء

الناظر، لکھنؤ

(۱)		(۲)	
جون	۱۹۱۵ء	جون	۱۹۱۶ء
مارچ	۱۹۱۶ء	اکتوبر	۱۹۱۶ء

خاور (ماهنامه) ڈهاکه

(۱)		(۲)	
مئی	۱۹۵۲ء	جولائی	۱۹۵۲ء

خیابان (خاص نمبر) شعبہ اردو، پشاور یونورسٹی میگزین

دسمبر ۱۹۶۴ء

دلگزار (ماہنامہ)، لکھنؤ

اپریل ۱۹۱۲ء — دسمبر ۱۹۱۴ء

اکتوبر ۱۹۱۲ء — جنوری ۱۹۱۵ء

نومبر ۱۹۱۲ء — جنوری ۱۹۱۷ء

دی کراچی لا جرنل (ایس ایم لا کالج میگزین)، کراچی

۱۹۶۴ء

صحیفہ، لاہور

جنوری ۱۹۶۸ء — اپریل ۱۹۶۸ء

جولائی ۱۹۶۸ء — اپریل ۱۹۷۲ء

مخزن (ماہنامہ)، دہلی

اکتوبر ۱۹۰۴ء — فروری ۱۹۰۶ء

فروری ۱۹۰۵ء — دسمبر ۱۹۰۸ء

مارچ ۱۹۰۵ء — مارچ ۱۹۰۹ء

جنوری ۱۹۰۶ء

معارف (ماہنامہ)، علیگڑھ

اپریل ۱۸۹۹ء — دسمبر ۱۹۰۱ء

منشور (ہفت روزہ)، دہلی

۷ جولائی ۱۹۴۰ء — ۲۸ جون ۱۹۴۲ء

۶ جون ۱۹۴۳ء — ۲۶ دسمبر ۱۹۴۳ء

نقوش، لاہور

فروری ۱۹۶۲ء

نگار، لکھنؤ

جون	۱۹۳۶ء	جون	۱۹۵۱ء
جولائی	۱۹۳۶ء	اگست	۱۹۵۱ء

ہماری زبان (پندرہ روزہ)، دھلی

یکم اپریل	۱۹۳۹ء	۱۶ ستمبر	۱۹۴۰ء
۱۶ اپریل	۱۹۳۹ء	۱۶ مارچ	۱۹۴۵ء
یکم مئی	۱۹۳۹ء	۱۶ جنوری	۱۹۴۶ء
یکم ستمبر	۱۹۳۹ء	یکم فروری	۱۹۴۶ء
۱۶ ستمبر	۱۹۳۹ء		

انگریزی کتابیں

1. Afzal, M. Rafique — Selected Speeches and Statements of Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah (1911—34) and (1947-48), Lahore Research Society of Pakistan, University of Panjab, 1966.

2. Ahmad, Jamiluddin — Some Recent Speeches of Mr. Jinnah, Lahore, 1952 Ed., 2 Vols.

3. Ahmed, Jamiluddin — Speeches and Writings of Mr. Mohammad Ali Jinnah, Vol. II, Mohammad Ashraf, Lahore, 1947.

4. Ahmad, Aziz — Islamic Modernism in India and Pakistan (1857—1964), London, Oxford University Press, 1967.

5. Ahmad, Aziz — Studies in Islamic Culture in the Indian Environment, London, 1964.

6. Allana, G. — Our Freedom Fighters (Twenty one great lives), Karachi, 1969.

7. Allana, G. — Pakistan Movement: Historical Documents, Karachi.

8. Allana, G. — Quaid-i-Azam: The Story of Nation, Karachi.

9. Al Mujahid, Sharif — Indian Secularism, Karachi, 1970.

10. Ambedkar, B.R. — Pakistan or Partition of India, Bombay, 1946.

11. Arnold, T.W. — The Preaching of Islam, Lahore, 1950.

12. Azad, Abul Kalam — India Wins Freedom, Calcutta, 1959.

13. Aziz, K.K. — The All India Muslim Conference (1928-1935): A Documentry Record, Karachi, 1972.

14. Aziz, K.K. — The Making of Pakistan, A Study in Nationalism, London, 1967.

15. Aziz, K.K. — Amir Ali: His Life and Work, Lahore, 1968.

16. Bonerji, S.N. — Nation in the Making, Oxford, 1925.

17. Bailey, T. Grahame — Studies in Northern Languages, London, 1938.

18. Bayly, C.A. — The Local Roots of Indian Politics (Allahabad) Oxford, 1975.

19. Beni Parasad — India's Hindu-Muslim Question, London, 1946.

20. Bolitho, Hector — Jinnah: Creator of Pakistan, London: John Murray, 1954.

21. Bress, Paul, R. — Language, Religion and Politics, Cambridge University Press, 1974.

22. Chand, Dr. Tara — Influence of Islam on Indian Culture, India Press, Allahabad, 1946.

23. Chand, Dr. Tara — The Problem of Hindustani, Indian Periodical Ltd., Allahabad, 1944.

24. Choudhuri, Nirad. C. — The Continent of Circe History: An essay on the people of India, London, 1965.

25. Choudhuri, Nirad. C. — The Autobiography of an Unknown Indian, London—New York, 1951.

26. Coupland, R. — Indian Politics (1936-1942), Oxford University, London, 1943.

27. Coupland, R. — India: A Resettlement, London, 1945.

28. Dani, Ahmed Hasan — Historical Writings on Pakistan (Methodology and Interpretation), Vol. II, University of Islamabad, 1974.

29. Dass, M.N. — India Under Minto-Morley, London, 1964.

30. Das, Gupta Jyotrindra — Language Conflict and National Development: Group politics and National language policy in India, Berkeley: University of California Press, 1970.

31. Dayakovo, A.M. — The National Problem in India Today, Moscow, 1966.

32. Dodwell, H.H., *Ed.* — The Cambridge History of the British Empire: Vols. i-vi, London: Cambridge University Press, 1932.

33. Dobbin, Christine, E. Basic Documents in the Development of Modern India and Pakistan (1835-1947), London, 1970.

34. Durrani, F.K. Khan The Meaning of Pakistan, Lahore, 1944.

35. El-Hamza Pakistan: A Nation, Lahore, Mohammad Ashraf, 4th ed., 1946.

36. Elliot, Sir H. The History of India as told by its own historians, Vol. III, London, 1969.

37. Frazer, R.W.A. Literary History of India, London, 1893.

38. Feldman, Herbert From Crisis to Crisis (Pakistan 1962-1969), Lahore, 1972.

39. Gauba, K.L. Passive Voices: A penetrating Study of Muslims in India, Lahore, 1975.

40. Gandhi, Mahatma The Language problem, edited by T. Hingorani, Karachi, 1942.

41. Gazeteer of the Punjab, Provincial Vol. The Govt. of Punjab, 1888-89.

42. Gopal, R. Indian Muslims: A Political History (1858-1947), Bombay, 1959.

43. Graham, G.F.I. The life and work of Sir Sayyied Ahmed Khan, London, Rev. ed., 1909.

44. Grierson, G.A. Linguistic Survey of India, Vol. VI, Calcutta, 1904 and Vol. IX, Calcutta, 1916.

45. Haq, A.K. Fazlul Muslim Sufferings under Congress Rule, Calcutta, 1939.

46. Hardy, P. — The Muslims of British India, Karachi, 1973.

47. Hamid, A. — Muslim Separatism in India: A Brief Survey (1858-1947), Oxford, 1967.

48. History of the Freedom Movement, Vol. III, Pt. I, Pakistan Historical Society, Karachi, 1961.

49. History of Freedom Movement, Vol. III, Pt. II, Pakistan Historical Society, Karachi, 1963.

50. History of the Freedom Movement, Vol. IV, Pt. I & II, Pakistan Historical Society, Karachi, 1970.

51. Hunter, W.W. — Our Indian Musalmans, Calcutta, 1945.

52. Husain, Zakir — Basic National Education [with Foreword by Mahatma Gandhi, Wardha (C.P.)], 1938.

53. Ikram, S.M. — Modern Muslim India and the birth of Pakistan (1858-1951), Lahore, 1965.

54. Ikram, S.M. and Spear Percival — The Cultural Heritage of Pakistan, Oxford, 1958.

55. Ispahani, M.A.H. — Quaid-e-Azam, As I Knew Him, Karachi, 1966.

56. Iqbal, Afzal — Selected writings and speeches of Maulana Mohammad Ali, Vol. I, Lahore, 1969.

57. Jahan, Rounaq — Pakistan—Failure in National Integration, Lahore, 1972.

58. Jain, M.S. — The Aligarh Movement; Its Origin and Development, Agra, 1965.

59.	Jinnah, M.A.	Quaid-i-Azam Mohammad Ali Jinnah: Speeches as Governor General, 1947-48, Ferozsons Ltd., Karachi.
60.	Khan, Abdul Waheed	India Wins Freedom: The other side, Karachi, 1961.
61.	Khan, Dr. Shafique Ali	Two Nation Theory, Markaz-i-Adab, Hyderabad, 1973.
62.	Khan, S. Ali	India of Today, Bombay, 1908.
63.	Khaliquzzaman, C.	Pathway to Pakistan, Lahore, 1961.
64.	Khan, The Aga	Memoirs of the Aga Khan, New York, 1954.
65.	Key, F.E.	History of Hindi Literature, Mysore, 1920.
66.	Latif, Syed A.	The Muslim Problem in India, Bombay, 1939.
67.	Latif, Syed A.	The Cultural Problem of India, Bombay, 1939.
68.	Lovett, Sir Verney	A History of the Indian Nationalist Movement, London, 1968.
69.	Mahajan, V.D.	Constitutional History of India, Delhi, 1962.
70.	Matin, H.M.	National Language of Pakistan, Karachi, 1954.
71.	Majumdar, R.C.	An Advanced History of India, Calcutta, 1950.
72.	Malik, Hafeez	Muslim Nationalism in India and Pakistan, Washington, 1963.

73. May, L.S. — The Evolution of Indo Muslim Thought after 1857, Lahore, 1970.

74. Mehtar, M.A. — Whys of Great Indian Conflict, Mohammad Ashraf, Lahore, 1947.

75. Mohammad, Din — Hindustani: A Politico - Linguistic Catchword, Amritsar, 1939.

76. Mohammad, Shan — Sir Syed Ahmad Khan (A Political Biography), Lahore, 1976.

77. Munshi, K.M. — The Changing Shape of Indian Politics, Poona, 1946.

78. Mujamdar, R.C. — History of Freedom Movement in India, Vol.-II, Calcutta, 1963.

79. Nehru, Jawahar Lal — An autobiography, Allied Publishers, New Delhi, 1962.

80. Nehru, Jawahar Lal — The Discovery of India, New York, 1946, 4th ed., Lahore, 1956.

81. Noman, Mohammad — Muslim India (Rise and Growth of All India Muslim League), Kitabistan, Allahabad, 1942.

82. Nurullah and Naik, J.P. — A Student's History of Education for India, Macmillan & Co. Ltd., Bombay, 1955.

83. Pannikar, K.M. — Asia and Western Dominance, London, 1959.

84. Pannikar, K.M. — Indian Nationalism: Its Origin, History and Ideas, London, 1920.

85. Pannikar, K.M. — A Survey of Indian History, Delhi, 1957.

86. Panjabi, A. — Confederacy of India, Lahore, 1939.

87. Percival, Griffith — The British Impact on India, London, 1952.

88. Pirzada, Syed Sharifuddin Evolution of Pakistan, Lahore, 1963.

89. Pirzada, Syed Sharifuddin Foundations of Pakistan, Vol. I: All India Muslim League Documents (1906-1924), Karachi, 1969.

90. Pirzada, Syed Sharifuddin Foundations of Pakistan, Vol. II (1924—1927), Karachi, 1970.

91. Qureshi, I.H. The Muslim Community of the Indo-Pakistan Subcontinent (610-1947), The Hague, 1962.

92. Qureshi, I.H. The Struggle for Pakistan, University of Karachi, 1974.

93. Rajput, A.B. Muslim League: Yesterday and Today, Lahore, 1948.

94. Rahman, Dr. M. From Consultation to Confrontation (1906—1912), London, 1970

95. Ramnathan, G. Educational Planning and National Integration, Bombay, 1974.

96. Riazul Islam Islamic History (A History of Muslims in Indo-Pakistan Subcontinent), National Text Book Corporation Ltd., Lahore, 1961.

97. Robbinson, Francis Separatism Among Indian Muslims, Cambridge University Press, 1974.

98. Saksena, Ram Babu A History of Urdu Literature, Sind Sagar Academy, Lahore, 1975.

99. Sarkar, Jadunath The Fall of the Mughal Empire, Calcutta, 1938.

100. Sampurnanand Memories and Reflections, Bombay, 1962.

101. Sayeed, K.B. The Political System of Pakistan, Boston, 1967.

102. Sayeed, K.B. Pakistan: The Formative Phase, Karachi, 1960.

103. Sayyid, Matloobul Hasan Mohammad Ali Jinnah: A Political Study, Lahore, 1953.

104. Sharma, J. Indian National Congress, Delhi, 1958.

105. Singh, Durlab A Complete Record of Unity Talks, Hero Publications, Lahore, 1945.

106. Sitaramyya, Paithabhi History of Indian National Congress, Vol. I, Madras, 1935 and Vol. II, Bombay, 1947.

107. Seal, Anil The Emergence of Indian Nationalism, Cambridge, 1971.

108. Spear, Percival India, Pakistan and the West, London, 1958.

109. Spear, Percival The Oxford History of India, Oxford, 1958.

110. Syed Ahmad Khan, Sir Sir Syed on the Present State Indian Politics, Allahabad.

111. Symonds, R. The Making of Pakistan, London, 1949.

112. Shafi, Mian Mohammad Haji Sir Abdullah Haroon: A Biography, Karachi, 1951.

113. The Cambridge History of India, Vol. I, Cambridge, 1922.

114. Verma, Shanti Parsad Problems of Democracy in India, Delhi, 1940.

115. Wahiduzzaman Towards Pakistan, Lahore, 1964.

116. Wasti, Dr. Syed Razi The Political Triangle of India (1858—1924), Lahore, 1976.

102. Sayeed, K.B. Pakistan: The Formative Phase, Karachi, 1960.

103. Sayyid, Matloobul Hassan Mohammad Ali Jinnah: A Political Study, Lahore, 1953.

104. Sharma, J. Indian National Congress, Delhi, 1958.

105. Singh, Durlab A Complete Record of Unity Talks, Hero Publications, Lahore, 1945.

106. Sitaramyya, Pattabhi History of Indian National Congress, Vol. I, Madras, 1935 and Vol. II Bombay, 1947.

107. Seal, Anil The Emergence of Indian Nationalism, Cambridge, 1971.

108. Spear, Percival India, Pakistan and the West, London, 1958.

109. Spear, Percival The Oxford History of India, Oxford, 1958.

110. Syed Ahmad Khan, Sir. Sir Syed on the Present State Indian Politics, Allahabad.

111. Symonds, R. The Making of Pakistan, London, 1949.

112. Shafi, Mian Mohammad Haji Sir Abdullah Haroon: A Biography, Karachi, 1951.

113. The Cambridge History of India, Vol. I, Cambridge, 1922.

114. Verma, Shanti Parsad Problems of Democracy in India, Delhi, 1940.

115. Wahiduzzaman Towards Pakistan, Lahore, 1964.

116. Wasti, Dr. Syed Razi The Political Triangle of India (1858—1924), Lahore, 1976.

اشاریہ

اشخاص

اماکن

ادارے

کتب

اخبارات، جرائد و رسائل

مقالات

زبانیں اور رسم الخط

زبانیں

رسم الخط

متفرقات

مطبوعات زیرِ اہتمام قومی کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ
پیدائشِ قائدِ اعظم محمد علی جناح

(وزارتِ تعلیم، حکومتِ پاکستان، اسلام آباد)

تاریخی فیصلہ	عبدالواحد قریشی
سی۔ پی۔ میں کانگریس راج	(حکیم) اسرار احمد کریوی
قائدِ اعظم	چراغ حسن حسرت
اِشاریہ قائدِ اعظم	پروفیسر احمد سعید
قائدِ اعظم اور پاکستان	ڈاکٹر عبدالسلام خورشید
طلبہ اور تعلیم	ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ
ہندی اُردو تنازع	ڈاکٹر فرمان فتحپوری
نظریۂ پاکستان	پروفیسر شریف المجاہد
اِرشاداتِ قائدِ اعظم	بریگیڈیئر گلزار احمد
وہ رہبر ہمارا، وہ قائد ہمارا (منتخب منظومات)	ناصر زیدی۔ محمود الرحمٰن

نیشنل بک فاؤنڈیشن

کراچی - اسلام آباد - لاہور - پشاور - کوئٹہ - سکھّر - ملتان